دستاویزات میں بولتا بہاول پور

(1833-2025)



تدوین وترجمہ: پروفیسر نسیم بلوچ

دستاویزات میں بولتا بہاول پور

(1833-2025)

تدوین و ترجمہ
پروفیسر نسیم بلوچ

بکس اینڈ ریڈرز ملتان

اضافہ شدہ PDF ایڈیشن

اشاعت: جولائی 2025ء
اضافہ شدہ PDF ایڈیشن

عبدالجبار نے بھٹو پرنٹنگ پریس لاہور
سے چھپوا کر بکس اینڈ ریڈرز ملتان
سے شائع کی۔

قیمت: 1500 روپے

ISBN: 978-969-7563-88-3

انتساب

آخری مقتدر نواب کے مندرجہ ذیل الوداعی پیغام کے نام جس
میں نواب نے بہاول پور کے عوام سے کہا:

" آپ اور میرے خاندان کے درمیان جو تعلقات کئی سو سالوں سے چلے آ رہے تھے، اب ختم ہونے جا رہے ہیں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے گذشتہ پچاس برسوں میں مجھے محبت، خلوص، تعاون اور وفاداری دی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ پاکستان کے لیے وفادار رہیں گے۔ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک میں آپ کی ترقی اور بہبود میں دلچسپی لیتا رہوں گا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، آپ کا خیال رکھے اور آپ کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔"

وضاحت: (Disclaimer)

بہاول پور سے محبت کا ثمر یہ کتاب گذشتہ تقریباً دو صدیوں کے عرصہ کے دوران بہاول پور کے حوالے سے لکھی جانے والی انگریزی تحریروں اور مضامین کے اردو تراجم پر مبنی ہے اور مترجم کی طرف سے کوئی کمی بیشی نہیں کی گئی سوائے کہیں کہیں ناگزیر مختصر وضاحتوں کے لہٰذا ان تحریروں میں بیان کیے گئے خیالات سے مترجم کو مکمل متفق تصور نہ کیا جائے۔اسی طرح ان سے اتفاق یا اختلاف کرنا ہر قاری کا حق ہے۔امید ہے اس کتاب کو مکمل غیر جذباتی اور علمی رویے کے تحت دیکھا اور پڑھا جائے گا۔

فہرست

عرضِ حال

یہ صفحات محض سیاہی سے رنگے کاغذ نہیں، وقت کی سانسیں ہیں۔ یہ بہاول پور کی دھرتی پر پڑنے والی اُن چاپوں کی گونج ہے جو دو صدیوں سے زیادہ کے سفر کی گواہی دیتی ہیں۔ 1833 سے 2025 تک کا یہ سفر صرف برسوں کا گنتی نامہ نہیں بلکہ ایک تہذیب، ایک طرزِ حکمرانی اور ایک خوابیدہ وقار کی وہ بازگشت ہے جو کبھی خامشی کی چادر اوڑھے سسکتی رہی اور کبھی تاریخ کے کنگرہ دار میناروں سے پکارتی رہی۔ یہ کتاب صرف الفاظ کا ذخیرہ نہیں بلکہ ایک ایسا کارواں ہے جو زمانوں کو جوڑتا ہے۔ انگریزی زبان کی دستاویزات سے اردو کے قالب میں ڈھلے یہ متون وہ چراغ ہیں جو ماضی کی دھند میں امید کی روشنی فراہم کرتے ہیں۔ ترجمے کی یہ کوشش صرف لغوی ترسیل نہیں بلکہ ایک تہذیبی ترجمانی ہے؛ احساس، تناظر اور سیاق کے ساتھ۔ یہ "عرضِ حال" اُن تمام خوش بختوں کے نام ہے جنھوں نے وقت کے ہاتھوں سے چھن جانے والی تاریخ کو صرف یاد ہی نہیں رکھا بلکہ محفوظ بھی کیا؛ کاغذ، قلم، دل اور یقین سے۔ وقت جب بیتتا ہے تو فقط یاد نہیں بنتا، وہ ایک خاموش دستاویز کی صورت میں اپنا وجود چھوڑتا ہے۔ اگر محفوظ نہ کیا جائے تو یہ دستاویز مٹتی سطروں، بوسیدہ حاشیوں اور گم گشتہ معانی کے ساتھ غبار میں کھو جاتی ہے۔ میری زندگی کے کئی عشرے ساہیوال، لاہور، رحیم یار خان اور بہاول پور جیسے شہروں میں گزرے مگر دل کا ایک گوشہ ہمیشہ ریاستِ بہاول پور کی سنہری شاموں، خیمہ زن روایتوں اور دُھند میں لپٹی عظمتوں میں مقید رہا۔ یہ ریاست صرف ایک جغرافیائی خطہ نہ تھی بلکہ ایک تہذیبی لب ولہجہ، ایک طرزِ احساس اور ایک اجتماعی حافظہ تھی جسے وقت اور سیاست نے آہستہ آہستہ تحلیل کر دیا۔

کتاب کا آغاز موہن لال کے 1837 کے ایک نادر مضمون سے ہوتا ہے جو نہ صرف بہاول پور کی اولین بین الاقوامی جھلک ہے بلکہ اس کا سیاسی، معاشرتی اور معاشی سنگِ بنیاد بھی۔ اس

کے بعد کے ابواب میں ہم پرانی اور نئی دستاویزات کے ذریعے ایک ایسی کہانی کی گہرائیوں میں اترتے ہیں جو کہی بھی گئی ہے اور ان کہی بھی، سنی بھی گئی ہے اور اَن سنی بھی۔ اختتامی مضامین محکمہ اطلاعات وتعلقاتِ عامہ حکومت ریاست بہاول پور کے جریدے "بہاول پور ریویو" سے لیے گئے ہیں تاکہ ریاست کے انضمام سے قبل کے آخری برسوں کے رنگ اور لہجے محفوظ ہوسکیں۔

یہ تمام دستاویزات گذشتہ پینتالیس سالوں میں میرے پاس وقت کے دریچوں سے آتی رہیں؛ کبھی کسی بوسیدہ فائل سے، کبھی کسی درویش محقق کی عطا سے اور کبھی ماضی کی راکھ میں سے کسی چمکتے ذرّے کی مانند۔ یہ کوشش کسی مادی منفعت کی نہیں بلکہ ایک بےلوث کاوش ہے، ریاست بہاول پور کے ماضی کو حال سے جوڑنے کی اور اسے تاریخی شعور میں زندہ رکھنے کی تاہم کتاب میں پیش کردہ تمام بیانیے سے متفق ہونا ضروری نہیں؛ یہ ایک دعوتِ مکالمہ ہے، اعلانِ حتمی نہیں۔ میری آرزو ہے کہ یہ کتاب فقط ماضی کی کہانی نہ رہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک آئینہ ہو۔

اس کتاب کی ترتیب وتدوین کا مقصد محض ریاست بہاول پور سے متعلق تاریخی وانتظامی دستاویزات کو یکجا کر کے ایک ایسا حوالہ فراہم کرنا ہے جو محققین، طلبا، مؤرخین اور عام قارئین کے لیے علمی طور پر مفید اور قابلِ اعتماد ہو۔ کتاب میں شامل بعض اقتباسات ایسی معیاری کتب سے بھی لیے گئے ہیں جن کے مصنفین کی علمی خدمات ہمارے لیے نہایت قابلِ احترام و استناد ہیں۔ ان اقتباسات کی شمولیت سے قبل مصنفین سے رسمی اجازت حاصل کرنے کی سعی کی گئی تاہم درست اور مؤثر رابطہ ذرائع عدم دستیاب ہونے کے باعث ان سے براہِ راست اجازت ممکن نہ ہوسکی۔ یہ امر واضح کردوں کہ اس مجموعے کی تیاری سے کسی قسم کا تجارتی یا ذاتی مفاد وابستہ نہیں بلکہ یہ کام خالصتاً علمی خدمت اور تاریخی ورثے کے تحفظ کے جذبے کے تحت کیا گیا ہے۔ ہم ان محترم مصنفین اور قارئین سے اُمید رکھتے ہیں کہ وہ اس تناظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہماری کاوش کو علمی روایت اور تحقیقی ورثے کو جستجو کے ساتھ آگے بڑھانے کی ایک ''سعیِ حاصل'' تصور کریں گے۔

پروفیسر نسیم بلوچ

یکم جولائی 2025ء

لاہور

بہاول پور کی تجارت کے بارے میں

(On the trade of Bahawalpur)

منشی موہن لال (از۔ کالا باغ دریائے سندھ 20 جولائی 1837)

حکومت کو پیش کی گئی سیاسی، جغرافیائی اور تجارتی رپورٹس اور پیپرز جو 1935 تا 1937 کے دوران سروے کے دوران تیار کیے گئے، منشی موہن لال کی یہ رپورٹ VII نمبر پر 1837 میں شائع ہوئی۔

1۔ بہاول پور کی حدود:

داؤد پوترہ کے ملک میں بہاول پور کے علاوہ کوئی بہت بڑا شہر نہیں ہے۔ یہ شمال مشرق میں رانا متی سے لے کر جنوب مغرب میں فاضل پور تک پھیلا ہوا ہے جو لمبائی میں تقریباً 280 میل ہے۔ اس کی کاشت شدہ زمین کی چوڑائی جو دریائے گھارا کے دائیں کنارے سے لے کر ریتلے صحرا (روہی) تک ایک میل سے لے کر تیس میل تک ہے۔ یہ صحرا فتح آباد، بھٹنیر، بیکانیر اور جیسلمیر وغیرہ تک پھیلا ہوا ہے۔ دریا کے کنارے زرخیز ہیں مگر کئی مقامات پر جھاڑیوں اور جنگلی درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ گھارا، پنجند اور سندھ دریا مختلف کھودی گئی مصنوعی نہروں کے ذریعے ملک میں بڑی مقدار میں پانی پہنچاتے ہیں۔ ان نہروں سے مزید چھوٹے نالے (ڈرین) نکالے گئے ہیں تا3 کہ اندرونی علاقوں کو سیراب کیا جا سکے۔ ان میں سے کئی نہریں، جیسے قطب واہ، حجّا یا بہاری واہ اور اختیار واہ، یہ

بہار کے موسم میں کشتیاں چلانے کے قابل ہوتی ہیں۔

2۔زرعی پیداوار اور پھل:

داؤد پوترہ سردار کے زیرِ تسلط یہ ملک اگرچہ کئی جگہوں پر خشک اور بنجر ہے مگر یہاں گیہوں، جو، چنا، تل، ماش، بیج، سرسوں، مونگ، جوار، باجرا، سرسوں،، سرشف، دال ادس، مولی، گاجر، شلجم، دونوں قسم کی ککڑی، بینگن، پیاز، چقندر، زمینی کچالو، خربوزہ، تربوز، سیب، آم، لیموں، کھجور، بہی، ترنج، انگور، گلاب، چنبیلی، موسم خزاں کے پودے، پالک، لالہ کے پھول، گلِ تسرا، صد برگ (سو پتیاں)، گل شبو اور انگور کا سرکہ وغیرہ پیدا اور تیار ہوتے ہیں۔ یہاں سورکا بڑی مقدار میں استعمال ہوتا ہے کیوں کہ ہندو آبادی کا بڑا حصہ اسے مذہبی تہواروں اور روزوں کے موقع پر کھاتا ہے۔اس کی قیمت 12 سیر فی روپیہ ہے۔ بہاول پور کے خوب صورت باغات میں اگنے والے سیب، آم اور کینو اپنی شہرت رکھتے ہیں۔سیب 8 آنے فی من، آم 8 سیر فی روپیہ اور کینو 3 سے 4 روپے فی من میں فروخت ہوتا ہے۔

3۔ریاست کی آمدنی:

بہاول پور ریاست کی زمین، کشتیوں اور کسٹم ہاؤسز سے سالانہ آمدنی تقریباً چھ سے سات لاکھ روپے ہوتی ہے۔اگر ہم ان زمینوں کی آمدنی کو بھی شامل کریں جو سیدوں اور درباری امرا کو دی گئی ہیں اور وہ منافع جو ہندو کاشتکار کماتے ہیں تو یہ رقم آسانی سے دوگنی ہوسکتی ہے۔ یہ سالانہ رقم یا آمدنی ریاست کے سربراہ کی سالگرہ کے موقع پر، جو "صفر" کے مہینے میں یا عام طور پر مئی میں منائی جاتی ہے، خزانے میں جمع کی جاتی ہے۔

4۔کرنسی کی اقسام اور تجارت:

بہاول پور میں تین قسم کی کرنسی رائج ہے: احمد پوری، چوبیسرا اور بہاول پوری۔ ایک سو روپے کا سکہ جو موجودہ حکمران کے دور میں ٹکسال سے بنے ہیں اور تنخواہوں، تحائف اور خریداری میں دیے جاتے ہیں، 17 احمد پوری روپے کے برابر ہوتے ہیں۔ بہاول پور میں جو تین قسم کی کرنسی رائج ہے اس میں پہلی کرنسی حکومت کی جاری کردہ تھی۔ دوسری کرنسی 24 سرا افغان حکومت کے تحت جاری ہوئی

اور پورے ملک میں عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ 109، 24 سر اروپے 100 روپے کے سکے کے برابر ہوتے ہیں۔ بہاول پور میں بنائے گئے سکے صرف وہیں کے تاجروں میں رائج ہیں اور بہاول پور کا نواب ہی ان کو قبول کرتا ہے۔ 101 روپے اور 9 آنے بہاول پوری کرنسی کے 100 روپے کے برابر ہوتے ہیں۔

5۔ جائے وقوع اور مختلف ساز وسامان تیار کرنے والے:

بہاول پور دریائے گھارا کے بائیں کنارے پر واقع ہونے کے باعث تجارت کے لیے نہایت موزوں ہے۔ خراسان سے آنے والے قافلے یہاں سے ہندوستان اور راجستان کے مرکزی شہر پالی کی طرف گزرتے ہیں جب کہ پنجاب کے قافلے شکار پور، خیر پور اور حیدرآباد (سندھ) کی طرف جاتے ہیں۔ یہ شہر آبی راستے سے امرتسر، لدھیانہ، شجاع آباد، ملتان، مٹھن کوٹ، ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان وغیرہ سے بھی جڑا ہوا ہے۔ یہ شہر اپنی ریشمی مصنوعات کے لیے جانا جاتا ہے اور یہاں تقریباً 300 جولاہوں کی دکانیں موجود ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ہر دکان ماہانہ چھ جوڑے لُنگیوں کے تیار کرتی ہے۔ تیمور شاہی اور شجاع خانی کپڑا ریشم اور دھاگے کے امتزاج سے تیار کیا جاتا ہے اور مسلمان اسے عام طور پر شلوار بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ کپڑا بڑی مقدار میں خراسان برآمد کیا جاتا ہے اور بہاول پور میں 10 سے 30 روپے فی عدد فروخت ہوتا ہے جس کی لمبائی 9 گز ہوتی ہے۔ گل بدن کپڑا ڈیرہ غازی خان کے کپڑے جتنا عمدہ نہیں تاہم لمبائی اور قیمت میں تیمور شاہی کے برابر ہے۔ یہ کپڑا سندھ کے علاقے میں شلوار بنانے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ بہاول پور کی ریشمی لُنگیاں بافت یا بنائی کے لحاظ سے تین اقسام میں تیار کی جاتی ہیں۔ پہلی قسم، جس پر سنہری حاشیہ (بارڈر) ہوتا ہے، 20 سے 300 روپے میں فروخت ہوتی ہے۔ دوسری قسم جس کا کنارہ چاندی کا ہوتا ہے، 20 سے 60 روپے میں دستیاب ہوتی ہے جب کہ تیسری قسم جس میں سبز اور پیلے ریشمی کنارے یا بارڈر ہوتے ہیں، 7 سے 30 روپے تک میں فروخت کی جاتی ہے۔ یہ لُنگیاں اور گل بدن کپڑے (پھولدار ریشمی کپڑا) سالانہ تقریباً 80,000 روپے کی مالیت میں فروخت اور برآمد کیے جاتے ہیں۔ ان کپڑوں پر 1 روپیہ اور 12 آنے فی صد کے حساب سے ٹیکس عائد کیا جاتا ہے۔ اس

کے علاوہ بہاول پور میں کھدر (سادہ سوتی کپڑا) بھی تیار کیا جاتا ہے، جو 4 سے 14 گز فی روپیہ میں فروخت ہوتا ہے۔ ادوہتر، جو کہ ایک قسم کی موٹی ململ ہے، 3 سے 12 گز فی روپیہ میں دستیاب ہوتی ہے۔ توسیلہ جو 11 مختلف اقسام میں دستیاب ہے، شلوار بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور دھاگے کے ساتھ تھوڑی مقدار میں ریشم ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ گل بدن کی طرح دھاری دار ہوتا ہے اور 2 سے 4 گز فی روپیہ میں فروخت کیا جاتا ہے۔ انگریزی دھاگے سے تیار کردہ لُنگیاں جو 1 سیر فی روپیہ کے حساب سے فروخت ہوتی ہیں، بھی معیاری ہوتی ہیں اور ان کی قیمت 7 سے 10 روپے تک ہوتی ہے۔ بہاول پور میں پگڑیاں (عمامہ) اور دوپٹے بھی تیار کیے جاتے ہیں اور یہاں کے باشندے انھیں خاصی تعداد میں استعمال کرتے ہیں۔ ان دونوں کپڑوں کی قیمت 8 آنے سے 3 روپے فی عدد ہوتی ہے۔ مجھے ایک جولاہے نے بتایا کہ سالانہ تقریباً 80,000 روپے مالیت کے یہ کپڑے تیار کیے جاتے ہیں۔

6۔ بہاول پور کی چھینٹ

بہاول پور میں چھپی ہوئی چھینٹ کے رنگ خوب صورتی، پائیداری اور قیمت کے لحاظ سے ملتان اور ڈیرہ غازی خان کی چھینٹ سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ انھیں "ناصر خانی" کہا جاتا ہے اور یہ 30 سے 40 روپے فی پیمائش کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں۔ آغا رافی جو کہ ایک یہودی تاجر ہے، نے مجھے بتایا کہ بہاول پور کے چھاپے والے ملتان کے چھاپے والوں سے زیادہ ہنر مند ہیں اور اگر انھیں آرڈر دیا جائے تو وہ ایک ایسا کپڑا بنا سکتے ہیں جس کی قیمت 10 روپے ہو۔ یہ کپڑا خراسان کو برآمد کیا جاتا ہے جہاں اس کی سالانہ فروخت تقریباً 30,000 روپے تک پہنچتی ہے جب کہ جملہ رقم جو بُنائی کرنے اور چھاپنے والے کو حاصل ہوتی ہے وہ 80,000 سے 100,000 روپے کے درمیان ہوتی ہے۔

7۔ انگریزی دھاگا اور اون:

انگریزی دھاگا بڑی مقدار میں بمبئی سے پالی کے راستے درآمد کیا جاتا ہے جس پر ڈیڑھ

روپے فی صد کسٹم ڈیوٹی عائد ہوتی ہے۔ اس بازار میں پٹ سن دستیاب نہیں ہے۔ موٹی اون جس سے تھیلے اور رسیاں بنائی جاتی ہیں، ساڑھے چھ روپے فی پیمائش کے حساب سے فروخت ہوتا ہے جب کہ بکری کی باریک اور بٹی ہوئی اون کی قیمت 4 سیر اسی رقم میں آتی ہے اور سالانہ تقریباً 4000 روپے مالیت کی اون تیار ہوتی ہے۔ مزدور کی یومیہ اجرت 1 آنہ سے 5 آنہ تک ہوتی ہے۔

8۔ انگریزی کپڑا اور گروسری:

لٹھا، چھینٹ، کڑھائی والا کپڑا، سوتی پھولدار کپڑا، ململ، مادر پٹھ اور ڈوریا وغیرہ جیسے انگریزی ساختہ کپڑے بہاول پور میں سالانہ تقریباً 20,000 روپے کی مالیت میں استعمال ہوتے ہیں جب کہ پورے ملک میں ان کی کھپت تقریباً 60,000 روپے تک ہوتی ہے۔ یہ کپڑے "پالی" سے مخصوص راستوں کے ذریعے آتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل تک تاجر "پالی" سے تقریباً 20,000 روپے کی مالیت میں روزمرہ استعمال کی اشیاء (گروسری) لایا کرتے تھے لیکن "دہلی" کی وجہ سے یہ تجارت کم ہوکر 20,000 روپے سے 5000 روپے تک رہ گئی ہے۔

9۔ بہاول پور لوہانی قافلوں کی خراسان کے لیے گزرگاہ:

افغان یا پشتون لوہانی قافلے کلکتہ، بنارس اور فرخ آباد سے 500,000 روپے مالیت کے تمام قسم کے کپڑے لاتے ہیں۔ وہ بہاول پور میں اپنا کوئی سامان فروخت نہیں کرتے بلکہ یہ سامان خراسان لے جاتے ہیں۔ بہاول پور سے گزرنے والی یا یہاں درآمد و برآمد کی جانے والی اشیاء پر 1 روپیہ 9 آنے فی صد کے حساب سے محصول (ڈیوٹی) عائد ہوتی ہے۔ حال ہی میں لوہانی قافلے پالی کی مارکیٹ سے 20,000 روپے کے انگریزی کپڑے اور 1 لاکھ روپے کی مالیت کی خوردنی اشیاء لے کر آئے تھے۔ خراسان میں اس تجارت کے فوائد اتنے زیادہ تھے کہ وہ بڑی مقدار میں نقدی لے کر گئے لیکن وہاں ضرورت کے مطابق سامان نہ ملنے کے باعث وہ رقم واپس لے آئے۔

10۔ تجارتی بل اور مالیات:

جب بہاول پور کے تاجر پالی کے لیے بل کی ادائیگی کرتے ہیں تو وہ ہنڈی کے طور پر فی

صد 10 روپے وصول کرتے ہیں، امرتسر کے بلوں پر 11 روپے اور ملتان کے لیے بھی یہی شرح لاگو ہوتی ہے۔ بہاول پور کے تاجروں میں بیمہ یا انشورنس کا رواج عام نہیں ہے لیکن جب اسے کسی حد تک اختیار کیا جاتا ہے تو پالی تک مال کی ترسیل پر چارج ایک فیصد سے زیادہ نہیں ہوتا۔ بہاول پور کے تاجر پالی کے لیے ایک لاکھ روپے، ملتان کے لیے بھی اتنی ہی رقم اور امرتسر کے لیے پانچ لاکھ روپے تک کے بل دے سکتے ہیں لیکن شہر میں بینکاروں کو 30,000 روپے کا بندوبست کرنے میں بھی بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ ان کا کریڈٹ اتنی ہی حد تک ہے جتنا میں نے بیان کیا ہے۔

11۔ ریشم، پھل اور نیل و دیگر وغیرہ:

بہاول پور کو خراسان سے درج ذیل قسم کا ریشم فراہم کیا جاتا ہے۔ بہاری چھلہ۔ 40 روپے فی سیر، لبابئی 32 روپے فی سیر، چرخی 19 روپے سیر، کوہکری 16 روپے فی سیر اور پانچویں قسم 12 روپے سیر۔ اس پر فی من 4 روپے ٹیکس عائد کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اضافی اخراجات تقریباً 9 روپے تک پہنچتے ہیں۔ بہاول پور میں ریشم کو نہایت خوب صورتی سے رنگا جاتا ہے جہاں اس کی سالانہ کھپت ایک لاکھ پچیس ہزار روپے کی ہوتی ہے۔ کابل کے میوے، جیسے کشمش اور بادام وغیرہ یہاں سالانہ پچاس ہزار روپے کی مالیت میں خریدے جاتے ہیں جن میں سے نصف پالی برآمد کیے جاتے ہیں۔ بہاول پور کے علاقے میں تقریباً پچاس ہزار من نیل پیدا ہوتا ہے جسے فی من 50 سے 60 روپے میں خریدا جاتا ہے، اور ہر ایک بار برداری میں 7 من ہوتے ہیں۔ یہاں سے کابل تک کے اخراجات بشمول محصول فی بار برداری قریباً 18 روپے بنتے ہیں جب کہ بخارا میں یہ فی بار برداری یا لوڈ 50 سے 150 روپے کے منافع پر فروخت ہوتا ہے۔ لیہ میں اس پر فی من 2 روپے 4 آنے ٹیکس عائد کیا جاتا ہے۔ اس کے تقریباً 200 لوڈ جیسلمیر، ٹنڈ واللہ یار اور کراچی کے راستے بمبئی کو برآمد کیے جاتے ہیں لیکن اسے پالی کے راستے شاذ و نادر ہی بھیجا جاتا ہے۔ ہر بار برداری میں 9 سے 10 من ہوتے ہیں اور اس راستے کے اخراجات اور ٹیکس تقریباً 173 روپے فی بار برداری ہوتے ہیں۔ کابل سے ہر سال 4 لوڈ تانبا بہاول پور آتا ہے وفی سیر 1 روپیہ 12 آنے میں فروخت ہوتا ہے جب کہ اس سے بنائے گئے برتن 2 روپے 4 آنے میں بیچے جاتے ہیں۔ ہندوستان سے آنے والا تانبا ڈیڑھ روپے فی سیر

میں فروخت ہوتا ہے اور اس پر ڈیڑھ روپیہ فی صد ٹیکس عائد کیا جاتا ہے۔

12۔ بہاول پور میں استعمال ہونے والے رنگ (Dyes):

قرمزی ایک خوب صورت سرخ رنگ ہے۔ یہ پہلے بخارا سے بہاول پور لایا جاتا تھا لیکن اب بمبئی سے درآمد ہوتا ہے کیوں کہ وہاں سے سستا ملتا ہے اور راستے میں محصول بھی کم لگتا ہے۔ اس کی سالانہ درآمد کی مالیت بیس ہزار روپے ہے۔ یہ 8 سے 20 رتی (کرنسی کا نام) روپے فی سیر فروخت ہوتا ہے۔ مجنیت گہرے سرخ رنگ کا ایک مادہ ہے جو خراسان سے دس ہزار روپے مالیت کا درآمد ہوتا ہے اور ساڑھے نو روپے فی من فروخت ہوتا ہے جب کہ اس کی سالانہ درآمد تقریباً 4000 روپے تک ہوتی ہے۔ گلنا زفر (کسوب) مختلف مقامات جیسے کابل، امرتسر اور دہلی سے بہاول پور آتا ہے جس کی مجموعی قیمت سات ہزار روپے تک ہوتی ہے اور یہ 18 سے 28 روپے فی من فروخت ہوتا ہے اور اس ملک میں بھی اگایا جاتا ہے۔ کابل اور قندھار کا زعفران بھی بہاول پور کی منڈی میں فروخت ہوتا ہے۔ اس کی سالانہ مالیت 2000 روپے ہے، اور یہ 30 روپے فی سیر فروخت ہوتی ہے۔ ان رنگوں پر ڈیڑھ روپیہ محصول لیا جاتا ہے۔ رنگ ساز جب ان اشیاء میں سے ایک سیر رنگ استعمال کرتا ہے تو اسے چھ آنے ملتے ہیں۔

13۔ غلہ جات، پھل اور سبزیاں:

بہاول پور کے ملک میں مختلف اجناس کی قیمتیں درج ذیل ہیں:

1۔ گندم۔ 13 سے 15 آنے فی من، 2۔ جو 11 آنے فی من، 3۔ چنے 32 سیر فی روپیہ، 4۔ تل 15 سیر فی روپیہ، 5۔ ماش 26 سیر فی روپیہ، 6۔ مُنگ 29 سیر فی روپیہ، 7۔ جوار 11 سے 12 آنے فی من، 8۔ باجرا 12 سے 14.5 فی من، 9۔ سرسوں 12 سے 15 سیر فی روپیہ، 10۔ مسور 1.5 من فی روپیہ، 11۔ دس سوا من فی روپیہ

سبزیاں اور پھلوں کی قیمتیں: 1۔ مولی 3 تا 4 سیر فی پیسہ، 2۔ سوہانجنا 12 تا 18 سیر فی روپیہ، 3۔ گاجر ڈھائی سیر فی روپیہ، 4۔ کھیرا 4 سیر فی روپیہ، 5۔ بینگن 2 سیر فی روپیہ، 6۔ شلجم 2 سیر فی

روپیہ،7۔ پیاز ساڑھے چھ سیر فی روپیہ،8۔ چقندر 3 سے 4 آنے فی سیر

پھلوں کی قیمتیں: 1۔خربوزہ 2 پیسے فی سیر 2۔، تربوز 4 پیسے فی سیر، 3۔لیموں 2 سے 4 سیر فی روپیہ،4۔کھجور 4 سے 8 سیر فی روپیہ،5۔نارنجی فی پیسہ،6۔انگور 6،7،8،9 سیر فی روپیہ

پھولوں کی قیمتیں: 1۔گلاب 12 تا 14 سیر فی روپیہ،2۔چنبیلی (یاسمین)۔ چھوٹی ٹوکری 2 آنے،3۔اُرائیبل ۔ چھوٹی ٹوکری 2 آنے

14۔ ججہ ۔ زرخیز ضلع اور عمدہ خوشبودار چاول:

ججہ ایک زرخیز ضلع ہے جو دریائے پنجند کے کنارے واقع ہے۔ پنجند کا علاقہ نہایت عمدہ اور خوشبودار چاول پیدا کرتا ہے۔ جب ہندو تاجر (جنھیں " کپر تیجے " کہا جاتا ہے) اس چاول کو صاف کرتے ہیں تو یہ " کپر تیجے " چاول کہلاتا ہے۔ یہ 3 سے 4 روپے فی من فروخت ہوتا ہے اور سالانہ تقریباً 2000 باربردار مال مارواڑ بھیجا جاتا ہے جہاں اسے منافع کے ساتھ فروخت کیا جاتا ہے۔ یہ چاول ملتان اور ڈیرہ جات بھی بھیجا جاتا ہے مگر اس سے آگے نہیں جا سکتا کیوں کہ پشاور کے علاقے میں باڑا نہر کے کنارے پیدا ہونے والا چاول اس سے زیادہ معیاری ہوتا ہے۔

15۔ جیسلمیر اور بیکانیر کے صحرائی علاقوں میں بارش اور مکھن کی پیداوار:

اگر جیسلمیر اور بھٹنیر کے صحرائی علاقوں میں اچھی بارش ہو تو مویشیوں سے بڑی مقدار میں مکھن حاصل ہوتا ہے جو پورے داؤد پوترہ کے علاقے میں درآمد کیا جاتا ہے اور چار سیر فی روپیہ فروخت ہوتا ہے لیکن یہ بہت کم ہی غیر ملکی منڈیوں تک پہنچ پاتا ہے۔

16۔ شکر اور کپاس:

بہاول پور میں گڑ تیار کیا جاتا ہے لیکن یہ غیر ملکی علاقوں میں برآمد نہیں کیا جاتا۔ اس کی قیمت ڈیڑھ سے 2 روپے فی من ہے۔ (سفید شکر) یا کھانڈ لدھیانہ اور امرتسر سے آتی ہے اور 13 سے 14 روپے فی من فروخت ہوتی ہے۔ یہاں پیدا ہونے والی کپاس مارواڑ اور ملتان کی کپاس سے بہتر ہوتی ہے۔ بہاول پور کی کپاس 10 روپے فی من فروخت ہوتی ہے جب کہ مارواڑ اور ملتان کی کپاس

8روپے فی من دستیاب ہوتی ہے۔اس پر 11روپے فی صد محصول عائد کیا جاتا ہے۔

17۔ بہاول پور کی گائے اور بھینس کی کھالیں:

بہاول پور کی گائے اور بھینس کی کھالیں اپنی پائیداری اور مضبوطی کے لیے مشہور ہیں اگر چہ یہ خراسان کی کھالوں جتنی اعلیٰ معیار کی نہیں ہوتیں۔انھیں پہلے رگڑا جاتا ہے پھر چونے ملے پانی میں ڈالا جاتا ہے اوراس سے بدبو آنا شروع ہوجاتی ہے پھر کھال سے بال اتارے جاتے ہیں۔ بعد میں ہر کھال کو سی کر پانی سے بھر دیا جاتا ہے اوراس میں ببول کے درخت کی چھال ملائی جاتی ہے۔تین دن بعد کھال استعمال کے قابل ہوجاتی ہے۔

18۔ بہاول پور کی نہری گزرگاہیں اور تجارتی جہاز رانی:

میں نے بیان کیا تھا کہ اس ملک کی نہریں قابلِ نقل وحمل یعنی جہاز رانی کے قابل ہیں۔ اب میں مزید تفصیلات پیش کرتا ہوں۔ جب ڈیرہ غازی خان اور وہ علاقہ جو گھارا اور سندھ کے درمیان واقع ہے، بہاول خان کے قبضے میں تھا تو تاجر شجاع آباد میں تیار کردہ گڑ کو گھارا کے ذریعے قطب واہ بھیجتے تھے جو اپنا پانی اس دریا سے داؤد پوتروں کے قریب تقریباً 15 میل نیچے بہاول پور سے حاصل کرتی ہے، بغیر کسی رکاوٹ کے کشتیاں احمد پور تک لے جاتی تھی۔ بہاری واہ بھی شجاع آباد سے یہی مال چینہ کے راستے جام پور اور آباد پور لے جاتا تھا جہاں یہ کاشت کاری میں استعمال ہوجاتا تھا۔ یہ "واہ" پنجند سے تقریباً 5 میل نیچے اوچ کے قریب کاٹی گئی تھی۔اختیار واہ، جو سب سے بڑی اور گہری تھی عام طور پر ڈیرہ غازی خان سے خان پور کے لیے نیل لے جانے والی کشتیاں وصول کرتی تھی جہاں سے یہ پالی وغیرہ بھیجا جاتا تھا۔ یہ مشہور نہر دریا سے شیداری کے قریب الگ ہوتی تھی جو دریائے سندھ اور پنجند کے سنگم سے 7 کوس اوپر واقع تھا۔خان پور، جو جیسلمیر وغیرہ کی ایک تجارتی منڈی بھی تھا، وہاں سے کشتیاں واپسی پر جچ کے مشہور چاول ڈیرہ کے لیے اور ہر قسم کا غلہ احمد پور کے لیے پنجند، گھارا اور قطب واہ کے راستے لے جاتی تھیں۔چپٹی تہہ والی کشتیاں جو 100 سے 150 من وزن لے جاسکتی تھیں، اختیار واہ میں پانچ ماہ تک اور قطب واہ اور بہاری واہ میں دریا کے چڑھنے کے

آغاز کے بعد تین ماہ تک آسانی سے چل سکتی تھیں۔ یہ تمام راستے، جو پہلے داؤد پوترہ کے حکمران کے زیرِ حکومت تھے، مٹھن کوٹ کے اوپر، ڈیرہ غازی خان، ملتان، شجاع آباد، بہاول پور، احمد پور، آباد پور اور خان پور تک دریاؤں اور مذکورہ بالا نہروں کے ذریعے نقل وحمل کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ مولوی خدابخش، جو ایک مقدس شخصیت تھے، کشتیوں کے کرایے کے طور پر سالانہ 6,000 سے 12,000 روپے حاصل کرتے تھے۔ان کی ملکیت میں متعدد کشتیاں تھیں اوران میں مختلف تاجروں کا مال بغیر کسی محصول کے اُس وقت تک سفر کرتا تھا جب تک کہ ان کی کشتیاں اسے لے کر جاتی تھیں لیکن جب سے ڈیرہ غازی خان اور کوچی دیوان سمند کو کرایے پر دیے گئے ہیں، اس نقل وحمل کو کوئی حوصلہ افزائی نہیں ملی اور اب یہ سلسلہ ترک کیا جا چکا ہے۔ موہن لال، کالا باغ دریائے سندھ۔ 20 جولائی 1837

ضمیمہ (APPENDIX)

بہاول پور جانے والے راستوں کا خاکہ

بہاول پور سے پالی تک راستے اور محصولات:

ڈیرامل 30- کوس: بہاول پور کے دروازے پر فی بار برداری محصول 1 روپیہ اور 9 آنے فی صد جب کہ پالی کے لیے لوڈ محصول فی صد ایک پائی، ڈیرامل میں پھلوں پر ساڑھے چھ روپے فی لوڈ اور خوردنی اشیا، مصالحہ وکپڑے پر ساڑھے آٹھ روپے فی لوڈ محصول لیا جاتا ہے۔

بیکم پور۔ جیسلمیر کی سرحد۔ کپڑے، الائچی اور لونگ پر فی لوڈ ساڑھے چار روپیہ اور دیگر اشیائے خوردونوش پر 2 روپے 2 آنے فی لوڈ محصول۔

پھلوری۔ جودھپور کی سرحد۔ کپڑے پر 1 روپیہ 4 آنے فی لوڈ اور خوردنی اشیاء پر 15 آنے سے 1 روپیہ فی لوڈ محصول۔ پالی بہاول پور سے جیسلمیر: بہاول پور، بدروالی، ڈیرہ وال، فتح گڑھ، کھاٹنو، برجنوٹ، آدی، حد جیسلمیر (جیسلمیر کی سرحد) باروک، بامنکا گرم، پھلوری، جودھپور، پالی۔

بہاول پور سے جیسلمیر کا راستہ:

بہاول پور، احمد پور، چودری، خانپور، خیر گڑھ، اسلام گڑھ، جیسلمیر۔ ان تمام مقامات پر فیصد محصول کی بتدریج حد 1 روپیہ اور 8 آنے۔

بہاول پور تا سبزل کوٹ: سندھ کی مشرقی سرحد۔ احمد پور، اللہ آباد، خانپور، احمد پور لمہ، شاہو کارا، سبزل کوٹ

تمام تجارتی اشیاء پر محصول 1 روپیہ 8 آنے فی صد

بہاول پور سے ڈیرہ غازیخاں:

دریائے ستلج کی کشتی فی لوڈ 6 آنے۔ آدم واہن فی لوڈ 6 آنے۔ میاں پور ڈیڑھ آنہ ملتان 4 روپے فی لوڈ محصول۔ دریائے چناب کی کشتی۔ فی لوڈ 6 آنے۔ کنڈ رالا، دادو یا شیری، ڈیرہ غازی خان۔ بہاول پور تا کہیر ی۔ خالو ماتا، شاہ کوٹ، ملتان۔ دریائے چناب کی کشتی۔ جالا مالا۔

لیہ۔ کپڑے پر محصول 1 روپیہ 5 آنے فی کس، نیل پر 2 روپے 4 آنے فی کس۔ دریائے سندھ کی کشتی۔ کاہیری۔ تمام تاجروں کو سوائے افغانوں کے عمر خان کو فی لوڈ 2 روپے، نیل پر 1 روپیہ اڑھائی آنے فی کس محصول ادا کرنا ہوتا ہے۔ (موہن لال)

☆☆☆☆☆

حکایات بہاول پور

بہاول پور ریویو کے دستیاب شماروں میں شائع شدہ کالموں سے انتخاب

(میرے پاس بہاول پور ریویو برائے سال 1953ء و 1954 کل نو شمارے تھے جن میں سے سات شماروں میں Typically Characeristic کے مستقل عنوان سے بہاول پور کی تہذیب و معاشرت کے مختلف واقعات بیان کیے گئے ہیں اور اس کے تحریر کنندہ کا انگریزی میں (شاید قلمی) نام Kilam Zatnum تھا۔ کالم کے نام کا ترجمہ نمایاں خصوصیت، یا فطری اظہار کی اصطلاحوں میں بنتا تھا تو میں نے ''حکایات بہاول پور'' کا انتخاب کیا۔ ہم اسی نام کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور ان کالموں سے اس کتاب کے مختلف حصوں میں بہاول پور کی کچھ دلچسپ حکایات درج کرتے جائیں گے)

(1)

یقین کریں یا نہ کریں لیکن مقامی روایت کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ابوالفضل اور فیضی (ملّا مبارک کے بیٹے جو شہنشاہ اکبر کے دربار کے "نورتنوں" میں شامل تھے) اور "سسی پنوں" کی شہرت رکھنے والی سسی، بہاول پور ریاست میں واقع بھٹہ واہن گاؤں میں پیدا ہوئے تھے جو رحیم یار خان کے شمال میں تقریباً 10 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ روایت یہ بھی کہتی ہے کہ آج بھی مذکورہ گاؤں میں ایک ایسا مقام موجود ہے کہ جب بھی کسی ماں کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ بچہ عالمی شہرت حاصل کرے گا اور یا تو ابوالفضل جیسا عظیم مدبر ہوگا یا فیضی جیسا بلند پایہ عالم یا سسی جیسا عشقیہ شہرت رکھنے والا ہوگا۔ بہاول پور ریاست کے دیہی علاقوں میں دلہا بارات کے ہمراہ دلہن کے گھر جاتے ہوئے نکاح کی مقدس رسم مکمل ہونے تک اپنا چہرہ چھپائے رکھتا ہے تا کہ بدنظری سے محفوظ رہ سکے۔

اوچ شریف کے بارے میں

(Discription of Uch-Sharif)

تحریر: موہن لال مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل دسمبر 1836

اُوچ شریف یا مقدس اُوچ کے نام سے جانا جاتا ہے جو کہ دریائے ستلج (Shatadru) بیاس (Hyphasis) اور راوی (Hydraotes) چناب (Acesin) اورجہلم (Hvdaspes) کے ملاپ کے قریب واقع ہے، جغرافیہ دانوں کی توجہ کا مرکز ہے اور یہاں بہت سارے مسلمان بزرگوں کی قبریں موجود ہیں۔ ان میں سب سے قدیم قبر شاہ سیفُ الحق قاری کی ہے لیکن یہ اب ماند پڑ چکی ہے۔ اس بزرگ کی خاک (قبر) کو ایک خستہ دیوار نے گھیر رکھا ہے جس کے اوپر چھت نہیں ہے۔

اگر میں اُوچ کے بزرگوں کے ناموں اور ان کے غیر معمولی کرامات کا ذکر کروں تو میرے خیال میں بات لمبی ہو جائے گی تاہم میں اپنی عاجزانہ تحریر کی کاوشوں کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں، خاص طور پر سید جلال شاہ اور ان کے معروف ورثا کے بارے میں۔ وہ 600 سال پہلے وفات پا چکے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ انھوں نے 150 سال عمر پائی۔ ان کی قبر ایک بڑے مگر نیم تاریک کمرے میں واقع ہے اور یہ زمین سے تقریباً پانچ ہاتھ بلند ہے۔ یہ بہت سادہ عمارت ہے جس کی چھت بہت کمزور اور پرانی ہے اور اس کے دونوں اطراف ان کے بیٹوں کی دس قبریں ہیں۔ ہر قبر بالترتیب پہلی قبر سے ذرا بلند ہے جس سے ان کی عمر یا مقام کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کسی بھی قبر پر کوئی لکھا ہوا متن یا کتبہ موجود نہیں ہے۔ سید جلال شاہ نے بہت زیادہ شہرت اس وقت حاصل کی جب انھوں نے بہاول پور کے قریب واقع ریاست بیٹ واہی کے حکمران ہالسو کو شکست دے کر اور اس کے بیٹے بلاقو کو مسلمان کیا۔

سید جلال شاہ کے تین بیٹے تھے: احمد کبیر، بہاءُالدین اور سید محمد۔ جب ان میں سے پہلا بیٹا تقریباً دس سال کا تھا تو اس کی ملاقات بازار میں ایک شخص سے ہوئی جس کے بیٹے کی کسی بیماری کی وجہ سے موت واقع ہو چکی تھی۔ اس شخص نے احمد کبیر سے درخواست کی کہ وہ اس کے مردہ بیٹے کو زندہ کر دے۔ نیک نوجوان نے وضو کیا اور اپنا رخ مکہ کی طرف کر کے "قُم بِاذْنِ اللہ (اللہ کے حکم سے اٹھ) کے الفاظ پڑھے جس سے مردہ بچہ زندہ ہو گیا۔ میں تو صرف یہ جانتا تھا کہ ان الفاظ کو حضرت عیسیٰؑ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ احمد کبیر کی یہی کرامت بیان کی جاتی ہے۔ جب وہ بڑا ہوا تو وہ ان کے ہاں دو مشہور بیٹوں سید جلال الدین اور سید محمد راجو کا تولد ہوا۔ پہلے کو دنیا مَخدُوم جہانیاں جہانگشت یعنی مسافر اور تمام مخلوقات پر قادر کے نام سے جانتی تھی اور دوسرے کو راجو قتّال یعنی راجو قاتل کہا جاتا تھا۔ ان دونوں بھائیوں سے کئی معجزات منسوب کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے براستہ ایران حج کیا اور متعدد شادیوں کے باعث متعدد ممالک میں بچے چھوڑے جن کی تعداد روایات کے مطابق بہت زیادہ ہے مگر میں ان معلومات کو مستند قرار نہیں دیتا کیوں کہ ان کی صداقت مکمل طور پر مشتبہ ہے۔ مَخدُوم جب مدینہ پہنچا تو اُسے سید کی بجائے عام مسلمان سمجھا گیا۔ اس پر وہ دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا اور نبی کریم حضرت محمدؐ کی قبر مبارک کی طرف دیکھ کر کہا: "السلام علیک یا جدّی" یعنی آپ پر سلام ہو، اے میرے دادا تو مرقد مبارک سے جواب آیا "وَعَلَیکُم السَّلَامُ یَا وَلَدِی") یعنی تم پر سلام ہو، اے میرے بیٹے جس سے روضہ مبارک کے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ وہ ایک حقیقی سید ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ان کے مؤقر اور مسلمانوں کے ایک عظیم درویش ہونے کا ثبوت ہے۔ جب مجھے یہ معلومات ملیں تو میں نے اوچ کے اس مشہور مقدس شخص کے مزار کی زیارت کرنے کا ارادہ کیا۔ اپنے ہم وطن اور ہم جماعت پنڈت کاشی ناتھ کے ہمراہ ہم اُوچ کے شہر روانہ ہوئے اور کچھ تنگ گلیوں سے گزر کر مزار تک پہنچے۔ جب ہم وہاں کے مزار کے دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ اب بہت زیادہ کہنہ اور بوسیدہ ہو چکا ہے تو ہم مغرب کی طرف نیچے اُترے اور جنوب کی طرف مڑ کر اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں مَخدُوم کا جسد خاکی آسودہ خاک تھا۔ اس مزار کا ڈھانچہ بہت سادہ ہے لیکن یہ زمین سے تقریباً سات فٹ بلند ہے اور اس کے ارد گرد بہت ساری دوسری قبریں ہیں جس سے یہ پورا نظر نہیں آتا۔ مزار شریف میں کوئی

خاص چیز نہیں ہے۔ کمرے کے اندر تین چھوٹی کھڑکیاں روشنی فراہم کرتی ہیں۔ دروازے پر درج فارسی عبارت ہمیں مخدُوم کی وفات کی تاریخ بتاتی ہے۔

تاریک گشت جملہ جہان بی جمالِ شاہ

تاریخ بود ہفت صد و ہشتاد و پنج سال

شاہ یا مخدُوم کے بغیر تمام عالم میں تاریکی تھی تو تاریخ 785 ہجری کی تھی۔

مخدُوم جہانیان جہاں گشت کا مزار ہر سال دور دراز کے علاقوں سے آنے والے زائرین کا مرکز بن جاتا ہے۔ اس علاقے میں یہ بات قبولیت کا درجہ رکھتی ہے کہ پاگل شخص مخدوم صاحب کے مزار کی مٹی کھانے سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ یہ بہت عجیب بات ہے کہ اُوچ کے بزرگ جن کی قدیم زمانوں میں بے حد شہرت اور عزت تھی ان کے بعد ان کی اولاد اور پیروکاروں کی طرف سے ان کے مزارات کسی قسم کی تعمیری خوب صورتی سے آراستہ نہیں کیے گئے سوائے "بی بی جندوڈی" یا طویل عمر والی خاتون کے مزار کے جو ایک کھائی کے کنارے پر واقع ہے جو قدیم پنجابی دریاؤں کی گزرگاہ کی یاد دلاتا ہے اور ایک دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ اس عظیم مقبرے کا جنوبی حصہ بدقسمتی سے حالیہ سیلاب میں بہہ چکا ہے۔ اس کے علاوہ، یہ مسلمانوں کی غفلت کی وجہ سے بہت زیادہ متاثر ہو رہا ہے جو اس کی مرمت نہیں کرتے۔ دروازہ، جو مکمل طور پر دیمک نے کھا لیا ہے مشرق کی طرف کھلتا ہے اور اس میں دیگر دو گنبدوں کا منظر نظر آتا ہے۔ یہ گنبد مواد اور خوب صورتی میں اُوچ کے دیگر گنبدوں سے بہتر ہیں، سوائے "بی بی جندوڈی" کے۔ "بی بی جندوڈی" سید جلال شاہ کی نسل میں سے تھیں جن کا میں نے پہلے ذکر کیا۔ جس گنبد میں وہ آرام کر رہی ہیں وہ بھٹی پر پکائی ہوئی پختہ اینٹوں کو مسالے سے جوڑ کر تعمیر کیا گیا ہے۔ پوری عمارت کو مختلف رنگوں اور بدخشاں کے مشہور لاجوردی پتھروں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس عظیم عمارت کی بلندی تقریباً 50 فٹ اور محیط 25 فٹ ہے۔ اگرچہ بدقسمتی سے بادلوں سے دن کی روشنی نا ہونے کے برابر رہ گئی تھی پھر بھی ہم نے چھپائے ہوئے کیمرہ کی مدد سے بی بی جنڈ وڈی کے مزار کی ایک خاکہ نما تصویر تیار کرنے کی کوشش کی۔ میں اس کی ایک نقل اس مضمون کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔ [اس تصویر کو ہم ایک سابقہ موقع پر بیان کی گئی وجوہات کی بنا پر حذف کر رہے ہیں۔ مدیر)

حکایات بہاول پور

(2)

بہاول پور ریاست میں خوشحال مسلمان زمیندار یا قدامت پسند تاجر کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں کہ اس کی ایک سے زائد بیویاں ہوں۔ بعض اوقات تو چاروں موجود ہوتی ہیں لیکن اگر کسی خاکروب جیسے معمولی حیثیت رکھنے والے فرد کی دو یا تین بیویاں ہوں تو بھی حیرت کی کوئی بات نہیں۔ میرا پہلا خاکروب دو بیویوں کا مالک تھا۔ دونوں باری باری ہفتہ وار بنیاد پر میرے گھر کی صفائی کرتیں۔ بعد ازاں گھریلو جھگڑوں کے باعث وہ دیہات منتقل ہو گئے۔ پھر میں نے ایک اور خاکروب رکھا جس کی تین بیویاں تھیں۔ وہ بھی ہفتہ وار نوبت پر باری باری میرے گھر صفائی کے لیے آتیں۔ ایک دن میری بیوی نے ان میں سے ایک خاتون سے پوچھا کہ ان کا خاوند اتنے اخراجات کیسے برداشت کرتا ہے؟ جواب تھا": بیگم صاحبہ، ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا مالی لحاظ سے زیادہ فائدہ مند ہے۔ ہر بیوی ہر گھر سے پانچ روپے ماہانہ کماتی ہے۔ ہم مجموعی طور پر تقریباً 50 گھروں میں کام کرتی ہیں، اور یوں ہر ماہ ڈھائی سو روپے بن جاتے ہیں۔ اگر خاوند کے پاس صرف ایک بیوی ہوتی تو وہ بمشکل 15 یا 20 گھروں میں کام کر پاتی اور آمدنی بمشکل 75 یا 100 روپے ہوتی۔"

(3)

بہاول پور ریاست کے دوور دراز دیہی علاقوں میں جہاں شہری تہذیب کی رسائی کم ہے وہاں دودھ کی فروخت سختی سے ممنوع ہے۔ مقامی سماجی روایت کے مطابق دودھ کو ایک آسمانی نعمت سمجھا جاتا ہے اور اسے قیمت لے کر دینا گناہِ عظیم تصور کیا جاتا ہے چناں چہ دودھ مسافروں اور راہگیروں کو مفت میں پیش کیا جاتا ہے اور مہمان اس مہمان نوازی سے خوب لطف اندوز ہوتا ہے۔

داؤد پوترہ قبیلے کی ابتدا، ان کے سردار بہاول خان کا ظہور اور اقتدار کا سرسری بیان ستلج اور سندھ کے کنارے

(A brief Account of the origin of the Daud, Potras, and of the power and birth of Bahawal khan their chief, on the bank of the Ghiri and Indus,)

تحریر: موہن لال مطبوعہ جرنل آف ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ 1838

میں نے بہت پہلے سے ارادہ کیا تھا کہ آپ کے سامنے محمد بہاول خان جو کہ موجودہ داد پوتروں کے سردار ہیں، کے ظہور اور اقتدار کا بیان پیش کروں لیکن مجھے خیال آیا کہ وہ مقتدر ہستیاں جنھوں نے اکثر ستلج کے اس علاقے کا سفر کیا ہے شاید پہلے ہی ان کا ذکر کر چکے ہوں۔ تاخیر سے ملنے والے مارچ کے مہینے کے لیے ایشیاٹک جرنل کے حالیہ شمارے میں کیپٹن سی۔ ایم۔ ویڈ کے 1832-33 میں دریائے ستلج کے ذریعہ لدھیانہ سے مٹھن کوٹ تک کے دریائی سفر کا احوال موجود ہے وہ دراصل لاہور سے بہاول پور ایک مشن پر آئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ لیفٹیننٹ میکسن، 14 ویں رجمنٹ، این۔ آئی نے اس علاقے، عمارتوں، باغات اور لوگوں وغیرہ کے بارے میں تو تفصیل فراہم کی ہے مگر داؤد پوتروں کی کوئی سوانحی تفصیل نہیں دی جو کہ میں نے مستند ذرائع سے جمع کی ہے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ تحریر آپ کے لیے مکمل طور پر قابل قبول ہوگی لیکن امید ہے کہ یہ آپ کو کچھ تفریح اور معلومات فراہم کرے گی۔

داؤد خاں ایک غیر معروف پس منظر سے تعلق رکھتا تھا اور شکار پور میں ایک جولاہا (Spinner) تھا۔ وہ عام طور پر مضافات میں شکار کے لیے جایا کرتا تھا۔ ایک دن جب اسے کوئی شکار نہ ملا تو وہ مایوس ہو کر واپس آ رہا تھا کہ اچانک وہ ایک گھاٹ یا تالاب (ٹوبھے) کے کنارے پہنچا

اور اس نے پانی میں کسی جانور کے گزرنے کی آواز سنی۔ رات کا وقت تھا اور وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی انسان نہیں بلکہ کوئی جانور ہے۔ اس کے پاس ایک بھری ہوئی بندوق تھی اور وہ پانی میں اس کی نقل وحرکت دیکھ سکتا تھا چناں چہ اس نے گولی چلا دی۔ اسے ایک اونچی چیخ سنائی دی۔ داؤد اس کے سر کے قریب گیا اور جب وہ ابھی سانس لے رہا تھا تو وہ کہنے لگا کہ تم نے ایک معصوم اور بے قصور شخص کا قتل کیا ہے۔ میں جانور نہیں بلکہ ایک انسان تھا۔ تم میری بیوی اور بچوں کا خیال رکھنا کیوں کہ اب دنیا میں ان کا خیال رکھنے والا کوئی نہیں رہا۔ اس نے اس کے خاندان کے بارے میں معلوم کر لیا۔ اس کی موت کے بعد، داؤد نے اس کی ایک انگلی کاٹ لی اور اسے اس کے گھر لے گیا۔ وہاں پہنچ کر، اس نے دیکھا کہ ایک عورت دو کم سن بیٹوں کے ساتھ اکیلی بیٹھی تھی اور جب وہ قریب پہنچا تو وہ اسے ڈرانے دھمکانے لگی۔ داؤد نے کہا: "بیوقوفی کی کوشش مت کرو، میں نے ابھی تمھارے شوہر کو قتل کیا ہے،" اور اس کی کٹی ہوئی انگلی اس کے سامنے پھینک دی۔ اس عورت نے خود کو داؤد کے حوالے کر دیا اور اس سے رحم کی بھیک مانگی کہ وہ اس کے بیٹوں کو قتل نہ کرے۔ داؤد نے انھیں تسلی دی اور پوچھا کہ اس کے مرحوم شوہر کا کیا نام تھا اور اس کے بیٹوں کے کیا نام ہیں۔ عورت نے جواب دیا کہ اس کے شوہر کا نام "کہرو" تھا، اور اس کے دو بیٹوں کے نام کاہیر اور کانڈا (کانٹا) تھے اور ان کے آباؤ اجداد عام سی ذات سے تھے۔ چوں کہ وہ عورت جوان تھی اور اس کی رنگت اور شکل دلکش تھی، داؤد اسے اور اس کے بیٹوں کو اپنے گھر لے آیا۔ کہرو نے جو بھی دولت لوٹ مار کے ذریعے جمع کی تھی وہ سب داؤد کے ہاتھ لگ گئی۔ چوں کہ داؤد غیر شادی شدہ تھا اس نے بلا تاخیر اس عورت سے شادی کر لی۔ اس نے اس کے بیٹوں کے نام بدل کر "کاہیر" سے "کیہور" اور "کانڈا" سے "ارب" رکھ دیے۔ کچھ عرصے بعد، داؤد اور اس عورت کے ہاں ایک اور بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام "بیرج" رکھا گیا۔ جب یہ تینوں لڑکے بالغ ہوئے، تو انھوں نے بڑی اولادیں پیدا کیں۔ "براج" کی نسل کو آج بھی "برجانی" کہا جاتا ہے، جب کہ "کہور" کی نسل کو "کہرانی" اور "ارب" کی نسل کو "اربانی" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ چوں کہ بیرجانی داؤد کی اپنی نسل سے ہیں، وہ اپنے بیٹے کی بیٹیوں کی شادی تو کہرانی اور اربانی قبیلے میں کر دیتے لیکن ان کی بیٹیوں کو ان قبیلوں میں نہیں دیتے کیوں کہ وہ کہرانی اور اربانی کو قبیلے کا سب سے کم

تر حصہ سمجھتے تھے۔

(عرض مترجم) اوپر جو خیالی کہانی پیش کی گئی ہے جرنل کے مدیر نے اس پر اپنا نوٹ تحریر کیا ہے جس کا یہاں بیان کرنا لازمی ہے۔ حاشیہ نمبر ا۔ یہ کہانی بادشاہ "دسرتھ" کے ہاتھوں قتل ہونے والے "یجن دت" کی موت کے قصے سے مماثلت رکھتی ہے جو رامائن کا ایک خوب صورت باب ہے اور جس کا ترجمہ آنجہانی ایم۔ شیزی نے کیا تھا اور غالبًا اس کہانی کی شاعرانہ کیفیت بھی کچھ حد تک وہیں سے مستعار لی گئی ہے۔

حاشیہ نمبر 2۔ اس حاشیے میں مدیر نے اس سے مماثلت رکھنے والی ہندی شاعری اور اسکا لاطینی ترجمہ پیش کیا ہے جس کے اردو ترجمے کے لیے مترجم نے مصنوعی ذہانت سے تکنیکی معاونت حاصل کی ہے، ان اشعار کا اردو ترجمہ پیش ہے۔ پہلے سنسکرت اشعار کا ترجمہ ہے پھر ان اشعار کا لاطینی سے ترجمہ دیا گیا ہے، اور آخر میں اختتامی نوٹ بھی شامل کیا گیا ہے:

18۔

رات کے وقت، جب میں بے قابو حواس کے ساتھ،
دریا کے کنارے پانی پینے آئے ہوئے کسی ہاتھی،
یا کسی دوسرے جنگلی جانور کو مارنے کی خواہش میں تھا۔

19۔

تب میں نے پانی سے بھرتے ہوئے گھڑے کی آواز کو،
بینا آنکھوں کے بغیر، ہاتھی کی غراہٹ سمجھ کر سنا۔

20۔

میں نے تب کمان پر تیز اور اچھے پروں والا تیر چڑھا کر،
اسی آواز کی سمت تیر چلا دیا؛ بدقسمتی سے دھوکہ کھایا۔

21۔

تیر چلنے کے بعد جب گرا تو میں نے یہ آواز سنی:

''آہ! میں مارا گیا'' ۔ یہ کسی انسان کی دردناک اور کانپتی ہوئی آواز تھی۔

اور اب لاطینی ترجمے کا اردو مفہوم:

18۔

جب رات کو دریا کے کنارے ہاتھی یا کوئی دوسرا جنگلی جانور

پانی پینے آیا تو میں بے قابو دل کے ساتھ اسے مارنے کا خواہش مند تھا۔

19۔

تب میں نے، دیکھنے کی صلاحیت سے محروم،

ایک گھڑے کے بھرنے کی آواز کو ہاتھی کی آواز سمجھ کر سنا۔

20۔

پھر میں نے اپنی کمان پر اچھی طرح پروں والا، تیز تیر چڑھایا،

اور اس آواز کی طرف دھوکے میں آ کر فوراً تیر چھوڑ دیا۔

21۔

تیر چلانے کے بعد جب وہ گرا تو میں نے ایک دردناک انسانی آواز سنی،

''آہ! میں مارا گیا ہوں!'' یہ کسی بدقسمت انسان کی کانپتی آواز تھی۔

اختتامی نوٹ کا اردو ترجمہ:

اس خوب صورت باب کے اشعار کی طرز وہی ہے جو مہاونسا کے متعدد پالی اقتباسات سے جانی پہچانی ہے۔ انگریزی پڑھنے والا اسے بہتر طور پر اس مقبول دھن کی طرز پر پڑھ کر لطف اٹھا سکتا ہے: (مدیر کے نوٹ کے بعد اب ہم موہن لال کی باقی کہانی طرف آتے ہیں (مترجم)

جلد ہی ان کی طاقت اور تعداد میں بے حد اضافہ ہوا اور انھوں نے شکار پور کے مضافات میں اپنی رہائش کے لیے ایک الگ قلعہ تعمیر کر لیا۔ ان میں سے بیشتر لوگوں نے خود کو کھیتی باڑی، مچھلی پکڑنے اور دیگر نے لوٹ مار میں مصروف کر لیا حالانکہ ملک کے حکمرانوں نے ان کے برے کاموں پر انھیں دھمکیاں دیں لیکن انھوں نے کبھی ان کی بات پر کان نہ دھرے۔ داؤد پوتروں کی نسل مذکورہ تین اہم شاخوں سے نکلی اور جیسے جیسے ان کی تعداد میں اضافہ ہوا، وہ مزید مختلف قبیلوں میں تقسیم ہو گئے جن کے نام خاندان کے کسی معزز فرد کے نام پر رکھے گئے جو بعد میں گوتیں یا قبیلے کہلائے۔ اسی طرح داؤد پوتروں کی نسل کا آغاز ہوا۔

جب اورنگزیب 1118 ہجری (1707 عیسوی) میں وفات پا گیا، تو بہادر شاہ نے ہندوستان کا اقتدار سنبھالا۔ اسے روزانہ اطلاع ملتی تھی کہ جیوان خان کے تحت رہنے والے افغانی قندھار کے قریب سیوا اور ڈھاڈر کے علاقوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ وہ فخر سے کہتا تھا کہ اس نے اورنگزیب کے لیے دارا شکوہ کے خلاف بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ جب دارا شکوہ قندھار جاتے ہوئے سیوہ سے گزرا تو اس نے جیون خان کو مال و دولت سے نوازا اور اس پر بھروسا کرتے ہوئے اس کے گھر قیام کیا مگر جیوان خان دغا باز نکلا اور ان نے تمام احسانات کو بھلا کر اسے گرفتار کر کے دہلی میں بادشاہ کے دربار میں پیش کر دیا۔ بادشاہ نے اسے "بختیار خان" کا لقب دیا اور قیمتی پوشاکوں سے نوازا۔ بختیار خان نے بادشاہ سے اپنے وطن واپس جانے کی اجازت حاصل کر لی اور خود کو قندھار اور شکار پور کے حکمرانوں سے آزاد تصور کرنے لگا۔ وہ کھلے عام فخر سے کہتا تھا کہ اس نے دارا شکوہ کو قید کر کے اورنگزیب کو تخت پر بٹھایا مگر جب تک بادشاہ زندہ تھا وہ بغاوت یا لوٹ مار جیسی حرکتیں کرنے سے ڈرتا تھا۔ جب اورنگزیب کا انتقال ہوا تو بختیار خان باغی ہو گیا اور مسافروں کو لوٹنے کے لیے اپنی طاقت میں اضافہ کر لیا۔ بہادر شاہ اس پر سخت غضبناک ہوا اور اس کے خلاف اپنے بیٹے شہزادہ معزالدین کو ایک تجربہ کار فوج کے ساتھ روانہ کیا تا کہ ان ڈاکوؤں کو سزا دے۔ شہزادہ معزالدین ملتان کے راستے سیوہ پہنچا اور سخت جنگ کے بعد بختیار خان اور اس کے دیگر افغان ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ اس جنگ میں داؤد پوتروں نے شہزادے یعنی بہادر شاہ کے بیٹے کی بھرپور مدد کی اور بے مثال بہادری کا

مظاہرہ کیا۔ انھوں نے بختیاری لشکر کے کیمپ سے بہت سا مال غنیمت حاصل کیا لیکن ایک اچھے رہنما کی کمی کے باعث شہزادے اور درباریوں کی توجہ حاصل کرنے کے ذرائع سے محروم تھے۔ دباؤ کا شکار ہو کر انھوں نے فوج کے پیچھے لوٹ مار شروع کر دی جس پر انھیں شہزادے کے دربار میں طلب کر لیا گیا۔ معزالدین نے داؤد پوتروں سے ان کے اس غلط رویے کی وجہ پوچھی، جس پر ان کے سربراہان جیسے کہ صادق خان پیرجانی، مندوخان، اسلام خان، محمد معروف کہرانی اور قائم اربانی نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ انھوں نے بغیر کسی تنخواہ کے بادشاہ کا ساتھ دیا تھا۔ (یہ تفصیلات خاص طور پر "شاہ جہاں نامہ" اور "اورنگزیب نامہ" میں درج ہیں) اور شہزادے نے بختیاریوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا لیکن اس کے بدلے میں کوئی انعام حاصل نہ کر سکا۔ داؤد پوتروں نے یہ بھی شکایت کی کہ جنگ میں بہادری دکھانے والوں کو نظرانداز کر دیا گیا جب کہ ان لوگوں کو انعام واکرام سے نوازا گیا جنھوں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ یہ سن کر، شہزادے نے انھیں دریائے ستلج اور سندھ کے مشرقی کنارے اور شکار پور و ملتان کے مقابل واقع صحرائی علاقے پر قبضہ کرنے اور اسے ڈاکوؤں سے بچانے کا حکم دیا۔ شہزادے کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق، داؤد پوترے زمین کی پیداوار کا نصف حصہ حکومت کو دیتے اور باقی آدھا اپنے پاس رکھتے۔ یہ پہلا موقع تھا جب داؤد پوتروں نے دریائے سندھ کو عبور کیا۔ انھوں نے کچھے کے علاقے میں سب سے پہلے جس بستی کو آباد کیا وہ خان بیلہ کہلائی۔ پوری قوم نے زمین کو آپس میں تقسیم کر لیا جو آج تک ان افراد کے ناموں سے جانی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ دولت مند ہو گئے اور سبزل کوٹ سے کوٹ قوزان رئیس تک کے علاقے کے مالک بن گئے۔ انھوں نے ریتیلے صحراؤں میں قلعے تعمیر کیے جنھیں اسلام گڑھ، موج گڑھ، دین گڑھ، خان گڑھ وغیرہ کے نام دیے۔ یہ قلعے تقریباً 25 کی تعداد میں تھے اور ایک دوسرے سے 15 سے 16 کوس کے فاصلے پر واقع تھے۔ یہ علاقے ولہاراور بھالاں تک یعنی بیکانیر کی سرحد تک پھیلے ہوئے تھے۔ دریائے ستلج کے کنارے، داؤد پوتروں نے احمد پور، نوشہرہ، سلطان پور اور خان پور تعمیر کیے اور پاک پتن سے اوچ تک دریا کے مشرق و مغرب میں مختلف علاقوں کو آباد کیا۔ انھوں نے ملتان حکومت کی منظوری حاصل کی، کئی کنویں اور نہریں کھدوائیں اور شاہ گڑھ سے مٹھن کوٹ تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا جو دریائے

سندھ کے مشرقی کنارے اور چناب و پنجند کے مغربی کنارے کے درمیان واقع تھا۔ ان علاقوں میں انھوں نے کئی دیہات بسائے جو آج بھی انہی کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ جب ان کی طاقت میں اضافہ ہوا تو انھوں نے ظلم و زیادتی شروع کر دی کیوں کہ ان کے درمیان کوئی حکمران نہیں تھا اور وہ ایک دوسرے کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔ آخرکار وہ ظالم بن گئے اور مسافروں، زائرین اور تاجروں کو لوٹنے لگے۔

1153 ہجری کے آغاز میں، جب نادرشاہ دہلی فتح کر کے کابل واپس جا رہا تھا تو وہ مجبوراً ڈیرہ جات کی طرف آیا اور شکارپور اور لاڑکانہ کی راہ لی جہاں سے اس نے دریائے سندھ عبور کر کے عمرکوٹ کے حکمران خدایار یا میاں نور محمد کلہوڑا کو اطاعت پر مجبور کیا۔ جب اس نے ان علاقوں کے معاملات طے کیے تو اسے داؤد پوتروں کے خلاف بہت سی شکایات موصول ہوئیں۔ چناں چہ نادرشاہ نے سردار طہماسپ قلی خان کو مقرر کیا کہ وہ ان لوگوں کو سزا دے لیکن اس سے پہلے کہ ترموچ قلی (جیسا کہ یہ لوگ اسے کہتے تھے) ان کے علاقے میں پہنچا تو تمام داؤد پوترے اکٹھے ہو گئے اور انھوں نے اپنی عورتوں میں سے کئی کو قتل کر دیا، بچوں کو ساتھ لے کر ریت کے صحراؤں میں جا چھپے اور ایک چھوٹے سے تالاب کے گرد دیوار بنا کر اپنا دفاع کرنے لگے۔ سردار نے ایک بڑی فوج کی قیادت میں داؤد پوتروں کو گھیرے میں لے لیا۔ جنگ شروع ہو گئی اور ایرانی کمانڈر کو دشمن نے گولی مار دی۔ اگرچہ بعض کا کہنا ہے کہ یہ اس کے اپنے ہی سپاہیوں کی گولی سے ہلاک ہوا۔ اس کی موت کے بعد فوج منتشر ہو گئی، راستہ بھٹک گئی اور پانی کی کمی کے باعث جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ وہ پانی کے ٹوبھے جو داؤد پوتروں نے اپنے قبضے میں رکھے ہوئے تھے، اگر فارسیوں کے پاس ہوتے تو وہ فیصلہ کن فتح حاصل کر لیتے۔ سردار طہماسپ قلی خان کی موت اور اس کی ناکام مہم کی خبر نادرشاہ کو مشہد میں دی گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ناکامیوں کا بدلہ لے گا، مگر پہلے وہ اس خطے میں جاری بغاوتوں کو دبانے میں مصروف رہا جو اس کی زندگی کے آخری ایام تک جاری رہیں۔ جب شہزادہ معزالدین نے داؤد پوتروں کو دریائے ستلج کے بائیں کنارے کا علاقہ دے دیا تو صحرائی علاقے میں واقع دراوڑ کا قلعہ بیکانیر کے راجہ کی حکومت کے تحت تھا۔ میر مومن خان اور دیوان جسپت رائے جو نواب خان بہادر (بیٹا

ابوالفتح خان تیموری، گورنر لاہور وملتان) کے کارندے تھے انھوں نے راجہ کی فوج کو شکست دے کر قلعہ دراوڑ پر قبضہ کرلیا اور داؤد پوتروں کو اس کا مالک بنا دیا۔ان کا کہنا تھا کہ داؤد پوتروں کو دراوڑ میں بسا کر، انھوں نے اپنی سرحد پر ایک لوہے کی میخ گاڑ دی تا کہ اپنے دشمنوں کی پیش قدمی کو روکا جا سکے۔ داؤد پوتروں کے دراوڑ میں آباد ہونے سے پہلے، بیکانیر اور جیسلمیر کے راجپوت دریائے ستلج کے کنارے واقع مظفر گڑھ کے تمام شہروں کو لوٹتے اور تباہ کرتے تھے مگر جب سے داؤد پوترے یہاں آباد ہوئے تب سے کسی راجپوت کو صحرائی علاقے کو پار کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔لکھی نامی علاقہ (ایسا علاقہ جو دونوں اطراف میں چپٹی سطح مرتفع کا حامل ہو) پنجند اور دریائے سندھ کے مشرقی کنارے سے 25 کوس جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہاں سے دراوڑ تک کا راستہ طے کرتے ہوئے، موج گڑھ اور دین پور سے ولہار اور بھلڑ تک کا فاصلہ 100 کوس شمار کیا جاتا ہے۔ مذکورہ تمام قلعے دریائے ستلج کے مشرقی کنارے سے 25 کوس کے فاصلے پر واقع ہیں۔

داؤد پوترے قبیلے کے پیرجانی گوت کا پہلا فرد جو اس علاقے میں آیا وہ صادق خان تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام بہاول خان تھا جس نے شہر بہاول پور تعمیر کیا۔اس کے دو بیٹے ہوئے، مبارک خان اور فتح خان۔مبارک خان سخی اور عوام میں مقبول تھا۔اس نے شہر کو مزید وسعت دینے کے لیے کئی عمارتیں تعمیر کیں۔اسے ملتان کے حکمران علی محمد خان کھگواری نے خصوصی خطاب سے نوازا۔اس نے دریائے ستلج سے ایک نہر کھدوائی جو آج بھی سردار وہار کہلاتی ہے، اور جلال پور، کٹا، گھل وہار اور آدم وہار جیسے ویران علاقوں کو دوبارہ آباد کیا۔وہ ملتان حکومت کو باقاعدگی سے خراج ادا کرتا اور کچھی کے علاقے کو بہت ترقی دی یہاں تک کہ اسے ازسرِنو آباد کیا۔فتح خان زاہد اور درویش صفت تھا اور دنیاوی معاملات سے بے پرواہ رہتا تھا۔مبارک خان بے اولاد فوت ہوا اور اس کے بعد اس کے بھائی فتح خان کے بیٹے جعفر خان نے جانشینی حاصل کی جس کے بعد اسے بہاول خان کے نام سے پکارا جانے لگا۔

انتقال کے تیسرے دن تمام معزز داد پوترے اور اُوچ کے سید اکٹھے ہوئے تا کہ جعفر خان سے اس کے چچا کی وفات پر تعزیت کریں اور مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ان میں مخدوم سید

نصیر الدین بخاری اور مخدوم گنج بخش گیلانی بھی شامل تھے۔ یہ دونوں بزرگ کھڑے ہوئے اور جعفر خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہرانی قبیلے کے نور محمد خان اور جان محمد خان اور ابرانی قبیلے کے کرم خاں اور جوال خان کو مخاطب کر کے کہا": مبارک خان نے داد پوترے قبیلے کو ایک اچھا نام دیا اور ہر شخص کے ساتھ نرمی اور بھلائی کا سلوک کیا۔ تم لوگوں میں کوئی ایسا حاکم نہیں جو تمہیں متحد رکھے جب کہ دنیا میں ہر قوم کا کوئی نہ کوئی سربراہ ہوتا ہے۔ اگر تم ہماری مخلصانہ نصیحت پر عمل کرو تو سب مل کر جعفر خان کو اپنا رہنما تسلیم کرو اور اسے بہاول خان کا خطاب دو۔" بہت طویل بحث کے بعد، تمام داد پوتروں نے مخدوموں کی اس تجویز سے مکمل اتفاق کیا اور جعفر خان کو بہاول خان کا خطاب دے دیا اور اسے اپنے قبیلے کی وراثتی سربراہی قبول کرنی پڑی۔ اختیار خان کہرانی نے بہادری سے ان مخدوموں سے کہا": جس طاقت اور اختیار کو تم بہاول خان کے سپرد کر رہے ہو، یہی سب سے پہلے تمھارے اپنے گھروں کو تباہ کرے گا اور پھر پورے داد پوترے قبیلے کو برباد کر دے گا۔" بعد کے واقعات نے اس شخص کی پیش گوئی کو بالکل درست ثابت کر دیا۔ جب مذکورہ مخدوم وفات پا گئے، تو بہاول خان نے ان کے بیٹوں میں پھوٹ ڈال دی۔ ان کے قلعے زمین بوس کر دیے اور ان کی ساری جائیداد ضبط کر لی۔ اس نے ایسی چالیں چلیں کہ داد پوتروں میں انتشار پیدا ہو گیا جس کا فائدہ اٹھا کر بہاول خان نے سب کو کمزور اور غربت کا شکار کر دیا اور ان سے ان کے اختیارات اور مراعات چھین لیں۔

بہاول خان نے قبیلے میں عظیم مقام کے حامل خدا بخش خان کہرانی کو قتل کیا اور کہا، ''میں نے تمام باغی داد پوتروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس ملک میں ایسی امن و امان کی فضا قائم کر دی ہے کہ اب یہاں ایک عورت بھی حکومت کر سکتی ہے، بغیر کسی بغاوت کے خوف کے۔'' باغی داد پوتروں نے مدد کے لیے کابل کے بادشاہ تیمور شاہ سے رجوع کیا اور اسے یقین دلایا کہ اگر وہ آ کر بہاول خان کے خلاف ان کی مدد کرے تو اسے بے شمار دولت حاصل ہو گی۔ 1203 ہجری یا 1788 عیسوی میں، تیمور شاہ 70,000 گھڑ سواروں کے ساتھ بہاول پور پہنچا جس کی وجہ سے بہاول خان کو پناہ لینے کے لیے ریگستان کا رخ کرنا پڑا۔ بادشاہ نے دراوڑ قلعے میں قابض نواب کی فوج کو شکست دی اور تمام داد پوتروں کو سردار محمد خان سدوزئی کے ماتحت کر کے اسے اس علاقے کا گورنر مقرر کر دیا۔ جب تیمور شاہ

واپس روانہ ہوا تو بہاول خان نے اپنی چالاکی سے دوبارہ باغی داد پوتروں سے دوستی کر لی اوران کی مدد سے بادشاہ کے گورنر کو ملک سے نکال دیا اور دوبارہ حکمران بن گیا۔ بہاول خان 1224ہجری (1808 عیسوی) میں طبعی موت کا شکار ہوا، اس نے 36 سال تک حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا صادق خان حکمران بنا جس نے داد پوتروں پر 16 سال حکومت کی۔ یہی وہ شخصیت تھی جس نے عالی جناب ایل فنسٹن کے کابل کے سفر کے دوران ان کا بڑے عزت واحترام سے استقبال کیا اور مہمان نوازی کی جیسا کہ اس عالی جناب کے سفر نامے میں درج ہے۔

صادق خان کو گزرے تقریباً 13 سال ہو چکے ہیں اور اس کا بیٹا محمد بہاول خان جو موجودہ سربراہ ہے، نے اپنے تمام چچاؤں اور بھائیوں کو قتل یا قید کر دیا اور خود ملک کا مالک بن گیا۔ ابتدا میں وہ عیش وعشرت میں مبتلا رہا اور ملکی معاملات کی طرف بہت کم توجہ دی۔ پنجاب کے شیر نے اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا اور اسے ملتان اور کچھی کے علاقوں سے بے دخل کر دیا جو کہ اس کے باہمت آباؤ اجداد کی جاگیر تھی۔ جو زمین اب اس کے قبضے میں ہے وہ سالانہ چھ لاکھ روپے کی آمدنی دیتی ہے جب کہ اس کے خزانوں میں کل پانچ ملین روپے موجود ہیں جو دراوڑ قلعے میں محفوظ ہیں۔ اس کا مزاج آمرانہ ہے اور وہ ہر قسم کی عیش وعشرت کا عادی ہے۔ وہ برطانوی حکام کی طرف سے دریائے سندھ کی گزرگاہ میں ہر ممکن مدد فراہم کرتا ہے اور اس دریا پر ہمارا سب سے اہم اور بہترین اتحادی سمجھا جاتا ہے۔ اسے شکار کا بہت شوق ہے اور وہ شکار کے تمام ریکارڈز رکھتا ہے تا کہ اپنے والد کے شکار کے اعداد وشمار سے موازنہ کر سکے اور جان سکے کہ اس نے زیادہ شکار کیا یا اس کے آباؤ اجداد نے۔ جب میں لیفٹیننٹ ایف. میکسن (جو دریائے سندھ پر برطانوی ایجنٹ تھا) کی جگہ پر فرائض انجام دے رہا تھا تو بہاول خان نے میرے ساتھ بہت عزت ومحبت کا سلوک کیا اور مجھے ہر طرح کا احترام دیا۔ میں اس کے احسانات کا، جو اس نے میرے قیام کے دوران مجھ پر کیے، ذاتی اور سرکاری دونوں حیثیتوں میں شکر گزار ہوں۔ (انگریزوں کے بہاول پور میں عارضی سفیر اور ایجنٹ موہن لال کشمیری 1838)

☆☆☆☆☆

بہاول خاں کی ریاست کی تجارتی صورت حال کا جائزہ

(COMMERCIAL INFORMATION REGARDING

BAHAWAL KHAN'S COUNTRY)

Published at No.VI of reports and papers on

political,geographical and commercial published in calcutta

during 1837

تحریر: لیفٹیننٹ آر لیچ انجینئرز

بہاوال خان کے زیرِ حکومت علاقہ "ابھو "(ابھا) کہلاتا ہے، جو "لمہ" یا "سندھ" کے برعکس ہے۔ اس کے سرحدی علاقے سبزل کوٹ، دریائے بھٹہ، بھٹنیر، خیر گڑھ اور مروٹ ہیں۔ اس علاقے کے دو بڑے شہر احمد پور اور بہاول پور ہیں۔

احمد پور

احمد پور کی آبادی 10,000 نفوس پر مشتمل ہے۔ اس میں درج ذیل کاروباری مراکز اور دکانیں موجود ہیں: بینکاروں کے 3 گھر، منی چینجروں کے 10 گھر، کپڑے اور دیگر سامان فروخت کرنے والے 30 دکاندار، سرکاری غلے کے 4 گودام، سونے کے زیورات بنانے والے 40 سنار، 3 بندوق ساز، 20 لوہار، 15 مٹھائی فروش، 25 کھانے کے ہوٹل، 18 نیل رنگنے والے، 8 کسم کے پھول سے رنگ رنگنے والے، 33 بکرا گوشت بیچنے والے قصائی، 17 گائے کا گوشت فروخت کرنے والے قصائی، 86 کریانہ فروش اور 195 سادہ کپڑے کے جولا ہے۔

غلہ جات کی قیمتیں:

احمد پور میں اناج کی درج ذیل قیمتیں تھیں۔

گندم فی من:1روپیہ 10 آنے کرنسی محمودی کچا، اعلیٰ چاول (کولنگا)2روپے 8 آنے، موٹا چاول:2روپے، مونگ:2روپے 8 آنے، جوار:1روپیہ 2 آنے، چنے:1روپیہ 4 آنے، جو:1 روپیہ 2 آنے، تل:1روپیہ 12 آنے۔

پیمائش اور تولنے کے پیمانے:

1" کوس" تقریباً 3/2-1 انگریزی میل کے برابر ہے۔تقریباً 4/1-1، 50 محمودی روپے =1 سیر، 2.5 سیر =1 ٹوپا، 5 سیر =1 دری، 8 دری =1 من، 100 دری =1 مانی، بعض اوقات 13 من =1 مانی

سونے کے زیورات تولنے کے پیمانے:

8 چاول =1 رتی، 8 رتی =1 ماشہ، 12 ماشہ =1 تولہ، شاہجہانی چھوٹا گز یا ہاتھ =18 انگریزی انچ، عام گز یا ہاتھ =22 انچ، 2 ہاتھ =1 گز

ایک ہزار من نیل کے جو نمونے بھیجے گئے تھے اس سال احمد پور کے آس پاس کے علاقوں میں پیدا کیے گئے تھے۔حکومت ہر 5 من نیل میں سے 1 من لیتی ہے۔خان پور کے آس پاس کے اضلاع سے اس سال 800 من برآمد کیے گئے، کچھ حصہ اللہ یار کے راستے مسقط بھیجا گیا اور کچھ کابل۔ یہاں ایک من کی قیمت 50 کچا بہاولی روپے ہے۔ جو تاجر یہاں نیل خریدنے آتے ہیں انھیں احمد پور کے تاجروں سے خریدے گئے ہر 4 من کے بدلے حکومت سے 1 من خریدنا لازمی ہوتا ہے اور وہ بھی 10 روپے مہنگا۔ تاجر نیل کا معائنہ اس طرح کرتے ہیں کہ کیک کو توڑ کر اس کا رنگ دھوپ میں دیکھتے ہیں جو کہ گہرا نیلگوں جامنی ہونا چاہیے اور یہ بھی یقینی بناتے ہیں کہ اس میں چھلکا شامل نہ ہو۔ یہاں ایک من کی قیمت ہمیشہ 50 روپے ہی رہتی ہے۔اگر کوئی خریدار نیل کے نمونے کے نقص دکھا کر تاجروں سے بھاؤ تاؤ کرتا ہے تو بظاہر قیمت کم نہیں ہوتی مگر اسے ایک یا دو سیر زیادہ دے دیا جاتا ہے جو کہ بالآخر وہی بات ہوتی ہے۔ بہاول پور میں یہی نیل 65 روپے کچا میں فروخت ہوتا ہے اور اس کا کچھ حصہ ملتان برآمد کیا جاتا ہے جو خراسانی بازار کے لیے ہوتا ہے جہاں نیلی پتلونوں

کا بہت زیادہ رواج ہے۔ جب حکومت اپنی نیل کی مقدار مناسب قیمت پر فروخت نہیں کر پاتی اور نیل ان کے پاس ہی رہ جاتا ہے تو وہ اپنے سپاہیوں کو ماہانہ ایک سیر نیل بطور ادائیگی دیتی ہے اور اس کے بدلے ان کی تنخواہ سے 2 روپے کاٹ لیے جاتے ہیں جو کہ زیادہ سے زیادہ 5 روپے ہوتی ہے۔

مقامی موسموں کی تقسیم: یہاں سال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

1- گرمی کا موسم یا انالہ-6 ماہ

وساکھ (مئی)، جیٹھ (جون)، ہاڑ (جولائی)، ساون (اگست)، بھادوں (ستمبر)، اسوج (اکتوبر)

2- سردی کا موسم یا سیالا-6 ماہ

کاتک (نومبر)، مگھر (دسمبر)، پوہ (جنوری)، ماگھ (فروری)، پھاگن (مارچ)، چیتر (اپریل)

نیل کی کاشت:

نیل کا بیج چیتر (اپریل) میں بویا جاتا ہے۔ گذشتہ سال شکار پور کے ایک تاجر نے 5 اونٹ بھر بیج بمبئی بھیجا جہاں یہ 500 روپے فی کینڈی (20 من) میں فروخت ہوا جس سے خاصا منافع ہوا۔ یہاں نیل کی قیمت 30 روپے فی من ہے۔

زمین کی تیاری اور آبپاشی:

نیل کی کاشت کے لیے زمین کو ساون (اگست) میں سیلابی پانی سے بھرا جاتا ہے جو 3 ماہ تک کھڑی رہتی ہے۔ پھر پھاگن (مارچ) اور چیتر (اپریل) میں زمین کو ہل چلا کر بیج بویا جاتا ہے۔

جب پودے زمین سے نکل آتے ہیں تو کم از کم ہر 20 سے 25 دن کے وقفے سے 3 بار پانی دیا جاتا ہے، اسوج (اکتوبر) میں پتے چن لیے جاتے ہیں۔ چیتر (اپریل) اور پھاگن (مارچ) میں پرانے پودوں کو پانی دیا جاتا ہے۔ اگر زمین اچھی ہو تو دوسری فصل بھی اچھی ہوتی ہے

لیکن نئی زمین میں پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔

اون (Wool):

یہاں بھیجے گئے نمونے کی 200 من اون موجود ہے جس میں نصف سفید اور نصف بھوری ہے جو ایک سال میں اُبھو کے علاقے میں دنبہ سے حاصل کی گئی ہے۔ "دنبہ" کا نام تمام بھیڑوں پر لاگو ہوتا ہے چاہے وہ چربی والی دم والی نسل کی نہ بھی ہوں۔ اس کی قیمت 6 سے 7 روپے فی من (40 سیر) ہے۔ یہ درآمد نہیں کی جاتی بلکہ اسے قالین، رضائیوں اور دُھسّوں میں استعمال کیا جاتا ہے جو غریب لوگ پہنتے ہیں اور نمدے بنانے میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ بھیڑوں کو سال میں دو بار مونڈا جاتا ہے، ایک بار چیت (اپریل) میں اور دوبارہ اسوج (اکتوبر) میں، جس میں پہلی کٹائی سب سے عمدہ اور سب سے زیادہ مقدار میں ہوتی ہے۔

احمد پور کے ضلع میں سالانہ 100 من گڑ (شکر) پیدا ہوتا ہے جس کی قیمت 3 روپے فی من ہے۔ یہ برآمد نہیں کیا جاتا حالانکہ پہلے بڑی مقدار میں شکار پور بھیجا جاتا تھا۔ اس ضلع میں اناج کی پیداوار تقریباً 2 لاکھ روپے تک ہوتی ہے۔ یہاں 800 سیر تِل پیدا ہوتا ہے جس کی قیمت 15 روپے فی من ہے۔ صابن کی پیداوار تقریباً 40 سے 50 من ہوتی ہے تاہم اگر کھپت زیادہ ہو تو ہزار من تک تیار کیا جا سکتا ہے۔

احمد پور کی درآمدات مندرجہ ذیل ہیں:

سِنگرف (ورمِلین) دہلی سے، سالانہ 1 من، قیمت 200 روپے فی من احمد پور میں۔ چینی لدھیانہ سے سالانہ 1000 من، قیمت 17 روپے فی من۔ کالی مرچ، 200 من، قیمت 28 روپے فی من۔ تانبا (چادر کی صورت میں) 200 من، قیمت 60 روپے فی من۔ نشادر (سال امونیاک) دہلی سے، 200 من، قیمت 20 روپے فی من۔ کرمز (کوچینیل) دو من، قیمت 22 روپے فی سیر۔ لوہا، 100 من، قیمت 12 روپے فی من۔ ہلدی، 60 من، قیمت 18 روپے فی من۔ ادرک، 50 من، قیمت 16 روپے فی من۔ ہریڑ (مائیروبالن)، 50 من، قیمت 8 روپے فی من۔ پتھری نمک (سندھالو) 50 من، قیمت 3 روپے فی من۔ قلعی دہلی سے، 100 من، قیمت 14 روپے فی

من۔ سیسہ (لیڈ) 100 من، قیمت 13 روپے فی من۔ کپڑا 80,000 روپے مالیت کا درآمد کیا جاتا ہے۔ پیتل کے برتن، تقریباً 50 من وزن، قیمت 50 روپے فی من۔

احمد پور سے دریا تک اونٹ کرائے پر لینے کی قیمت 8 آنے ہے۔ خیر پور، گھوٹکی یا شکار پور گھاٹ تک کشتی کا کرایہ 3 روپے احمد پوری ہے۔ یہاں 80 ہراتی روپے کا وزن ایک سیر کے برابر ہوتا ہے جب کہ خان پور میں 84 روپے وزن ایک سیر کے برابر ہے۔ ہندو مہاجن مُکھی صاحب برادری کا سربراہ ہے۔ ایجنسی، بروکری یا کمیشن کی شرحیں یہ ہیں:

گروسری پر 1 فیصد، نیل پر ½ فیصد، کپڑوں پر 3/4 فیصد، سونے پر 1/4 فیصد، حوالہ یا بلوں پر 1/4 فیصد، اناج پر 1 فیصد

دلّالی یا بروکری کے نرخ:

منجیت پر 6 آنے فی صد، علاوہ ازیں تولنے والے کو 2 آنے فی من اور کوتوال (میئر) کو 2 آنے دیے جاتے ہیں جو کہ خریدار اور فروخت کنندہ دونوں دیتے ہیں۔ پھلوں پر 6 آنے، کریانہ پر 8 آنے فی صد، کپڑے پر 6 آنہ فی صد، دھاتوں پر 6 آنے فی صد۔

گودام کا کرایہ:

60 من گنجائش والے گودام کا کرایہ 8 آنے ماہانہ، 100 من گنجائش والے گودام کا کرایہ سوا روپیہ ماہانہ

ٹکسال) (منٹ) کا کرایہ:

پچھلے سال ٹکسال کا ٹھیکہ 2300 روپے میں دیا گیا تھا لیکن اس سال اب تک صرف 300 روپے حاصل ہوئے ہیں تاہم سال کے 6 ماہ باقی ہیں۔ کابل اور شکار پور سے پچھلے سالوں کے مقابلے میں چاندی کم آئی ہے۔ ٹکسال کا ٹھیکہ دار ہر 100 روپے کے سکے پر حکومت کو 2 روپے دیتا ہے اور اڑھائی روپے خود رکھتا ہے۔

شکار پور سے آنے والا تجارتی راستہ:

شکار پور سے روانگی کے بعد راستہ (قافلہ روڈ) کچھ یوں ہے:

روہڑی دریا عبور کر کے خیر پور، پھر مکائی، پتافی، خیر گڑھ۔اٹالا، ڈیہاول، سیاری کا کوٹ، نواہ خیر گڑھ، خیر پور ڈاہا، دراوڑ، بہاول پور یا احمد پور۔

شکار پور سے روانگی مندرجہ ذیل محصولات لاگو ہیں۔

کریانہ اور دھاتوں پر فی من 12 آنے، شکار پور کی طرف دریا کے کنارے فی اونٹ بار برداری 1 روپیہ، دریا پار یا دوسرے کنارے پر 2 روپے فی اونٹ، خیر پور میں داخلے پر 12 روپے فی اونٹ، اگر خیر پور نہ لے جایا جائے تو مستی خان ٹنڈہ کے راستے سے 1 روپیہ فی اونٹ، پتافی میں 2 من فی اونٹ، دراوڑ میں ساڑھے 6 روپے فی بار برداری، پھر احمد پور میں 1/4 آنہ فی روپیہ اشیائے خورد ونوش اور کپڑے پر 2.1/4 فیصد محصول۔ دریائی روٹ کو ابھی استعمال نہیں کیا گیا تاہم جلد متوقع ہے۔

سکھوں کی طرف سے احمد پور آنے والی اشیا میں گندم، اناج، جوار اور کپاس آتی ہیں جن پر 3/4 آنہ فی روپیہ لیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں دوسری اشیا پر دو آنہ فی روپیہ وصول کیا جاتا ہے جس طرح ملتان کا ساون مل بہاول پور کی اشیا پر وصول کرتا ہے۔ ضلع احمد پور میں کپڑے کی سالانہ پیداوار کی مالیت ساٹھ ہزار روپے ہے۔ 100 گز عمدہ کپڑا 8 روپے میں اور کمتر معیار کا 7 روپے میں بکتا ہے۔

احمد پور سے اونٹ کا کرایہ:

شکار پور 12 روپے، بہاول پور 1 روپیہ، ملتان 3.5 روپے، ڈیرہ غازی خان 4 روپے، اللہ یار 13 روپے جیسلمر 10 روپے، پالی 12 روپے، امرتسر 9 روپے، پشاور 14 روپے، کابل 24 روپے احمد پور کے اردگرد افیون کی پیداوار:

احمد پور کے پانچ دیہاتوں میں 20-16 من سالانہ پیداوار، قیمت: 12.5 احمد پوری روپے فی سیر

مشہور مہاجن (تاجر): لال چند بھابڑا، کھیت چند شرف، ڈولا مل پساری،

برآمدات و درآمدات:

احمد پور سے شکار پور کو 500 من چینی برآمد، لدھیانہ میں 3000 من چینی شکار پور روانگی

کے لیے تیار ہے ان میں سے ایک کشتی سیٹھ کا تارام جمگا ترا اور باقی چار بیکا نیر کے سیٹھ ہلیری مل کی ہیں۔ 5 من ہلدی، مرزاپور کے قرب و جوار میں بُنے ہوئے اورنگشن اور بالا کاڈا تمام ریشم کا کپڑا 12,000 روپے کا، 6,000، روپے کے اُبھا کے سادہ سوتی کپڑے، 2,000 روپے کا نیل، 2,000 روپے کا احمد پور کا چاول، 500 روپے کی لال مرچ، 200 روپے کا احمد پوری جیرہ (زیرہ)، 200 روپے کا، احمد پور کی اُڑد (ماش) کی دال دوصدروپے کی۔

کابل سے درآمدات:

پرانے سونے کے زیورات اور سنہری تلاّ روسی سکوں میں، چاندی کی اشرفیاں، مہریں اور یموس بخارا سے ہر ایک 140 روپے کے کل پچاس ہزار کے۔ 500-400 گھوڑوں کی پوستین کی کھال کے چغے، 10,000 روپے کے پھل، 25,000 روپے کی کپڑے رنگنے والی مجیٹھ۔ 2,000 روپے کا سنہری بروکیڈ) اصلی ونقلی (اور ریشمی کپڑا، کناگر یزو والا" نامی ریشمی کپڑا،

کابل سے خط کے ذریعے اطلاع:

چند دن قبل کابل سے ایک خط موصول ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ تمام نیل بخارا بھیج دیا گیا ہے اور قلت کی وجہ سے قیمت 150 روپے فی من تک پہنچ گئی۔ (کابل اور احمد پور کے روپے برابر ہیں) یہ خط شاہ پر مانند کے ایجنٹ موتو را داس کی طرف سے آیا تھا جو شکار پور میں مقیم تھا۔ یہاں قیمت 58 روپے فی من ہے لیکن خریدار نہیں مل رہے کیونکہ ساون مل جو ملتان کا گورنر تھا، پہلے ساڑھے بارہ روپے فی اونٹ بوجھ پر لیتا تھا لیکن اب وہ ہر روپے کی مالیت پر 2 آنے محصول لے رہا ہے۔

1 کابل کا من=1 من اور 15 سیر احمد پور کا۔

تجارتی سرگرمیاں:

شکار پور سے کابل سالانہ 20 اونٹوں کے بوجھ کے برابر نیل کی پیتاں بھیجی جاتی ہیں جن کی قیمت 4 روپے فی من ہے۔ کابل میں یہ نیل 44 روپے فی من فروخت ہوتی ہے۔

قاصد (پیغام بر) کے سفر کے نرخ

شکارپور: 6 روپے، بہاول پور: 12 آنے، ملتان: 21 روپے، ڈیرہ غازی خان: 21 روپے، ڈیرہ اسماعیل خان 7 روپے، امرتسر: 12 روپے، حیدرآباد: 15 روپے، کراچی: 7 روپے، جیسلمر: 10 روپے پالی 20 روپے، پشاور: 30 روپے

قافلوں کی آمد ورفت:

قافلے فروری (پھاگن)، مارچ (چیت)، مئی (ویساکھ)، اور جون (جیٹھ) میں روانہ ہوتے ہیں۔ شکارپور سے پورے سال قافلے آتے جاتے رہتے ہیں۔

خزانے کی ترسیل (Jagiree) کے نرخ:

شکارپور تک 1000 روپے پر 4 روپے محصول، ترسیل عام طور پر سندھی بدراکھیوں یا بھاڑیوں (خزانے اور دولت کی ترسیل کرنے والے لوگ جو عموماً سید ہوتے ہیں) کے ذریعے کی جاتی ہے لیکن سندھ میں کوئی انشورنس سسٹم نہیں ہے اور اگر مال کھو جائے تو اس کا ہرجانہ نہیں دیا جاتا۔

بہاولپور 12 آنہ ملتان: 1 روپیہ، جیسلمیر: سوا روپیہ، امرتسر ڈیڑھ روپیہ، ڈیرہ غازی خان: سوا روپیہ روپیہ، حیدرآباد: 5 روپے، پالی: 2 روپے

گھوڑے کا کرایہ (سوار اور ایک تا تین من بوجھ کے ساتھ):

شکارپور: 6 روپے، بہاول پور: 1 روپیہ، امرتسر: 6 روپے، ملتان: 3 روپے، ڈیرہ غازی خان: 4 روپے، جیسلمیر 8 روپے (ریت کی وجہ سے گھوڑوں کو نقصان ہوتا ہے)، پالی: 10 روپے، حیدرآباد: 13 روپے، پشاور: 25 روپے، کابل: 35 روپے

ہنڈی (زر مبادلہ) کے نرخ:

احمد پور میں 125 روپے 4 آنے میں 100 روپے کی شکارپوری ہنڈی خریدی جاتی ہے۔ احمد پور میں 75 روپے ادا کر کے بہاول پور میں 101 روپے کی ہنڈی حاصل کی جا سکتی ہے۔ 100 روپے کی جیسلمیری ہنڈی کے لیے 110 احمد پوری روپے درکار ہیں۔ پالی میں 100 گھاد شاہی روپے کے لیے 109

احمد پوری روپے ادا کرنے پڑتے ہیں۔حیدرآباد میں 100 روپے کی ہنڈی 102 احمد پوری روپے میں ملتی ہے۔امرتسر میں 100 نانکشاہی چلکی روپے کے لیے 112 احمد پوری روپے دینے پڑتے ہیں۔ملتان میں 100 متے نانکشاہی روپے کے لیے 108 احمد پوری روپے دینے ہوتے ہیں۔اگر کوئی اجنبی پالی میں کپڑا لاتا ہے لیکن احمد پور کے راستے میں خطرات کی وجہ سے لے جانے سے گھبراتا ہے تو وہ ہر روپے پر 2.5 آنے دے کر اپنا سامان احمد پور تک انشورنس کرواسکتا ہے۔یہ "ہنڈی چڑھا" کہلاتا ہے اور صرف مارواڑ میں رائج ہے۔سکھیتا سودا ایک ایسا معاملہ ہے جس میں اصل لاگت سے کہیں زیادہ قیمت کتابوں کے حساب سے طے کی جاتی ہے۔احمد پور میں 1 روپے کی مالیت کا سامان پالی میں 1 روپے 11 آنے میں شمار کیا جاتا ہے۔

دراوڑ میں دو تاجر ہیں جو خان کے تمام کاروباری معاملات سنبھالتے ہیں: رامچند بھابڑا اور رام داس۔احمد پوری روپیہ ساڑے آٹھ ماشے وزن کا ہوتا ہے۔پرانا بہاولی روپیہ پونے 12 ماشہ وزن رکھتا ہے اور ایک روپیہ چھ آنے احمد پوری کے برابر ہے۔گوونڈی روپیہ ساڑے گیارہ ماشہ وزن رکھتا ہے اور ایک روپیہ ساڑھے چار آنے احمد پوری کے مساوی ہے۔خیر پوری روپیہ ساڑھے گیارہ ماشہ وزن کا ہوتا ہے اور ایک روپیہ چار آنے احمد پوری کے برابر ہے۔بڑا اشکار پوری روپیہ یہی وزن رکھتا ہے اور چونتیس ٹکے = ایک احمد پوری روپیہ ہوتا ہے۔ہراتی روپیہ ساڑھے گیارہ ماشے وزن کا ہوتا ہے اور ایک روپیہ ساڑھے چار آنے احمد پوری کے برابر ہوتا ہے۔نانک شاہی روپیہ ساڑھے گیارہ ماشے وزن کا ہوتا ہے اور ایک روپیہ چھ آنے احمد پوری کے مساوی ہوتا ہے۔کلدار روپے کا بھی یہی تناسب ہے۔حیدرآبادی روپیہ ساڑھے نو ماشے وزن رکھتا ہے اور احمد پوری روپے کے برابر ہوتا ہے۔پرانا ٹھٹھہ روپیہ سات آنے کے مساوی ہوتا ہے۔نیا ٹھٹھہ روپیہ ایک روپیہ پونے آٹھ آنے کے برابر ہوتا ہے۔سونے اور چاندی کے کاروبار میں اگر کوئی صراف تجارتی لین دین کرے تو اسے حکومت کو ہر روپے پر ڈیڑھ پیسے ادا کرنا ہوتے ہیں۔سکہ ڈھالنے کی قیمت ایک پیسہ فی روپیہ ہے۔

اشیائے ضروریہ کی قیمتیں:

روئی: 14 روپے فی من (41 سیر کا من، اسی روپے)، رنگ منجیٹھ: (12 روپے فی من)،

تیل:5روپے فی من، اون:6 روپے فی من ، افیون:12 روپے فی سیر، صابن:8 روپے فی من، سکھڈ (تمارسک کے درخت سے نکالا جانے والا مادہ) پونے تین روپے فی من، آلو بخارا:2روپے فی من، کشمش:8روپے فی من، بادام:14روپے فی من، چلغوا بن چھلا:5روپے فی من۔

شکار پور سے درآمدات:

چار ہزار روپے مالیت کے قندھاری ٹکے ہر سال احمد پور لائے جاتے ہیں۔ پان کے پتوں کو خاص تیاری کے بعد دوصد من جو احمد پور میں دس روپے فی من بیچے جاتے ہیں۔ سنہری سنکھیا (orpiment) تقریباً دوصد روپے مالیت کا سوا دو روپے فی سیر لایا جاتا ہے۔ خراسان سے لائی گئی سوئیاں ایک ہزار روپے کی قیمت کی جو پونے دو سیر وزن کے بنڈل میں چار ہزار سوئیاں ہوتی ہیں۔ دھات کے برتن تین ہزار روپے مالیت کے۔ شکار پور میں بنائی گئی ڈھالیں پانچ صد روپے مالیت کی، جو دو سے دس روپے فی ڈھال میں فروخت ہوتی ہیں۔ سرمہ (antimony) چار صد روپے مالیت کا۔ افیون ایک ہزار روپے مالیت کی۔ (آر۔ لیچ انجینئر)

بہاول پور

آبادی اور پیشے:

بہاول پور کی کل آبادی تقریباً18,000 ہے، جو درج ذیل پیشوں میں تقسیم ہے:

لنگی اور اعلیٰ درجے کے دھاریدار کپڑے کے کاریگر:160، دیگر جولا ہے:250، رنگریز: 200، لوہے کی تار بنانے والے:50، کپڑے کے تاجر:150، برتن فروخت کرنے والے:25، لوہار:60، دوا فروش:60، نانبائی:40، پھیری والے (ہاکر) 40، سبزی فروش50، حلوائی:120، زعفرانی رنگریز:64، غلہ فروش:100، قصاب (گوشت فروش) 50، تانبے کے برتن بنانے والے: 30، صراف (منی چینجر) 45، نیل رنگنے والے:20، ریشم و زیورات بیچنے والے (پٹولی) 40، مٹی کے برتن بیچنے والے:8، عطار (خوشبو فروش:7)۔ تاجر:30،، ترکھان (بڑھئی):20، کھانے پینے کے ہوٹل:43، فالودہ بیچنے والے:50، سنار:43، تانبے کے کام کرنے والے:12، لکڑی کے برتن بنانے

والے: 16،لکڑی فروش: 12،کمہار (مٹی کے برتن بنانے والے) 22، درزی: 50،مصور یا پینٹر (شاید مصور بھی) 17،کمان بنانے والے :16،دلال (ایجنٹ / بروکر) 30۔

آمدنی) ریونیو:

بہاول پور کی سالانہ آمدنی تقریباً 1,25,000 روپے ہے۔

اہم تاجر اوران کا سرمایہ:

آغا رفیع (یہودی): 3لاکھ روپے،خوب چند: اڑھائی لاکھ روپے،گنگا داس بھابڑا: 1لاکھ روپے،ہسرڑی بھابڑا 2لاکھ روپے، گوردھن داس: 1لاکھ روپے، پنہ لال بھابڑا: 1لاکھ روپے

علاقے میں پیدا ہونے والی اشیاء اوران کی قیمتیں:

گڑ: 2,000 من، قیمت پونے چار روپے فی من، برآمد نہیں ہوتا۔ تیل: 10,000 روپے مالیت، قیمت 4 روپے فی من۔ زعفرانی پھول (Kasumb) یا (Safflowers) 2,300 روپے مالیت، قیمت 20 روپے فی من۔ گندم: 10 سے 14 آنے فی من۔ گھی: 10 روپے فی من، گندم اور گھی کی کل پیداوار 2لاکھ روپے مالیت۔ نیل: (Indigo) 800 من، اس سال کابل کو مکمل برآمد، قیمت 45 روپے فی من۔ لال تمبا کو: 2,000 من دہلی بھیجا جاتا ہے، ایک اونٹ کے ذریعے ترسیل کا خرچ ساڑھے 21 روپے۔

ہنڈیوں کے نرخ (Exchange of Bills)

110 بہاول پوری روپے = 100 روپے جیسلمیر میں (15 دن بعد ادائیگی)، 105 بہاول پوری روپے = 100 روپے بمبئی میں (41 دن بعد ادائیگی)، 103.5 بہاول پوری روپے = 100 روپے شکار پور میں (21 دن بعد ادائیگی)، 100 بہاول پوری روپے = 124 روپے حیدرآباد میں (27 دن بعد ادائیگی)، 112 بہاول پوری روپے = 100 روپے پالی میں (31 دن بعد ادائیگی)، 80 بہاول پوری روپے = 100 ڈاکدار روپے، کابل کے لیے 51 دن بعد ادائیگی)، 117.1/4 بہاول پوری روپے = 100 نانک شاہی روپے امرتسر میں (27 دن بعد ادائیگی)، 113.1/2 بہاول پوری روپے = 100 چلکے نانک شاہی روپے ملتان

میں(15 دن بعد ادائیگی)، 100 پرانے بہاول پوری روپے = 109.6 آنے بہاول خانی چالان، نقد تبادلہ 104 بہاول پوری روپے=100 شکار پوری روپے

قاصد کی کرایہ داری:

حیدرآباد تک 10 روپے، شکارپور تک 7 روپے، جیسلمیر تک 6 روپے، ملتان تک ساڑھے 3 روپے، خان پور تک 3 روپے، امرتسر تک 10 روپے، کراچی تک 14 روپے، پالی تک ساڑھے 8 روپے، کابل تک ساڑھے 25 روپے۔

کشتی کا کرایہ:

8 من وزنی سامان کے لیے 23 روپے شکارپور، کوکلی یا خیر پور کے گھاٹ تک، 5 روپے حیدرآباد تک، 4 روپے سہون تک، 7 روپے گوراباری تک، 4 روپے لدھیانہ تک، 3.5 روپے امرتسر تک، 2.5 روپے ملتان تک (نوٹ مترجم: یہ کرایہ جات 1837 کے سیاق وسباق کے مطابق ہوں گے جب مختلف شہروں کے درمیان سفر کے لیے مخصوص نرخ مقرر کیے جاتے تھے)۔

دلالی اور کمیشن:

راشن (گروسری) پر: دونوں فریقین سے 8 آنے فی صد، دھاتوں پر: 6 آنے فی صد، ہنڈیوں پر: 4/1 آنہ فی صد، سونے کے تبادلے پر: 2/1 آنہ فی صد، غلہ پر: 4 آنے فی صد۔

ٹکسال (منٹ) میں چاندی اور سونے کے سکے بنانے پر حکومتی فیس:

حکومت 1 روپیہ 5 آنے فی صد وصول کرتی ہے۔

بازار میں دکانوں کے کرائے:

ایک سال کے لیے دکان کا کرایہ 10 سے 15 روپے، ایک گودام جس میں 40 من سامان سما سکے، 1 روپیہ ماہانہ، 100 من کے گودام کا کرایہ 2 روپے ماہانہ۔

کمیشن کے نرخ:

ہنڈیوں پر: 4 آنے فی صد، رقم اور خزانے کی ترسیل پر: 4 آنے فی صد، کپڑے پر: 1 روپیہ فی صد، دھاتوں پر: 1.5 روپے فی صد، راشن پر: 2 روپے فی صد، غلہ پر: 1 روپیہ فی صد

اونٹوں کے کرایے:

شکار پور: 7 روپے، ڈیرہ غازی خان اور ملتان: 2 روپے، امرتسر: 7 روپے، جیسلمیر: 6 روپے، پالی: 8 روپے، اللہ یار: 10 روپے، حیدر آباد اور کابل: 20 روپے۔

برآمدات اور درآمدات پر محصول:

برآمدات: 2 روپے اڑھائی آنے فی صد، درآمدات: 3 روپے ساڑھے پانچ آنے فی صد، سکہ سازی پر محصول: پونے دو آنے فی صد
(رات کے وقت شہر میں سونے اور چاندی کی اسمگلنگ کی جاتی ہے، پکڑے جانے پر پورا مال ضبط کر لیا جاتا ہے (یہاں کے پیمانے احمد پور کے برابر ہیں)

لکڑی اور تعمیراتی سامان کی قیمتیں:

لکڑی کے تختے کا سائز: 3 فٹ 8 انچ × 1 فٹ 10 انچ × 1 فٹ، ببول (Acacia) کی 10 انچ لکڑی: 1 روپیہ، جھاؤ (Tamarisk) لکڑی: 2 گز فی روپیہ، ببول 2 انگلی چوڑائی کا تختہ: پونے دو گز فی روپیہ، (صرف یہ لکڑیاں گھروں کا سامان بنانے والے بڑھئی استعمال کرتے ہیں)۔

غلہ کی قیمتیں:

اعلیٰ درجے کا چاول: اڑھائی روپے فی من، عام چاول ڈیڑھ روپے فی من، گندم: 1 من 5 سیر فی روپیہ جوار: ڈیڑھ من فی روپیہ، چنے: 1 من فی روپیہ، مونگ: ڈیڑھ روپے فی من، موٹھ 1.25 روپے فی من، (یہاں وزن کا رائج پیمانہ 5 سیر ہے اور 80 محمودی روپے 1 سیر کے برابر ہوتے ہیں)۔

تجارتی راستے اوراخراجات مع مزدور:

1۔ بہاول پورسامان کی مالیت پر1روپیہ9 آنے فی صد+6 آنے فی اونٹ،2۔ بابرعلی، 8 کوس،ایک شکارگاہ،ایک قلعہ اور12 کنویں نواب کے،3۔ مٹاڈو12 کوس،50 گھر،4 کنویں، 4۔ دیراوڑ12 کوس،200 گھر،6 کنویں،4.3/4روپے فی اونٹ /8 من،5۔ نانکوٹ 18 کوس،20 گھر،2 کنویں،5روپے فی اونٹ،6۔ نڈھائی 48 کوس،50 گھر،5 کنویں، رانی کے علاقے کی حدود، 7۔جیسلمیر 18 کوس،11روپے فی اونٹ،اس راستے پر پاسپورٹ لازمی ہوتا ہے

دیگر راستے بہاول پور:

1۔خان پور 7 کوس،ایک بڑا قصبہ اور قلعہ، پانی وافر،8روپے فی اونٹ،2۔ بھاگلا16 کوس،8 گھر،4 چھوٹے کنویں،3۔دھنوٹ32 کوس،50 گھر،2 کنویں،300فٹ گہرائی۔

راستوں اورفاصلے کی تفصیلات:

1۔گوٹارو24 کوس،8 گھر،3 کنویں) گہرائی200فٹ،2۔شاہ گڑھ10 کوس،30 گھر،3 کنویں،3۔ جوبا50 کوس،8 گھر، پانی کے چشمے (ہر 8 کوس پر بھی موجود)،4۔ ڈِنگ20 کوس،8 گھر،2 کنویں،5۔اللہ یار12 کوس،اونٹ کا کرایہ: اڑھائی روپے

جیسلمیر کے راستے:

1۔کوآڈی22 کوس،10 گھر،2 کنویں،2۔ساتوک8 کوس،5 گھر،1 کنواں،3۔ سوندرو15 کوس،50 گھر،4 کنویں،4۔چھوڑ12 کوس،80 گھر،5 کنویں،5۔عمرکوٹ3 کوس

پھلوری کے راستے:

1۔بپ 8 کوس، پانی کا ٹینک،2۔نوکھ 6 کوس، 6 کنویں، 3۔ بیکون پور 8 کوس،2 کنویں) ہلکا کھارا پانی۔(اونٹ پر راشن کی مالیت کا2روپے12 آنے، کپڑے پر ٹیکس: سوا5روپے، کرمیزکوچینیل رنگ پر 17 روپے)،4۔ چنڈ نالا 4 کوس، 1 کنواں) کھارا پانی 5۔ رکن پور 28 کوس،(راشن کا کرایہ ساڑھے6روپے فی اونٹ، کپڑا: سوا8روپے،قرمیز ساڑھے چار آنے (یہاں

یا ڈیرا وار میں)6۔ تیار ا24 کوس، 7۔ بہاول پور 18 کوس (ہر چیز پر چوتھائی روپیہ ٹیکس سوائے قرمیز پر آدھا روپیہ ٹیکس)

بازار میں مختلف سکوں کی قیمتیں:

1۔ ایک احمد پوری روپیہ 12.25 بہاول پوری آنے، 2۔ 100 پرانے ٹھٹھہ روپے = 112 بہاولی۔ 3۔ 100 نئے ٹھٹھہ روپے 116 روپے 9 آنے بہاولی، 4۔ 100 دہلی سکے 110 روپے 4 آنے بہاولی، 5۔ 100 حیدر آبادی روپے میر کرم علی کے سکے (86 چالان)، 6۔ 100 مراد علی کے سکے 84 روپے 8 آنے بہاولی، 7۔ 100 میر فتح علی کے سکے 103 روپے 10 آنے بہاولی، 8۔ 1 اخیشائی ایک روپیہ سوا آنہ بہاولی، 9۔ 1 نانک شاہی 1 روپیہ ڈیڑھ آنہ بہاولی، 10۔ 1 پرانا کالدار 1 روپیہ پونے دو آنے بہاولی، 11۔ 100 بدخشی روپے) ہرات کے سکے، 1224 کے مطابق 102 بہاولی۔

برآمدات۔ شکار پور اور خیر پور میں سالانہ تجارت:

دھلے ہوئے سوتی کپڑے 10,000 روپے، غیر دھلے ہوئے سوتی کپڑے 20,000 روپے، سادہ لُنگیاں 20,000 روپے، خوب صورت کڑھائی دار لُنگیاں 30,000 روپے، گربی (کپڑے کی ایک قسم)20,000 روپے، راشن (گروسری)10,000 روپے، ٹسر (اعلیٰ معیار کا ریشمی کپڑا)20,000 روپے۔

برآمدات اور درآمدات کی تفصیلات:

حیدر آباد اور اللہ یار کو برآمدات یہ ہیں: کورا کپڑا ایک لاکھ روپے مالیت کا، دھلا ہوا سوتی 10,000 روپے، بغیر دھلا سوتی 20,000 روپے، سادہ لُنگیاں 10,000 روپے، نفیس لُنگیاں 10,000 روپے۔ یہاں کھنچنے والی نیل 10,000 روپے، ٹسرّ کپڑا 10,000 روپے۔ مارواڑ کو برآمدات: اُبھے میں پیدا ہونے والا چاول 50,000 روپے مالیت کا، گندم 10,000 روپے، گھی 25,000 روپے، کورا کپڑا 10,000 روپے، مونگ 5,000 روپے، چھینٹ 2,000 روپے، نیل 3

لاکھ روپے، ریشم اور سوتی کورا کپڑا 1 لاکھ روپے۔

کابل کو بہاول پور سے برآمدات:

50,000 روپے کی گروسری، 50 اونٹوں پر مشتمل چھینٹ اور بہاول پور کے راستے سالانہ 100 اونٹوں کے بوجھ کے برابر انگریزی کپڑا گزرتا ہے۔

بمبئی سے درآمدات:

نوابی ریشم سالانہ 400 من جو 18.5 روپے فی سیر میں فروخت ہوتا ہے اور طلب بڑھ کر 700 من تک ہوسکتی ہے، دیگر ریشم 300 من سالانہ، جو 6 سے 7 روپے فی سیر کے حساب سے فروخت ہوتا ہے۔ سیاہ مرچ 500 من جو مارواڑ کے راستے 25 روپے فی من کے حساب سے آتی ہیں۔ قرمز جو دہلی اور کابل سے بھی آتی ہے، 50 من، 17 روپے فی سیر۔ انگریزی کپڑا، بشمول دہلی سے آنے والا، 1.5 لاکھ روپے۔ تانبا 5,000 روپے، 58 روپے فی من۔ پیوٹر 2,000 روپے، ساڑھے 12 روپے فی من۔ سوئیاں 2,000 روپے، 9 روپے فی پیکٹ، ہر پیکٹ میں 4,000 عدد اور وزن سوا سیر۔ گروسری 10,000 روپے مالیت کی، اونی کپڑا 5,000 روپے، بید 20,000 روپے، 10 سے 13 روپے فی من، بشمول مارواڑ سے آنے والا لوہا 10,000 روپے۔

امرتسر اور لدھیانہ سے درآمدات:

چینی 2500 من، قیمت 30,000 روپے، کریانہ 10,000 روپے، دھاتیں 10,000 روپے، قرمزی رنگ 10,000 روپے۔

دہلی سے درآمدات:

بروکیڈ (ریشمی کپڑا) 23,000 روپے، فی تولہ قیمت 1 روپیہ 10 آنے۔

ڈیرہ غازی خاں اور ملتان سے درآمدات:

روئی 100,000 روپے، فی من 10 روپے، کاٹن 20,000 روپے، دس روپے فی من، رنگین کپڑا 20000 زروپے، دیگر کپڑا 20000 روپے، گلبدن 20,000 روپے۔

عمر کوٹ اور جے پور سے:

ہر سال 25,000 روپے مالیت کی روئی، فی من 11 روپے لائی جاتی ہے۔

اللہ یار سے:

ہر سال 1 لاکھ روپے مالیت کا کریانہ۔

شکار پور سے درآمدات:

ریشم 10,000 روپے مالیت کا، قندھاری ٹوپیاں 5,000 روپے، سوئیاں 2,000 روپے، حنا قسم کی شے 2,000 روپے، خراسان سے کریانہ 5,000 روپے۔

کابل سے درآمدات:

چرخِ ریشم 50 سیر سالانہ، فی سیر 16 روپے، بخارا اور ہرات سے کوکنی ریشم 200 من سالانہ، فی سیر 12 روپے، سونا 80,000 روپے مالیت کا، فی تولہ 17.5 روپے، (جتنا منگوایا تھا تمام بک جائے گا)، اشرفیاں 20,000 روپے، فی عدد 5 سے 7 آنے، چاندی 100,000 روپے مالیت کی، فی روپے میں سوا دس ماشے، زعفران (بکوا) 10,000 روپے، فی سیر 30 روپے، کیسر گل (پھولوں کی شکل میں زعفران) 5,000 روپے، فی سیر 50 روپے، ہرات سے زعفران 2,000 روپے، فی من 28 روپے، گھوڑے 50,000 روپے جن پر بہاول پور میں فروخت کرنے پر 2.5 فیصد محصول، خشک و تازہ میوہ جات 10,000 روپے، بادام 3,000 روپے، فی من 12 روپے، اصل بروکیڈ 2,000 روپے، نقلی بروکیڈ 1,000 روپے، پوستین 2,000 روپے، چوغے 1,000 روپے، سونا 80,000 روپے، مختلف اقسام: بھگہ، فی تولہ 17.5 روپے، موہر، فی عدد 18، 19، 20 روپے،

اشرفیاں، تلہ، فی عدد 6 روپے 9 آنے۔ چاندی 20,000 روپے، جسے یاموس جنیٹی کہا جاتا ہے، مرجان 5,000 روپے، فی تولہ 2،3،5 روپے، قیمتی پتھر 50,000 روپے، گدھے 5,000 روپے، اگر یہ بہاول پور میں فروخت ہوں تو ان پر 4 فیصد محصول، زعفرانی پھول 2000 روپے، ریشم 25,000 روپے، قرمزی رنگ 10,000 روپے، منجیٹھ 20,000 روپے، فی من 9.5 روپے، اشبرگ 2,000 روپے، فی من 17 روپے، بوگند (مرچ جیسا بیج) 2,000 روپے، فی من 20 روپے، ریشم صاف کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، ہینگ 160 من، جس میں سے 120 من مارواڑ بھیجا جاتا ہے، فی من قیمت 40 سے 60 روپے۔

رنگ اور رنگائی:

1۔گل سوسنی - چھ ہاتھ لمبے کپڑے کو ایک سیر کیسومبہ کے محلول میں بھگو کر خشک کیا جاتا ہے، پھر اسے ایک پاؤ گھنٹہ چونے کے رس میں رکھا جاتا ہے۔2۔توری پھول - آٹھ روپے سیر کے حساب سے ایک پاؤ ٹنڈانہ ("ٹنڈانہ" (Tundana) ایک نباتاتی مادہ ہے جو عام طور پر رنگائی کے عمل میں استعمال ہوتا ہے) کو پانی میں ابال کر ٹھنڈا کیا جاتا ہے، پھر چھ ہاتھ کپڑا اس میں ایک گھنٹے کے لیے بھگو کر خشک کر لیا جاتا ہے۔3۔سن پستہ دانہ - مذکورہ مقدار کے کپڑے کو چار پائی وزنی ہلکے نیل کے محلول میں بھگو کر خشک کیا جاتا ہے، پھر ایک پاؤ سن دانہ کے ٹب میں ڈالا جاتا ہے۔4۔کافوری - ایک تولہ از برگ لے کر گھولا جاتا ہے) جس کی قیمت گیارہ سیر کے بدلے ایک روپیہ ہے (، اسے پیس کر پانی میں بھگو کر چھانا جاتا ہے، پھر کپڑے کو اس محلول میں گیارہ گھنٹے کے لیے رکھا جاتا ہے اور سایہ میں خشک کیا جاتا ہے۔5۔پھکائی خاص طور پر کپڑے کو نرم کرنے کے لیے رنگائی (dyeing) کے عمل میں استعمال ہوتا ہے، ایک تولہ چندن دو روپے سیر کو پیس کر کپڑے سے چھان لیا جاتا ہے، کپڑے کو اس میں آدھے گھنٹے کے لیے بھگو کر سایہ میں خشک کر لیا جاتا ہے۔6۔مشکیدار - دو تولہ مسک ایک روپے سیر کو پیس کر ابالا جاتا ہے، اس پانی میں کپڑا ایک گھنٹے کے لیے بھگو کر خشک کر لیا جاتا ہے، پھر دو پیسے وزنی نیل ایک روپے سیر گھول کر اس میں کپڑا ڈبو کر خشک کر لیا جاتا ہے۔7۔سایا- کپڑے کو نیل میں بھگویا جاتا ہے جو رنگریز کے صحن میں ہمہ وقت تیار رہتا ہے (، پھر اسے خشک کر کے دوبارہ

نیل میں ڈبویا اور سکھایا جاتا ہے، اس کے بعد چونے کے غسل میں ڈبو کر آخر میں خشک کر لیا جاتا ہے۔ 8۔ بادامی۔ دو تولہ کِکر چھال چالیس سیر ایک روپے میں، کو پیس کر ابالا جاتا ہے پھر جب ٹھنڈا ہونے لگے تو ایک تولہ پتھادی، پانچ سیر ایک روپے میں، شامل کر لیا جاتا ہے، پھر کپڑے کو دھو کر مختصر وقت کے لیے اس محلول میں ڈبو کر خشک کر لیا جاتا ہے۔ 9۔ فیروزی۔ کپڑے کو ایک بار نیل کے ٹھنڈے غسل میں ڈبو کر خشک کیا جاتا ہے، پھر ایک تولہ پتھادی) جزاء نیچرل ڈائی قدرتی رنگ کے طور پر کام کرتا ہے، کے ٹب میں ڈال کر خشک کر لیا جاتا ہے۔ 10۔ خاکی۔ دو تولہ مازوج پھل دو سیر ایک روپے میں کو پیس کر ابالا جاتا ہے، پھر ایک تولہ پتھادی شامل کر کے کپڑے کو اس میں بھگو کر خشک کر لیا جاتا ہے۔ 11۔ کرنی۔ ایک تولہ مازوج پھل کو پیس کر دو سیر پانی میں ابالا جاتا ہے، پھر ٹھنڈا ہونے پر کپڑے کو مختصر وقت کے لیے اس میں بھگو کر خشک کیا جاتا ہے۔ 12۔ پیازی ایک پاؤ، ڈیڑھ سیر ایک روپے میں، کو پانی میں حل کر کے کپڑے کو اس میں ڈالا اور خشک کیا جاتا ہے، مگر یہ رنگ پائیدار نہیں۔ 13۔ عنبری۔ پچھلے رنگ کی طرح ہلکا ڈبو دیا جاتا ہے۔ 14۔ گلابی۔ آدھا سیر کیسومبہ کو دو سیر پانی میں ملا کر کپڑے کو ایک گھنٹے کے لیے بھگو کر سایہ میں خشک کیا جاتا ہے۔ آخری تین رنگ ناپائیدار ہوتے ہیں۔ ان رنگوں کے نمونے اور رنگائی میں استعمال ہونے والے اجزاء کے ساتھ اس شہر میں تیار کردہ مختلف کپڑوں کے نمونے بھیجے گئے ہیں، جن کے متعلق درج ذیل وضاحت ضروری سمجھی گئی ہے۔

کپڑے کی صنعت اور تجارت: جس طرح ٹھٹھہ اور رانی پور اپنی قیمتی لنگیوں کے لیے مشہور ہیں اور گمبٹ اپنی کھَس (Khess) کے لیے اسی طرح بہاول پور اپنی منفرد لنگی کے عمدہ کپڑوں اور لُنگی عام طور پر زیادہ باریک اور ہموار ہوتی ہے، یا سوسی کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ لونگی بنانے والے چند بڑے کاریگر ٹھٹھہ سے یہاں منتقل ہو چکے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کے پاس ذاتی سرمایہ نہیں ہوتا اور وہ صرف آرڈر پر ہی کپڑا بُنتے ہیں۔ ہر کاریگر کا ایک مخصوص سرپرست یا آجر ہوتا ہے، جو ضرورت کے وقت انھیں قرض دیتا ہے اور اس کے بدلے میں اس کے احکامات سب پر فوقیت رکھتے ہیں۔ بڑے کارخانوں کی حالت کافی خوشحال اور ترقی یافتہ نظر آتی ہے۔ کاریگروں کے خاندان کے تمام افراد اس صنعت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہاں 8 اور 9 سال کے بچے بھی بارڈر کے نفیس ڈیزائن پر کام کرتے

نظر آتے ہیں جو اس عمر میں اتنے پیچیدہ کام کے لیے غیر متوقع طور پر قابل سمجھے جاتے ہیں۔ مہنگی لنگیوں کے سب سے بڑے خریدار سندھ کے امیر اور خود بہاول خان ہیں۔ بہاول پور، ٹھٹھہ کی نسبت زیادہ متنوع ڈیزائن تیار کرتا ہے اور اس کی لنگیاں اگر چہ اتنی پائیدار نہیں ہوتیں لیکن وہ زیادہ ہلکی ہونے کے باعث فوقیت رکھتی ہیں۔ ٹھٹھہ کی لنگیاں بازار میں دستیاب نہیں ہوتیں اور بہاول پور کی لنگیاں حیدرآباد سے نیچے برآمد نہیں کی جاتیں۔ تمام لنگیوں میں سب سے بڑا نقص درمیانی سلائی ہے جسے دور کرنے میں انگریزی مصنوعات انھیں مات دے سکتی ہیں۔ سوتی لنگی جس کے کنارے ریشمی بارڈر سے مزین ہوتے ہیں، بھی بہاول پور کی خاص پہچان ہے۔

بمبئی سے درآمدات:

بمبئی سے درج ذیل اشیاء درآمد کی جاتی ہیں:

انگریزی دھاری دار کیلکو چھینٹ 20,000 روپے، انگریزی چنٹز (چھینٹ) 17,000 روپے نانکلاتھ 15,200 روپے، ململ 5,200 روپے، بُک مل 6,300 روپے، نین سک 11,000 روپے، ڈوریا چوخانی 3,250 روپے، مدرپٹ 18,000 روپے، آغابانی 8,000 روپے، مخمل 1,050 روپے، بانات 5,000 روپے، کل مالیت 1,00,000 روپے

دیگر شہروں سے درآمدات:

حیدرآباد: 20 عدد اونی چادریں (دوہڑے) سالانہ درآمد کیے جاتے ہیں۔

جیسلمیر: 100 لوکار سفید اونی کپڑا جس کا کنارہ 2 انچ چوڑا ہوتا ہے سالانہ درآمد کیا جاتا ہے۔ 25 کمبل (لوکار جیسا لیکن زیادہ کھردرا) بھی درآمد کیا جاتا ہے۔

مارواڑ: 50 لوکار کھردرا سفید اونی کپڑا، ایک بارڈر کے ساتھ درآمد ہوتا ہے۔

(سیدآباد) دہلی کے قریب، 100 سے 200 گل بدن سالانہ درآمد ہوتے ہیں، جو بخارا کے ازبک لوگ استعمال کرتے ہیں۔ خود باف بھی یہاں کا مشہور ہے مگر درآمد نہیں کیا جاتا۔ اطلس سرخ 800 روپے سالانہ مالیت درآمد ہوتی ہے۔

گجرات: براستہ پالی 1600روپے مالیت کا مسر وخانجاری سالانہ درآمد ہوتا ہے۔

خراسان: 200 نانکین چوغے چھینٹ کے استر والے 2,000 روپے مالیت کے درآمد کیے جاتے ہیں۔ 200 اونی چوغے 600 روپے مالیت کے درآمد کیے جاتے ہیں۔ 20 من مارواڑ کا اونی دھاگا 20 روپے فی من کے حساب سے درآمد ہوتا ہے۔

بخارا: 3 یا 4 تھان" کا تھان برنجک" آغا رفیع نے بہاول خان کے لیے بطور نایاب اشیا لائے گئے، مگر ان کی زیادہ قیمت کے سبب عام فروخت میں نہیں آسکتے۔ 25,000 روپے مالیت کا سوتی دھاگا یہاں تیار ہوتا ہے اور استعمال کیا جاتا ہے۔ 10,000 روپے مالیت کا دھاگا گذشتہ دو سالوں سے حیدرآباد برآمد کیا جا رہا ہے۔ سفید دھاگا پونے دوسیر فی روپے فروخت ہوتا ہے، جب کہ رنگین دھاگا آدھا روپے فی سیر فروخت ہوتا ہے۔

دیگر صنعتیں اور تجارتی امور:

چنٹز کی صنعت ملتان کی صنعت نے چھینٹ کی مقامی صنعت کو تقریباً ماند کر دیا ہے، اور جو کچھ بھی تیار ہوتا ہے، وہ زیادہ تر مارواڑ برآمد کیا جاتا ہے۔

بنارس دوپٹہ کی صنعت: ایک شخص کچھ عرصہ پہلے بہاول پور آیا اور مختلف تاجروں سے قرض لے کر بنارسی دوپٹوں کے لیے کھڈی لگائی۔ اگر وہ صرف ایک یا دو دوپٹے بنا کر فرار نہ ہوتا تو یہ دوپٹے بازار میں خوب مقبول ہو سکتے تھے کیوں کہ کپڑا بیچنے والوں نے انھیں بے حد پسند کیا تھا۔ روسی مال ابھی تک بازار میں نظر نہیں آیا سوائے چند ٹکڑوں کے جو کہ کشمیری کھمیش (Keshamec) کے ہیں۔

ٹیکس پالیسی: کارخانوں پر کوئی ٹیکس عائد نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے کئی مقاصد، جو دریائے سندھ کی تجارت سے متعلق ہیں، پورے ہو سکتے ہیں اگر ان شہروں کے تاجروں کو، جن کی مصنوعات اور پیداوار جیسے نیل، اون اور افیون دریائے سندھ کے راستے بھیجی جا چکی ہیں، جلد از جلد یہ اطلاع دی جائے کہ ان اشیاء کی ہمارے بازاروں میں کیا قیمت ہے۔ اسی طرح اگر ان اشیاء کے نمونے، جو پہلے سے ہی ان بازاروں میں موجود ہیں لیکن جن کی زیادہ مقدار کی ضرورت ہے، ان کی قیمتوں کے ساتھ تاجروں کو بھیجے جائیں، تو وہ جان سکیں گے کہ وہ کتنی حد تک مقابلے پر انحصار کر سکتے

ہیں۔سوائے ایک یا دو شکار پوری تاجروں کے، جن کے بمبئی میں ایجنٹ موجود ہیں، دریائے سندھ کے تاجر اس بات سے بالکل لاعلم تھے کہ بمبئی میں کون سی تجارت کامیاب ہوسکتی ہے اور برطانوی حکومت کے موجودہ معاہدوں کے مطابق کون سے محصولات (duties) لاگو ہوں گے۔ یہ معاہدے ترجمہ کر کے ہر بڑے شہر کے اہم تاجروں کو بھیجے جاسکتے ہیں اور غالباً ایسا کرنے سے حکمرانوں کو کوئی حسد محسوس نہیں ہوگا بلکہ شاید ان کی اجازت سے بھی یہ ممکن ہو سکے گا۔ انگریزی سفید کارڈورائے (Corduroy) کو بہت پسند کیا گیا اور بہاول پور کے دلالوں کو فوراً اندازہ ہوگیا کہ یہ خراسان کے بازاروں میں جلد اور وسیع پیمانے پر فروخت ہوسکتی ہے۔

ان معلومات کا بڑا حصہ شکار پوری بھاٹیا، نرسنگ داس، جو بھمبھومل کا بیٹا تھا اور اس وقت برطانوی مشن کے ساتھ تھا، کے ذریعے حاصل ہوئیں۔اس کی خدمات کی قدر برطانوی حکومت سے اس کی وفاداری کے برابر سمجھی جاسکتی ہے۔

تحریر: آر۔ لیچ، انجینئر الیگزینڈر برنز، کابل مشن پر

ضمیمہ 1

بہاول پور کی مقامی طور پر تیار کردہ مصنوعات کی فہرست

(ہر تھان کی قیمت بہاولی کرنسی میں)

1۔لنگی، ریشم کا کپڑا، 6 اور 7 گز لمبا، اڑھائی ہاتھ چوڑا، قیمت 23 سے 52 روپے فی تھان، مسلمان اسے شال، پگڑی اور کمر بند کے طور پر پہنتے ہیں، سالانہ 30,000 روپے مالیت کے تیار ہوتے ہیں، پیٹرن، لاہدار کھیس، پٹادیدار، نگ، پیچ اور باز وہند۔2۔لنگی، کپاس کا کپڑا جس کے کنارے پر ریشمی کڑھائی ہوتی ہے، لمبائی 6 گز، چوڑائی اڑھائی ہاتھ، سالانہ تقریباً 200 تیار کیے جاتے ہیں، قیمت: 13 روپے 10 آنے۔) ہاتھ کی عام لمبائی 22 انچ اور شاہجہانی ہاتھ 18 انچ کے برابر 3۔لنگی۔کاٹن وریشم کے کنارے والے کپڑے، 2½ ہاتھ سے 6 گز تک لمبے اور ڈیڑھ سے 4 ہاتھ تک چوڑے، قیمت 1 سے 10 روپے، سالانہ 50,000 روپے مالیت کے تیار ہوتے ہیں۔4۔

62 ڈیزائن، آدھے سوسی ریشم اور آدھے انگریزی کاٹن کے دھاگے کے کپڑے، 9 ہاتھ لمبے اور ڈیڑھ سے ساڑھے تین ہاتھ چوڑے، قیمت 6 سے 10 روپے، سالانہ 70,000 روپے مالیت کے تیار ہوتے ہیں۔ 5۔ بہاول پوری چھینٹ، 7½ گز لمبا اور ڈیڑھ ہاتھ چوڑا، 2,000 روپے مالیت کا مال ہر سال مرواڑ درآمد ہوتا ہے، قیمت: 1 روپے 4 آنے۔ 6۔ دوپٹہ، کپاس کا کپڑا جو پگڑی کے طور پر پہنا جاتا ہے، 6 گز لمبا او اڑھائی ہاتھ چوڑا، گرمی کے موسم میں 20 تیار کیے جاتے ہیں، قیمت: 6 روپے 8 آنے۔ 7۔ دوپٹہ، بنارس کے مشابہ، 6 ہاتھ لمبا اور اڑھائی ہاتھ چوڑا، تجرباتی طور پر 2 تیار کیے جاتے ہیں۔ قیمت 32 روپے۔ 8۔ پٹکا، ریشمی کپڑا، افغانوں کی پگڑی، 7½ گز لمبا اور 1 گز چوڑا، سالانہ 20 تیار ہوتے ہیں، قیمت: 11 روپے 13 آنے۔ 9۔ ساوی سالاری، کپاس کا کپڑا، خواتین کا لباس، اڑھائی گز لمبا اور 1 گز چوڑا، سالانہ 200 تیار ہوتے ہیں، قیمت: 1 روپے 3 آنے۔ 10۔ اگرائی تاہسیکلو، ریشم اور کپاس کا کپڑا، 20 گز لمبا اور 1 ہاتھ چوڑا، سالانہ 150 تیار ہوتے ہیں، ہندو اور مسلمان مرد اسے پاجامے کے طور پر پہنتے ہیں، قیمت: 8 روپے۔ 11۔ دوپٹہ بدرومی، ایک ریشمی کپڑا، 6 گز لمبا اور سوا دو ہاتھ چوڑا، شال کے طور پر پہنا جاتا ہے، قیمت: 50 روپے۔ 12۔ دریائی تمبور شاہی، 9 ہاتھ لمبا اور دس یا گیارہ گز چوڑا، قیمت: 9 روپے۔ 13۔ گل بدن، ریشمی کپڑا، 6 ہاتھ لمبا اور دس یا گیارہ گز چوڑا، قیمت: 6 روپے 12 آنے۔ 14۔ ایک بڑا چاقو 3 آنے، بڑی قینچی کا جوڑا 6 آنے، چھوٹی قینچی 2 آنے۔ 15۔ احمد پور کی افیون، سالانہ 20 من تیار ہوتی ہے، قیمت ساڑھے 12 احمد پوری روپے فی سیر۔ 16۔ خانپوری نیل، قیمت 50 کچا بہاولی روپے فی من۔ 17۔ بہاول پوری اون، قیمت 6 روپے فی من۔ 18۔ بارہ اقسام کی لنگیاں، قیمت 25 سے 44 روپے فی عدد، ہر ایک عموماً 6 گز لمبی اور پونے دو ہاتھ چوڑی ہوتی ہے۔ 19۔ اون کا دھاگا، سالانہ 40 من استعمال ہوتا ہے، قیمت 10 روپے فی من۔ 20۔ کپاس کا دھاگا (موٹی لنگی بنانے کے لیے)، سالانہ 25,000 روپے مالیت کا استعمال ہوتا ہے، سفید دھاگا سوا سیر فی روپے اور رنگین دھاگا سوا روپیہ فی سیر۔

رنگ سازی کا سامان:

کیکر ساڑھے چار سیر 1 روپیہ، پھٹکری 5 سیر 1 روپیہ، نیل 1 سیر 12 روپے، فیوری فل زعفران ڈیڑھ سیر 1 روپیہ، اسبرگ 1½ سیر 1 روپے، سائدہ 1 سیر 2 روپے، مساخ 1 سیر 4 آنے، ٹنڈانا 1 سیر 8 روپے، ماز وپھل 2 سیر 1 روپے EngineersBombayR.LEECH

ضمیمہ۔2

بہاول پور کے بازار میں دستیاب غیر ملکی مصنوعات کے نمونے:

1۔ مارواڑی لٹھا 12 ہاتھ لمبا اور 2 ہاتھ چوڑا، سالانہ 50 عدد درآمد کیے جاتے ہیں۔ فی قیمت: 1 روپیہ 6 آنے بہاولی۔ 2۔ حیدرآبادی دری 20 ہاتھ لمبی اور اڑھائی ہاتھ چوڑی، سالانہ 20 کی تعداد میں درآمد کیے جاتے ہیں۔ قیمت: 6 روپے 12 آنے۔ 3۔ جیسلمیری کمبل 12 گز لمبی اور سوادو ہاتھ چوڑے، سالانہ 25 عدد درآمد کیے جاتے ہیں۔ قیمت: 5 روپے 12 آنے۔ 4۔ جیسلمیری لوکار 12 گز لمبی اور سوادو ہاتھ چوڑی، سالانہ 100 عدد درآمد کی جاتی ہیں۔ قیمت 5 روپے فی عدد۔ 5۔ جیسلمیری لوئی (تفصیلات موجود نہیں)۔ 6۔ وَدھ، یہ ایک اونی کپڑا ہے جو پورے خراسان میں بنایا جاتا ہے اور گھوڑے کے کور کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لمبائی 7 فٹ 4 انچ، چوڑائی 4 فٹ 3 انچ۔ قیمت: 1 روپیہ 8 آنے فی عدد۔ 7۔ ایران کا خام ریشم اور ریشمی دھاگا۔19 نمونے، قیمت 15 سے 22 روپے تک فی سیر۔ 8۔ بخارا کا خام ریشم (سندھی زبان میں "پٹ" کہلاتی ہے)۔ سالانہ 200 من درآمد، قیمت 12 روپے فی سیر۔ 9۔ مارواڑی اون پالی میں رنگی ہوئی، سالانہ 20 من درآمد، قیمت 20 روپے فی من۔ 10۔ انگریزی سوتی دھاگا قیمت 3 روپے فی سیر۔ 11۔ انگریزی رنگین دھاگے کی آٹھ اقسام۔ قیمت 3 روپے 8 آنے سے 4 روپے فی سیر۔ 12۔ براڈ کلاتھ 26 گز اور 25 گز لمبا، پونا ہاتھ چوڑا، قیمت 94 سے 167 روپے 8 آنے فی عدد، سالانہ 5,000 روپے مالیت کی درآمد۔ 13۔ مخمل ساڑھے 14 گز لمبی اور 5 گز چوڑی، سالانہ 20 عدد درآمد کیا جاتا ہے۔ قیمت: 30 روپے۔ 14۔ آغابانی 8 گز لمبی اور 2 ہاتھ چوڑی، سالانہ 8,000 روپے مالیت کی

درآمد۔ قیمت: 6 روپے۔ 15۔ مادر پات 20 گز لمبا اور 1.5 ہاتھ چوڑا، سالانہ 18000 روپے مالیت کی درآمد۔ قیمت: 8 روپے۔ 16۔ ڈوریا چوخانی 10 گز لمبا اور 2 ہاتھ چوڑا، سالانہ 3,250 روپے مالیت کی درآمد۔ قیمت: 6 روپے 4 آنے۔ 17۔ نین سکھ 16 گز لمبا اور 2 ہاتھ چوڑا، سالانہ 11,000 روپے مالیت کی درآمد۔ قیمت: 8 روپے۔ 18۔ بوک مل 8 گز لمبا اور 2 ہاتھ چوڑا، سالانہ 6,300 روپے مالیت کی درآمد۔ قیمت: 4 روپے 4 آنے۔ 19۔ ململ 16 گز لمبا اور 2 ہاتھ چوڑا، سالانہ 5,200 روپے مالیت کی درآمد۔ قیمت: 8 روپے۔ 20۔ نان کلاتھ 20 گز لمبا اور پونے تین گز چوڑا، سالانہ 4,200 روپے مالیت کی درآمد۔ قیمت: 16 روپے۔ 21۔ چھینٹ 24 گز لمبا اور 1 ہاتھ چوڑا، سالانہ 17,000 روپے مالیت کی درآمد۔ قیمت: 36 روپے۔ 22۔ دھاری دار چھینٹ۔ 24 گز لمبا اور 1 ہاتھ چوڑا، سالانہ 20,000 روپے مالیت کی درآمد۔ قیمت: 7 روپے آٹھ آنے۔ 23۔ اطلس ہندوستانی ریشمی کپڑا، 15 گز لمبا اور دس یا گیارہ گز چوڑا، سالانہ 20 عدد درآمد کیے جاتے ہیں۔ قیمت: 40 روپے۔ 24۔ مصر و کھنجارک۔ گجرات کا ریشمی کپڑا، 9 ہاتھ لمبا اور سات یا آٹھ گز چوڑا، سالانہ 200 عدد درآمد کیے جاتے ہیں۔ قیمت: 8 روپے۔ 25۔ خود باف از سارداآباد، نزد دہلی 7 گز لمبا اور 1.5 گز چوڑا۔ قیمت: 17 روپے 8 آنے۔ 26۔ گلبدن سعید آبادی 9 ہاتھ لمبا اور 3 گز چوڑا، بخارا کے ازبک باشندوں میں مقبول ریشمی کپڑا۔ قیمت: 11 روپے 4 آنے۔ 27۔ نانکین چوغوں کے لیے خراسان سے سالانہ 200 عدد درآمد کیے جاتے ہیں، چنٹز سے استر کیے جانے پر قیمت میں فرق آتا ہے۔ قیمت: 10 روپے۔ 28۔ کھیس چاندنی ریشمی۔ روسی کپڑا، 11 گز لمبا اور 1 ہاتھ چوڑا، بہت کم مقدار میں درآمد کیا جاتا ہے۔ قیمت: 12 روپے 8 آنے۔ 29۔ بخارا کا راتھان برنجک 20 گز لمبا اور سوا ہاتھ چوڑا، صرف بہاول خان کی دلچسپی کے لیے لایا جاتا ہے۔

رپورٹ: آر۔ لیچ، بمبئی انجینئرز۔

☆☆☆☆☆

حکایات بہاول پور

(4)

جو لوگ شادی شدہ ہیں اور بچوں کے والدین ہیں، وہ جانتے ہیں کہ بچے کی پیدائش کے وقت والدین کو کس قدر سخت ذہنی کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ ماں کو تو گویا موت اور زندگی کی کشمکش سے گزرنا ہوتا ہے۔ زچگی کے انتظامات اور بچے کی سلامتی کے لیے ہفتوں پہلے سے تیاریاں کی جاتی ہیں اور اگر بچہ بحفاظت پیدا ہو جائے تو اس کے بعد بھی کئی ہفتے فکروں اور تکلیفوں میں گزر جاتے ہیں ۔ اگر چہ شہروں میں زچگی کے مراکز، ویلفیئر سینٹرز، لیڈی ہیلتھ وزیٹرز، مڈوائفز اور جدید ادویات موجود ہیں لیکن اب بھی ایسے دیہاتی لوگ موجود ہیں جنھوں نے نہ کبھی زچگی کا کوئی مرکز دیکھا اور نہ دائی کا۔ ایک دن میں نے ایک منفرد منظر دیکھا۔ ریاست کے دارالحکومت کے باہر کچھ بھٹے ہیں جہاں میں اینٹیں خریدنے گیا۔ وہاں ایک عورت پر مالک غصے میں برس رہا تھا کیوں کہ وہ پچھلے دن کام پر نہیں آئی تھی۔ مالک اسے برطرفی کی دھمکی دے رہا تھا۔ عورت نے زبان سے کچھ نہ کہا بلکہ ایک مٹی میں لپٹا ہوا کپڑا اٹھایا اور اس میں لپٹے ایک نومولود بچے کو مالک کے سامنے پیش کر دیا۔ مالک حیران رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ عورت کل بچے کی پیدائش کی وجہ سے غیر حاضر تھی لیکن آج پھر وہ اینٹوں کے بوجھ اٹھا کر کام کر رہی تھی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

داؤد پوترہ قوم کے بارے میں ضمنی بیان

(The Supplementary Account of the Daoodputras)

شہامت علی کی انگریزی تصنیف ''بہاول پور کی تاریخ'' کے آخری باب کا اردو ترجمہ

[مندرجہ ذیل بیان داؤد پوترہ قوم کے متعلق ایک مختلف ماخذ سے لیا
گیا ہے۔ اگرچہ یہ پہلی مذکورہ تحریر سے مماثل نکات دہراتا ہے
تاہم چوں کہ یہ بیان سابقہ تفصیلات کی توثیق یا اصلاح میں
معاون ہوسکتا ہے لہٰذا اس کا شامل کرنا مفید سمجھا گیا۔ مصنف سال
اشاعت کتاب۔1848 انگلستان]

داؤد پوترہ، بالخصوص وہ شاخ جس کا سربراہ بہاول خان ہے، اپنا نسب حضرت عباسؓ، عمِ رسولِ اکرمؐ سے جوڑتے ہیں۔ خان کا لقب ہے: محمد بہاول خان عباسی تاہم ان کی اصل نسبت کسی بالکل مختلف پس منظر سے وابستہ ہے۔ ان کے جدِ اعلیٰ داؤد شکار پور کے رہائشی تھے اور جولاہوں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ روایت ہے کہ ان کے پانچ بیٹے تھے: عرب، عباس، حسین، حسیب اور قاسم۔ ان میں سے پہلے چار بیٹوں کی نسل سے اربانی، عباسی، حسینی اور حسبانی داؤد پوترے وجود میں آئے۔ داؤد اور ان کے بیٹے بندوق چلانے میں خاص مہارت رکھتے تھے اور ان کا زیادہ وقت شکار میں گزرتا تھا بجائے اس کے کہ وہ کھڈی پر کام کرتے۔ چوں کہ وہ کامیاب شکاری تھے اس لیے شکار کی فروخت سے انھیں اپنے ہمسایوں کی نسبت بہتر گزر بسر میسر آئی اور جب وہ یہ شکار دوستوں میں بطور تحفہ تقسیم کرتے تو

ان کی شہرت اور اثر ورسوخ بڑھتا گیا حتیٰ کہ ان کی طاقت حکمرانوں کے لیے خطرہ بن گئی۔

داؤد کے بیٹے عباس کا ایک بیٹا پیرج تھا۔ اس کی بیوی غائب ہو گئی تاہم اس سے کئی بیٹے ہوئے۔ کئی سال بعد جب پیرج کے اعزہ واقربا کو عورت کی جائے پناہ کا علم ہوا تو اس عورت کو اس کے بچوں سمیت واپس پیرج کے خاندان میں لے آئے۔ اس عورت کے کہور سے جو بیٹے پیدا ہوئے ان کی نسل سے کہرانی داؤد پوترے کہلاتے ہیں جب کہ پیرج سے پیدا ہونے والے بیٹوں کی نسل عباسی یا پیرجانی داؤد پوترے کہلاتی ہے۔ یہ قبیلہ مختلف شاخوں یا خانوادوں میں بٹ چکا ہے لیکن اہم شاخیں وہی ہیں جو اوپر ذکر ہو چکی ہیں، یعنی: عربانی، عباسی یا پیرجانی، حسینی، حسبانی اور کہرانی۔ جیسے جیسے ان کی تعداد میں اضافہ ہوا ویسے ویسے انھوں نے اپنا پرانا پیشہ یعنی جولاہا کاری چھوڑ کر اسلحہ کے استعمال کی طرف زیادہ توجہ دی۔ بہت سے افراد نے ملتان وٹھٹھہ کے ناظمین اور دہلی کے سلاطین کے زیرِ خدمت کام کیا لیکن اکثریت نے شکارپور سے ملتان تک کے راستوں میں قافلوں پر ڈاکے ڈالنے اور لوٹ مار کرنے کو اپنا مشغلہ بنایا۔ تاہم ان کا مستند تذکرہ بادشاہ اورنگزیب کے عہد میں ملتا ہے جب شہزادہ معزالدین، جو اس وقت ملتان کا ناظم تھا، دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر بلوچ قبائل کی بغاوت کچلنے کے لیے مہم پر نکلا تو ایک قبیلہ جسے داؤد پوترے کہا جاتا ہے اس کے پاس شکایت لے کر آیا کہ نور محمد خان جو کہ ٹھٹھہ، حیدرآباد و شکارپور کا حاکم تھا ان پر ظلم ڈھا رہا ہے۔ ان لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور اس کے ہاتھوں سخت سزا پائی تھی۔ اس وقت مبارک خان اس قبیلے کا سربراہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ شہزادہ معزالدین کے لشکر میں قیام کے دوران بلوچوں نے رات کے وقت شہزادے کے "حرم سرا" پر حملہ کر دیا تاکہ اسے لوٹ لیں۔ محافظ بھاگ گئے اور اگر مبارک خان کی قیادت میں داؤد پوتروں کی ایک جماعت بروقت مداخلت نہ کرتی تو بلوچ کامیاب ہو جاتے۔ اس بیمثال خدمت کے صلے میں (کیوں کہ شہزادے نے اعتراف کیا کہ اپنی عزت کی حفاظت کا سہرا انہی کے سر ہے)، انھیں شکارپور کے گرد ونواح میں جاگیر عطا کی گئی۔

داؤد پوتروں کا اگلا تذکرہ تقریباً چالیس سال بعد نادر شاہ کے ہندوستان سے واپسی کے موقع پر ملتا ہے، جب ان کے ایک گروہ نے نادر شاہ کی فوج کی راہنمائی کی تاکہ وہ عمر کوٹ میں نور محمد

خان یعنی خضری یار خان، جو سندھ کا گورنر تھا، کا تعاقب کر سکے۔ اس موقع پر سن 1744ء میں، مبارک خان کا بیٹا، صادق محمد خان، نادر شاہ کے ساتھ فارس تک گیا۔ وہاں سے اسے عزت واحترام کے ساتھ رخصت کیا گیا، اور اس کے قبیلے کے لیے شکار پور کے نواح میں مزید زمینیں عطا کی گئیں۔ اگر چہ صادق محمد خان اس وقت قبیلے کا بظاہر سربراہ تھا لیکن دیگر شاخوں کے سردار بھی کچھ کم با اثر نہ تھے۔ ان میں معروف خان، عمر خان اور نوروز خان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو بعد ازاں خیر پور کے داؤد پوترے کہلائے۔ چوں کہ صادق محمد خان نے نادر شاہ کی عطا کردہ زمینوں میں سے اپنی اور اپنے خاندان کے لیے نسبتاً زیادہ حصہ رکھ لیا جو قبیلے کے رائج اصولوں کے خلاف تھا اس لیے دیگر شاخوں کے سرداروں نے خود کو علیحدہ کر لینے اور اپنی قسمت کسی اور مقام پر آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے تحت وہ اپنے خاندانوں سمیت دریائے سندھ کے بائیں کنارے کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہ اپنے خاندانوں سمیت اور درحقیقت قبیلے کی اکثریت کو ساتھ لے کر دریائے سندھ کے بائیں کنارے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ ان کے مویشی، اسلحہ اور وہ ساز وسامان بھی تھا جو ان کے خانہ بدوشانہ مگر نیم عسکری طرزِ زندگی کے لیے ضروری تھا۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں نے خان پور کے نزدیک ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا جو اس وقت بنجر اور غیر آباد علاقہ تھا۔ یہاں انھوں نے اپنی مرضی کے مطابق زمین کو آباد کیا اور اس جگہ کو اپنا نیا مسکن بنایا۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی گئی، اور ان کی تنظیم و نظم وضبط نے ان کو ایک با قاعدہ قبیلے کی شکل دے دی۔ صادق محمد خان نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اس نو آباد شاخ سے اپنے تعلقات دوبارہ استوار کرنے کی کوشش کی لیکن خیر پور کے داؤد پوتروں نے اپنی خود مختاری پر اصرار کیا اور بہاول پور کے عباسیوں سے علیحدہ حیثیت اختیار کی۔ بہر حال صادق محمد خان نے اپنی جاگیروں کو مستحکم کیا اور اپنے اثر ورسوخ کو بڑھایا۔ اس نے مقامی قبائل کو ماتحت کیا، زمینوں پر قابض ہوا اور بہاول پور کو اپنا مستقل مستقر بنایا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ قبیلے کا سب سے با اثر سردار بن کر ابھرا اور عباسی ریاست کی بنیاد رکھی۔ بہاول پور، جو اس وقت ایک گمنام مقام تھا اس کی قیادت میں رفتہ رفتہ ایک با قاعدہ ریاست کی شکل اختیار کرنے لگا۔ ان کے جانشین خاص طور پر بہاول خان اول نے اسی نظم وضبط اور عسکری ذہانت کو آگے بڑھایا اور نہ صرف

آس پاس کے چھوٹے قبائل کو اپنے زیرنگیں کیا بلکہ ریاست بہاول پور کو ایک مضبوط، خودمختار اور معزز حکمرانی میں ڈھال دیا۔

شکار پور کی لوٹ مار

قبیلے کے افراد کو کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہ ہوا چناں چہ وہ دریائے پنجند اور ستلج کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ پُرامن طریقے سے آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ وہ خیر پور پہنچے۔ وہاں اُنہوں نے مقامی حکام کی اجازت سے زمین کرایہ پر حاصل کی اور حاصل پور جو اُس وقت اقتدار کا مرکز تھا، کے نائب سے زمین لے کر کاشت کاری شروع کی۔ یہ واقعہ 1745ء کے آغاز میں پیش آیا۔ اس کے فوراً بعد ایک خطرناک دشمنی بھڑک اٹھی۔ صادق محمد خان جو اُن داؤد پوتروں کا سردار تھا جو شکار پور میں مقیم رہے تھے، اُس کا تنازع وہاں کے گورنر سے ہو گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ اُس گورنر نے زبردستی صادق محمد خان کے بڑے بیٹے بہاول خان کی منگیتر کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ صادق محمد خان جو قبیلے کی تقسیم کے بعد خود کو کمزور سمجھنے لگا تھا گورنر کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہا۔ چناں چہ اُس نے اپنے بیٹے بہاول خان کو خیر پور میں مقیم اپنے ہم قبیلہ افراد کے پاس بھیجا تا کہ اُنہیں اطلاع دے سکے کہ اس کی ذات پر جو ظلم ہوا ہے وہ دراصل پورے قبیلے کی توہین ہے اور ان سے انتقام کے لیے واپسی کی درخواست کی۔ بہاول خان دو برس تک اُن کے در پر فریادی بنا رہا لیکن اُسے کوئی کامیابی نہ ملی۔ آخر کار وہ نرم پڑ گئے، انھوں نے صادق محمد خان کی سابقہ زیادتیوں کو فراموش کیا اور بہاول خان کے ساتھ شکار پور واپس آ گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے گورنر بختیار خان کے خلاف بغاوت کھڑی کی، اُسے معزول کیا اور لڑکی کو اس کے خاندان کو واپس کیا لیکن انتقام کی تسکین پر اکتفا نہ کرتے ہوئے انھوں نے شکار پور شہر کو لوٹ لیا، باشندوں کو نکال دیا اور دور دراز کے دیہات پر تاوان عائد کر کے خراج وصول کرنا شروع کر دیا۔ جب یہ بغاوت نادر شاہ تک پہنچی تو اُس نے اپنے ایک جرنیل جسے مقامی روایات میں طہماسپ قلی کہا گیا ہے، کی سربراہی میں ایک بڑی فوج داؤد پوتروں کو مطیع کرنے کے لیے روانہ کی۔ داؤد پوترے اس کی آمد کی خبر سنتے ہی اپنے خاندانوں سمیت دریائے سندھ کے بائیں کنارے کی طرف بھاگ نکلے لیکن عورتوں اور بچوں کی موجودگی نے ان کے سفر میں رکاوٹ ڈالی

اور فرار کی امید کم ہوگئی چناں چہ انھوں نے لڑائی کا فیصلہ کیا۔ حسبِ معمول لڑائی سے قبل انھوں نے اپنی اکثر عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا، چند کو زندہ رکھا گیا جنھوں نے جنگ کے دوران پیاسے اور تھکے ہوئے شوہروں کو پانی پہنچا کر بہت مدد کی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جنگ پورا دن جاری رہی۔ دشمن کی شکست میں پانی کی کمی نے اہم کردار ادا کیا۔ داؤد پوتروں نے دشمن کو مکمل شکست دی اور ایرانی جرنیل کے لشکر کو بھی لوٹ لیا۔ اس کامیابی کے بعد وہ دوبارہ شکار پور واپس نہ گئے بلکہ دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر اپنا سفر جاری رکھا اور زیادہ تر افراد اللہ آباد میں آ بسے۔ وہ شاخ جو خیر پور سے مدد کو آئی تھی وہیں واپس لوٹ گئی۔

بہاول خان، جو پیر جانی شاخ سے تھا، اللہ آباد کے قریب کا علاقہ چھوڑ کر مزید شمال کی طرف بڑھا اور اُس مقام پر پہنچا جہاں آج کا شہر بہاول پور واقع ہے۔ وہیں اس نے اس شہر کی بنیاد رکھی جو آج اُس کے نام سے منسوب ہے۔ محض دو برس کے قلیل عرصے میں صحرا اور دریا کا درمیانی پورا علاقہ، جو دریائے سندھ پر سبزل کوٹ سے لے کر دریائے ستلج پر مبارک پور تک پھیلا ہوا تھا، داؤد پوتروں کی حکومت کے تابع آ گیا۔ بہاول پور کے گرد و نواح کا علاقہ جو براہِ راست بہاول خان کے حصے میں آیا اس کی لمبائی تقریباً سو کوس اور چوڑائی پانچ سے پندرہ کوس تک تھی۔ اس اعتبار سے بہاول خان کو اس خاندان کا بانی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ دریائے سندھ کے اس کنارے پر اقتدار کی بنیاد اس نے رکھی البتہ داؤد پوترے اپنی حکمرانی کا آغاز اس کے والد صادق محمد خان سے منسوب کرتے ہیں کیوں کہ اُسے نادر شاہ سے جاگیر عطا ہوئی تھی۔ بہاول خان اول کو ایک سادہ مزاج، رحم دل اور نرم خو حکمران کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اُس نے ہر طبقے کے لوگوں کو بہاول پور میں آ کر آباد ہونے کی ترغیب دی۔ جو مقام پہلے صرف مویشیوں کے چرنے کی جگہ تھا وہ جلد ہی ایک خوشحال قصبہ بن گیا۔ اُس نے اپنی سلطنت کی حدود کو صحرا کی جانب قلعہ دڑاور سے آگے تک وسعت دی جسے اُس نے راجا بیکانیر کے ایک رشتہ دار سے چھینا۔ اُس قلعے کے پچھلے مالک کی اولاد اب بھی بیکانیر میں مقیم ہے۔ اسی دوران خیر پور، گوٹھ قائم رئیس اور حاصل پور کے داؤد پوتروں نے بیکانیر کے راجا سے رکن پور، موج گڑھ، مروٹ، تہاڑا اور پھولہڑا کے قلعے حاصل کر لیے جب کہ گڑھی اور ہرور کے داؤد پوتروں نے جیسلمیر کے

راجا سے دین گڑھ اور اسلام گڑھ کے قلعے چھین لیے۔ بعدازاں یہی قلعے ان کے لیے پناہ گاہ اور قلعہ بند مورچوں کے طور پر استعمال ہوئے۔ بہاول خان تقریباً دس برس تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے دو بھائی : مبارک خان اور فتح خان۔ چوں کہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ وفات کے بعد اپنے بڑے بھائی مبارک خان کی جانشینی کی وصیت چھوڑ گیا۔ مبارک خان ایک باصلاحیت اور سرگرم سردار تھا۔

مبارک خان کی حکومت اور ریاست کی وسعت:

مبارک خان نے شمال مشرقی سرحد کو مضبوط بنانے کے لیے مبارک پور میں ایک قلعہ تعمیر کروایا اور دریا کے بائیں کنارے پر مظفر انوالہ تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ دریائے ستلج کے دائیں کنارے پر بھی اُس کی سلطنت دس میل مغرب میں پاکپتن اور کوٹ قبولہ سے شروع ہو کر قلعہ ٹبّی ہلکھو کے اور سمّے سلدیرے تک پھیل گئی۔ اسی دوران حاصل پور، کوٹ اور خیر پور کے داؤد پوتروں نے دریا کے اس پار ملتان کے زیر انتظام علاقوں پر قبضہ کر لیا جو دنیا پور اور کہروڑ تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان مقامات سے دریائے چناب تک کا علاقہ، مبارک خان نے شجاع خان اور مظفر خان نوابانِ ملتان سے کرائے پر حاصل کر رکھا تھا جب کہ اس کے ساتھ ساتھ ڈیرہ کے تابع جو علاقہ یعنی کنجر سے لال پور تک، جو دریائے سندھ اور چناب کے درمیان واقع تھا وہ غازی خان نے کابل کے بادشاہوں کے زیرِ سایہ صوبہ دار سے کرایہ پر حاصل کیا ہوا تھا۔ مبارک خان نے نہ صرف دریائے ستلج کے دائیں کنارے پر بڑے علاقے کو سلطنت میں شامل کیا بلکہ قبیلے کی حریف شاخوں کی طاقت کو بھی کم کر کے اُنہیں اپنی حکومت کے دائرے میں محدود کر دیا۔ اُس نے پندرہ سال تک حکومت کی اور چوں کہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اپنی وفات سے قبل اپنے بھائی فتح خان کے بیٹے، جعفر خان، کو اپنا جانشین نامزد کیا اور اُسے "بہاول خان" کا لقب عطا کیا۔

بہاول خان دوم کی حکومت:

بہاول خان دوم کو ایک دانشمند اور نیک طینت حکمران کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اُس نے تجارت کو بھرپور فروغ دیا اور اُس کے دور میں بہاول پور شہر ریشمی کپڑوں، شطرنجی اونی قالینوں اور

دریوں کی تیاری میں ملتان کا ہمسر بن گیا۔اس نے مظفرانوالہ کے مشرق میں گنجیانہ اور رانا وٹو کے علاقے بھی اپنی ریاست میں شامل کیے جو اس نے بھائی لال سنگھ کیتھل کے سردار سے حاصل کیے۔ صحرا میں واقع قلعہ ولہار جو بیکانیر کے راجا کی ملکیت تھا، بھی اس کے زیرِ قبضہ آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی سالانہ آمدنی چونتیس لاکھ روپے سے زیادہ تھی اور اسی مناسبت سے اُس کی طاقت میں بھی اضافہ ہوا۔ اُس نے وہ خراج دینا بند کر دیا جو پہلے ملتان کے ناظمین اور ڈیرہ کے غازی خان کو ریاستی کرایہ کے طور پر ادا کیا جاتا تھا اور اس کے برعکس، اپنے قبیلے کی دیگر شاخوں سے اُن علاقوں کے بدلے خراج لینا شروع کر دیا جو اُن کے قبضے میں تھے۔

تیمور شاہ کی مداخلت:

اُس کی بڑھتی ہوئی طاقت نے خیر پور کے داؤد پوتروں میں حسد اور ناراضی پیدا کی جنھوں نے ملتان کے ناظم اور ڈیرہ کے غازی خان سے مل کر تیمور شاہ درانی کے دربار میں شکایات بھجوائیں اور درخواست کی کہ بہاول خان کو قابو میں لانے کے لیے فوجی کارروائی کی جائے۔ 1784ء میں جب سندھ میں تالپوروں کی بغاوت ہوئی تو سردار مدد خان کو اسے دبانے کے لیے بھیجا گیا۔ اسی جنرل کو بعد میں ڈیرہ جات اور ملتان کے معاملات درست کرنے کا حکم دیا گیا تاہم اُس کی کارروائیاں داؤد پوتروں کے خلاف صرف دھمکیوں اور زبانی انتباہات تک محدود رہیں جنھیں بہاول پور کے حکمران نے نظر انداز کر دیا۔ دو سال بعد، احمد خان نورزئی کی قیادت میں ایک نئی فوج روانہ کی گئی لیکن وہ تالپوروں کے ہاتھوں شکست کھا کر داؤد پوتروں کا سامنا کرنے کے قابل نہ رہی۔ بالآخر 1788ء میں تیمور شاہ خود ایک بڑی فوج کے ساتھ بہاول پور کی طرف روانہ ہوا تا کہ داؤد پوتروں کو زیر کر سکے۔ جیسے ہی بہاول خان کو اطلاع ملی کہ تیمور شاہ نے دریائے سندھ عبور کر لیا ہے وہ اپنے خاندان اور خزانے سمیت صحرا کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُس نے اپنا خزانہ دراوڑ سے بیس کوس مشرق میں قلعہ خانگڑھ میں محفوظ کروایا اور خود اپنی فوج کے ساتھ مسلسل مقام بدلتا رہا تا کہ دشمن کی گرفت میں نہ آ سکے۔ تیمور شاہ نے بہاول پور شہر کو لوٹ کر برباد کیا اور پھر سیدھا قلعہ دراوڑ کی طرف بڑھ گیا۔

بہاول پور پر تیمور شاہ کا حملہ اوراس کے بعد کی صورتحال:

تیمور شاہ بہاول پور شہر کو تاراج کرنے کے بعد براہِ راست قلعہ دراوڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔اس دوران بہاول خان مسلسل صحرائی علاقوں میں نقل مکانی کرتا رہا تا کہ تیمور شاہ کی فوج اس کا پیچھا نہ کر سکے۔وہ اکثر راتوں کو قیام کرتا اور دن کو کوچ کرتا اور دشمن کو اپنے مقام کا پتہ چلنے سے پہلے ہی نکل جاتا۔یہ چالاکی داؤدپوتروں کی روایتی جنگی حکمت عملی کا حصہ تھی جس کے ذریعے وہ اکثر بڑے حملہ آوروں کو تھکانے اور دھوکہ دینے میں کامیاب رہتے تھے۔

تیمور شاہ نے جب دیکھا کہ بہاول خان اوراس کی فوج مسلسل صحرا میں غائب ہورہی ہے اور کوئی فیصلہ کن جنگ ممکن نہیں ہو پارہی تو کچھ وقت بعد وہ بھی بہاول پور اور قلعہ دراوڑ میں تباہی پھیلانے کے بعد واپس لوٹ گیا۔اس دوران داؤدپوتروں کی ریاست کو بھاری جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا لیکن ان کی قیادت اور مقامی حمایت نے انھیں مکمل شکست سے بچالیا۔بہاول خان نے بعد ازاں اپنے قبیلے کو دوبارہ مجتمع کیا اور بہاول پور شہر کی از سرِ نو تعمیر کا آغاز کیا۔اگر چہ ریاست کو وقتی طور پر نقصان پہنچا لیکن اس واقعے کے بعد داؤدپوتروں کے اندر مزید اتحاد پیدا ہوا اور انھوں نے بیرونی قوتوں سے سیاسی وعسکری طور پر خود کو زیادہ مستحکم کرنا شروع کیا۔یہ دور داؤدپوتروں کی مزاحمت،سیاسی حکمت عملی اور علاقائی خودمختاری کی بقا کی ایک شاندار مثال بن گیا جس نے بہاول پور ریاست کی بنیادوں کو مزید گہرا کر دیا۔

تیمور شاہ نے مخالف داؤدپوتروں کے مشورے سے قلعہ دراوڑ پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا جنھوں نے خان کے خلاف شاہ کا ساتھ دیا تھا۔چوں کہ دراوڑ کو وہ مقام سمجھا جاتا تھا جہاں بہاول خان نے اپنا خزانہ چھپا رکھا تھا اس لیے شاہ اس پر قبضے کے لیے بیحد پُرعزم تھا اور اس مقصد کے لیے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔قلعے کے محافظین نے سخت مزاحمت کی اور شاہ کے توپخانے نے تین دن کی گولہ باری کے باوجود اس کے مضبوط مٹی کے دیواروں پر کوئی خاص اثر نہ ڈالا۔شاہ کی فوج کو پانی کی شدید کمی کا سامنا تھا۔بالآخر قلعہ فتح کر لیا گیا لیکن انسانی جانوں کا بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔جب شاہ کو وہاں خزانہ نہ ملا جس کی وہ توقع کر رہا تھا تو اس کی مایوسی کی کوئی حد نہ رہی اور اُس نے ان داؤدپوتروں

پر شدید غصہ نکالا جنھوں نے اسے اس قلعے کے محاصرے کا مشورہ دیا تھا۔

تیمور شاہ نے خان کا صحرا میں مزید پیچھا کرنا بیوقوفی سمجھا اور جہاں وہ تھا وہاں فوج کی ضروریات پوری نہ ہو سکنے کے باعث اُسے بہاول پور کی طرف لوٹنا پڑا۔ وہاں اُس نے وعدوں اور دھمکیوں کے ذریعے بہاول خان کو ملاقات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔ اس مقصد کے لیے مظفر خان، نواب ملتان اور اُوچ کا مشہور پیر مخدوم گنج بخش سفیر مقرر کیے گئے۔ خان نے تمام تجاویز کو رد کر دیا یہاں تک کہ خود بھی صحرا میں اپنے پیروکاروں کی کفالت کے ذرائع سے محروم ہونے لگا۔ بالآخر اُس نے مجبوری میں اپنے بڑے بیٹے واحد بخش کو ضمانت کے طور پر شاہ کے پاس بھیجنے پر رضامندی ظاہر کی جو شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے سے قبل مبارک خان کے لقب سے موسوم کیا گیا۔ جب واحد بخش خاں (مبارک خان) شاہ کی خدمت میں پہنچا، تیمور شاہ خود کابل واپس روانہ ہو گیا جہاں اہم امور اس کی موجودگی کے متقاضی تھے۔ وہ اس مہم سے اس حد تک خوش تھا کہ جس میں ابتدا میں تباہی اور رسوائی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا وہ کسی طرح عزت کے ساتھ بچ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ اُس نے بہاول خان کے تمام معاملات نواب مظفر خان کے سپرد کر دیے اور صرف سردار خان، ایک افغان کی زیر قیادت ایک چھوٹا سا دستہ قلعہ دراوڑ میں چھوڑ کر باقی تمام لشکر کے ساتھ دریائے سندھ عبور کر لیا تاہم وہ ابھی ڈیرہ غازی خان سے آگے نہ بڑھا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ بہاول خان صحرا سے لوٹ آیا ہے۔ اس نے دراوڑ میں چھوڑا گیا لشکر حیران کن طور پر ہلاک کر دیا اور احمد پور سے ہوتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے پہنچا اور راستے میں تمام لوگ اس کی حکومت تسلیم کرتے گئے۔ اگرچہ شاہ اس حرکت پر سخت ناراض ہوا لیکن اس نے اس سے زیادہ ردعمل نہ دیا بلکہ بہاول خان کے بیٹے مبارک خان کو مکمل اختیار دے دیا کہ وہ اپنے والد کے زیر انتظام تمام علاقے پر حکومت کرے۔ اُسے رخصت کرتے وقت شاہ نے "سربلند خان" کا خطاب دیا اور بیش قیمت تحائف عطا کیے نیز اس سے یہ تحریری عہد نامہ بھی لیا کہ وہ ملتان اور ڈیرہ غازی خان کے ناظمین سے لیز پر لیے گئے علاقوں کا باقاعدہ خراج ادا کرے گا۔ دوسری طرف، وہ داؤد پوترے سردار جنھوں نے بہاول خان کے خلاف شاہ کا ساتھ دیا تھا اور اسے دراوڑ تک لے گئے تھے، انھیں سخت سزا دی گئی۔ شاہ نے انھیں کبھی معاف

نہیں کیا کیوں کہ وہ اس بے فائدہ مہم پر لے جایا گیا تھا اور اس کی فوج کی تکلیف دہ حالت کی اطلاعات ان ہی لوگوں نے بہاول خان کو پہنچائی تھیں جس کی وجہ سے وہ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ ہوا۔ ڈیرہ غازی خان سے رخصت ہوتے وقت، شاہ نے انھیں اُس مقام کے نواب شاہ محمد خان بدوزئی کی تحویل میں دے دیا اور سخت نگرانی کا حکم دیا۔ یہ واضح نہیں کہ بہاول خان اپنے بیٹے مبارک خان سے اس لیے ناراض تھا کہ اسے شاہ کی طرف سے اعزازات ملے جو اُس کے خود کے حق میں نقصان دہ سمجھے گئے یا واقعی اس کے ارادوں پر شبہ تھا؛ بہر حال جب مبارک خان واپس آیا تو اسے سخت قید میں ڈال دیا گیا جو اس کے والد کی زندگی تک جاری رہی۔ جیسے ہی بیٹا واپس آیا بہاول خان نے دریا عبور کیا اور تیمور شاہ کے پشاور پہنچنے سے پہلے اس نے نواب ملتان کو شکست دی، ڈیرہ غازی خان کا محاصرہ کیا اور اپنے داؤد پوترے بھائیوں کو قید سے آزاد کرا لیا۔ اس مہم میں اس کا ساتھ اوچ کے پیر، مخدوم گنج بخش نے دیا جو بے پناہ طاقتور اور علاقے میں غیر معمولی اثر و رسوخ کا حامل شخص تھا۔ وہ شاہ سے ضبط کی گئی توپیں جو مظفر خان اور شاہ محمد خان کے پاس تھیں، واپس لے کر بہاول پور لوٹا۔ اس مہم کے بعد تین سال تک مکمل امن قائم رہا جس دوران خان نے اپنی سلطنت کی داخلی ترقی پر توجہ دی اور خود کو دشمنوں کے خلاف مزید مضبوط کیا۔ دریاؤں سے نہریں نکال کر بنجر اور کم آبادی والے علاقوں کو آباد کرنے کی کوشش کی گئی تا کہ وہاں لوگ آ بسیں۔ جو شخص کنواں کھودتا، اُسے چار سال کے لیے اتنی زمین بلا کرایہ دی جاتی جتنی وہ آباد کر سکتا۔ ہر قسم کے تاجر اور ہنر مندوں کو مختلف قصبوں میں آ کر بسنے کی دعوت دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ خیر پور، بہاول پور اور خانپور کے علاقوں میں خاصی تجارت قائم تھی۔ بہاول پور میں توپیں ڈھالنے کی فیکٹری قائم کی گئی اور لوہے کا کام اس معیار تک پہنچا کہ وہ لاہور یا ملتان میں بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ وہاں تیار کی گئی بندوقوں کی نالیں پورے ہندوستان میں سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی تھیں۔ اس دوران پنجاب اور دریائے سندھ کے دائیں کنارے کے علاقوں کی شورش کے باعث پُرامن باشندے وہاں سے نکل کر بہاول پور کا رُخ کرنے لگے۔ خان کی نرمی، جس کے لیے وہ مشہور تھا، نے انھیں اپنی طرف راغب کیا۔ انہی اسباب نے افغان تجارت کو وسطی ہندوستان سے بہاول پور کی طرف موڑ دیا۔ لُوہانی تاجر بہاول پور آ کر اپنے مال کے بدلے ہندوستانی پیداوار حاصل کرتے۔ یہ

دور داؤد پوتروں کی حکومت کا سب سے خوشحال دور تصور کیا جاتا ہے جب اندرونی امن نے بیرونی استحکام فراہم کیا تاہم یہ خوشحالی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ گڑھی اختیار خان کے سردار ایک طرف اور خیر پور و حاصل پور کے سردار دوسری طرف، حسد کے ساتھ بہاول خان کی ترقی کو دیکھتے رہے۔ وہ بجا طور پر سمجھتے تھے کہ اگر خان کو نہ روکا گیا تو وہ ان تمام چھوٹے چھوٹے سرداروں کو زیر کر لے گا۔ پچھلی ناکامیوں کے باوجود انھوں نے پھر سازشیں شروع کر دیں اور خان کی سلطنت میں چڑھائیاں کیں۔ مسلح گروہ اُس کے رعایا کے مویشی اور املاک چھیننے بھیجے گئے؛ زمینداروں کو کرایہ دینے سے روکنے پر اُکسایا گیا۔ ابتدا میں ان کوششوں کو خان کی دھمکیوں اور مذاکرات سے روکا گیا اور مجرموں سے نقصان کی تلافی بھی کروائی گئی لیکن آہستہ آہستہ ان حملوں نے سنگین صورت اختیار کر لی یہاں تک کہ اُوچ کا پیر، مخدوم گنج بخش بھی خان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور خان کو کھلی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خان نے اپنے بھائیوں اور بالخصوص پیر کے ساتھ کچھ ایسے اقدامات کیے تھے جو شکایات کا باعث بنے۔ وہ صرف اپنے خوف کی وجہ سے اُن کی زمینوں کو ضبط کرنے سے باز رہا تھا لیکن ان کے ردعمل نے وہی انجام جلدی لا دیا جس سے وہ ڈرتے تھے۔ اگر وہ صلح جو رویہ اپناتے تو یہ انجام لمبے عرصے تک مؤخر ہو سکتا تھا۔ مخدوم گنج بخش نے خان کے خلاف فوج کھڑی کی اور ایک موقع پر خان کے بیٹے مبارک خان کو قید سے نکال کر اُس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ دونوں کے درمیان ایک جنگ ہوئی جس میں خان کی افواج کو شکست ہوئی۔ اگر مخالفین میں اتحاد ہوتا تو خان کی طاقت کا خاتمہ یقینی تھا لیکن ایسا نہ ہوا۔ ان کے باہمی جھگڑوں اور حسد نے خان کو فائدہ دیا اور وہ تقریباً بغیر فوج کے بھی اپنی پوزیشن سنبھالنے میں کامیاب رہا۔ پھر وہ خود حملہ آور بن گیا۔ ایک ایک کر کے سردار مغلوب ہوئے، ان کے قلعے مسمار کیے گئے، زمینیں چھین لی گئیں اور وہ اپنے علاقوں سے بھاگ کر ہمسایہ ریاستوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ بہاول خان کو فخر تھا کہ اُس نے اپنی ریاست میں کوئی ایسا شخص نہ چھوڑا جو آئندہ اس کی حکومت میں خلل ڈالنے یا اس کے اقتدار کو چیلنج کرنے کی ہمت کر سکے۔ جو لوگ اس کے آگے جھک گئے وہ گمنامی میں چلے گئے اور وظیفے پر زندگی گزارنے لگے۔ ان خاندانوں کی طاقت کبھی بحال نہ ہو سکی ان کی چند اولادیں آج بھی موجودہ خان سے وظیفہ پاتی ہیں جب کہ باقی

لوگ عوام میں گم ہو چکے ہیں اوران کا نسب بھلا دیا گیا ہے۔

بہاول خان دوم 1811 میں وفات پا گیا (بیشتر کتب میں ان کی وفات کا سال 1809 لکھا ہے۔مترجم)، اُس نے چالیس برس سے زائد حکمرانی کی۔ اُسی کے دور میں 9-1808 میں آنریبل مسٹر الفنسٹن کابل کے سفارتی مشن پر بہاول پور سے گزرے۔ جب خان کواس بات پر طعنہ دیا گیا کہ اس نے ایک اجنبی کو جو شاید کبھی اس کے کام نہ آسکے، شاہانہ مہمان نوازی دی تو اُس نے اپنے وزیر کو جھڑکا اور کہا: ''اگر چہ میں خود اس کا فائدہ نہ اٹھا سکوں لیکن میرے جانشین ضرور اٹھائیں گے کیوں کہ قرآن؟؟؟ میں لکھا ہے کہ "فِرنگیوں کی سلطنت پورے ہندوستان پر پھیل جائے گی!" (کتاب کے صفحہ نمبر 195 پر لفظ "Koran" ہی درج ہے۔مترجم)

خان نے سات بیٹے چھوڑے جن کے درمیان جانشینی کا جھگڑا ہوا: مبارک خان، عبداللہ خان، خُدا یار خان، ناصر خان، حاجی خان، قادر بخش خان اور فیروز محمد خان۔ خان کی وفات کے فوراً بعد، اُس کے وزرا ناصر خان بلوچ گورگیج، مصر خان بلوچ گورگیج اور فتح محمد خان غوری، جنھوں نے پہلے مبارک خان کو قید کروانے میں اہم کردار ادا کیا تھا ایک سازش میں شریک ہوئے تاکہ اُسے جانشینی سے ہٹا کر عبداللہ خان کو تخت پر بٹھایا جا سکے۔ وہ اسے کمزور اور غیر پُرجوش سمجھتے تھے اس لیے زیادہ تابعدار رہنے کی امید رکھتے تھے۔ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے، انھوں نے اسے اُس کے والد کی تدفین سے قبل ہی تخت پر بٹھا دیا اور ساتھ ہی یہ افواہ پھیلائی کہ مبارک خان فوت ہو چکا ہے۔ انھوں نے پانچوں باقی بھائیوں کو بھی عبداللہ خان کی حکمرانی تسلیم کرنے پر مجبور کیا اور بعد ازاں سب کو پھر قید کر دیا۔ عبداللہ خان کو تخت نشین ہوتے وقت ''صادق محمد خان'' دوم کا خطاب دیا گیا۔ وہ ایک کمزور اور وزیروں کا تابع حکمران تھا جس کی سلطنت میں قوت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو بخل اور شدید لالچ تھا۔ سندھ کے امراء، جو طویل عرصے سے کوٹ سبزل پر دعویٰ رکھتے تھے لیکن بہاول خان کے دبدبے کی وجہ سے کچھ نہ کر سکے تھے اب اس کمزور حکمران کو دیکھ کر متحرک ہو گئے۔ انھوں نے فوج جمع کی اور سرحد کی طرف بڑھنے لگے۔ صادق محمد خان نے بھی مزاحمت کی تیاری کی اور ایک بڑی فوج کے ساتھ میدان میں آیا۔ دونوں افواج آمنے سامنے

ہوئیں لیکن خان کی فوج پہلے ہی حملے میں شکست کھا گئی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بددل ہو چکی تھی کیوں کہ اُنہیں تنخواہیں نہ ملی تھیں۔ اگلے دن خان کے وزیروں نے بہتر تنخواہوں اور انعامات کا وعدہ کر کے فوج کو دوبارہ لڑنے پر آمادہ کیا۔ اس بار سندھ کے امراء کی فوج مکمل طور پر شکست کھا گئی۔ خان کی افواج نے ان کا تعاقب کیا اور انھیں سرحد پار دھکیل دیا لیکن اس فتح کے بعد بھی خان نے اپنی فوج کو بدستور نظر انداز کیا جس سے وہ ناراض ہو کر بغاوت پر اتر آئے۔ سندھ کی افواج کے کمانڈروں کو جب خان کی فوج کی اس بددلی کی خبر ملی تو انھوں نے اپنی فوج دوبارہ جمع کی اور پھر خان کے علاقے پر حملہ کر دیا۔ اس بار خان کی فوج نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا اور منتشر ہو گئی اور خان خود جان بچا کر فرار ہو گیا۔ سندھ کی افواج نے سبزل کوٹ سے لے کر احمد پور اور اوچ تک کا سارا علاقہ لوٹ لیا اور دریائے ستلج کے مخالف کنارے پر سیت پور تک جا پہنچے۔ یہاں خیر پور سے جلدی میں جمع کی گئی داؤد پوتروں کی ایک فوج، چنی خان داؤد پوتروں کی قیادت میں ان کی پیش قدمی کو چند دن روکے رکھنے میں کامیاب ہوئی۔ اس دوران خان کو وقت ملا کہ وہ سندھ کے کمانڈروں کو مصالحت کی پیشکش کرے۔ طے پایا کہ خان ایک لاکھ روپے ادا کرے گا، قلعہ سبزل پر اپنا دعویٰ چھوڑ دے گا اور اپنے بڑے بیٹے رحیم یار خان کو بطور ضمانت سندھ کے امراء کے پاس بھیجے گا۔ خان نے ان شرائط کو قبول کر لیا اور رحیم یار خان جو آج کے بہاول خان ہیں سندھ کی فوج کے ساتھ حیدرآباد روانہ ہوئے جہاں ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا اور کچھ عرصے بعد قیمتی تحائف دے کر واپس روانہ کر دیا گیا۔ صادق خان کی کمزور حکومت نے اس سے وہ علاقے چھین لیے جو اس کے پیش روؤں نے تلوار کے زور پر حاصل کیے تھے جب کہ انتظامی غفلت نے بچی کھچی سلطنت کی آمدنی بھی گھٹا دی۔ افسران کی رشوت ستانی نے تجارت کو تباہ کیا اور خان اس سب کو روکنے میں غافل اور سست رہا۔ وہ ناصر خان گورگیج اور فتح محمد غوری جیسے وزیروں کے مشوروں پر بہت زیادہ انحصار کرتا تھا اور شاید اُس کے دور کا سب سے بہتر عمل یہ تھا کہ اُس نے اُن سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ دونوں بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ ناصر خان کو خان نے واپسی کی دعوت دی اور بحالی کا وعدہ کیا لیکن جیسے ہی وہ واپس آیا، خان نے اُسے قتل کروا دیا۔ اُس کے خاندان اور تابعین کو بھی قتل کر دیا گیا اور اس کا گھر لوٹ لیا گیا۔ فتح محمد غوری کو وہ فوجی بچا لے گئے جو اُسے گرفتار کرنے آئے

تھے کیوں کہ وہ اکثر ان پر فیاضی سے خرچ کیا کرتا تھا۔ وہ اپنے اہلِ خانہ سمیت پہلے ملتان، پھر لاہور اور آخر کار سندھ میں میر سہراب (سربراہ خیر پور) کے دربار پہنچا جہاں اُسے وزارت دی گئی جو وہ آج بھی میر کاظم کے دور میں سنبھالے ہوئے ہے۔ ان وزیروں کی جگہ شیخ دین محمد اور اس کے بیٹے شیخ مقبول اور شیخ نور محمد کو مقرر کیا گیا جنھوں نے خان کے اعتماد کو قائم رکھا اور پچھلے وزیروں کی طرح بددیانتی نہیں کی۔ انہی کی اچھی حکمرانی کی بدولت خان لاہور کے حکمران رنجیت سنگھ کے بڑھتے ہوئے خراج کے مطالبات کو کسی حد تک سنبھال سکا۔

رنجیت سنگھ نے بہاول خان کی زندگی میں تین مرتبہ ملتان پر چڑھائی کی اور ہمیشہ پیشکش یا خراج لیا لیکن کبھی مستقل قبضہ نہیں کیا۔ 1818ء میں اُس نے ملتان پر قبضہ کیا اور 1821ء میں ڈیرہ کے علاقے پر بھی تسلط قائم کر لیا۔ بہاول خان کی وفات کے بعد اس نے صادق محمد خان سے خراج طلب کیا۔ خان نے انکار کر دیا اور دریائے ستلج کے دائیں کنارے پر فوج جمع کی۔ قلعہ ٹبی کے قریب لڑائی ہوئی اور خان کی فوج شکست کھا گئی۔ مہاراجہ نے سات لاکھ روپے خراج اور سالانہ ایک لاکھ روپے نذرانہ مانگا تاکہ وہ ریاست پر دوبارہ حملہ نہ کرے۔ بعد میں نذرانہ پچاس ہزار روپے پر طے پایا۔ صرف ان کی عمدہ انتظامی صلاحیتوں کے باعث خان لاہور کے حکمران کی جانب سے روزافزوں اور حد سے بڑھے ہوئے خراج کے مطالبات کو سنبھالنے کے قابل ہو سکا۔

صادق خان کے والد بہاول خان نے جب مظفر خان نواب ملتان اور ناظم ڈیرہ غازی خان کو خراج دینا بند کر دیا تو اس نے لاہور کے حکمران سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت اس نے وعدہ کیا کہ وہ مظفر خان کی کسی صورت مدد نہیں کرے گا اور لاہور کے حکمران نے وعدہ کیا کہ اگر کبھی ملتان اُس کے قبضے میں آ گیا تو وہ بہاول خان سے خراج طلب نہیں کرے گا۔ رنجیت سنگھ نے بہاول خان کی زندگی میں تین مرتبہ ملتان پر چڑھائی کی اور ہمیشہ پیشکش یا خراج تو لیا مگر وہاں مستقل قبضہ قائم نہ کیا لیکن جب مہاراجہ نے ڈیرہ غازی خان کے گردونواح پر بھی قبضہ کر لیا تو اس نے اپنا مطالبہ پہلے ایک لاکھ، پھر ڈیڑھ لاکھ اور آخر کار دو لاکھ روپے تک بڑھا دیا۔ تاہم یہ مطالبہ صرف نام کی حد تک ہوتا اور تب تک لاگو نہیں ہوتا جب تک لاہور کی طرف سے فوجی کارروائی کی دھمکی نہ دی جاتی۔ جیسے ہی ایسا

ہوتا، خان کے دریا کے پار افسران علاقہ چھوڑ کر اِس طرف آ جاتے اور کم از کم مال چھوڑنے کی کوشش کرتے تا کہ حملہ آور زیادہ نقصان نہ کر سکیں۔ اکثر معاملات میں مطالبہ کردہ رقم سے بھی کم رقم پر سمجھوتہ ہو جاتا اور سکھ افواج واپس لوٹ جاتیں، ہر بار ملک پہلے سے زیادہ کمزور ہوتا جاتا۔ یہ صورتِ حال صادق محمد خان کی وفات تک برقرار رہی۔

بہاول پور کے حکمرانوں نے کبھی دریائے ستلج اور سندھ کے بائیں کنارے کے اپنے علاقوں پر کسی طاقت کو خراج ادا نہیں کیا۔ مبارک خان نے ڈیرہ غازی خان کے ناظم کے ذریعے کابل کے حکمران کو 70,000 روپے سالانہ ان علاقوں کے عوض ادا کیے جو اُس نے لیز پر حاصل کیے تھے اور ملتان کے نواب سے حاصل شدہ زمین کے بدلے بھی اتنی ہی رقم دی جاتی تھی۔ بہاول خان دوم نے یہ خراج دینا بند کر دیا۔ تیمور شاہ نے مبارک خان کو اس کے والد بہاول خان کی زندگی میں ہی ریاست بہاول پور کا حکمران مقرر کیا اور اس موقع پر اس سے کابل کی حکومت کی تابع داری اور خراج گزاری کا وعدہ لیا لیکن غالب امکان ہے کہ یہ شرائط اُس کی رہائی کی قیمت کے طور پر مسلط کی گئیں اور بہاول خان نے ان شرائط کو کبھی قبول نہیں کیا۔ یہی اس کے بیٹے سے ناراضی کی بنیادی وجہ بنی اور اسی کو بنیاد بنا کر اُس نے بیٹے کو قید کر دیا۔ صادق محمد خان نے بعد ازاں خراج کی ادائیگی کا رخ نواب ملتان اور ناظم ڈیرہ غازی خان سے ہٹا کر رنجیت سنگھ کی طرف موڑ دیا جب وہ ان علاقوں پر قابض ہوا۔

صادق محمد خان کے خلاف بھائیوں کی سازش:

صادق محمد خان کے کئی دشمن تھے اور ایک بار جب وہ شکار کے لیے دراوڑ سے باہر گیا ہوا تھا، ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو اس کے اقتدار کے خاتمے کا سبب بن سکتا تھا۔ قبیلے کے کچھ بااثر افراد نے اس کے پانچ بھائیوں کے ساتھ سازش کی۔ بھائی قید سے فرار ہو گئے، محافظوں کو قابو میں کر کے قتل کر دیا اور قلعہ دراوڑ پر قبضہ کر لیا۔ خان قلعہ دراوڑ سے صرف پانچ میل دور تھا جب یہ واقعہ پیش آیا۔ اُسے فوراً خبر دے دی گئی لیکن خوف غالب آیا اور وہ فرار کی تیاری کرنے لگا تاہم اس کے حامیوں نے اُسے شام تک رکنے پر راضی کر لیا اور مشورہ دیا کہ دراوڑ میں عوام کے جذبات کا اندازہ لگانے کے لیے ایک جماعت بھیجی جائے۔ اس مہم کی قیادت محمد دایم خاص خیلی کو سونپی گئی۔ وہ خان کے روہیلہ محافظوں اور

دیگر افواج کے ہمراہ دراوڑ پہنچا اور قلعے میں موجود باغیوں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا۔ خان کی باقاعدہ فوج کا ایک بٹالین جو مشرقی علاقوں سے تعلق رکھتا تھا اور جسے سازش میں شامل نہیں کیا گیا تھا قلعے کے باہر موجود تھا، فوراً اُس کے ساتھ ہو گیا۔ تب محمد دایم نے خان کو پیغام بھیجا کہ قلعے پر حملے کی اجازت دی جائے۔ خان پیغام موصول ہونے پر خود باقی لشکر کے ساتھ دراوڑ پہنچا۔ اس کی روہیلہ محافظ فورس (تقریباً چار سو افراد) قلعے پر حملے میں آگے بڑھی اور دروازوں کو اتنے زور سے مارا کہ وہ کنگھیاں (چولیں) چھوڑ گئے۔ ایک بار جب داخلہ حاصل ہو گیا تو عددی اکثریت خان کے حق میں تھی اور وہ دوبارہ اقتدار میں آ گیا تاہم اس قدر خوفزدہ ہوا تھا کہ کہا جاتا ہے ایک مہینے تک اپنے حرم میں ہی محصور رہا اور کسی کو باہر سے اندر آنے کی اجازت نہ دی۔ اس نے حکم دیا کہ اس کے تین بھائی خُدا یار خان، حاجی خان اور فیروز محمد خان اور اس کے بھائی مبارک خان کے دو بیٹے قتل کر دیے جائیں۔ ناصر خان اور قادر بخش خان، باقی دو بھائیوں کو صرف اس بنیاد پر بخش دیا گیا کہ ان کے خلاف بغاوت میں شامل ہونے کے واضح ثبوت نہیں ملے تھے۔

صادق محمد خان کی وفات اور جانشینی:

صادق محمد خان دوم 1825ء میں وفات پا گیا اور اس کے بڑے بیٹے رحیم یار خان (جو محمد بہاول خان کے لقب سے مشہور ہوئے)، نے تخت سنبھالا۔ تخت نشینی کے فوراً بعد اُن کا پہلا اقدام اپنے والد کے وزیروں، شیخ مقبول اور شیخ نور محمد سے نجات حاصل کرنا تھا۔ یہ عمل محمد یعقوب خاص خیل، محمد قایم اور محمد دایم کی تحریک پر کیا گیا جو وہی افراد تھے جنھوں نے صادق محمد خان کو ناصر خان گورگیج اور فتح محمد غوری کو قتل کر کے اُن کا مال ضبط کرنے پر اُکسایا تھا۔ اس وقت محمد یعقوب کو میر بخشی (فوج کا افسر خزانہ) مقرر کیا گیا تھا اور اس کے چچا محمد قایم اور محمد دایم خان کے درباری معاملات میں نچلے درجے کے عہدوں پر تھے۔ چوں کہ یہ سب غلام تھے جن کی حیثیت خان کے خاندان کی ترقی کے ساتھ بڑھی اس لیے وہ ہمیشہ انتہائی قابلِ اعتماد سمجھے جاتے تھے اور خفیہ اور اہم امور میں استعمال کیے جاتے تھے۔

بہاول خان کی تخت نشینی 1827 تا حال:

تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان افراد نے اپنی ذاتی طاقت و دولت میں اضافہ کرنے کے لیے خان کے مفاد کو نظر انداز کیا۔ انھوں نے خان کو قائل کر لیا کہ اس کے وزراء، شیخ مقبول اور شیخ نور محمد، اس کے چھوٹے بھائی عظیم یار خان کو تخت پر بٹھانے کی سازش کر رہے ہیں۔ خان اس الزام کو قبول کرنے میں اس لیے بھی آمادہ تھا کہ اسے اپنے والد کی زندگی میں ان وزیروں سے کئی معاملات پر اختلافات رہے تھے اور ان پر یہ شبہ پہلے سے موجود تھا کہ وہ اس کے حق میں نہیں۔ یہ بات عام تھی کہ عظیم یار خان عوام میں زیادہ مقبول تھا اور ہر اعتبار سے بہاول خان سے بہتر حکمرانی کی صلاحیت رکھتا تھا جو خود خاص ذہانت کا مالک نہ تھا اور اس میں اپنے والد کی طرح بے اعتمادی اور بخل کی جھلک پائی جاتی تھی تاہم اگر یہ وزیر واقعی بہاول خان کے مخالف ہوتے تو صادق محمد خان کی وفات ہی ان کے لیے عظیم یار خان کی حمایت کا بہترین موقع ہوتا لیکن ایسا کرنے کے بجائے انھوں نے فوراً بہاول خان کو تخت نشین قرار دیا اور عظیم یار خان کو قید کر دیا۔ اب خواہ وہ خان کے خلاف سازش میں ملوث تھے یا نہیں، ان کے مخالفین کی نیتیں صاف ظاہر تھیں۔ یہ افراد، جنھیں "خاص خیل" کہا جاتا ہے، خان کے ذہن پر گہرا اثر رکھتے تھے اور انھیں وزیر ہی اپنے اقتدار کے راستے کی بڑی رکاوٹ نظر آتے تھے چناں چہ انھوں نے خان کے لالچ کو بھڑکایا اور بتایا کہ وزیروں نے ظلم و جبر سے بے پناہ دولت اکٹھی کی ہے جسے حاصل کر کے خان کی حکمرانی مزید مضبوط بنائی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ خان نے وزیروں کو قتل کرنے کا فیصلہ واقعی اس یقین کی بنیاد پر کیا ہو کہ وہ غداری میں ملوث ہیں لیکن اس کے پاس اس شک کو ثابت کرنے کے کوئی قوی شواہد نہیں تھے اور وہ بظاہر اپنے مفاد پرست مشیروں کے مشورے پر چل رہا تھا۔ اگر خان کو اپنے وزیروں کو معزول کرنے کے لیے ان کا خون بہانا پڑا تو یا تو اس کی حکمرانی بہت کمزور بنیادوں پر قائم تھی یا پھر وہ واقعی شدید نفرت کا شکار تھا۔ ایسے افعال ان مطلق العنان ریاستوں میں اتنے عام ہیں کہ حیرت نہیں ہوتی لیکن چاہے یہ کبھی خود حفاظتی ضرورت کے تحت کیے جائیں، ان کے ساتھ کی جانے والی سرد مہری اور دھوکہ دہی کو کسی صورت جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس واقعے میں مقتولین کو پہلے ہی اپنے انجام کی خبر ہو چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی نقل

وحرکت پر خفیہ نگرانی ہو رہی ہے اور فرار کا ہر راستہ بند کر دیا گیا ہے جب کہ ظاہری طور پر خان کا رویہ ان سے بدستور خوش اخلاقی کا رہا۔ وہ روزانہ دربار میں حاضر ہوتے، عزت وتکریم سے ملتے اور معمول کے مطابق ریاستی امور سرانجام دیتے۔ اگرچہ ہر لحہ انھیں موت کا اندیشہ لاحق تھا پھر بھی انھوں نے اپنے خدشات ظاہر نہیں کیے کہ کہیں خان کا شک اور نہ بڑھ جائے اور موت جلدی نہ آ جائے۔ جس دن ان کے قتل کا فیصلہ ہوا، خان نے احمد پور محل میں دربار لگایا اور وزیروں کو بھی طلب کیا۔ دربار برخاست ہونے کے بعد خان نے ان سے کہا کہ وہ کچھ مزید بات کرنا چاہتا ہے اس لیے وہ انتظار کریں۔ کچھ ہی دیر میں ایک خادم آیا اور انھیں ایک اور کمرے میں بلایا جہاں خان عموماً انھیں انفرادی ملاقاتوں کے لیے بلایا کرتا تھا۔ اس کمرے تک پہنچنے کے لیے انھیں ایک صحن سے گزرنا تھا۔ وہاں ان کا سامنا محمد یعقوب خاص خیل اور آٹھ یا دس مسلح افراد سے ہوا۔ ان سے تلواریں چھین لی گئیں اور کہا گیا کہ وہ خان کے غدار ہیں اور انھیں مرنا ہوگا۔ انھوں نے اپنی بیگناہی کی دہائی دی مگر مزاحمت نہ کی۔ ان کی واحد التجا یہ تھی کہ انھیں موت سے قبل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حضور دعا کی اجازت دی جائے۔ یہ اجازت ملی اور بعدازاں انھیں جلد ہی قتل کر دیا گیا۔ ان کے قتل کے بعد ان کے گھروں اور املاک کو لوٹ لیا گیا لیکن ان کے اہلِ خانہ کو پہلے ہی ان کی موت کی خبر پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد وہی منظر دیکھنے کو ملا جو ایسے واقعات کے بعد اکثر پیش آتا ہے۔ خاندان کے ایک زندہ بچ جانے والے بھائی نے گھر کی تمام خواتین کو خود ہی قتل کر دیا تا کہ وہ دشمنوں کے ہاتھ نہ آئیں۔ وہ بھائی خود چند ساتھیوں کے ساتھ اپنے گھر کے دروازے پر لڑتے لڑتے مارا گیا اور پھر خان کے کارندے، جن کی قیادت محمد دایم خاص خیل کر رہا تھا، نے گھر کو مکمل طور پر لوٹ لیا۔ دو نابالغ بیٹے زندہ چھوڑ دیے گئے اگرچہ نیا وزیر محمد یعقوب ان کی ہلاکت کا خواہاں تھا اور کہا کرتا تھا: "سانپ کا بچہ بڑا ہو کر سانپ ہی بنتا ہے۔" لیکن خان نے ان کی کمسنی پر رحم کیا اور انھیں اپنے ہم عمر بیٹے کے ساتھ پالا اور ان کی تعلیم وتربیت کے لیے استاد مقرر کیے۔

خلاف ورزی اور جنرل وینٹورا کی آمد:

شیخ مقبول اور شیخ نور محمد کی موت کے بعد، محمد یعقوب، محمد قایم اور محمد دایم خاص خیل نے

مکمل اختیار حاصل کر لیا۔ محمد یعقوب وزیر مقرر ہوا اور محمد قایم افواج کا بخشی۔ بہاول خان ملتان، ڈیرہ غازی خان اور دریا کے مخالف کنارے کے علاقوں کے بدلے لاہور کے حکمران کو نذرانہ دیتا رہا۔ مہاراجہ ہر سال نذرانہ بڑھاتا گیا یہاں تک کہ وہ پانچ لاکھ روپے تک جا پہنچا۔ جب بھی وہ فوج کے ذریعے خراج وصول کرنے آتا، خان کے افسر علاقے خالی کر دیتے اور دشمن کو کھلا میدان دے دیتے کہ جتنا چاہیں لوٹ لیں۔ یہ سلسلہ 1831ء تک جاری رہا جب جنرل وینٹورا کو سات لاکھ روپے کے تمام واجب الاداخراج کی وصولی کے لیے بھیجا گیا۔ خان کے افسران پیچھے ہٹتے گئے اس امید پر کہ سکھ لوٹ مار کر کے واپس چلے جائیں گے لیکن وینٹورا، جسے مہاراجہ کی اجازت حاصل تھی، نے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا اور جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا اپنی پوزیشن مضبوط کرتا گیا۔ اُس نے مختلف قصبوں میں تھانے اور اہلکار تعینات کیے تا کہ نظم و نسق قائم ہو اور محصولات کی وصولی کی جا سکے۔ خان نے مہاراجہ سے اپنے سابقہ معاہدے کی تجدید کی کچھ کوششیں کیں لیکن بدانتظامی اور افسران کی بدعنوانی کی وجہ سے ناکام رہا۔ وہ علاقہ جو کبھی بمشکل خان کو پانچ لاکھ روپے دیتا تھا، ونیٹورا نے پہلے ہی سال گیارہ لاکھ روپے مہاراجہ کے خزانے میں جمع کروانے کا عہد کیا۔

☆☆☆☆☆

حکایات بہاول پور

(5)

یہ واقعہ مجھے ایک اسکول ماسٹر نے سنایا: اسکول کے کھیل کے میدانوں کے ساتھ ایک سبزیوں کا کھیت اور ایک مرغیوں کا باڑہ تھا جہاں دو کسانوں نے اپنا گھر بسایا تھا۔ مرغیوں کا پالنا بظاہر کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب مرغیاں ہمسائے کی سبزیوں کے کھیت میں گھسنے لگیں۔ مرغی والے کی بیوی نہایت بدزبان تھی۔ جب سبزی اگانے والے کسان کی بیوی نے شکایت کی تو اس نے الٹا ڈانٹ پلائی اور کہا کہ مرغیاں گائے بھینسیں نہیں کہ باندھ کر رکھی جائیں۔ بات بڑھ گئی اور مرغی والی عورت نے اپنے بچوں کو حکم دے دیا کہ جان بوجھ کر مرغیاں ہمسائے کے کھیت میں چھوڑا کریں۔ آخر کار کسان کی بیوی نے اپنے شوہر سے فریاد کی۔ وہ نرم طبیعت کا آدمی تھا، بحث مباحثے سے گریز کرتا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ خاموشی سے گھر سے نکل گیا۔ اگلے دن دوپہر کے کھانے کے وقت وہ چھ انڈے لے کر آیا اور بیوی سے کہا": یہ انڈے میں نے گاؤں سے خریدے ہیں۔ جب مرغی والی عورت اسکول کے میدان کے قریب ہو اور بچے کھیل رہے ہوں، تو یہ انڈے استادوں کے پاس بیچ دینا۔ مگر کسی کو خبر نہ ہو کہ یہ کہاں سے آئے ہیں۔" بیوی نے شوہر کی حکمت عملی سمجھ لی۔ کچھ دنوں میں مرغی والی عورت کو یہ گمان ہو گیا کہ اس کی مرغیاں ہمسائے کے کھیت میں انڈے دے رہی ہیں اور ہمسایہ انھیں بیچ رہا ہے۔ یوں چند ہی دن میں اس نے اپنے بچوں کو سختی سے حکم دے دیا کہ مرغیاں کبھی سبزیوں کے کھیت میں نہ جائیں۔ یوں کسان نے چالاکی سے اپنی سبزیاں بچالیں۔

ایک ہندوستانی نواب کے دربار میں

تحریر: آر۔ڈی۔میکنزی

[آر۔ڈی میکینزی(R.D Mackenzie) یک برطانوی مصنف اور مصور تھے جنھوں نے 1899 میں شائع ہونے والے مضمون " At the Court of an Indian Prince کے ذریعے شہرت حاصل کی۔ یہ مضمون برطانوی جریدے CenturyMagazine The میں شائع ہوا تھا اور اس میں انھوں نے ریاست بہاول پور کے نواب کی درباری زندگی، طرزِ حکمرانی، ثقافت اور شکار کے شوق کی تفصیلات بیان کیں۔ Mackenzie نے اپنے سفر کے دوران نواب صادق محمد خاں چہارم کے دربار کی روایات، فنِ تعمیر، لباس اور درباری آداب کا مشاہدہ کیا۔ انھوں نے دربار کی شاندار عمارتوں، قیمتی زیورات اور نواب کی شان وشوکت کا تفصیل سے ذکر کیا۔ مضمون میں نواب کی مہمان نوازی، درباری موسیقی اور روزمرہ کی رسومات کا بھی بیان ہے جو اس دور کے ہندوستانی شاہی درباروں کی جھلک پیش کرتا ہے۔ آر ڈی میکینزی کے بارے میں مزید معلومات محدود ہیں اور ان کی دیگر تصانیف یا سوانح حیات کے بارے میں مستند ذرائع دستیاب نہیں ہیں۔ ترجمہ نگار کو یہ نام اینابل لائیڈ کی کتاب "بہاول پور ایک گم شدہ ریاست" کے مطالعے کے دوران اس مضمون کا ذکر حوالہ جات میں ملا۔ اصل مضمون تک رسائی "مصنوعی ذہانت" نے ممکن بنائی۔)

ہندوستان کا عظیم میدان بے شمار علاقوں میں بٹا ہوا ہے جنھیں "ریاستیں" کہا جاتا ہے۔ یہ ریاستیں یا تو ہندو یا مسلمان حکمرانوں کے زیرِ اثر ہیں۔ کچھ پر مقامی شہزادے مکمل اختیار رکھتے ہیں جب کہ دیگر میں انگریز اہلکار، جنھیں "ریزیڈنٹ" کہا جاتا ہے، معاونت کرتے ہیں لیکن سب کے سب کسی نہ کسی حد تک برطانوی حکومت کے ماتحت ہیں۔ میری تحریر جس حکمران پر مبنی ہے وہ ان میں

سے سب سے زیادہ خودمختار ریاست کا مالک ہے۔اس کی ریاست راجپوتانہ کے انتہائی شمال مغرب میں واقع ہے جو بیکانیر کے ریگستان کے کنارے پر ہے۔اگر عمومی طور پر بات کی جائے تو یہ ریاست تین سو میل لمبی اور سو میل چوڑی ہے، اور اس کی آبادی تقریباً چھ لاکھ ہے۔اس ریاست کا نام بہاول پور ہے اور اس کا حکمران ہے صادق محمد خان عباسی، .G.C.S.I جو عمومی طور پر "عالی جاہ نواب بہاول پور" کہلاتا ہے۔

میں نے نواب کو پہلی مرتبہ احمد پور کے محل میں دیکھا جو حال ہی میں تعمیر ہوا تھا اور جس کا منظر پہلی بار دیکھنے والے کے لیے صحرائی ریت اور دھوپ میں ابھرتی ہوئی ایک حیرت انگیز عمارت جیسا تھا۔ یہ محل غیر صاف، دھندلے، کچی دیواروں والے بازار کے بیچ واقع ہے جہاں سست اونٹ اور گدھے دروازے کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں اور اس کے گرد تیس فٹ اونچی برج دار دیوار ہے جس کا گھیر تقریباً دو میل ہے۔ یہ محل ان شاندار مگر تضاد سے بھرپور عمارتوں میں سے ایک ہے جو کبھی کبھار یورپی سیاح کو ہندوستانی ریاستوں میں چونکا دیتی ہیں۔اس عمارت کا نقشہ اور عمومی خاکہ فرانسیسی طرز کا ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے یہ پیرس میں واقع (مشہور محل) پالے دی لُکسمبرگ ہو۔ ریگستان کی دھوپ اور چمک اتنی شدید ہے کہ دیکھنے والے کو لگتا ہے اُس کی آنکھیں یا دماغ دھوکہ دے رہے ہیں لیکن جیسے جیسے قریب جایئے، آپ کو طرزِ تعمیر کی تفصیل میں حیرت ہوتی ہے — یونانی، رومی اور عربی طرز کے ستون، محرابیں اور چھجے دار بالائی ساخت۔ رنگوں کا امتزاج بھی خوشنما ہے — سفید سنگِ مرمر اور ٹیرّا کوٹا۔ باہر کاسٹ آئرن کے فوارے نصب ہیں جو کبھی نہیں چلتے اور جب آپ خشک، صحرائی ریت پر کھڑے ہوتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کسی نے ان فواروں کو چلانے کا سوچا بھی تو کیسے؟

محل کے اندر ایسے امتزاج ہیں جن کا خواب بھی نہیں دیکھا گیا۔ وہاں "سبز کمرہ" ہے، "پیلا کمرہ" ہے اور دیگر۔لیکن "سبز کمرہ" کی دیواریں گلابی اور پیلی ہیں اور اس میں شوخ سبز پردے لگے ہیں جن کی وجہ سے شاید اسے یہ نام دیا گیا۔ کچھ فرنیچر کٹے ہوئے کرسٹل سے بنا ہے اور کچھ لوئس چہاردہم کے طرز پر سونے کے پانی سے ملمع کیا گیا ہے۔سب سے نمایاں چیز ایک دیو قامت گوتھک آئینہ ہے جو کہ ایک قسم کا چھوٹا ویسٹ منسٹر ایبے لگتا ہے۔اس میں رنگین شیشے کے پندرہ نقل شدہ برتن اور

جاپانی ساخت کے دو چینی مجسمے ہیں جن کے سر، زبان اور ہاتھ حرکت کرتے ہیں۔ کمرے کو روشن کرنے کے لیے ہر چھ فٹ کے فاصلے پر مختلف رنگوں کے جھاڑ فانوس لگے ہیں اور زمین پر شمعدان رکھے گئے ہیں۔ کمرے میں ایک عجیب "موسیقی پلنگ" بھی ہے، جس کے چاروں کونوں پر انسانی جسامت کے فربہ، گوشت رنگ ناچتے ہوئے مجسمے لگے ہیں۔ (بہاول پور۔ ایک گمشدہ ریاست کی مصنفہ نے اس حیرت انگیز پلنگ کی تصویر بھی دی ہے۔ مترجم) نواب اس محل میں نہیں رہتا۔ وہ ایک چھوٹے محل کو ترجیح دیتا ہے جو باغ کے ایک کونے میں ہے، نارنجی اور کھجور کے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے اور حرم کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہی اس کا اصل گھر ہے جہاں اونچی دیواروں کی خلوت اور پردہ داری اسے محبوب ہے جیسا کہ ہر مسلمان کو عزیز ہوتا ہے۔

یہ چھوٹا محل چوکور، کم اونچائی والا اور ہموار چھت والا ہے جس کے اردگرد محرابوں والا برآمدہ ہے جیسا کہ مقامی طرزِ تعمیر میں ہوتا ہے۔ بیرونی سطح سفید پلستر کی ہے جس پر چمکدار رنگوں سے چونے کی سجاوٹ کی گئی ہے اور سورج کی روشنی میں یہ پتھر یا اینٹ نہیں بلکہ جیسے پھول، تتلیاں اور بھنورے ہوں۔ یہیں سبز طوطوں کے جھنڈ چیختے چلاتے اڑتے ہیں۔ ایک لمبی راہداری کے پار ایک آواز گونجی۔ یہ ڈھیلے کپڑوں کی سرسراہٹ اور ننگے قدموں کی دوڑ تھی۔ یہ نواب کے خادم تھے۔ ان میں سے ایک نے اعلان کیا: "جی ہاں، عالی جاہ یہاں ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" ملاقات بے تکلف تھی۔ میرا کمرہ اسی راہداری میں کھلتا تھا اور نواب اپنے ذاتی سیکریٹری کے ساتھ اندر آئے۔ باہر برآمدے میں محافظ دستہ اور ریاستی افسران موجود تھے لیکن جب تک نواب خود مخاطب نہ ہو، کوئی بات نہیں کرتا — سوائے یورپی مہمان کے۔ نواب کی عمر تقریباً چھتیس سال ہے، قد چھ فٹ، جسم متناسب، گہرے نین نقش، سیاہ گھنگریالے بال، بھرا ہوا داڑھی والا چہرہ اور بڑی بڑی مونچھیں جو آخر میں گھوم کر انگوٹھی کی شکل میں مڑ جاتی ہیں۔ وہ انتہائی حساس مزاج رکھتے ہیں، ان کی قوتِ ارادی مضبوط ہے، جسمانی طور پر فولاد جیسے ہیں اور فطری طور پر بے حد محتاط، شکی اور غیر معمولی طور پر حسد کرنے والے ہیں۔ خاص مواقع کے علاوہ نواب کا لباس سادہ سفید ململ کی بہت کشادہ شلوار، ریشمی یا اونی کوٹ اور ویسٹ کوٹ اور سنہری ریشمی عمامہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کی جیبیں بیشمار ہیں اور ان میں موجود اشیاء

حیرت انگیز۔ عام طور پر وہ دو یا تین گھڑیاں باندھے ہوتے ہیں جو بہت خوب صورت ہوتی ہیں لیکن اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے پاس کم از کم سترہ سو مختلف گھڑیاں ہیں اور وہ مسلسل نئی گھڑیاں خریدتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس کچھ نہایت قیمتی جواہرات بھی ہیں۔ ان کے تاج کا وزن نو پاؤنڈ ہے جو چاندی میں جڑے ہوئے ہیروں کا مجموعہ ہے جس کے کنارے پر بڑے بڑے موتیوں کی قطار ہے۔ ان کی تلوار کی میان اور دستہ جواہرات سے مزین ہیں جن کی مالیت پانچ لاکھ ڈالر بتائی جاتی ہے۔ وہ قیمتی سرخ یاقوت اور کٹے بغیر زمرد پہنتے ہیں جو موتیوں اور یاقوت کی زنجیروں میں پروئے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس پندرہ غیر تراشیدہ زمرد بھی ہیں جو مغل بادشاہوں کے ناموں سے کندہ ہیں۔ یہ جواہرات تاریخی نوعیت کے ہیں اور بے ترتیب اشکال میں ہیں۔

نواب کی موجودہ آمدنی سالانہ تقریباً پندرہ لاکھ روپے ہے۔ وہ ایک مطلق العنان حکمران ہے جسے مجرموں کی زندگی یا موت کے فیصلے پر دستخط کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ ریاست کے انتظامی امور وزیرِ اعظم اور دیگر افسران کی نگرانی میں ہوتے ہیں لیکن کوئی بھی سرکاری حکم نواب کے تحریری دستخط کے بغیر نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر طبع ساز گار ہو تو نواب ہفتہ وار دربار یا "عوامی مجلس" منعقد کرتا ہے۔ ان مواقع پر امیر و غریب، جسے بھی موقع میسر ہو، آ کر اپنی عرضیاں پیش کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ نواب اور اس کی کونسل کے سامنے زبانی طور پر اپنی شکایت بیان کریں اور تحریری عرض داشت بھی پیش کریں۔

میری آمد کے پہلے ہی دن شام کے وقت مجھے ان ہی میں سے ایک دربار دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک بوڑھا کسان دو محافظوں کے درمیان تیزی سے لایا گیا اس قدر پر جوش کہ نواب کے حضور پہنچنے سے پہلے ہی جیب سے روپیہ نکال کر پیش کرنے لگا۔ نواب نے اگرچہ بے چینی محسوس کی مگر اسے پھر بھی شروع سے پوری بات سننا پڑی۔ اس کی شکایت یہ تھی کہ کسی نے اس سے تین آنے یعنی ایک روپے کے سولہ حصے میں سے تین حصے ہتھیا لیے تھے۔ نواب کو اس بیچارے بوڑھے کی گھبراہٹ اور سنجیدگی اتنی مضحکہ خیز لگی کہ اُس نے ہنستے ہوئے اسے ایک پورا روپیہ دے مارا اور کہا: ''لو بھئی، اب حساب پورا ہو گیا لیکن سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب بوڑھا پھر

بھی راضی نہ ہوا اور تین آنے مانگتا رہا۔ بالآخر محافظوں نے اُسے باہر نکال دیا۔ وہ جتنا بے چین اور شوریدہ حال آیا تھا، اتنا ہی ناراض ہو کر گیا۔ یہ واقعہ اُن عرضیوں کی بے وقعتی کی مثال تھا جو اکثر پیش کی جاتی تھیں۔ اگرچہ ان میں کچھ سنجیدہ نوعیت کی بھی ہوتی تھیں۔ نواب ہر مقدمے کا فیصلہ انتہائی سختی اور قطعیت سے کرتا اور بعض اوقات مشورے کے لیے اپنے وزیروں سے رجوع کرتا۔

دربار کے بعد ہمارا پروگرام محل کے سامنے کے علاقے کی سیر کا تھا۔ ایک چھوٹی سی بگھی منگوائی گئی جو مکمل طور پر چمڑے کی چھت سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کے پہیے چھوٹے اور ٹائروں کی چوڑائی چھ انچ تھی تاکہ ریت میں چل سکے۔ کوچوان کے لیے ایک نشست مخصوص تھی، باقی سب کو مقامی طرز پر فرش پر بچھے گدے پر بیٹھنا تھا۔ ہم آٹھ افراد ایسے بیٹھے تھے جیسے اچار کی بوتل میں ٹھونسا گیا ہو، بیچ میں تلواریں، بندوقیں، اور ناگزیر سگار و سگریٹوں کا ڈبہ۔ وقت ضائع کرنے کا سوال ہی نہ تھا کیوں کہ دو گھنٹے بعد اندھیرا چھا جاتا۔ چھ میل کا یہ سفر ایسے راستوں پر طے ہونا تھا جہاں یورپی کوچوان چلانے کی جرات بھی نہ کرتے۔ کبھی نرم ریت کے ٹیلے جو پہیوں کو آدھا نگل جاتے تو کبھی سخت اور خشک مٹی کی ڈھیلی گانٹھیں۔ آخر کار ہم خاردار جھاڑیوں سے ہوتے ہوئے صحرائی زمین کے سب سے کٹھن اور ناہموار حصے میں جا پہنچے جس میں ایک تازہ تازہ کھدی ہوئی لکیر ہمیں راستہ دکھا رہی تھی۔ ابھی ہم بگھی میں سوار ہو ہی رہے تھے کہ اطلاع ملی کہ دو یا تین جنگلی سور گھیرے میں آ چکے ہیں۔ بگھی کو فوراً اصطبل واپس بھیج دیا گیا اور "شکار کی گاڑی" منگوانے کا حکم ہوا۔ میں نے کبھی سور کا شکار، یعنی "پِگ اسٹِکنگ" نہیں دیکھا تھا اس لیے فطری طور پر بہت متجسس تھا۔ سؤر کو نہایت بے خوف اور شدید خطرناک جانور سمجھا جاتا ہے۔ ابھی صرف دس منٹ ہی گزرے تھے کہ آٹھ اعلیٰ نسل کے خچروں کی دوڑتی ہوئی بگھی افق پر ایسے نمودار ہوئی جیسے ریت کے سمندر کی لہریں افق تک پھیل گئی ہوں۔ ریت کی ہر لہر، جو پانچ سے دس فٹ بلند تھی، سبز مائل جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی شاید کوئی صحرائی صنوبر۔ نواب نے سب کو سگار اور سگریٹ پیش کیے جن کے وہ نہایت فیاض میزبان تھے۔ چھ میل کا یہ فاصلہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا خاص طور پر جب پیچھے اڑتی گرد ہوا میں بیس فٹ بلند دیوار کی طرح کھڑی تھی مگر اسی دھند کے بیچ بیچ میں ہمیں ایک کھلی بگھی نظر آتی جو پیچھے سے ہمارے پیچھے دوڑتی

آ رہی تھی۔ یہ بگھی بہاول پوری سواروں سے بھری ہوئی تھی جس پر چھوٹے مگر سخت مزاج بلوچ گھوڑوں پر سوار تھے جن میں تھوڑا بہت عربی خون بھی شامل تھا۔ ان میں سے اکثر کے گھوڑوں پر فقط ایک ڈور کی لگام تھی۔ وہ بغیر کسی ترتیب کے دوڑتے، کبھی داہنے، کبھی بائیں، کبھی واپس آ کر چکر لگاتے اور کبھی جھاڑیوں اور ریتلے ٹیلوں کو چیرتے آگے بڑھتے۔

ان کے لباس میں ڈھیلا عمامہ تھا جس کی ایک پٹی شانوں پر جھولتی رہتی، ڈھیلا کوٹ اور سفید سوتی پاجامہ جو دھول مٹی سے زرد ہو چکا تھا۔ کمر کے گرد رنگین کمر بند لپٹا ہوتا اور اس پر ایک پتلی بیلٹ بندھی ہوتی جس سے ایک تیز دھار، خم دار تلوار لٹک رہی ہوتی۔ بالآخر ہم اپنے مقام پر پہنچ گئے — مٹی اور گرد سے اٹے ہوئے۔ ہر چیز اس بات کی یاد دہانی کروا رہی تھی کہ جہاں نواب قدم رکھے وہاں حکم ہی حکم ہوتا ہے اور غلام صرف حکم بجالانے کے لیے ہوتے ہیں۔ چار بڑے سور پہلے ہی دس فٹ اونچی کپڑے کی دیوار (قنات) میں بند کیے جا چکے تھے۔ یہ احاطہ آدھے میل پر پھیلا ہوا تھا جس کے بیچ میں تھوڑا سا مکئی کا کھیت تھا شاید کسی غریب ہرن کی عارضی چراگاہ۔ نئی گھوڑیاں زین سے آراستہ کر دی گئی تھیں۔ ہاتھی بھی تیار کھڑے تھے جو شائقین کو سوار کرنے والے تھے۔ وزیر اعظم، شاہی طبیب اور غیر ملکی نمائندہ سب موجود تھے۔

جیسے ہی قنات کھولی گئی، پندرہ وحشی نوجوان اندر دوڑے، ہر ایک کے ساتھ چار پانچ کتے بندھے ہوئے۔ یہ کتے گرے ہاؤنڈ نسل کے بگڑے ہوئے خون آلود ورژن (Version) تھے۔ جب ان کے پاس چبانے کو سور نہ ہو تو ایک دوسرے کو چیر پھاڑ ڈالیں۔ میں نے خود دیکھا کہ بیس کے قریب کتے اندر دوڑے، کچھ تو اپنے ہی ساتھیوں کو زخمی کر چکے تھے۔ ہر سوار نے اپنی نیزہ چن لی اور اس مقام کی طرف روانہ ہو گیا جہاں سے سوروں کے نکلنے کی توقع تھی۔ اگلا گروہ پیدل محافظوں کا تھا جن کے پاس ننگی تلواریں اور کچھ کے پاس نیزے تھے۔ پھر سواروں نے کتوں کے ساتھ نواب اور اس کے دستے کی طرف دوڑ لگائی، جو نہایت غور سے ان کا معائنہ کر رہے تھے۔ ہمارے ہاتھی داخل ہوئے، قناتیں بند کر دی گئیں۔ کتوں نے خوشبو پالی اور چند منٹوں میں جھاڑیوں سے ایک ہلچل ہوئی۔ تین بڑے سؤر تیزی سے نکلے اور نواب کے گروہ پر تین مختلف سمتوں سے حملہ آور ہوئے۔ یہ "پگ

اسٹِکنگ" کا مخصوص دائرہ نما انداز تھا جس میں سور کو کھلے میدان سے کیمپ کی حدود تک ہانکا جاتا ہے۔ ایک شور بلند ہوا، ایک سوار گر گیا۔ نواب نے پہلا نیزہ مارا — بالکل اُس لمحے جب ایک سور اس کے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ زخمی تو معمولی ہو، مگر گھوڑا چاقو نما دانت سے بری طرح کٹ گیا اور فوراً تبدیل کیا گیا۔ ایک محافظ کو بھی زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی کے لیے بھیجا گیا جس کا پاؤں تقریباً چیر گیا تھا۔ پھر حملہ دوبارہ ہوا۔ نواب کا گھوڑا دوبارہ سامنے آنے سے گریزاں تھا لہٰذا نواب خود کود کر نیچے آیا، بے دھڑک اور پورے نیزے سے ایک سور کو چیر ڈالا۔ دو محافظ فوراً لپکے اور بھاری نیزوں سے اس کا کام تمام کر دیا۔

دوسرے سور کو کتوں نے دبوچ لیا اور ہاتھا پائی جاری رہی جب تک کہ ایک پیادہ محافظ نے آخری وار نہ کیا۔ ابھی دو اور باقی تھے، جن میں سے ایک ہمارے ہاتھی کی طرف لپکا۔ ہاتھی خوف سے تھرتھرا اٹھا، زور زور سے چنگھاڑا اور اپنے آپ کو سمیٹ کر کونے میں جمع کر لیا۔ اس نے بچ نکلنے کی کوشش کی مگر سور کے حملے کی شدت ایسی تھی جیسے بجلی گرنے سے بچنا ہو۔ شکر ہے کہ مزید حملہ نہیں ہوا۔ آدھے گھنٹے میں شکار ختم ہوا — تین سور مارے گئے اور چوتھے کو ایک سوار نے زندہ پکڑ کر اس کا سر الگ کر لیا۔ ان کے دانت اتنے لمبے تھے کہ کچھ تو انسان کے قد کے برابر تھے لمبے، نوکیلے، اور امریکی "ریزر بیک" سے مشابہ۔ ہم رات آٹھ بجے محل واپس پہنچے۔ نواب باغ کے ایک پرائیویٹ کمرے میں چلے گئے اور رات کے کھانے کے بعد میں برآمدے کے دروازے کے پاس چارپائی پر لیٹا ہوا دن بھر کی سرگرمیوں پر غور کر رہا تھا۔ اسی وقت محل میں عجیب و غریب "بازگشت" اور فضا میں ایک موسیقی کی لَے گونجی۔ مجھے لگا شاید ہوا کی شدت ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ آواز "صحنِ شکار یا مخصوص احاطہ جو شکار سے متعلق وہاں سرگرمیوں اور شکار کے بعد قیام یا شکار کی تیاری کے لیے مخصوص تھا۔ موسیقی کی آواز کنویں سے اٹھنے والی زنجیری بالٹیوں کی تھی جو پانی نکالنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔

پھر رات کو ہوا چلنے لگی اور سارا منظر ایک بار پھر نمی سے لبریز اور سکون آمیز ہو گیا۔ اگرچہ یہ آوازیں اس وقت تک چلتی رہیں جب تک آپ ان کے عادی نہ ہو جائیں۔ گرمی ایسی تھی کہ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا مگر آہستہ آہستہ ایک نرم ہوا بلند دیواروں سے چپکے سے اندر آئی، لوہے کے ساکت

فوارے کے گرد گھومتی ہوئی اور سنگِ مرمر کی چھت دار راہداری میں سے گزرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے فانوسوں کے شیشے کے لٹکتے جھمکوں کو ہلکا سا ہلایا اور اُن سے نکلنے والی کرسٹل کی مدھم جھنکار عظیم دربار ہال کے شفاف ماحول میں گونجنے لگی۔ میں اٹھا اور راہداری میں چلا گیا۔ وہاں صرف ایک چراغ روشن تھا جو ہال کے وسط میں جل رہا تھا۔ اس کی روشنی ہزاروں زاویوں سے منعکس ہو کر اس شیشے کی غار میں عجیب و غریب قوس قزح پیدا کر رہی تھی۔ کبھی نیلا، کبھی نارنجی، کبھی جامنی، کبھی سبز، پھر یکا یک ایک خالص سفید روشنی کی جھلک جو اندھیرے گوشوں میں چمک کر غائب ہو جاتی۔ جیسے جیسے ہوا تیز ہوئی، فانوسوں کی جھنکار بھی تیز ہوتی گئی۔ خاموشی کا وہ عالم تھا کہ ویرانی نے وحشت اختیار کر لی۔ اس پُر شکوہ محل میں اُس لمحے صرف سکون اور میں موجود تھے۔ دیواروں سے گھرا، ریگستان سے جدا یہ محل اب ایک ایسی خاموش قید بن گیا تھا جسے روشنیوں سے سجایا گیا ہو لیکن روح خالی ہو۔ "محل" کا لفظ اب اپنے ہی بوجھ تلے دبنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر کوئی شہزادہ جو یورپ کا تعلیم یافتہ ہو اور جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مغربی تہذیب میں گزارا ہو، یہاں تنہا آ جائے تو اس پر کیا گزرے گی؟ یہ محل ایک قیدی کے تنہائی خانے سے زیادہ ویران معلوم ہوتا تھا۔ میں اپنے پلنگ پر واپس آیا، ہوا اب تیز ہو چکی تھی اور ٹھنڈی بھی۔ میں تازہ ہوا اور فانوسوں کی جھنکار کے سنگم میں محو ہو چکا تھا کہ باغ کی گہرائی سے آتی ہوئی ایک لالٹین کی روشنی نے میری توجہ کھینچ لی۔ چاند کی چاندنی بلند دیواروں سے پہلے ہی چھپ چکی تھی۔ لالٹین جب محل کے موڑ کے قریب پہنچی تو میں نے سفید کپڑوں میں لپٹا ایک سایہ دیکھا اور تلوار کی جھنکار سنی۔ یہ یقیناً نواب اور اس کے محافظ تھے۔ سادگی کی ایسی مثال کم ہی دیکھی ہو گی۔ پھر راہداری میں کسی چیز کی سرسراہٹ سنائی دی؛ وہ میرے دروازے کے سامنے آ کر رُکی اور آواز آئی": صاحب! نواب بلاتے ہیں۔ "میں فوراً اپنے خاکی فولڈنگ پلنگ سے اٹھا اور باہر نکلا۔ نواب باغ میں لال رنگ کی لالٹین کے ساتھ تشریف فرما تھے، ساتھ میں وزیرِ اعظم، ذاتی سیکریٹری اور حقہ بردار موجود تھے۔ نواب نے فرمایا: " مجھے لگا آپ ناچ دیکھنا چاہیں گے۔ "یوں ہم سب ایک خاموش جلوس کی شکل میں باغ کے ایک اور گوشے کی طرف روانہ ہوئے جہاں گہرے سائے میں پہرے دار کھڑے تھے اور ایک بند احاطہ نظر آیا جو شاندار ریشمی پردوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ قنات پہلے

دیکھے گئے شکاری خیموں سے بالکل مختلف تھے۔ ہر رنگ کے نفیس پردے سبز، بنفشی، نارنجی، سیاہ احاطے کو چھپا رہے تھے۔ زمین پر قیمتی قالین اور دری بچھی تھیں اور دو قطاروں میں تقریباً پورے احاطے کے طویل رقبے تک نشستیں رکھی گئی تھیں۔ خدام کے پاس سگار کا ایک ڈبہ تھا؛ ہم سب نے ایک ایک سگار سلگایا۔ نواب نے بیچ میں نشست سنبھالی اور وزیرِاعظم کو شعلہ جلانے کا اشارہ دیا۔ ذاتی سیکریٹری اور چند نیزہ بردار قریبی مقام پر کھڑے ہو گئے۔ میں بازو کے بوجھ سے قدرے نیم دراز ہو گیا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ بوڑھے نوکر اندر آئے اور ان کے پیچھے نرم ریشمی کپڑوں میں لپٹی ہوئی لڑکیاں داخل ہوئیں۔ ان کے پازیبوں کی چھنک فضا میں گونج رہی تھی۔ دس بارہ رقاصائیں داخل ہوئیں، سونے اور چاندی کے زیورات میں جگمگاتی ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ قدموں کو گھسیٹتی ہوئی دائرے میں داخل ہوئیں اور پھر نواب کو سلام کر کے دو قطاروں میں بیٹھ گئیں اور اپنے دامنوں کی تہیں نرمی سے اپنے گرد پھیلائیں۔

پھر سارنگی اور ترسنگی کی آہ نکلی اور ایک مخصوص تمہید بجی، اس کے بعد ایک مدھم اور سست لے میں ایک گیت شروع ہوا جو چہرے اور دوپٹے کو ڈھانپنے کے انداز میں بڑھتا تھا۔ پھر چھ کنواری لڑکیاں، عجیب وغریب ساز، طبلے اور جھانجھریں لے کر آئیں۔ وہ اپنے سازوں کو ٹھیک کر رہی تھیں اور سریلے مگر غمگین اور پراسرار سُروں کے ریاض میں مشغول تھیں۔ نواب کے پیچھے کھڑے خفیہ خادم کے اشارے پر دور رقاصائیں کھڑی ہوئیں۔ ان کی چال میں خاص لچک اور جھومنے کا انداز تھا جسے ان کے وزنی لباس مزید نمایاں کرتے تھے۔ ساز اب بالکل قریب تھے اور جب سب ساز، خاص طور پر طبلہ ہم آہنگ ہو گئے تو رقاصاؤں نے جھک کر سازوں کو چھوا پھر ماتھے اور سینے پر ہاتھ رکھے جیسے موسیقی کو سلام کر رہی ہوں۔ پھر موسیقی نے ایک نئی روح کے ساتھ آغاز کیا۔ مدھم، نرم، اور زیریں لہروں میں جھولتے ہوئے سُر جیسے الف لیلہ کی کوئی جادوئی ہوا رقص میں لے بھر رہی ہو۔ ہر رقاصہ نے مختصر مگر انتہائی خوب صورت حرکات میں آگے پیچھے جھومنا شروع کیا۔ پازیب کی جھنکار، لباس کی لہراتی روانی اور ہاتھوں کی حیرت انگیز لچک کبھی دونوں ہاتھ ملتے، کبھی آنکھوں کے اوپر، کبھی ہلکے سے بلند۔ سر ایک جانب سے دوسری جانب نرمی سے ہلتا اور تمام حرکات موسیقی کے ساتھ ہم آہنگ۔ یہ رقص دس

منٹ تک جاری رہا اور ہر رقاصہ نے اپنی باری پر ایک "سولو" پیش کیا — نصف دائرے کی مانند بازوؤں کی حرکات اور موسیقی کے زیرِ اثر اپنے فن کا مظاہرہ۔ پھر ہر لڑکی نے ایک مصرع گایا جو کبھی کبھار کسی سازندے کی سولو دھن سے مترشح ہوتا۔ یوں یہ محفل کبھی آدھے گھنٹے، کبھی دو گھنٹے تک چلتی جیسا کہ نواب کی مرضی ہوتی۔ پھر ایک یا دو لڑکیوں کو دوبارہ بلایا جاتا اور وہ بھی وہی کچھ دُہراتیں، ہر ایک کے ساتھ اس کا مخصوص سازندہ۔ جو لوگ ناواقف ہوں ان کے لیے یہ آوازیں رفتہ رفتہ یکسانیت کا شکار ہو جاتیں اور یہی یکسانیت سب کو نیند کی آغوش میں لے جاتی حتیٰ کہ محافظوں سمیت تقریباً تمام حاضرین اونگھنے لگتے حالانکہ یہ گیت کلاسیکی شاعری پر مبنی ہوتے تھے جو سنسکرت، اردو اور ہندی میں پیش کیے جاتے اور مقامی لہجے میں عام گانے والے گاتے۔ جیسا کہ یورپی محفلوں میں ہوتا ہے، بہترین حصہ آخر میں پیش کیا جاتا، یہی وجہ تھی کہ یہ موسیقی سحر کے وقت تک چلتی۔

مہمان، شاید تھوڑی نیند لے کر، آخر کار اس محفل کی قدر کرنے لگتے مگر نواب، سچ کہوں تو شاذ و نادر ہی سوتا۔ وہ مجھے مسلسل سگار دیتا رہا جس کی وجہ سے میں جاگتا رہا اگر چہ رات بھر کی تھوڑی تھوڑی گفتگو سے سارا ذخیرہ الفاظ ختم ہو چکا تھا۔ ایسی محفل سے جلدی اٹھنا آداب کے منافی سمجھا جاتا۔ وہ یکسانیت جو یورپی کے لیے بیزاری تھی، ایک مشرقی شخص کے لیے دل لگی تھی۔ آخر کار ہر شے کو ختم یا تبدیل ہونا ہی ہوتا ہے۔ جب صبح کی پہلی روشنی گنبدوں کو چاندی میں لپیٹنے لگی اور سائے نرم ہونے لگے تو نواب نے ہلکی سی جنبش دی۔ موسیقی رک گئی، لڑکیاں آہستہ آہستہ کھڑی ہوئیں، سلام کیا اور خاموشی سے ایک قطار میں نکل گئیں۔ جب آخری چاندی کی جھنکار بھی مدھم ہوئی، ہم مکمل سکوت میں محل واپس آ گئے جہاں محافظ دستے نے الوداع کہا۔ نواب میری طرف مڑا اور بولا: ''تم اب شاید اپنے عمدہ سگاروں سے اکتا چکے ہو۔ میں نے ہر قسم کا سگار تمہیں دے دیا ہے، اب بہتر ہوگا کہ محل کے اندر چل کر آرام کرو۔" چناں چہ میں اندر گیا۔ وہاں، ایک بڑے پنکھے کے نیچے دو گائیں بندھی تھیں۔ نواب نے ایک لکڑی کے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا": یہ تمھارے لیے ہے۔" یہ عجیب سی مہمان نوازی تھی جس نے مجھے تقریباً جاگتے ہوئے سلا دیا۔ میں تھکا ہوا تو تھا اور اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے سونے کی تیاری کی۔ ہوا بند ہو چکی تھی اور اندھیری رات ابھی مکمل اندھیرے میں

نہیں ڈوبی تھی، ایک عجیب سی گھٹن کا عالم تھا۔

میں باغ کی اونچی دیواروں کے پارستاروں کو دیکھتے سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا، اتنے میں ایک بڑی چاندی کا حقّہ میرے قریب رکھا گیا۔ اس کی لمبی نلکی نواب کو دی گئی اور اس نے ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ کش لینا شروع کیا۔ دو بوڑھے مرد نواب کے پاؤں کی طرف آ بیٹھے۔ ایک نے کوئی داستان سنانی شروع کی۔ نواب نے درمیان میں روکا اور پھر جنگلی سور کے شکار کی باتیں شروع کر دیں۔ میں زیادہ کچھ نہ بولا اور نہ ہی اس دھیمی سی شاعری جیسی کہانی کو سمجھ پایا۔ وہ "قصہ گو" تھے، ان کا کام تھا رات بھر کہانیاں سناتے رہنا جب تک نواب سو نہ جائے۔ ایک اور خادم نواب کے جسم کی مالش میں مصروف تھا اور نواب اپنے حقّے کے کش میں مصروف۔ اسی ہلچل میں مجھے نیند آ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ میں نے نہایت پرسکون نیند لی تھی۔ میں نے آہستگی سے دیکھا کہ نواب جاگ رہا ہے یا نہیں لیکن حیرت سے دیکھا کہ وہ بستر خالی تھا۔ قصہ گو، محافظ، حقہ سب غائب تھے۔ میں اکیلا چھت پر رہ گیا تھا۔ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ نواب کہاں گئے۔ لگا جیسے سب کچھ خواب تھا۔ میں نیچے نوکروں کے راستے سے اترا اور کسی سے کچھ نہ پوچھا۔ باغ میں صرف سوتے ہوئے لوگ تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ پھر شکار پر گئے ہیں اور میں نے خود سے وعدہ کیا کہ آج کی طرح کے کسی اور مہم سے دور رہوں گا۔ دوپہر بارہ بجے کے قریب نواب واپس آئے۔ دوپہر کو شکار کی ایک نمائش ہوئی اور شام کو انھوں نے مجھے رسمی طور پر الوداعی ملاقات دی۔ ایسے بے چین مسافروں کا ایک خیمہ ہمیشہ قائم رہتا ہے جو شاہانہ سکوت کو سہہ نہیں پاتے لیکن نواب نے میری قدر اس طرح کی کہ میرا نام اعزاز کے فہرست میں شامل کر دیا۔ جب درباری شور تھم جائے اور نئے مہمان آنے لگیں تب کہا جاتا ہے ":وہ سو رہے ہیں لیکن محبت کے ساتھ۔ "نواب کا مزاج اور مہمان نوازی خالص تھی۔ وہ مطالعے کے زیادہ شوقین نہ تھے لیکن ان کے قصہ گو بدوی کردار ایسے تھے کہ ان کی باتیں سن کر حق میں کہا جا سکتا تھا کہ ''... یہ کہانی سننے کے قابل تھی۔

☆☆☆☆☆

حکایات بہاول پور

(6)

یہ ایک پرانی کہانی ہے جو ریاست بہاول پور کے ایک ریونیو افسر نے سنائی تھی، جو کچھ عرصہ مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ انھوں نے کہا:

''ایک بار میں ایک مقدمہ سن رہا تھا، جس میں حملے کا الزام تھا۔ سرکاری گواہ پر پبلک پراسیکیوٹر جرح کر رہا تھا۔ اس دوران، فریقین کے درمیان عدالت کے باہر صلح ہوگئی مگر گواہ کو روکنے کا وقت نہ رہا۔ بہرحال، ایک ثالث عدالت کے دروازے تک آیا اور گواہ کو ایک خاص اشارہ کیا جسے گواہ بخوبی سمجھ گیا۔ میں بے تابی سے دیکھنے لگا کہ اب کیا ہوگا کیوں کہ گواہ پہلے ہی ملزم کے خلاف کافی بیان دے چکا تھا اور اب اس کے لیے بات واپس لینا مشکل تھا لیکن دیہاتی گواہ بہت چالاک نکلا جس کی میں نے چالاکی کو کم سمجھا تھا۔ جب پبلک پراسیکیوٹر نے ایک اور سوال کیا تو گواہ نے مبہم سی بڑبڑاہٹ شروع کردی۔ وکیل نے سختی سے کہا کہ صاف صاف بیان دو۔ گواہ پھر ہچکچاتے ہوئے بے ربط الفاظ بولنے لگا، کبھی ایک آدھ لفظ، پھر رکا، پھر بے جوڑ باتیں کہہ کر چپ ہوگیا۔ پراسیکیوٹر نے جلد بازی میں مجھ سے درخواست کی کہ گواہ کو صاف بیان دینے کا حکم دوں۔ جب میں نے ایسا کیا تو گواہ نے ملتجیانہ لہجے میں کہا: 'جناب! پولیس انسپکٹر کو بلائیں تا کہ وہ مجھے پھر سے یاد دلائے کہ کیا کہنا ہے۔ میں کہانی کا بقیہ حصہ بھول گیا ہوں۔ اب میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا سوائے اس مقدمے کو من گھڑت قرار دے کر خارج کر دینے اور پولیس پر اپنے فیصلے میں سخت تبصرہ کرنے کے۔''

ڈائری بہاول خاں پنجم 1901

حصہ اول ودوم مکمل

ڈائری یا روزنامچے کی اہمیت سے ہر ذی شعور آگاہ ہے۔ اگر کوئی عام فرد ڈائری تحریر کرے تو وہ اس فرد کی ذاتی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے اور اگر کسی ملک یا ریاست کا سربراہ یا رہنما تحریر کرے تو اس میں ایک عہد زندہ ہو جاتا ہے۔ ایسی ڈائری تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کو جوڑنے میں معاون ہوتی ہے۔ جس ڈائری کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں ضلع رحیم یار خان کے شمال مغربی اور جنوب مغربی اور ریاست کے مشرقی علاقے کے 1901ء کے عہد کا نظام آبپاشی اور مالگزاری زندہ ہو گیا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب رحیم یار خان ریلوے اسٹیشن پر مشتمل ایک معمولی سا شہر تھا اور صادق آباد اور لیاقت پور ابھی نقشے پر نہیں آئے تھے جب کہ خانپور کو نظامت (ضلع) کا درجہ حاصل تھا۔ علاوہ ازیں مشرقی جانب منچن آباد (نظامت) کا علاقہ انتظامی طور پر نمایاں تھا۔ بہاول نگر ابھی روجھان والی تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی دورے کے دوران 8 اپریل کو اس قصبے کے رہائشیوں نے اس کا نام بہاول نگر رکھنے کی تجویز پیش کی تھی جسے نواب نے قبول کر کے دورے کے منٹس کا حصہ بنایا تھا۔ اس ڈائری کا تعلق ریاست بہاول پور کے ایک فرمانروا نواب بہاول خان پنجم سے ہے جس کا اصل نام مبارک خاں تھا اور جو 1899ء میں اپنے والد صادق محمد خاں چہارم کی وفات کے بعد صرف سولہ سال کی عمر میں ریاست کی امارت پر فائز ہوئے۔ اس کے بارے میں ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ان کی والدہ کا تعلق خانپور سے تھا اور اس طرح خانپور ان کا ننھیال تھا۔ اپنے والد کے انتقال کے وقت وہ ایچی سن کالج (تب چیفس کالج) کے باقاعدہ طالب علم تھے اور صرف دستار بندی کے لیے بہاول پور آئے اور پھر واپس جا کر تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ وہ کالج کی تعطیلات کے دوران ریاست کے دورے کرتے اور اپنے دوروں کے اہم نکات اور فیصلوں کو ڈائری کی شکل میں تحریر کرتے۔ ادارہ تحقیق و تذکرہ تاریخ

پاکستان رحیم یار خان کی لائبریری میں ایسی ہی ایک ڈائری موجود ہے۔ جس میں ان کے دو دوروں کی تفصیل درج ہے۔ یہ ڈائری دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ان کے ریاست کے مشرقی یعنی (ابھا) کے علاقوں کے پہلے دورے پر مبنی ہے جب وہ ایچی سن کالج سے ایسٹر کی تعطیلات کے دوران بہاول پور آئے۔ اس ڈائری کے پہلے حصے کا تعلق ان کے پہلے دورے سے ہے جو یکم تا 13 اپریل تک جاری رہا۔ دوسری بار انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے اینٹرنینس امتحان میں کامیابی کے بعد ریاست کے جنوب، مغربی علاقے کا دورہ کیا اور یہ دورہ 20 مئی سے 30 مئی 1901ء تک جاری رہا۔ وہ ان دس دنوں میں خانپور، ججہ، غوث پور، چاچڑاں شریف، ٹھل حسن، آباد پور، راجن پور، شرینہ، پکا بھٹہ اور بھونگ اور مشرقی علاقے کی کارداریوں اور بیش کاریوں میں نہروں، ان کے ہیڈز اور ریگولیٹرز، دریائی شاخوں، موگوں اور کنوؤں کے معائنے کے ساتھ ساتھ ریونیو اور مالگزاری کے ریکارڈ کی پڑتال اور زمین داروں سے ملاقاتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ڈائری دراصل ان کے اس دورے کے اہم نکات (Minutes) پر مشتمل ہے اور ہر روز کی ڈائری کے بعد لکھا ہوا ہے ''اس ڈائری کو اصل صورت میں ریاست کے سپرنٹنڈنٹ کی خدمت میں بھیجا جاتا ہے۔'' یہ چوں کہ خود لاہور میں زیر تعلیم تھے لہٰذا ریاستی امور کا نگران کرنل گرے تھا جو ''سپرنٹنڈنٹ سٹیٹ'' کہلاتا تھا۔ اس کی طرف ڈائری بھیجنے کا مقصد اس میں مذکور اہم نکات اور فیصلوں سے اس کو آگاہ کرنا اور ان پر عمل درآمد کا اہتمام کرنا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ڈائری سپرنٹنڈنٹ آفس کے ہیڈ کلرک ایم۔ مہر دین نے انگریزی میں ترجمہ کی یا شاید لکھی۔

آئندہ صفحات میں اس ڈائری کا مکمل ترجمہ پیش کرنے کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت کے ریاستی سربراہ کے سرکاری دوروں کی کیا ترجیحات ہوتی تھیں اور پھر اس کے مطالعے سے اس وقت کے نظام آبپاشی و آبادکاری اور زمینی بندوبست پر بھی نمایاں روشنی پڑتی ہے۔

نوابِ بہاول خاں پنجم کے پہلے دورے کی ڈائری

(4 تا 13 اپریل 1901)

4 اپریل 1901ء

ہم گذشتہ رات 12 بجے حمایتی سے روانہ ہوئے اور 4 اپریل کو شہر فرید پہنچے۔ میرے اس روز کے معائنے کے نتائج درج ذیل ہیں:

I۔ چشتیاں سے مبارک پور تک میں نے فورڈ واہ کا معائنہ کیا۔ صفائی نشاناتِ پیمائش (benchmarks) کے مطابق درست ہے لیکن خامی یہ ہے کہ تلچھٹ یا گاد (silt) کو فالتو مٹی کے پشتے (Spoil bank) پر نہیں ڈالا گیا بلکہ یہ کنارے (berm) پر ہے اور نتیجتاً وہ مٹی ہوا اور مویشیوں کے چلنے سے واپس نہر میں چلی جاتی ہے۔ آئندہ تلچھٹ کو صرف پشتے پر ڈالا جائے اور دونوں کناروں پر کم از کم 4 فٹ کنارہ چھوڑا جائے۔ برم مٹی کو نہر میں گرنے سے بچاتا ہے اور اس طرح بہاؤ میں اضافہ اور صفائی میں کمی واقع ہوتی ہے۔

II۔ میں نے نہر کے دائیں کنارے پر نمبر والے ستون (pillars number) اور ان کے عین سامنے نہر کی تہہ میں معیاری پیمانے دیکھے۔ کچھ نشانات کے سرے گھس چکے ہیں اور اس بنا پر یہ درست گہرائی ظاہر نہیں کرتے۔ معیاری پیمانوں کا مقصد صفائی کی مقدار کو ہر سال سروے کروائے بغیر ماپنا ہوتا ہے۔ پرانے اور خراب benchmarks پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ نہری عملہ کو ہدایت دی جائے کہ وہ نئے معیاری پیمانے لگوائیں تا کہ صفائی کی جانچ درست ہو سکے۔

III۔ اگرچہ نہر کے ساتھ کہیں کہیں کیکر اور بیر کے درخت نظر آئے لیکن عمومی طور پر

درختوں کی کمی ہے۔ میری رائے میں ایک مستقل اصول اپنایا جائے کہ جہاں درخت نہ ہوں وہاں پانی کی نگرانی پر مامور لوگ شیشم، شرینہ اور ان جیسے دوسرے درخت لگائیں۔ یہ درخت نہروں کے زیور کا درجہ رکھتے ہیں، مسافروں کو سایہ فراہم کریں گے، پشتوں کی مرمت کے لیے لکڑی مہیا کریں گے اور ریاست کی آمدنی کا ذریعہ بھی بنیں گے۔ ایسے منصوبے اختیار کرنا انتہائی موزوں ہے جو لاگت کچھ نہ رکھتے ہوں اور فائدہ بہت دیں۔

IV۔ اس نہری حصے میں دونوں کناروں پر 3 یا 4 پکی مٹی کے موگھے یا آؤٹ لیٹس (masonry outlets) دیکھے گئے جو اچھی حالت میں تھے مگر کچھ کسیوں کے موگھے موجود نہ تھے۔ دریافت کرنے پر کاردار نے بتایا کہ وہ کسیاں ترک کر دی گئی ہیں اس لیے موگوں کی ضرورت نہیں تاہم اس بیان کی سچائی کی تصدیق ممکن نہیں، یہ بہانہ ہوسکتا ہے کہ پکے موگے تعمیر ہی نہیں کیے گئے۔ بہرحال، کاردار کو ہدایت کی جائے کہ جتنی بھی کسیاں فعال ہیں ان پر موگے تیار کروائے جائیں۔ موگوں کی موجودگی پانی کو نچلے علاقوں تک پہنچانے میں مدد دیتی ہے اور پانی کو کسیوں کے مالکان کے کنٹرول میں رکھتی ہے۔

V۔ میں نے راجواہ کا معائنہ کیا جو دولتواہ کی ایک شاخ ہے۔ یہ اچھی حالت میں نہیں ہے اور اس سے منسلک کاشت کے قابل زمین کا ایک بڑا حصہ بیکار پڑا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس شاخ کا ہیڈ مناسب جگہ پر نہیں لیا گیا اسی لیے یہ مطلوبہ پانی فراہم نہیں کر پا رہی۔ تجویز ہے کہ ہیڈ کو بدل کر دولتواہ سے مہتہ جھیڈو میں، محمد واہ ہیڈ سے اوپر لیا جائے۔ اس طرح یہ شاخ جھیڈو، مہتاب پور، ٹھانگل، منگی، شہر فرید، کوٹ لال، مبارک پور، صادق پور، راٹھی، قصور داراں اور عبدالخالق کے دیہات کو سیراب کرنے کے قابل ہو جائے گی۔

VI۔ ہم نے محمد واہ (جو پہلے دولتواہ کہلاتی تھی) کے 5 یا 6 میل کا دورہ کیا۔ یہ نہر باقاعدہ نقشے کے مطابق تیار کی گئی ہے، اس کی صفائی بھی نقشے کے مطابق ہوئی ہے اور تلچھٹ کو ڈیزائن شدہ برم سے کچھ فاصلے پر ڈالا گیا ہے۔ ہر نمبر پر کنارے پر اینٹوں کے نمبر شدہ ستون لگے ہوئے ہیں اور نہر کے فرش میں معیاری پیمانے موجود ہیں۔ اس نہر سے نکلنے والے نالوں کے تمام ہیڈ پکے ہیں۔

VII۔دولتواہ کی جنوبی شاخ کا معائنہ کیا گیا،صفائی نہایت عمدگی سے کی گئی ہے، تلچھٹ برم سے باہر ڈالی گئی ہے،نہر کے سرے پر ایک ریگولیٹر موجود ہے،اس کی سوئیاں درست جگہ پر رکھی گئی ہیں اوراس شاخ میں کوئی نقص نظر نہیں آتا۔

VIII۔شہر فرید گاؤں میں محمد لکھویرا کے کنویں کے لیے 300روپے بطور تکاوی دیے گئے تھے۔کنواں تقریباً تیار ہے۔باقی معمولی کام مالک خود کر رہا ہے۔یہ کنواں جلد ہی قابل استعمال ہو جائے گا۔اسی گاؤں میں دو دیگر کنوؤں کی مرمت کے لیے بھی تقاوی دیا گیا جن کے لیے اینٹیں مقام پر پہنچائی جا رہی ہیں۔ کاردار کو زبانی طور پر ہدایت دی گئی ہے کہ ان کی تکمیل جلد کرائے۔

IX۔ آج کے معائنے میں نظر آنے والی ربیع کی فصلیں کامیاب اور بہترین معلوم ہوئیں۔

X۔شام 4 بجے تمام اہم زمیندار،مہاجن اور کاشت کار مجھ سے ملے۔میں نے ان کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ کاشت کاری کو بہتر بنائیں، زیادہ پیداوار حاصل کریں اور نئے کنویں تیار کریں۔

یہ ڈائری اصل شکل میں سپرینٹڈنٹ کو معلومات اور ضروری احکامات کے اجرا کے لیے بھیجی جاتی ہے۔

5اپریل 1901ء

آج صبح ہم شہر فرید سے روانہ ہوئے، دوپہر کا قیام مہتہ جھیڈو میں کیا اور رات کا پڑاؤ جودیکا میں ڈالا۔ان دونوں مرحلوں میں جو کچھ دیکھا وہ درج ذیل سطور میں بیان کیا گیا ہے:

I۔میں نے راجواہ کا معائنہ کیا جس کا ذکر کل کی ڈائری کے پیرا5 میں کیا گیا تھا۔اس شاخ کا پرانا ہیڈ میل 30 کے 3 نمبر پر دولتواہ پر تھا۔دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اس شاخ کی کھدائی کے بعد سے یہ کبھی بھی مؤثر طریقے سے کام نہیں کر سکی اور اس کا پانی کبھی بھی ٹیل تک نہیں پہنچا۔معلوم ہوا کہ راجواہ کے ہیڈ پر دولتواہ کی ڈھلوان بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے سارا پانی بہہ جاتا ہے۔ راجواہ کی اپنی ڈھلوان، زمین کے اونچا ہونے کے باعث، بڑی نہر سے کم ہے اس لیے یہ شاخ مناسب مقدار میں پانی نہیں کھینچ سکتی۔اس خرابی کو دور کرنے کے لیے موزوں طریقہ یہ ہے کہ اس کا ہیڈ میل 28 پر منتقل کیا جائے جو پہلے سے تجویز کردہ مقام سے تھوڑا سا اوپر ہے۔اگر اس منصوبہ پر عمل درآمد کیا جائے تو راجواہ کی شاخ تقریباً10 یا12 میل لمبی ہو کر دولتواہ کا آخری حصہ بن جائے گی اور

اس کے بہاؤ سے موجودہ دولتواہ کے نچلے حصے کی تلچھٹ نکل جائے گی اوراس کی بلند سطح کی بدولت تمام منسلکہ زمین سیراب ہوگی۔ میری رائے میں مالیہ اور تعمیرات عامہ کے محکموں کو اس منصوبے پر عملدرآمد کی ہدایت کی جانی چاہئے۔

II۔ آج دولتواہ کی ہریواہ شاخ کا معائنہ کیا گیا۔اس کی صفائی مکمل ہو چکی ہے۔ کناروں پر نمبر والے ستون اور نہر کی تہہ میں نشانات موجود ہیں۔ تلچھٹ پشتے کے پیچھے ڈالی گئی ہے۔

III۔ میں نے دولتواہ کی نیک بختواہ شاخ کا معائنہ کیا۔ صفائی نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔ پانی کی کمی کے باعث اس کی ٹیل آب نوشوں کے ذریعے چوڑی کر دی گئی ہے۔ مہتہ جھیڈو گاؤں اسکے اضافی پانی سے فائدہ اٹھائے گا۔

IV۔ دولتواہ کی شاخوں میں سے ہریواہ نمبر 2 کا بھی معائنہ کیا گیا۔اس کی صفائی اطمینان بخش نہیں ہے۔ کاردار کو زبانی طور پر ہدایت دی گئی ہے کہ وہ جلد از جلد کام مکمل کرے۔ میری رائے ہے کہ اس خرابی کی وجہ آب نوشوں کی غفلت اور مالیہ افسران کی عدم نگرانی ہے۔ نہر سے منسلک زمینیں ساری کی ساری ویران پڑی ہیں۔

V۔ ان دیہات: مہاندان، تلوکہ، فتانی، محمد شاہ، شاہدم شاہ اور مہتہ جھیڈو کو جن کے لیے تقاوی کے تحت 20 کنویں منظور کیے گئے تھے، صرف 3 کنویں کام کر رہے ہیں، 8 زیر تعمیر ہیں اور باقی تقاوی لینے والوں نے کام کا آغاز ہی نہیں کیا۔ کاردار نے تین افراد کو میرے سامنے پیش کیا جنھوں نے وضاحت کی کہ وہ نہروں کی صفائی میں اتنے مصروف تھے کہ کنوؤں کا آغاز نہ کر سکے اس وجہ سے خزانے سے رقم بھی نہیں لی گئی تھی۔ اب صفائی مکمل ہو چکی ہے اور وہ جلد کنویں شروع کریں گے۔ کاردار کو ہدایت دی گئی ہے کہ کام کی پیش رفت تیز کرے۔

VI۔ میں نے محمد واہ کے نئے ہیڈ (تقریباً 6 میل لمبے حصے) کا معائنہ کیا۔ کھدائی درست طریقے سے ہوئی ہے اور دونوں کناروں پر برم باقاعدگی سے بنائے گئے ہیں۔ نہر کے مغربی جانب دو گڑھوں میں بند تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ شمالی سرے پر بند کو اونچی زمین تک بڑھا دیا جائے تاکہ سیلابی پانی اس کے اوپر سے نہ جائے اور کام کو نقصان نہ پہنچائے۔ کاردار کو زبانی ہدایت دی گئی

ہے۔صفائی جاری ہے مگر ہیڈ پر اب بھی ایک فٹ تلچھٹ باقی ہے جسے ہر حال میں صاف کرنا ضروری ہے بصورت دیگر جب دریا کا پانی کم ہوگا تو ہیڈ پانی لینا بند کر دے گا۔اس ہیڈ کے نیچے پرانی دولتو اہ نہر میں دو میل تک ڈیڑھ فٹ تلچھٹ ہے لہٰذا صفائی کو تعمیرات عامہ کے نقشے کے مطابق، کمیٹی کی تکمیل رپورٹ کی روشنی میں مکمل کر کے نہر کو کھولا جائے۔فی الوقت ہیڈ اچھی حالت میں ہے کیوں کہ دریا کا بہاؤ اس کی طرف ہے۔

VII۔میں نے شاہدم شاہ اور بلاول کے دریائی کنارے والے دیہات میں طغیانی سے آنے والی مٹی (Alluvion) اور (diluvion) زمین بہہ جانے کا کام چیک کیا۔جریب بندی کا کام درست پایا گیا لیکن پٹواری نے قطعہ نمبر 1 اور 2 میں " قابلِ کاشت "(cultivable) کا لفظ درج نہیں کیا جس کی وجہ سے ریاست کو مالی نقصان پہنچ سکتا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ گرداور نے آج تک پٹواری کا کام چیک نہیں کیا۔یہ ایک ایسی غفلت ہے جسے فوراً درست کیا جانا چاہیے۔اس شخص کی تمام alluvion اور diluvion کی گرداوری کو گرداور اور کاردار دونوں کو دوبارہ چیک کرنا چاہیے۔یہ کوتاہی بند ہونی چاہیے۔

VIII۔آج سہ پہر 3 بجے شہر فرید اور خیر پور کی پیشکاریوں کے زمینداروں نے مجھ سے ملاقات کی۔ میں نے انھیں ایک عوامی اجلاس میں نئے کنویں کھودنے اور زیادہ پیداوار، جیسے کہ باغات، گنا، نیل، کپاس وغیرہ کی کاشت کی ترغیب دی۔ میں نے ان لوگوں کو جنھوں نے بڑے پیمانے پر گنا کاشت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، ریاستی شکر ملیں فراہم کرنے کی پیشکش کی۔(شاید یہاں بیلنے کے سسٹم کا ذکر ہے۔مترجم)

IX۔خیر پور کارداری تین پیشکاریوں پر مشتمل ہے، خیر پور، قائم پور اور شہر فرید۔میں نے ان میں سے صرف آخری پیشکاری کا 4 اور 5 تاریخ کو معائنہ کیا۔ان پیشکاریوں کی تفصیل کل کی ڈائری اور اس ڈائری کے ابتدائی پیراگراف میں بیان ہو چکی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ سپرنٹنڈنٹ کی جانب سے دی گئی فہرست میں جن ضوابط کا ذکر ہے وہ باقی دو پیشکاریوں سے متعلق ہیں جن کا میں معائنہ نہ کر سکا۔تاہم میں درج ذیل نکات میں مکمل کارداری کا خلاصہ اس کے ریکارڈ کی روشنی میں

پیش کرتا ہوں:

I'۔حسابی گوشوارا (Balance Sheet) کے مطابق محصولات کی بقایاجات کی رقم 3,04,921-8-10 روپے (تین لاکھ، چار ہزار، نوسو اکیس روپے، آٹھ آنے اور دس پیسے صرف) ہے، تفصیل درج ذیل ہے:

مد	رقم
سابقہ برسوں کی بقایا رقم	Rs.69,182-10-7
موجودہ مالی سال (اپریل 1900 تا مارچ 1901)	Rs.2,35,738-14-3
کل رقم وصول شدہ	Rs.2,60,942-15-10
باقی رقم واجب الادا	Rs.43,978-9-0
جس میں شہر فرید سے	Rs.38,302-6-6
باقی دو پیشکاریوں سے	Rs.5,676-8-7

فہرست کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ زیادہ تر بقایاجات کی وجہ مالیہ افسران کی سستی اور نوٹس (Dastak) جیسے اقدامات نہ اپنانا ہے۔ رواں سال ربیع کی فصلیں بہترین ہیں لہٰذا مشیر مال کو بقایا جات کی وصولی کی طرف توجہ دلائی جائے اور کارداروں کو بھی تاکید کی جائے کہ وہ اسی ربیع کے دوران وصولی مکمل کریں۔

II۔تقاوی کے گوشوارے کے مطابق 52,965 روپے کی رقم 108 کنوؤں کی تعمیر اور 37 کی مرمت کے لیے منظور کی گئی۔ کل 145 میں سے 72 کنویں تیار ہیں اور 45 زیر تعمیر ہیں اور 28 پر ابھی تک کوئی کام شروع نہیں کیا گیا۔ یہ مکمل ایک سال کا کام ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ مالیہ افسران کی نگرانی غیر تسلی بخش رہی۔ آئندہ کے لیے اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ جوں ہی رقم دی جائے، کام کا آغاز فوراً کر دیا جائے۔

III۔ریاستی ریگولیٹرز اور زمینداروں کے پکے موگوں کی فہرست کے مطابق:

خیر پور کارداری میں 77 میں سے 45 موگے مکمل ہو چکے ہیں اور 32 باقی ہیں۔ شہر فرید میں 149 میں

سے 29 تیار ہیں جب کہ 50 کو ابھی تک چُھوا بھی نہیں گیا۔ کاردار کو ہدایت کی جائے کہ باقی outlets پر بھی کام تیز کرے تا کہ اخراجات کی مساوی تقسیم ہو۔

IV۔ شہر فرید میں کوئی ریگولیٹر منظور نہیں ہوا۔ خانپور اور خیر پور میں 6-690-7,690 روپے ریگولیٹرز کے لیے منظور کیے گئے مگر میں ان علاقوں کا دورہ نہ کر سکا۔

V۔ میں نے alluvion اور diluvion کا تمام ریکارڈ منگوا کر معائنہ کیا۔ اس کارداری میں 46 دریائی دیہات ہیں۔ ان کی پیمائش ہر سال کی جاتی ہے اور اس کی بنیاد پر محصول عائد یا معاف کیا جاتا ہے۔ اس سال 30 دیہات کی پیمائش ہو چکی ہے جن میں سے کاردار نے صرف 5 کی جانچ کی ہے، 25 کی جانچ باقی ہے اور 16 کی پیمائش بھی نہیں ہوئی۔ پیمائش کا مقصد یہ ہے کہ جو زمین دریا بہا لے جائے اس پر محصول معاف کیا جائے اور جو زمین قابلِ کاشت بن جائے اس پر محصول عائد کیا جائے۔ عام طور پر نئی قابل کاشت بننے والی زمینوں پر زمیندار پہلے کچھ عرصہ لوسن اگاتے ہیں جو مارچ میں جانوروں کے چارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اگر اپریل تک بھی پیمائش نہ ہو تو فصل کاٹنے کے بعد اصل قابلِ کاشت رقبہ کیسے معلوم ہوگا؟ یہ غفلت سخت قابلِ اعتراض ہے۔ میری رائے ہے کہ چوں کہ ریاست کی آمدنی کا بڑا حصہ ان پیمائشوں پر مبنی ہے لہٰذا یہ عمل ہر سال فروری کے اختتام تک مکمل ہو جانا چاہیے۔ اس کاردار نے 5 اپریل تک صرف 5 دیہات چیک کیے لہٰذا محصول کی معافی محض پٹواری اور گرداور کی رپورٹ پر کی جا رہی ہے جو نا قابلِ اعتماد ہے۔ آئندہ کے لیے حکم جاری کیا جائے کہ تمام کاردار فروری میں، فصل کھڑی ہونے کے دوران، خود تمام قطعہ جات کا معائنہ کریں۔ اسی لیے حال ہی میں جو نائب مشیر مال مقرر ہوا ہے اُسے خود یہ پیمائش چیک کرنی چاہیے تا کہ کسی قسم کی غلطی نہ رہے۔ برطانوی علاقوں میں بھی یہی اصول ہے کہ جب تک اسسٹنٹ کمشنر چیک نہ کرے، پیمائش تسلیم نہیں کی جاتی۔

VI۔ مالی سال 1900–1901 میں عوامی عمارات کے لیے 11–7–2,297 روپے کی منظوری دی گئی، جس میں سے:

- 7–9–1,267 روپے کے کام مکمل ہو چکے ہیں اور حسابات بھیجے جا چکے ہیں

• 10-4-874روپے کے کام زیرِتعمیر ہیں

• 6-9-155روپے کے کاموں پر ابھی تک آغاز نہیں ہوا

اگرچہ ان کے لیے منظوری کافی عرصہ قبل دی جاچکی تھی۔مکمل تفصیل درج ذیل ہے:

نمبر شمار	پیشکاری	عمارت	منظوری کی تاریخ	رقم روپے میں
1	خیر پور	شیڈ کی مرمت	3-6-1900	47-10-9
2	شہر فرید	بنگلہ کی مرمت	11.10.1900	48-14-62
3	شہر فرید	مہاراں اسکول کی مرمت	18.10.1900	15-8-9
4	قائم پور	صادقواہ نہری پل کی مرمت	14.12.1900	18-12-0
5	قائم پور	قائمپور ڈاکخانہ کی مرمت	11-2-1900	7-6-10
6	قائم پور	قائمواہ درے کی مرمت	18-2-1901	7-3-10

میری تجویز ہے کہ اگر کوئی اور امر مانع نا ہوتو 200 روپے تک کے کاموں کے حسابات 3 ماہ کے اندر اور اس سے زائد رقم والے کاموں کے 6 ماہ میں جمع کرائے جائیں۔ میں نے آج خیر پور کارداری کے معائنے کو مکمل کرلیا۔

یہ ڈائری اصل صورت میں ناظمِ اعلیٰ / سپرینٹنڈنٹ کو اطلاع کے لیے بھیجی جاتی ہے۔

6اپریل 1901ء

جودھیکا سے روانگی کے بعد ہم نے آج صادق پور میں قیام کیا۔صبح اور شام کے دوروں میں جن کاموں کا معائنہ کیا گیا وہ درج ذیل ہیں:

I۔ میں نے جودھیکا، بیگکا، ماموںکا، مخیم شاہ، بالوکا، کالیا شاہ اور قائمکا کے دیہات کے تقاوی کنوؤں کا معائنہ کیا۔ان میں سے 3 کنویں کام کر رہے ہیں جب کہ باقی تمام زیرِتعمیر ہیں۔

II۔آج شمالی راجواہ کی ٹیل کا معائنہ کیا گیا۔اس کی صفائی نقشے کے مطابق مکمل ہے اور زیادہ تر جگہوں پر پکے موگے بھی تیار ہیں۔ جو چند باقی ہیں ان کے لیے کاردار اور پیشکار کو زبانی ہدایات دی جاچکی ہیں۔

III۔ میں نے نیک بختواہ کا ہیڈ دیکھا جو دولتواہ سے نکالا گیا ہے۔ پرانا ہیڈ موجودہ ہیڈ سے اوپر واقع تھا لیکن وہ تلچھٹ بھر جانے کے باعث ناکارہ ہو چکا تھا۔ اس صورتِ حال میں نیا ہیڈ لینا قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔

IV۔ میں نے دولتواہ سے فورڈواہ تک نئی نہر کی لائن دیکھی۔ اس میں پشتے (embankments) کھدائی سے زیادہ بنائے گئے ہیں جو ظاہر کرتا ہے کہ اس راستے کی زمین بہت نشیبی ہے۔ یہ پشتے جنھیں پانی روکنے کے لیے تعمیر کیا جا رہا ہے بالکل غیر معیاری نظر آتے ہیں۔ اندرونی ڈھلوان 1:1 سے بھی کم ہے جس کی وجہ سے پانی کا بہاؤ اور ہوا ان بندوں کو یقیناً نقصان پہنچائے گی۔ اگرچہ پہلے سے بنائی گئی ساخت میں دخل اندازی مناسب معلوم نہیں ہوتی لیکن باقی کام کو ہر حال میں انجینئرنگ کے اصولوں کے مطابق مکمل کرنا ناگزیر ہے اور چوں کہ نہروں کو کھولنے کا وقت قریب آ رہا ہے، اس پر فوری عملدرآمد ضروری ہے۔

V۔ چک سرکاری جسے صادق پور کہا جاتا ہے، کا ایک بڑا حصہ فورڈواہ آبپاشی کے مغربی جانب بننے والی نئی لائن کی وجہ سے کٹ گیا ہے۔ فورڈواہ کا ہیڈ دولتواہ سے اونچا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ علاقہ دولتواہ سے اتنے ہی مؤثر طریقے سے سیراب ہو سکتا ہے جتنا فورڈواہ سے۔ اگر نہیں تو فوراً کوئی تدبیر کی جانی چاہیے تاکہ چک کی آمدنی کو نقصان نہ پہنچے۔ بظاہر یہ معاملہ پہلے کبھی زیرِ غور نہیں آیا۔

VI۔ چک سرکاری کے معائنے پر معلوم ہوا کہ یہ چک 10,400 بیگھے رقبے پر مشتمل ہے جن میں سے 7,500 بیگھے زیرِ کاشت اور 2,900 بیگھے غیر کاشت ہیں۔ اس میں 11 پکے کنویں اور 112 نیل کے حوض شامل ہیں۔ چند سال سے چک کی سالانہ آمدنی 9-1-17,426 روپے رہی جو اگر صرف زیرِ آب زمین پر تقسیم کی جائے تو فی بیگھہ .2-5-2 روپے بنتی ہے اور اگر پورے رقبے پر تقسیم کی جائے تو فی بیگھہ 9-10-1 روپے بنتی ہے۔ یہ گاؤں گنجان آباد ہے یہاں 300 گھر موجود ہیں۔ اناج کے ذخیرے میں خریف کی فصل کی آمدنی 3,267 من اور 38 ٹوپے درج کی گئی ہے۔ مقامی عملہ نے تا حال اس اناج کو فروخت کرنے میں کوتاہی کی ہے حالانکہ حالیہ دنوں میں اس کی قیمت زیادہ تھی

جواب بتدریج کم ہو رہی ہے کیوں کہ ربیع کی فصل تیار ہے لہٰذا اب فوری طور پر اس اناج کی فروخت عمل میں لائی جانی چاہیے۔

یہ ڈائری اصل حالت میں سپرنٹیڈنٹ کو اطلاع اور ضروری احکامات کے لیے بھیجی جا رہی ہے۔

7اپریل 1901ء

آج چک سرکاری سے روانہ ہو کر دوپہر کا قیام صادق پور میں کیا اور رات کا پڑاؤ بھانگڑاں میں ڈالا۔ آج کے دورے میں جو کچھ مشاہدہ کیا، وہ ذیل کے پیراگرافوں میں درج ہے:

I۔ میں نے دولتواہ کی صفائی کا معائنہ کیا جو باقاعدہ اور نقشے کے مطابق کی گئی تھی۔ اس نہر کے تمام پکے موگے مکمل حالت میں موجود ہیں۔

II۔ میں نے شمالی راجواہ کا معائنہ کیا جو دولتواہ کی ایک شاخ ہے اور تقریباً 7 میل تک دیکھا۔ یہ ایک نہایت عمدہ شاخ ہے جو دونوں اطراف کی زمین کو مکمل طور پر سیراب کرتی ہے۔ ربیع اور خریف دونوں فصلوں میں اس نہر سے منسلک تمام زمین کاشت میں ہے۔ صفائی نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔ کناروں پر نمبر شدہ ستون موجود ہیں، تہہ میں معیاری پیمانے لگے ہوئے ہیں اور کسیوں کے سروں پر پکے موگے تعمیر شدہ حالت میں ہیں۔

III۔ میں نے درج ذیل دیہات کا دورہ کیا: کھیم گڑھ، موہاری، چک شیر علی، چک قمرالدین، چشتی، وارا پیراں، ساہی کے، راجکے، قاسم کے، اکوکے، چک علی گوہر، اور بھانگڑاں۔ ان دیہات میں 8 تقاوی کنویں فعال حالت میں ملے اور 7 کے مقامات پر سامان موجود پایا گیا جب کہ باقی 11 کنویں ابھی تک شروع نہیں ہوئے۔ کاردار اور پیشکار کو کام میں تیزی لانے کی ہدایت کر دی گئی ہے۔

IV۔ میں نے دولتواہ کا ریگولیٹر دیکھا اور پایا کہ اسے مرمت کی ضرورت ہے۔ اس کے شہتیر (beams) کیڑوں نے آدھے سے زیادہ کھا لیے ہیں جس کے باعث عوامی راستہ بند ہو چکا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کی مرمت کی منظوری 18 دسمبر 1900 کو دی گئی تھی لیکن ابھی تک مرمت کا آغاز نہیں کیا گیا حالانکہ نہر کھولنے کا موسم قریب آ چکا ہے۔ میں نے کاردار اور پیشکار کو زور دے کر فوری

آغاز کی تاکید کی ہے۔

V۔ یہ تجویز دی گئی ہے کہ دولتواہ ریگولیٹر سے اوپر ایک نئی شاخ نکالی جائے تا کہ دولتواہ سے سیراب ہونے والے علاقوں کو سیلاب سے محفوظ رکھا جا سکے اور قریبی زمینوں کی آبپاشی میں بہتری لائی جا سکے۔ دولتواہ کا زائد پانی جو محمدواہ کے اضافے سے مزید ہو جائے گا، اس مجوزہ شاخ کے ذریعے اضافی کاشت کاری میں استعمال کیا جا سکے گا۔ اس شاخ کی حد بندی کر دی گئی ہے اور تعمیرات عامہ کے محکمے نے اس کا نقشہ بھی تیار کر لیا ہے۔ کاردار اور پیشکار نے بتایا کہ جلد ہی اس پر کام شروع کیا جائے گا۔ میری رائے میں یہ نئی شاخ بہت مفید ثابت ہوگی۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ اس کا نام "موتیواہ" رکھا جائے۔

VI۔ آج کے معائنوں میں جتنی ربیع کی فصلیں دیکھی گئیں وہ نہایت عمدہ اور بہترین تھیں۔ فصلوں کی کٹائی جاری تھی۔ زمینداروں میں کاشت کاری سے دلچسپی نمایاں نظر آئی۔

VII۔ آج سہ پہر 3 بجے تمام زمیندار اور مہاجن مجھ سے ملنے آئے۔ ایک عوامی اجتماع میں انھیں کاشت کاری کو فروغ دینے، کنویں کھودنے، گنا اور نیل جیسی فصلیں اگانے کی ترغیب دی گئی۔ میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ میں آئندہ دورے میں ان کی بہتری خود دیکھنا چاہتا ہوں۔

یہ ڈائری اصل صورت میں ناظم اعلیٰ کو اطلاع اور ضروری اقدامات کے لیے بھیجی جا رہی ہے۔

8 اپریل 1901ء

بستی بھانگڑاں سے روانگی کے بعد، آج دن کا قیام روجھان والی اور رات کا پڑاؤ جھولن میں کیا گیا۔ ان دونوں دوروں میں جو کچھ مشاہدہ میں آیا وہ درج ذیل نکات میں پیش کیا جاتا ہے:

I۔ میں نے ان دیہاتوں کے تقاوی کنوؤں کا معائنہ کیا: نور محمد بھانگڑ، چک نادر شاہ، قمرالدین نمبر 308 ہوتیانہ، امر سنگھ، روجھان والی، چک سمندہ پرانا، شیرا چترا، جھولن آرائیں اور جھولن چشتیاں۔ ان دیہات کو مجموعی طور پر 65 کنوؤں کے لیے تقاوی دیا گیا جن میں سے 32 اس وقت کام کر رہے ہیں، 25 زیرِ تعمیر ہیں اور 8 پر ابھی تک کوئی کام شروع نہیں کیا گیا۔ کاردار، پیشکار اور تکاوی یافتگان کو تاکید کی گئی ہے کہ کام میں تیزی لائیں۔

II۔آج فورڈ واہ نہر کا معائنہ کیا گیا۔اس سال کوئی صفائی نہیں کی گئی نہ کوئی نشاناتِ پیمائش لگے ہوئے ہیں جو تلچھٹ کی مقدار ظاہر کریں اور نہ ہی کوئی پکے آؤٹ لیٹس تعمیر کیے گئے ہیں۔ یہ صورتحال سخت قابلِ اعتراض ہے۔فورڈ واہ ایک بڑی نہر ہے جو وسیع علاقے کو سیراب کرتی ہے اگر اس کی صفائی اسی طرح نظرانداز کی جاتی رہی تو متعلقہ تمام زمینیں ویران ہو جائیں گی اور چند برسوں بعد نہر کی صفائی کرنا ایک دشوار کام بن جائے گا۔میری رائے ہے کہ نہر کو پکا ہیڈ سے ٹیل تک دوبارہ ماپا جائے اور اس کی تہہ اینٹوں والے پیمائشی نشانات کے ساتھ دوبارہ تیار کی جائے جو دیرپا ہوں۔اگلے سال سے صفائی باقاعدگی سے کی جائے۔جب تک کمیٹی ہیڈ سے ٹیل تک تکمیل کی رپورٹ نہ دے، نہر کو ہرگز نہ کھولا جائے۔

III۔ میں نے روجھان والی کے نئے گاؤں کا معائنہ کیا۔ یہ ریلوے اسٹیشن کے قریب چولستان کی سرحد پر واقع ہے اس کی آبادی اچھی خاصی ہے۔ یہاں کے مکینوں نے درخواست کی کہ انھیں کچھ قابلِ کاشت زمین دی جائے تاکہ وہ ایک چھوٹا سا باغ لگا سکیں، ایک کنواں کھودیں اور اس طرح بستی کو خوب صورت بنائیں اور یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ اس بستی کا نام "بہاول نگر" رکھا جائے۔ انھوں نے مجھے اس سلسلے میں ایک تحریری درخواست دی ہے جو میں ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔ میں نے انھیں اُمید دلائی اور پکے مکان تعمیر کرنے کی ترغیب دی۔ان کی خواہشات کو منظور کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے؛ یعنی گاؤں کا نام "بہاول نگر" رکھا جائے کچھ قابلِ کاشت زمین دی جائے اور مقامی افسران کو گاؤں کی ترقی اور باشندوں کی سہولت کے لیے ذمہ داریاں تفویض کی جائیں۔

IV۔ میں نے فورڈ واہ کی وہ شاخ دیکھی جو جھولن چشتیاں سے نو میل کے فاصلے پر پنگلر کے مقام سے نکالی گئی ہے۔ چوں کہ یہ شاخ کئی نشیبی علاقوں سے گزرتی ہے اس کے لیے مضبوط بندوں کا ہونا ناگزیر ہے ورنہ پانی ٹیل تک نہیں پہنچ سکے گا۔کام کی تکمیل کے لیے کاردار اور پیشکار کو ہدایت دی جائے کہ کام تیزی سے مکمل کریں تاکہ اگلے دورے میں میں یہ مکمل حالت میں دیکھ سکوں۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ اس شاخ کا نام "شاخ زمرد" رکھا جائے۔

V۔ میں نے روجھان والی کا معائنہ کیا جو ریاست کی ملکیت ہے اور اس کی حالت تسلی بخش

نہیں پائی۔معلوم ہوا کہ یہ چک غیر مقامی آبادکاروں کو پٹے پر دیا گیا تھا لیکن ریاستی افسران کی غفلت کے باعث وہ اپنے علاقوں کو واپس چلے گئے۔ بعدازاں نہ تو کوئی نیا کاشتکار مہیا کیا گیا اور نہ ہی ریاستی نظام کے تحت کاشت کی گئی۔اس چک پر 900 روپے مالیتی محصول واجب الادا ہے اور کسی منیجر کی تقرری بھی کبھی نہیں کی گئی جب کہ آبادکار پیداوار سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ ریاست کی طرف سے مطالبہ کیوں نہ کیا گیا؟ کون سے افسر نے اس میں کوتاہی سے کام لیا ہے اور غیر ملکی آبادکاروں سے ضمانت کیوں نہ لی گئی؟ یہ تمام اعتراضات اس چک سے متعلق ہیں۔مشیر مال اور مقامی کاردار سے وضاحت طلب کی جائے۔مناسب احکامات جاری ہوں اور ریاستی مطالبہ وصول کیا جائے۔آئندہ دورے میں اس چک کا خصوصی معائنہ کروں گا۔

VI۔درج ذیل دیہات سے منسلک زمینیں زیادہ تر ویران پائی گئیں: چک سمندہ پرانا، اراتی ڈھڈی، شیرا چترا، محمد پور، مخدوم جھولن اور چشتیاں۔مالکان اس کا سبب فورڈواہ کے پانی کی کمی کو قرار دیتے ہیں حالانکہ گذشتہ سال نہر میں وافر پانی تھا۔میرا اندازہ ہے کہ پانی کی کمی دراصل صفائی کی خرابی کے سبب ہوئی کیوں کہ اچھا بہاؤ ہمیشہ اچھی صفائی پر منحصر ہوتا ہے۔کاردار اور پیشکار کو ہدایت دی جائے کہ ان دیہات کی کاشت کے لیے فوری انتظامات کریں تا کہ اگلے دورے میں یہ علاقے زیرِ کاشت ہوں۔

VII۔آج سہ پہر 3:30 بجے صادق پور پیشکاری کے تمام زمیندار مجھ سے ملنے آئے۔ ایک عوامی اجتماع میں انھیں ترغیب دی گئی کہ وہ کنوؤں کے لیے تکاوی حاصل کریں اور گنا، باغات، نیل وغیرہ کی کاشت کو بہتر بنائیں۔اُن زمینداروں سے جو بڑے پیمانے پر گنا کاشت کریں گے، وعدہ کیا گیا کہ انھیں ریاستی شکر ملیں فراہم کی جائیں گی۔(یہ شکر ملیں شاید بیلنا اور اس سے متعلق آلات ہیں) یہ ڈائری اصل حالت میں ناظمِ اعلیٰ (Superintendent) کو معلومات کے لیے بھیجی گئی ہے۔

9 اپریل 1901ء

آج جھولاں سے مندھووالہ تک کے دوروں میں جو کچھ مشاہدہ میں آیا، وہ درج ذیل نکات میں بیان کیا جاتا ہے:

I۔ میں نے ان دیہاتوں کے تکاوی کنووں کا معائنہ کیا: ٹوبہ قلندر شاہ، چاویکا، بہادر کا، سکندر بلو چاں، وزیرکا، مصلہ، چاہ مرادوالا، گنجی ڈھڈی، کبوتری اور خازن سنگھ۔ ان دیہات کو مجموعی طور پر 38 کنوؤں کے لیے تقاوی دی گئی جن میں سے 8 اس وقت کام کر رہے ہیں، 11 زیرِ تعمیر ہیں اور باقی کے لیے ابھی تک سامان بھی فراہم نہیں کیا گیا۔ تقاوی یافتگان اور عملہ کنوؤں کی بہتری میں کوئی دلچسپی لیتے دکھائی نہیں دیتے۔ کاردار اور زمینداروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ جلد از جلد کام مکمل کریں۔

II۔ مقامی معائنہ کے دوران میں نے دیکھا کہ مخدوم، جھلاّں آرائیں، ٹوبہ قلندر شاہ، چک محمود پورہ، چاویکہ اور سکندر بلو چاں دیہاتوں سے منسلک زمینیں، پچھلے سیلابوں کے باوجود زیادہ تر غیر زیرِ کاشت ہیں۔ پیشکار اس ویرانی کو گریواہ نہر میں پانی کی کمی سے جوڑتا ہے۔ میں نے گریواہ کا ہیڈ سے ٹیل تک معائنہ کیا اور دیکھا کہ اس کا ایک تہائی حصہ منچن آباد پیشکاری میں اور باقی دو تہائی صادق پور پیشکاری میں واقع ہے۔ منچن آباد والا حصہ نشیبی زمین سے گھرا ہوا ہے جو سارے پانی کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اس طرح صادق پور کی زمین کو بہت کم پانی میسر آتا ہے۔ منچن آباد پیشکاری میں کسیوں کے سروں پر کہیں بھی پکے آؤٹ لیٹس موجود نہیں حالانکہ ایسے مقامات پر ان کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے مشیرِ مال اور کاردار کو فوری طور پر آؤٹ لیٹس تعمیر کرنے کا حکم دیا جائے اور صادق پور پیشکاری سے ایک اہلکار کو اس نہر کے رواں موسم میں مقرر کیا جائے جو چیر بندی؟ (ایک موٹے کپڑے پر اتارا ہوا زرعی زمین کا ریکارڈ یا نقشہ مع حد بندیاں) کے مطابق پانی منچن آباد اور صادق پور کو تقسیم کرے۔ کاردار اور پیشکار دونوں کو اپنے اپنے دائرہ اختیار میں اس نہر کی آبپاشی کا ہفتے میں کم از کم ایک بار معائنہ کرنا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ یہ انتظامات دونوں پیشکاریوں میں پانی کی منصفانہ فراہمی یقینی بنائیں گے۔ اس نہر سے پانی کے ضیاع کو نشیبوں میں بہہ جانے سے بچانا بھی ضروری ہے۔

III۔ گریواہ کی صفائی مناسب تو ہے مگر قابلِ تعریف نہیں۔ عام طور پر کناروں پر نمبر والے ستون موجود نہیں اور بعض پیمانے گلے سڑے ہوئے ہیں۔ کنارے کے درختوں کے ساتھ بدسلوکی کی گئی ہے انھیں اس طرح کاٹا گیا ہے کہ 4 سے 10 فٹ تک کا تنا چھوڑ دیا گیا ہے جو انھیں دوبارہ اگنے کے قابل نہیں چھوڑتا۔ آئندہ درختوں کی چھنگائی جنگلاتی قواعد کے مطابق کی جائے تاکہ لکڑی ضائع نہ

ہو۔ جاری ہونے والے نالوں کے سروں پر جو پکے آؤٹ لیٹس سپرنٹنڈنٹ کے حکم سے تعمیر ہونے تھے وہ نہیں بنائے گئے۔ نہر کے دونوں اطراف میں گہرے نشیبی علاقے موجود ہیں جو نہر سے حد سے زیادہ پانی جذب کر لیتے ہیں۔ ان جگہوں پر آؤٹ لیٹس فوراً تیار کیے جائیں۔

IV۔ آج کے دوروں کے دوران، میں نے بہت ہی کم بہاؤ کی آبپاشی دیکھی اور جو کچھ بھی دیکھا وہ بھی کمزور تھا۔

V۔ شام 4:30 بجے میں نے چک کبوتری اور خازن سنگھ کی زمینوں اور کنوؤں کا معائنہ کیا جو فورڈ واہ سے سیراب ہوتے ہیں۔ آبپاشی کے ذرائع تو موجود ہیں لیکن افسران کی غفلت کے باعث شاخیں اور کسیاں صاف نہیں کی گئیں، نتیجتاً زمینیں زیادہ تر ویران ہیں۔ ماہتم خاندانوں کا ایک بڑا حصہ لائلپور کی طرف ہجرت کر چکا ہے۔ یہ سب متعلقہ افسران کی سستی کا نتیجہ ہے۔ کاردار اور پیشکار کو سختی سے حکم دیا جائے کہ وہ آئندہ سیلاب کے موقع پر پانی کے راستے صاف کروائیں اور ویران زمینوں کو دوبارہ قابلِ کاشت بنائیں نیز کسی فعال زمیندار یا افسر کے ذریعے ہجرت کر جانے والے لوگوں کو واپس بلوایا جائے۔ یہ باعثِ افسوس ہے کہ اس کارداری کے زمیندار ریاست چھوڑ کر بیرونی علاقوں کو جا رہے ہیں جب کہ صادقپور کارداری میں باہر سے نئے آبادکار آ رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگلے دورے میں یہ ویران دیہات دوبارہ آباد اور ویران زمینیں دوبارہ کاشت کے قابل ہوں گی۔ یہ ڈائری اصل شکل میں ناظم اعلیٰ کو معلومات اور ضروری کارروائی کے لیے بھیجی گئی ہے۔

10 اپریل 1901ء

آج مندھوالہ سے روانگی کے بعد ہمارا قیام منچن آباد میں ہوا اور درج ذیل کاموں کا معائنہ کیا گیا:

I۔ آج میں نے چھبیانہ، منساوالہ، دیوانوالہ، چک سید علی، چک جندو، ادھانوالہ، نوشہرہ اور چک قادراں کے تقاوی کنوؤں کا معائنہ کیا جن کے لیے زمینداروں کو مجموعی طور پر 59 کنوؤں کی تقاوی منظور ہوئی تھی۔ ان میں سے 25 اس وقت فعال ہیں، 21 کے لیے سامان مہیا ہو چکا ہے جب کہ 13 پر ابھی تک کوئی کام شروع نہیں کیا گیا۔ کاردار، پیشکار اور تقاوی یافتگان کو کام کی جلد تکمیل کی

ہدایت کی گئی ہے۔ میری رائے ہے کہ مقامی افسران نے کنوؤں کی بہتری کو کم ترین ترجیح دی ہے لیکن خود زمیندار بھی کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ مختلف مقامات پر دستیاب اینٹیں عمومی طور پر ناقص معیار کی ہیں اور اگر یہی اینٹیں کنوؤں میں استعمال ہوئیں تو یہ جلد ہی گر جائیں گی جس سے معمولی فائدے کی بجائے زمینداروں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا۔ کنوؤں کی کھدائی بھی اطمینان بخش نہیں کیوں کہ زمیندار عموماً ماہر کاریگروں کی کمی کی شکایت کرتے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے ماہر کاریگر بلوائے جائیں۔ اگر ہر پیشکاری سے کاردار یا پیشکار ایک دو افراد روانہ کریں تو وہ قابل کاریگر مہیا کر سکتے ہیں جن کی اجرت زمیندار خود ادا کریں۔ یوں کم خرچ میں بڑا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تمام کارداروں کی توجہ اس جانب دلائی جائے تا کہ جس مقصد کے لیے بڑی رقم دی گئی ہے، وہ بخوبی حاصل ہو۔

II۔ فورڈواہ میں صفائی بالکل نہیں کی گئی۔ وضاحت یہ دی گئی کہ موجودہ تہہ، ڈیزائن کردہ تہہ سے نیچی ہے لیکن اس بات کی تائید میں کوئی معیاری پیمانے موجود نہیں۔ فورڈواہ ایک بڑی نہر ہے اور اس میں مکمل پیمائش کا نظام ہونا لازم ہے جیسا کہ کل کی ڈائری میں بیان کیا گیا تھا۔

III۔ میں نے میل 11 پر منظور شدہ فورڈواہ ریگولیٹر کا معائنہ کیا۔ اینٹیں، چونا، لکڑی اور دیگر سامان موقع پر موجود ہیں۔ کنویں کی منڈیر اور دیواریں زیرِ تعمیر ہیں اور بنیاد کی کھدائی جاری ہے، لیکن عمارت کی تعمیر ابھی شروع نہیں ہوئی۔ موقع پر موجود نگران نے وضاحت کی کہ کام جولائی تک مکمل ہو جائے گا لیکن منصوبے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کام بہت زیادہ ہے اور سیلاب کا موسم قریب ہے جب بہاؤ بڑھ جائے گا۔ اس صورت میں جولائی تک مکمل ہونا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ نہر کے بہاؤ کا موسم قریب ہے لیکن ابھی تک نہر کا رخ موڑنے (diversion) کے لیے کھدائی نہیں کی گئی۔ یہ کھدائی فوری طور پر مکمل ہونی چاہیے۔ میری رائے ہے کہ جب تک رخ موڑے جانے والی نہر تیار نہ ہو، فورڈواہ کا ہیڈ نہیں کھولا جانا چاہیے۔ اگرچہ ریگولیٹر کے اوپر گرے واہ نہر موجود ہے، ابھی اگر فورڈواہ پر بند تعمیر کر دیا جائے (جیسا کہ ہو رہا ہے) اور گریواہ کھولی جائے تو ملحقہ زمینوں کو صرف قلیل مدت کے لیے فائدہ ہوگا لیکن فورڈواہ کا پانی ٹیل تک نہ پہنچنے دینا نقصان دہ ہوگا۔ مشیر مال کو سختی سے

تاکید کی جائے کہ رخ موڑنے والی نہر کی کھدائی فوری مکمل کروائیں۔

IV۔ میں نے نئی شاخ لائن دیکھی جو نئے ریگولیٹر سے فورڈواہ کے جنوب میں واقع زمین کو سیراب کرنے کے لیے نکالی جا رہی ہے۔ درحقیقت جنوبی زمینیں بلند سطح پر ہیں اور فورڈواہ کا بہاؤ ان تک نہیں پہنچ سکتا اسی لیے وہ بیکار پڑی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ نئی شاخ روجھان والی تک کی تمام زمینوں کو سیراب کر سکے گی۔ جہاں یہ شاخ سدرن پنجاب ریلوے کو عبور کرتی ہے وہاں پہلے ہی 20 فٹ چوڑی کھلی جگہ موجود ہے لیکن معلوم ہوا ہے کہ ریلوے پلوں کی سطح برابر نہیں۔ درمیان میں فرش 1'.65 فٹ اور کناروں پر 3'.15 فٹ مجوزہ تہہ سے بلند ہے۔ چوں کہ یہ جگہ شاخ کے ہیڈ کے قریب ہے لہٰذا یہاں ہیڈ فوراً مٹی سے بھر جائے گا اور پانی پہنچ سکے گا نہ بہاؤ جاری رہے گا۔ میرے خیال میں یہ خرابی کھدائی شروع کرنے سے پہلے ہی دور کی جانی چاہیے۔ اگرچہ اس شاخ کے لیے منظوری دی جا چکی ہے مگر تا حال کوئی تعمیراتی کام شروع نہیں ہوا۔

V۔ آج جن دیہات کا معائنہ کیا گیا وہاں کی فصلیں تسلی بخش نہیں۔ آبپاشی کے ذرائع تو موجود ہیں مگر کمی کی وجہ صفائی کی عدم تکمیل معلوم ہوتی ہے۔ دریافت پر زمینداروں نے اس ویرانی کی وجہ پانی کی کمی بتائی حالانکہ گذشتہ سیلاب میں کوئی زمین ایسی نہ تھی جہاں پانی نہ پہنچا ہو۔ یہ مسئلہ حل ہونا چاہیے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ زمیندار اتنے سست ہیں کہ جب تک ریاستی افسر انھیں نہ جھنجھوڑیں وہ کچھ نہیں کرتے۔ مشیر مال اور کاردار کو ہدایت دی جائے کہ آئندہ سیلاب میں اس طرح انتظام کریں کہ اگلے دورے میں یہ تمام علاقے زیرِ کاشت دیکھے جائیں۔

VI۔ شام 4 بجے میں نے اسکول کا معائنہ کیا۔ تعلیم کی حالت اطمینان بخش ہے اور اوسط حاضری 62 ہے۔

VII۔ میں نے منچن آباد خزانے (Treasury) کا معائنہ کیا۔ گوشوارے میں درج 1,662-11-2 روپے کی رقم گن کر درست پائی گئی۔ 33-15 روپے بطور امانت جمع تھے جو نسبتاً بڑی رقم ہے۔ عدالتی و محصولاتی اسٹامپ اور عرضداشتوں کے کاغذات کو جانچا گیا اور رجسٹر کے مطابق سب کچھ درست پایا گیا۔ محصولات کے گوشوارے سے ظاہر ہوا کہ 2,606-6-6 روپے مالیتی چراگاہ

فیس ابھی تک وصول نہیں ہوئی۔ یہ معمولی رقم ہے جسے تھوڑی سی کوشش سے وصول کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ افسران محصول کی وصولی کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ اس لیے کاردار کو تاکید کی گئی ہے کہ وصولی میں تیزی لائیں۔

VIII۔ میں نے منچن آباد ڈسپنسری کا معائنہ کیا۔ ادویات اور آلات کی حالت تسلی بخش پائی گئی اور صفائی کا انتظام بھی اچھا تھا۔

IX۔ نمک شورا (saltpetre) بنانے کے کارخانے کا معائنہ کیا گیا اور اسے نہایت عمدگی سے کام کرتے پایا گیا۔ اس کا انتظام تسلی بخش ہے۔ یہ ڈائری اصل حالت میں ناظم اعلیٰ کو اطلاع کے لیے ارسال کی جا رہی ہے۔

11 اپریل 1901ء

آج صبح منچن آباد سے روانہ ہو کر ہم میکلوڈ گنج پہنچے اور وہاں سے شام 4 بجے حاصل سارو روانہ ہوئے۔ ان دونوں دوروں میں جو کچھ معائنہ کیا گیا اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

I۔ میں نے فیض واہ کا معائنہ کیا جو مراد واہ کی ایک شاخ ہے۔ اس کی صفائی باقاعدگی سے کی گئی ہے۔

II۔ اس کے بعد میں نے رائیٹ برانچ (Right Branch) کا معائنہ کیا جس کی صفائی نقشے کے مطابق ہیڈ سے ٹیل تک مکمل پائی گئی۔ آب نوشوں نے پانی کی تقسیم پر شکایت کی۔ میری رائے میں یہ تقسیم کاردار کے ذریعے کی جانی چاہیے۔ اس برانچ کے ہیڈ پر ایک ریگولیٹر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی عمارت اور سامان درمیانے درجے کے ہیں کیوں کہ کام ٹھیکیداری نظام کے تحت کیا گیا ہے۔ اس کی تکمیل کی رپورٹ کمیٹی سے حاصل کی جانی چاہیے۔

III۔ کلر واہ کا معائنہ کیا گیا جس کی صفائی مکمل پائی گئی۔ اس کے ہیڈ پر بھی ایک ریگولیٹر بنایا گیا ہے جس کی عمارت اور سامان رائٹ برانچ کے ریگولیٹر جیسے ہی ہیں۔ اس کی تکمیل کی رپورٹ بھی کمیٹی سے حاصل کی جانی چاہیے۔

IV۔ میں نے مراد واہ ریگولیٹر کا معائنہ کیا جو میکلوڈ گنج کی سڑک کے بالمقابل واقع ہے۔

بنیادوں کی کھدائی جاری ہے اور کچھ ساز وسامان موقع پر پہنچایا جا چکا ہے۔ مرادواہ کی تبدیلی رخ والی نہر (diversion) بھی زیر تعمیر ہے۔ میکلوڈ گنج اور منچن آباد کے زمیندار وہاں جمع تھے۔ میکلوڈ گنج کے زمینداروں کا کہنا تھا کہ اگر ریگولیٹر اس جگہ بنایا گیا تو انھیں پانی نہیں ملے گا اور اس ضمن میں انھوں نے ایک تحریری درخواست بھی دی ہے جسے میں ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔ منچن آباد کے زمینداروں نے بھی اسی طرح کہا کہ اگر ریگولیٹر تجویز کردہ مقام سے اوپر بنایا گیا تو انھیں پانی نہیں مل سکے گا۔ میکلوڈ گنج کے پیشکار نے وضاحت کی کہ مشیر مال اور مشیر تعمیرات نے ریگولیٹر کی جگہ موجودہ مقام سے تین چوتھائی میل اوپر تجویز کی تھی لیکن موجودہ تعمیر غلطی سے یہاں کی جا رہی ہے۔ منچن آباد کی زمینیں نشیبی ہیں جب کہ مکلیوڈ گنج کی زمینیں بلند سطح پر واقع ہیں۔ جن دیہات کلوکا، مرزا کا اور دوارانوالا کے لیے یہ ریگولیٹر بنایا جا رہا ہے وہ اس منصوبے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ اگر ریگولیٹر کو مرزا کا کے بالمقابل بنایا جائے تو میکلوڈ گنج کی زمین مکمل طور پر سیراب ہو سکے گی اور اس ریگولیٹر سے شمال و جنوب کی طرف ایک ایک شاخ نکال کر منچن آباد کی زمینوں کو بھی آبپاشی مہیا کی جا سکتی ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشیر تعمیرات اور نائب مشیر مال کو ایک یا دو دن کے لیے موقع پر بھیجا جائے تا کہ وہ دونوں فریقوں کے اعتراضات سن کر مناسب مقام کا تعین کریں۔

V۔ میں نے میکلوڈ گنج ریگولیٹر کا معائنہ کیا جو پرانی ایجنسی دور کی تعمیر ہے۔ اس کی عمارت قابلِ تعریف ہے لیکن آمدورفت کی وجہ سے نقصان پہنچا ہے۔ اسے مرمت کیا جانا چاہیے، اور آئندہ اس کے اوپری حصے کو بیل گاڑیوں سے بچانے کے لیے لکڑی کے ستون نصب کیے جائیں۔

VI۔ میں نے مرادواہ کے جنوب میں واقع راجواہ شاخ کا معائنہ کیا جو کئی دیہات کو سیراب کرتی ہے۔ افسوس کہ اس سال اس کی صفائی نہیں ہوئی۔ کاردار کو تاکید کی جائے کہ فوراً صفائی کروائے اور آئندہ آب نوشوں کے ذریعے سے باقاعدگی سے نہر صاف کرائی جائے۔

VII۔ میں نے میکلوڈ گنج ریگولیٹر دوبارہ دیکھا۔ گذشتہ سال کے سیلاب سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اگرچہ پانی کے بہاؤ کی سمت نیچے کی طرف ایک گہرا گڑھا ہے پھر بھی فرش کے نیچے لکڑی کی سپورٹس رکھی گئی ہیں اور دونوں اطراف پلچی مٹی (مٹی کا بند) لگائی گئی ہے اس لیے فرش اور

پانی کے بہاؤ کی مضبوطی کی توقع کی جاسکتی ہے۔

VIII۔ مرادواہ کا ٹیل سے ہیڈ تک کئی مقامات پر معائنہ کیا گیا۔ یہ ایک باقاعدہ ڈیزائن شدہ اور قابلِ تعریف نہر ہے۔ اس کی صفائی عمدہ ہے، benchmarks نصب ہیں۔ دونوں کناروں پر خشک درخت دیکھے گئے جنھیں فروخت کیا جاسکتا ہے اور جہاں درخت نہیں وہاں میر آب کیکر لگائیں۔

IX۔ کالوکا، مرزکا، رسوالا، چک پیپلاں، سمیل پور، دھنی سنگھ، شرف پور، جاموںکا، ناصر پور اور امیر سنگھ دیہات کے تقاوی کنوؤں کا معائنہ کیا گیا۔ ان دیہات کے زمینداروں نے مجموعی طور پر 38 کنوؤں کے لیے تقاوی حاصل کی جن میں سے 13 تیار اور فعال ہیں، 15 زیرِ تعمیر ہیں اور باقی ابھی شروع بھی نہیں ہوئے۔ پیشکار اور تقاوی یافتگان کو جلد تکمیل کی تاکید کی گئی ہے۔

X۔ میں نے امر سنگھ بند کا معائنہ کیا جو دریا کی ایک شاخ میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس بند کے اوپر تین پانی کے راستے کھودے گئے ہیں۔ گذشتہ سیلاب میں دریا کا پانی اس بند سے ٹکرا کر امر سنگھ، حسین شاہ، جیون سارو، ناصر پور، جموںکا، توکل، چک سرور دین، دھنی سنگھ وغیرہ دیہات میں پہنچا اور ان کی آبپاشی کی۔ وہ تمام علاقہ کاشت شدہ پایا گیا۔

XI۔ حاصل سارو کے بالمقابل فورڈواہ فالتو پانی کا راستہ (Escape) نمبر 1، 2، 3 اور 4 کا معائنہ کیا گیا۔ یہ پرانے پانی کے راستے ہیں جو فورڈواہ کے زائد پانی کو سیلاب کے موسم میں مشرقی اور جنوبی زمینوں میں استعمال کے لیے کھودے گئے تھے۔ ان کی صفائی نہیں کی گئی۔ کاردار کو تاکید کی جائے کہ نہر کھلنے کے بعد یہ راستے آب نوشوں سے صاف کروائے جائیں۔ یہ پانی کے راستے چولستان کی سرحدی زمینوں کو سیراب کرنے کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔

XII۔ آج کے دورے میں میکلوڈ گنج پیشکاری کی ربیع کی فصلیں خوب دیکھی گئیں اور قیمتی پائی گئیں۔ میرا خیال ہے کہ زمینداروں کو اس سیزن میں بڑا فائدہ ہوگا۔

XIII۔ آج سہ پہر 3:15 بجے میکلوڈ گنج کے بڑے زمیندار اور پنچ میرے پاس جمع ہوئے۔ عوامی اجلاس میں، میں نے انھیں ریاستی تقاوی سے کنویں کھودنے اور گنا، نیل وغیرہ کی کاشت

بہتر بنانے کی ترغیب دی۔ ان تقاوی یافتگان سے بھی باز پرس کی جنھوں نے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔

XIV۔ میکلوڈ گنج کی فصلیں شاداب دیکھی گئیں۔ اس پیشکاری کی نہروں کی صفائی عموی طور پر مکمل ہو چکی ہے۔ میری تجویز ہے کہ پیشکار غلام احمد کو اگلے سالگرہ دربار میں معمول کی خلعت کے علاوہ ایک ماہ کی اضافی تنخواہ بھی دی جائے۔

یہ ڈائری اصل حالت میں بہاول پور کے ناظم اعلیٰ کو اطلاع کے لیے ارسال کی جاتی ہے۔

12 اپریل 1901ء

آج حاصل سارو سے روانگی کے بعد میں نے صادقیہ شرقیہ کے دونوں ہیڈز اور فورڈواہ کے ہیڈ پر بند کا معائنہ کیا۔ ذیل میں تمام ہیڈز کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں:

I۔ چوں کہ دریا نے گذشتہ سال کے فورڈواہ ہیڈ سے ہٹ کر رخ بدل لیا ہے اس لیے اس سال پرانے ہیڈ سے نیچے ایک نیا ہیڈ لیا گیا ہے۔ اگر چہ یہ مقام کچھ نیچے ہے پھر بھی یہ موزوں ہے کیوں کہ دریا کا بہاؤ اسی سمت ہے اور اس سے بہتر جگہ میسر نہ تھی۔ باوجود اس کے کہ کاردار اور پیشکار نے ہیڈ کھولنے اور صفائی مکمل کرنے کی پوری کوشش کی ہے، سروئیر نے یہ انکشاف کیا کہ ہیڈ سے ایک میل تک اب بھی 1.75 فٹ تلچھٹ موجود ہے۔ اس کی صفائی کے لیے بڑی تعداد میں مزدور لگائے گئے ہیں۔ اگر مسلسل محنت سے کام جاری رکھا گیا تو صفائی ایک ہفتے کے اندر مکمل ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ نہر کے ریگولیٹر پر رخ موڑتی نہر (diversion) کی صفائی بھی باقی ہے۔ کاردار اور پیشکار کو ہدایت کی گئی ہے کہ کام نقشے کے مطابق مکمل کرائیں اور اعلیٰ افسر کی اجازت سے، کمیٹی رپورٹ کی روشنی میں ہیڈ کھولا جائے۔ انھیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہیڈ پر بند کو مضبوط حالت میں رکھیں۔

II۔ دریا نے صادقیہ شرقیہ نہر کے پچھلے ہیڈ سے ہٹ کر پیچھے 3 یا 4 نمبر تک ریت چھوڑ دی ہے۔ اگر نیا ہیڈ پرانے ہیڈ سے 6 نمبر اوپر لیا جائے اور اس سے جوڑ دیا جائے تو یہ مقام موزوں ثابت ہوگا کیوں کہ دریا کا بہاؤ واضح طور پر اس طرف ہے۔

III۔ میں نے اس مقام کا معائنہ کیا جو اس سال مشیر مال اور مشیر تعمیرات نے برطانوی گاؤں جھانگراں میں نئے ہیڈ کے لیے تجویز کیا ہے۔ یہ مقام پرانے ہیڈ سے 4 میل اور 8 نمبر اوپر

ہے اور موزوں ہے۔ یہ جگہ بلند زمین پر واقع ہے اور مضبوط مٹی سے گزرتی ہے اور پرانے ہیڈ سے جڑتی ہے لیکن وہ مقام جو انہی افسران نے 1900ء میں تجویز کیا تھا اب بالکل غیر موزوں ہے کیوں کہ دریا کا مرکزی بہاؤ مخالف کنارے کی طرف ہو چکا ہے۔ اس سے تقریباً ایک میل نیچے دریا نے جھانگراں گاؤں کے نزدیک مغربی کنارے کے قریب آ کر موڑ لیا ہے لہٰذا یہی مقام درست ہیڈ کے لیے ہے۔ اس صورت میں ہیڈ کی لمبائی 4 میل 8 نمبر کی بجائے 3 میل 8 نمبر ہو جائے گی۔ یہ تمام زمین غیر ملکی زمینداروں کی ملکیت ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اوپر دیے گئے ہیڈ سے نیچے تک دریا کا دباؤ اس طرف ہے جہاں زمین نرم ہے۔ اگر دریا کا دباؤ اسی طرح رہا تو ساری مذکورہ زمین کٹ جائے گی اور بالآخر دریا اُس گڑھے تک پہنچ جائے گا جہاں نیا ہیڈ تجویز کیا جا رہا ہے۔

IV۔ صادقیہ شرقیہ کے ہیڈ سے متعلق فاضلکا کے زمینداروں کو بلایا گیا۔ ابتدا میں انھوں نے اعتراضات اٹھائے اور احتجاج کیا کہ مشیر مال نے دو سال پہلے ہیڈ کے لیے ان کی 24 ایکڑ زمین لی تھی اور 25 روپے فی ایکڑ سالانہ کے حساب سے 600 روپے آبیانہ دینے پر اتفاق کیا تھا لیکن انھیں تاحال رقم نہیں ملی حالانکہ وہ حکومت کو محصول اور مزارعین کو معاوضہ دے چکے ہیں۔ انھیں بتایا گیا کہ وہ رقم انھیں مشیر مال کے وعدے کے مطابق ادا کی جائے گی اور خبردار کیا گیا کہ اگر وہ مزید اعتراضات کریں گے تو زمین پنجاب حکومت کے ذریعے حاصل کی جائے گی اور ایسی صورت میں ریاست سے کسی رعایت کی توقع نہ رکھیں۔ اس پر زمینداروں نے رضامندی ظاہر کی کہ جب بھی ریاست کو ہیڈ کے لیے زمین درکار ہو وہ 20 روپے فی ایکڑ سالانہ آبیانہ کے عوض زمین فراہم کریں گے۔ اگر زمین کا کچھ حصہ دریا بہا لے جائے تو اس کا آبیانہ معاف کر دیا جائے گا۔ یہ معاہدہ ہمیشہ کے لیے طے پا گیا ہے۔ جب بھی دریا کے رخ کی وجہ سے ہیڈ تبدیل کرنا پڑے فوراً کر دیا جائے گا اور مذکورہ شرح سے سالانہ آبیانہ دیا جائے گا۔ فاضلکا کے زمینداروں کو تسلیم کرنا ہو گا کہ وہ اپنی آبپاشی میں نقصان برداشت کریں گے کیوں کہ ہیڈ بہاول پور نہر کو دیا گیا ہے اور اس سے دریا کے بہاؤ کا ایک بڑا حصہ نہر میں چلا جائے گا جسے روکنے کا انھیں کوئی اختیار نہ ہو گا۔ اس سال انھوں نے جھانگڑانوالہ ہیڈ کا مطالبہ کیا تھا اور اس کے نتیجے میں ان کی ہزاروں بیگھہ زمین سیراب ہو گئی۔ مستقبل میں وہ پانی روکنے کا

اختیار نہیں رکھیں گے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ مشیر مال نے دو سال پہلے 24 ایکڑ زمین ہیڈ کے لیے لی تھی اور چھ صد روپے سالانہ آبیانہ کا وعدہ کیا تھا لیکن زمینداروں کو یہ رقم نہیں ملی اسی لیے وہ اس سال ہیڈ دینے سے انکاری تھے۔ اب میری موجودگی میں 20 روپے فی ایکڑ سالانہ کے حساب سے گذشتہ دو سال اور مستقبل کے لیے آبیانہ طے پا گیا جو مشیر مال کے معاہدے سے 5 روپے فی ایکڑ سستا ہے۔ مشیر مال کے مطابق مجموعی رقم 1,200 روپے بنتی تھی لیکن نئی شرح کے مطابق 960 روپے ادا کر کے 240 روپے کی بچت کی گئی۔ رقم میری موجودگی میں ادا کی گئی اور زمینداروں سے مستقبل میں زمین دینے کا تحریری معاہدہ حاصل کیا گیا جس کی نقل نیچے دی گئی ہے۔ زمینداروں کی درخواست پر ایک تحریر کاردار اور پیشکار نے دستخط کی تصدیق وزیر نے کی اور وہ بھی اس کے ساتھ منسلک ہے۔ میری رائے ہے کہ یہ معاہدہ ریاست کے مفاد میں ہے اور ہمیشہ نافذ العمل رہے گا۔ مشیر تعمیرات اور نائب مشیر مال کو چاہیے کہ فوراً موقع پر پہنچ کر پیرا 3 کے مطابق مقام کا تعین کریں اور کام کا آغاز کریں۔ فاضلکا کے 13 زمینداروں کو میری موجودگی میں خلعت دیے گئے اور انھیں واضح طور پر کہا گیا کہ وہ نئے ہیڈ کی کھدائی میں کوئی اعتراض نہ کریں۔ متعلقہ افسران کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ بلا تامل، زمین کے بدلے مقررہ شرح سے آبیانہ ادا کریں اور رسید مشیر مال کو پیش کریں۔

V۔ آج دورے میں معائنہ کیے گئے دریا کے کنارے واقع دیہاتوں کی ربیع کی فصلیں بہت عمدہ اور قابلِ تعریف پائی گئیں۔ تمام قابلِ کاشت زمین زیرِ کاشت لائی جا چکی ہے۔

VI۔ شام کو تمام زمیندار مجھ سے ملے۔ ایک عوامی اجلاس میں انھیں ترغیب دی گئی کہ وہ کاشتکاری اور کنوؤں کو بہتر بنائیں۔ یہ ڈائری اصل حالت میں سپرنٹنڈنٹ کو ارسال کی گئی ہے۔

ضمیمہ: الف (Appendix)

ہم، ذیل میں دستخط کنندگان نے اس سال صادقیہ شرقیہ نہر کے ہیڈ کے لیے زمین دینے سے انکار کر دیا تھا کیوں کہ دو سال سے 24 ایکڑ زمین کا آبیانہ نہیں ملا تھا۔ اب ہمیں 960 روپے کی رقم 20 روپے فی ایکڑ فی سال کے حساب سے موصول ہو چکی ہے لہٰذا ہم اقرار کرتے ہیں کہ اب تک کا تمام واجب الادا آبیانہ وصول ہو چکا ہے اور آئندہ کے لیے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ریاست کو جب بھی

بہاول پور نہر کے ہیڈ کے لیے ہماری جاگیروں میں زمین درکار ہو ہم بغیر اعتراض زمین فراہم کریں گے بشرطیکہ 20 روپے فی ایکڑ فی سال آبیانہ دیا جائے۔ موجودہ سال کے لیے ہم جھانگرانوالہ کی درکار زمین دینے پر آمادہ ہیں اور اجازت دیتے ہیں کہ کام شروع کیا جائے۔ ہم مزید اقرار کرتے ہیں کہ اگر دریا زمین بہالے جائے تو اس کا آبیانہ معاف کیا جائے گا۔ 12 اپریل 1901ء

(دستخط شدگان)

1۔ جیون خان ولد حاصل خان 2۔ پیر خیر محمد 3۔ پیر دین محمد 4۔ محمد علی چشتی 5۔ نبی بخش ولد جموں رحمونکا 6۔ فضل دین ولد فتح دین 7۔ تاوا سلیمو کا ولد سوہنا 8۔ تاجہ سلیمو کا ولد مچھی

ضمیمہ: ب (Appendix)

ہم، منچن آباد کے کاردار اور میکلوڈ گنج پیشکاری کے پیشکار اعلان کرتے ہیں کہ صادقیہ نہر کے ہیڈ سے منسلک 25 ایکڑ زمین کے لیے دو سال کا آبیانہ 20 روپے فی ایکڑ فی سال کے حساب سے کل 960 روپے مالکان زمین کو ادا کیا گیا ہے اور اس کی علیحدہ رسید حاصل کی گئی ہے۔ اس سال جھانگرانوالہ ہیڈ، جس پر گنج بخش جھانگرانوالہ اور یار محمد چشتی کے زمینداروں نے رضامندی ظاہر کی ہے، فوراً تعمیر کیا جائے گا اور زمین کے لیے 20 روپے فی ایکڑ فی سال آبیانہ دیا جائے گا۔ آئندہ جب بھی دریا کی تبدیلی کے باعث ہیڈ تبدیل کرنا پڑے گا، یہ کام فوراً کیا جائے گا اور نئی جگہ پر بھی اسی شرح سے آبیانہ ادا کیا جائے گا۔ اگر کوئی زمین دریا بہالے جائے تو اس کا آبیانہ معاف کر دیا جائے گا۔

12-4-1901 (دستخط شدگان) 1۔ محمد اکبر خان، کاردار، منچن آباد 2۔ غلام احمد، پیشکار، میکلوڈ گنج

13 اپریل 1901ء

آج حاصل سارو سے ڈھیکانوالہ تک سوار ہو کر آیا اور راستے میں درج ذیل کاموں کا معائنہ کیا:

I۔ حاصل سارو، قطب سارو، ڈونا جیون سارو اور قائمکا کے دریا کنارے واقع دیہات کے زمینداروں نے 14 کنوؤں کے لیے تقاوی حاصل کی تھی۔ ان میں سے 6 کنویں تیار اور فعال

ہیں، 3 زیرِتعمیر ہیں اور باقی 5 پر ابھی تک کام شروع نہیں کیا گیا۔ تقاوی حاصل کرنے والوں اور پیشکار کو کام میں تیزی لانے کی تاکید کی گئی ہے۔

II۔ میں نے صادقیہ شرقیہ نہر کا معائنہ کیا۔ یہ ایک حیرت انگیز نہر ہے جو چولستان جیسے صحرائی علاقے سے گزرتی ہے۔ اس نہر سے منسلکہ زمین ہموار ہے اور اعلیٰ معیار کی حامل ہے؛ یہاں کی فصلیں ایک یا دو پانی سے ہی پک جاتی ہیں۔ میں ذاتی طور پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ اگر ریاست کی طرف سے مزید سرمایہ لگایا جائے تو اس نہر کو قلعہ دراوڑ تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ میں اس بارے میں حتمی رائے نہیں دے سکتا جب تک ہریکے بیراج (HarikeWeir) کا معاملہ طے نہ ہو جائے جس کے متعلق مختلف افواہیں گردش میں ہیں۔

III۔ میں آج کے دورے کے دوران چولستان کے ان دیہات سے گزرا: باریکا ہٹھاڑ، روڑیوالا، تھاڈا، ڈھب نہال، ڈھب باریکا اُتار، منہا، جنڈ والا، ڈھیگانوالہ اور جھاٹیکا۔ ان دیہات کی زمین زرخیز اور ہموار ہے۔ گندم، جو اور توریا یہاں کی بہترین فصلیں ہیں۔ ان فصلوں کے لیے ایک یا دو بارشیں ہی کافی ہوتی ہیں۔ یہاں کے چکوک میں زیادہ تر مکانات کچے ہیں۔ آبپاشی کے لیے کچھ تالاب پہلے سے موجود ہیں اور جہاں زیرزمین پانی میٹھا ہے وہاں کنویں بھی کھودے جا رہے ہیں۔ یہ کنویں انسانوں اور مویشیوں کے لیے تو کارآمد ہیں لیکن زرعی مقاصد کے لیے پانی ناکافی ہے۔ چکدار بظاہر مستقل طور پر آباد ہو چکے ہیں لیکن ان کی بقا بارش پر منحصر ہے جو اس ریاست میں شاذ و نادر ہوتی ہے۔ پانی کی کمی کے پیشِ نظر چولستان کے تمام چکدار مجھ سے ملے اور مطالبہ کیا کہ سرہند نہر (SirhindCanal) کا پانی جو ریاست کی سرحد کے قریب پہنچ چکا ہے اور ہریکے بیراج کی تعمیر کے بعد بھی جاری رہے گا، انھیں فراہم کیا جائے تا کہ چولستان کا یہ حصہ ہمیشہ کے لیے آباد رہ سکے۔ چوں کہ یہ درخواست کاشتکاری میں بہتری سے متعلق ہے اور میرا دورہ اسی مقصد کے لیے ہے لہٰذا میں نے ان کی اُمید افزائی کی۔ بلاشبہ حکومت کی نہر سے پانی لینا کچھ مشکلات پیدا کرے گا لیکن فریدکوٹ اور بیکانیر جیسی ریاستوں کی مثالیں موجود ہیں۔ چولستان کے جس حصے کا تعلق منچن آباد کارداری سے ہے اور جو صادقیہ شرقیہ کے مشرق میں واقع ہے اس کی موجودہ ویرانی کے پیشِ نظر، مجھے یہ مناسب

معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کی کاشت کے لیے پانی حاصل کیا جائے۔

IV۔آج کے ساتھ میرا یہ دورہ مکمل ہوا۔6اپریل سے آج تک منچن آباد کارداری کا جتنا حصہ میں نے معائنہ کیا۔اس کا تفصیلی جائزہ مکمل کرلیا گیا ہے۔

V۔اس کارداری کے مالی گوشوارے کے مطابق مجموعی مطالبہ 3-0-3,55,690روپے جس میں سابقہ بقایا جات بھی شامل ہیں۔اس میں سے 11-0-2,67,181روپے مارچ 1901 تک وصول ہو چکے ہیں اور باقی 4-15-87,508روپے ابھی تک واجب الادا ہیں۔ یہ خاصی بڑی رقم ہے اس لیے مشیر مال اور مقامی کاردار کو تاکید کی جائے کہ وہ اس رقم کو ہر حال میں ربیع کی فصل سے وصول کریں کیوں کہ سیٹلمنٹ کی میعاد ختم ہونے والی ہے۔ اگر یہ بقایا جات وصول نہ کیے گئے تو یہ نئی جانچ پر منفی اثر ڈالیں گے۔

VI۔ تقاوی کنوؤں کے گوشوارے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کارداری میں 84,425 روپے کی رقم 199 کنوؤں کے لیے دی گئی تھی۔ان میں سے 32 مکمل ہیں،48 زیرِتعمیر ہیں اور 69 پر ابھی کام شروع نہیں ہوا۔ایک سال ہونے کو آیا لیکن ابھی تک صرف 82 کنویں مکمل ہوئے ہیں وہ بھی تسلی بخش نہیں۔خدانخواستہ اگر ستلج کا پانی بند ہو گیا تو یہ تمام کنویں ناکارہ ہو جائیں گے کیوں کہ ان کی کھدائی مکمل طریقے سے نہیں ہوئی۔مشیر مال، کاردار اور پیشکار کو تاکید کی جائے کہ بقیہ کنوؤں کو تسلی بخش طریقے سے مکمل کریں تاکہ لوگ معمولی فائدے کی بجائے نقصان سے محفوظ رہیں۔

VII۔اس کارداری میں زمینداروں کو 814 پکے موگے بنانے تھے جن میں سے 387 مکمل، 97 زیرِتعمیر اور 334 پر ابھی کام ہی شروع نہیں ہوا۔ یہ کارکردگی قابلِ تعریف نہیں۔ جو آؤٹ لیٹس بن چکے ہیں ان میں سے بعض کی تہہ نقشے کے مطابق نہیں ہے جسے درست کیا جانا چاہیے۔ باقی آؤٹ لیٹس کی تہہ سرویئر کے ڈیزائن کے مطابق بنائی جائے اور مواد کا معیار بہتر رکھا جائے کیوں کہ یہ کام عمومی طور پر ٹھیکے پر کیا جارہا ہے۔

VIII۔اس کارداری میں ریاستی فنڈ سے جن ریگولیٹرز کی منظوری دی گئی ہے ان کا تخمینہ 8-2-28,287 روپے ہے۔ یہ ریگولیٹرز درج ذیل مقامات پر بنائے جانے ہیں:

1۔ رائٹ برانچ 2۔ کلرواہ 3۔ صادقیہ شرقیہ 4۔ مراد واہ 5۔ فورڈ واہ 6۔ خالص واہ 7۔ گریواہ 8۔ دولتواہ جن کی مرمت ہونی ہے نمبر 1 اور 2 مکمل ہو چکے ہیں اور ان پر سابقہ ڈائریوں میں بات ہو چکی ہے۔ نمبر 3، 4، 5، 6 کے لیے سامان اکٹھا کیا جا رہا ہے جب کہ نمبر 7 اور 8 پر کام کا آغاز بھی نہیں ہوا۔ چوں کہ نہریں کھولنے کا وقت قریب ہے ان ریگولیٹرز کی تعمیر فوری اور پائیدار ہونی چاہیے تا کہ یہ لمبے عرصے تک کارآمد رہیں۔

IX۔ اس کارداری میں 71 دریا کنارے کے دیہات ہیں جن کا کل رقبہ 78,477 بیگھہ 2 کنال 1 مرلہ ہے اور وہ 1-9-69,031 روپے محصول ادا کرتے ہیں۔ Alluvion اور Diluvion کا کام 74 دیہات میں مکمل ہو چکا ہے، 12 میں جاری ہے اور 12 میں ابھی تک شروع نہیں ہوا۔ کاردار نے تا حال کسی بھی گاؤں کی پیمائش کی جانچ نہیں کی جو سخت قابلِ اعتراض غفلت ہے۔ زمین کے محصول میں کمی یا زیادتی انہی پیمائشوں پر منحصر ہے اس لیے یہ کاردار کا ایک اہم فرض ہے۔ یہ موضوع اسی ڈائری میں خیر پور کارداری کے حوالے سے مکمل طور پر زیرِ بحث آ چکا ہے۔ میری رائے میں ریاست بھر میں اس نظام کو یکساں ہونا چاہیے۔

X۔ اس کارداری میں عوامی عمارات کی مرمت کے لیے 7-11-1,068 روپے کی رقم منظور کی گئی تھی۔ اس میں سے 9-6-429 روپے کی مرمت مکمل ہو چکی ہے اور حسابات بھیج دیے گئے ہیں، 6-11-589 روپے کے کام جاری ہیں اور 4.-9-49 روپے کے کاموں پر ابھی تک آغاز نہیں ہوا۔

میری رائے میں ان کاموں کی سخت نگرانی ہونی چاہیے کیوں کہ عوامی عمارات کی پائیداری افسران کی نگرانی پر منحصر ہوتی ہے۔ مشیر تعمیرات کو چاہیے کہ دورے کے دوران مکمل اور زیرِ تعمیر دونوں اقسام کے کاموں کا خود معائنہ کریں، حسابات کی جانچ کریں اور تصدیق کریں تا کہ عملہ ذمے داری سے کام کرے۔

یہ ڈائری اصل حالت میں ناظم اعلیٰ یعنی Superintendent کو برائے اطلاع و ضروری کارروائی ارسال کی گئی ہے۔

نوابِ بہاول خاں پنجم کے دوسرے دورے کی ڈائری
16 مئی تا 30 مئی 1901

مورخہ 16 مئی 1901

14 مئی 1901 کولاہور سے شام کی ریل گاڑی کے ذریعے روانگی کے بعد میں 15 مئی کی صبح بہاول پور پہنچا اور اسی رات 11 بجے حمایتی اسٹیشن سے روانہ ہو کر آج صبح تقریباً 2:30 بجے خیر پور پہنچا۔ دوپہر کے وقت خزانے کا معائنہ کیا گیا۔ کل موجود رقم رجسٹر کے مطابق درست پائی گئی، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

شے	رقم
کرنسی نوٹ	1,060-0-0
روپیہ سکہ	71,063-0-0
آٹھ آنے کے سکے	184-0-0
چار آنے کے سکے	219-0-0
دو آنے کے سکے	85-0-0
تانبے کے سکے	43-1-6
کل	72,654-1-6

ڈاک ٹکٹوں کی مالیت 4,165-12-0 روپے بھی درست پائی گئی، تفصیل درج ذیل ہے:

عدالتی اسٹامپ: 3,446-15-0 روپے، بل اسٹامپ: 544-0-0 روپے، رسید و

سٹیفکیٹ اسٹامپ: 0-12-139 روپے، عرضداشت اسٹامپ: 0-1-27 روپے، ڈاک ٹکٹ: 0-4-5 روپے، سرکاری ڈاک ٹکٹ: 0-12-2 روپے۔ کل: 0-12-4,165 روپے

رجسٹر کے مطابق 3-13-3,587 روپے بطورڈپازٹ موجود پائے گئے، جن میں سے 11-14-2,882 روپے کی تفصیل درج ذیل ہے:

نمبر شمار	کام کی نوعیت	منظوری کی تاریخ	رقم نکالنے کی تاریخ	رقم
1	صادق واہ کی توسیع	17-3-1898	30-3-1899	80-5-3
2	۔قائم واہ کی کھدائی	30-12-1898	29-3-1900	647-15-4
3	جی۔ٹی۔ایس ٹاورز کی مرمت	18-11-1900	4-12-1900	10-7-4
4	چشتیاں کی سرائے کی مرمت	25-11-1900	27-3-1901	138-3-0
5	فورڈ واہ کی شاخ کی کھدائی	18-01-1901	27-3-1901	2006-0-0
6	کل روپے			2882-14-11

نمبر :1 یہ رقم تین سال قبل 30 مارچ 1899 کو نکالی گئی تھی مگر تا حال تصفیہ نہ ہو سکا حالانکہ نہر دو سال سے جاری ہے۔ اگر واجب الادا افراد دستیاب ہوں تو رقم ایک ہفتے میں تقسیم کی جائے بصورت دیگر خزانے میں جمع کر دی جائے اور اطلاع دی جائے۔ مشیر مال سے دریافت کیا جائے کہ کیا 17 مارچ 1898 کو منظور شدہ 3,083 روپے کا حساب بھیجا گیا؟ اگر نہیں تو تاخیر کی وجہ اور کوتاہی کس کی ہے؟

نمبر :2 قائم واہ کی کھدائی کے لیے 30 دسمبر 1899 کو 9,430 روپے منظور ہوئے جن میں سے 8-0-2,782 روپے خرچ ہوئے۔ بچی ہوئی رقم 4-15-647 روپے 14 ماہ بعد 19 مارچ 1901 کو بطور بچت نکالی گئی جب کہ نہر مکمل ہو کر گذشتہ برس ہی جاری ہو چکی ہے۔ مشیر مال سے وضاحت طلب کی جائے کہ اب تک حساب کیوں نہ بھیجا گیا اور بچی ہوئی رقم خزانے میں فوراً جمع کرائی جائے۔ آئندہ تکمیل رپورٹ کے 3 ماہ کے اندر حسابات خزانے میں جمع ہوں اور بچی رقم فوری طور پر خزانے میں واپس کی جائے۔ صدر پیشکار اس امر کی نگرانی کا ذمہ دار ہوگا۔

نمبر :3 جی ٹی ایس ٹاورز کی مرمت کے لیے 18 نومبر 1900 کو منظور شدہ 4-7-10

روپے کی رقم 4 دسمبر 1900 کو نکالی گئی مگر تا حال ڈپازٹ میں موجود ہے۔ یا تو کام شروع نہیں ہوا یا مزدوری کی ادائیگی نہیں ہوئی۔ یہ عمل سخت قابل اعتراض ہے۔ مشیر مال کو وضاحت دینی چاہیے۔

نمبر :4 اگر مرمت درکار تھی تو اتنی تاخیر کیوں؟ اور اگر درکار نہ تھی تو منظوری کیوں لی گئی؟ محکمہ تعمیرات کو آئندہ صرف ضروری کاموں کی منظوری حاصل کرنے اور رقم صرف کام شروع ہونے پر نکالنے کی ہدایت دی جائے۔

نمبر :5 چوں کہ نہری موسم قریب ہے اور نیل کی کاشت کا وقت ہاتھ سے نکلنے کا اندیشہ ہے، لہٰذا کام فوری مکمل کیا جائے اور 0-0-2,006 روپے کی رقم بھی کام مکمل ہونے کے بعد تصفیہ کی جائے۔

بقیہ رقم 11-14-2,882: روپے کو کل ڈپازٹ 3-13-3,587 میں سے منہا کرنے پر 4-14-704 روپے باقی رہتے ہیں، جن کی تفصیل:

الف۔ مستقل ایڈوانس 20 روپے، جن میں سے 9-10-12 روپے 1895 میں خرچ ہو چکے، اب تک حساب کیوں نہ دیا گیا؟

ب۔ پٹواریوں، میر آبوں، چوکیداروں کی تنخواہیں، جو فوری طور پر صدر پیشکار یا مقامی پیشکار کے ذریعے منتقل کی جانی چاہئیں تاکہ تاخیر نہ ہو اور بروقت حسابات مکمل ہوں۔ مشیر مال کو ہدایات جاری کی جائیں

II۔ آمدنی کی وصولی کا بیلنس شیٹ

آمدنی کی بیلنس شیٹ کے جائزے سے معلوم ہوا کہ 31 مارچ 1900 کو واجب الادا بقایا رقم 1-10-44,028 روپے تھی، جس میں ریونیو 4-14-43,798 روپے اور ترنی 9-11-229 روپے شامل تھے۔ ذیل میں ہر پیشکاری کے لیے تفصیل دی جا رہی ہے:

پیشکاری	31 مارچ 1901 تک بقایا رقم	15 مئی 1901 تک وصولی	16 مئی 1901 کو باقی

شہرفرید	38131-13-0	1436-1-11	36695-11-1
قائم پور	4152-10-7	1152-1-6	3000-9-1
خیر پور	1514-6-9	1394-7-4	119-8-5
کل ریوینیو	43798-14-4	3982-10-9	39816-?-?
ترنی	229-11-9	19-3-8	210-?-?
مجموعی کل رقم	44028-10-1	4001-14-6	40026-?-?

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہوتا ہے کہ کل واجب الادا رقم 44,028-10-1 روپے میں سے صرف 4,001-14-6 روپے وصول کیے گئے ہیں۔ یہ وصولی متعلقہ افسران کی کارکردگی کے لیے باعثِ شرمندگی ہے، خاص طور پر ترنی کی مد میں صرف 19-3-9 روپے وصول ہوئے جب کہ یہ معمولی رقم ہر مویشی کے مالک سے بطور علامتی حصہ وصول کی جاتی ہے اور معمولی کوشش سے باآسانی جمع کی جاسکتی ہے۔

جب میں اپریل میں شہرفرید پیشکاری کے دورے پر تھا تو مشیر مال اور کاردار کو بقایاجات کی وصولی کے بارے میں ہدایت کی گئی تھی لیکن موجودہ رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں کوئی عملی اقدام نہیں کیا گیا۔

III۔ سپرنٹنڈنٹ نے 24 مارچ 1901 کو یہ حکم دیا تھا کہ ربیع کی مانگ 15 مئی اور خریف کی 15 اکتوبر کو واجب الادا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود تاخیر کا ہونا سخت قابل اعتراض ہے۔ مشیر مال سے دریافت کیا جائے کہ ربیع 1958 کی ڈیمانڈ اب تک کیوں نہ متعین کی گئی؟ 44,086-2-9 روپے ربیع کی ڈیمانڈ کے طور پر ایڈوانس میں وصول کیے گئے ہیں جو کہ جب ڈیمانڈ کا تعین نہ کیا جائے اسی کھاتے میں جمع کر دیے جائیں گے اور یوں پوری ڈیمانڈ بروقت مکمل ہو جائے گی، کیوں کہ فصلوں کی حالت عمومی طور پر تسلی بخش ہے۔

IV۔ تیرنی کی کل مانگ 20,614-0-6 روپے میں سے 16,650-2-9 روپے وصول ہو چکے اور خزانے میں جمع کیے جا چکے ہیں۔ باقی ماندہ رقم 3,950-1-9 روپے ہے، جو فوری طور پر

خزانے میں جمع کرائی جائے۔

V۔تقاوی ریکارڈز کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کارداری میں 79,905-8-0 روپے کی درخواستیں داخل ہوئیں، جن میں سے 55,107-8-0 روپے کی درخواستیں مشیر مال کو سفارش کے لیے بھیجی گئیں اور ان میں سے 53,765 روپے کی منظوری مشیر کے دفتر سے حاصل ہو چکی ہے۔ باقی 1,342-8-0 روپے کی درخواستوں پر مشیر مال کو فوری فیصلہ کرنے کی ہدایت کی جائے جب کہ 24,298 روپے کی مسترد شدہ درخواستوں کی وجہ بھی مشیر مال سے دریافت کی جائے۔منظور شدہ رقم 53,765 روپے میں سے 42,137-8-0 روپے مستحقین میں تقسیم کیے جا چکے ہیں جب کہ باقی 11,627-8-0 روپے تا حال ڈپازٹ میں موجود ہیں۔تاکید کی جائے کہ یہ رقم صرف اسی مقصد پر خرچ ہو جس کے لیے منظور ہوئی ہے، نہ کہ کسی اور کام پر۔کاردار اور مقامی پیشکار کو اس کی نگرانی کی ذمہ داری دی جائے تاکہ ماضی کی طرح کوئی کوتاہی نہ ہو جیسا کہ منچن آباد کارداری میں پیش آئی۔

VI۔اس کارداری میں کل 47 دریا کنارے (riparian) دیہات ہیں۔پچھلے سال کے زمین کے ابھار و کٹاؤ کے کاغذات کے مطابق ان کی کل اراضی 2,50,212-1-7 بیگھہ اور آمدنی 49,443-13-7 روپے تھی جب کہ اس سال کی رپورٹ کے مطابق اراضی 2,48,899-2-4 بیگھہ اور آمدنی 50,806-8-5 روپے ہے۔اس کا مطلب ہے کہ اراضی میں 1,312-3-5 بیگھہ کی کمی اور آمدنی میں 1,962-10-10 روپے کا اضافہ ہوا ہے۔لیکن تا حال پچھلے سال کی دریا سے بحال اور دریا برد ہونے والی زمینوں کی کارروائی کی منظوری حاصل نہیں کی گئی، غالباً اس لیے کہ پیمائش کی جانچ وقت پر مکمل نہیں ہو سکی۔آئندہ، اس سلسلے میں 5 اپریل 1901 کی ڈائری میں دی گئی ہدایات پر سختی سے عمل درآمد کیا جائے۔

VII۔غیر منقولہ جائیداد سے متعلق التواء میں پڑے مقدمات کے رجسٹر سے معلوم ہوا کہ کل 13 مقدمات ابھی تک زیر التواء ہیں، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

سال۔1899=3، 1900=6، 1901=4 = 13

ان اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقدمات کی جلد از جلد نمٹائی میں کوئی دلچسپی نہیں لی جا رہی حالانکہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔اس غفلت کے باعث متعلقہ فریقین کو ہر پیشی پر غیر ضروری زحمت اور مالی نقصان ہوتا ہے۔مشیر مال کو چاہیے کہ وہ کاردار کی توجہ اس جانب دلائے اور 1899ء و 1900 کے مقدمات کو 15 جون 1901 تک ہر صورت نمٹایا جائے۔آئندہ یہ اصول طے کیا جائے کہ کوئی مقدمہ ایک سال سے زائد زیر التواء نہ رہے اِلاّ یہ کہ کوئی خاص وجہ ہو۔اس مقصد کے لیے ایک ماہانہ رپورٹ کارداروں سے مشیر مال کو بھیجی جانی لازم ہے لیکن افسوس کہ مشیر مال اس پر عمل درآمد میں دلچسپی نہیں لے رہا۔آئندہ یہ خامی دور کی جائے۔

VIII۔مردم شماری 1891ء میں خیر پور کارداری کی آبادی 73,412 تھی جب کہ 1901ء کی مردم شماری میں یہ بڑھ کر 81,716 ہوگئی یعنی 8,304 نفوس کا اضافہ ہوا۔دونوں سالوں کے اعداد وشمار کا تقابلی جائزہ ذیل میں پیش ہے

خیر پور شہر کی آبادی 1891 میں 2487 مرد، 2243 عورتیں کل 4730 جب کہ 1901 میں یہی تناسب 2636 اور 2282 کے ساتھ کل تعداد 4913 تھی۔اس طرح ان دو سالوں میں 149 مردوں اور 39 عورتوں کے ساتھ کل اضافہ 188 نفر تھا۔خیر پو مفصل کی آبادی 1891 میں 40765 مرد، 27917 عورتیں کل نفر 68692 جب کہ 1901 میں یہی تناسب 41798 اور 5010 کے ساتھ کل تعداد 76798 تھی۔ان دو سالوں میں 1023 مردوں اور 7098 عورتوں کے ساتھ کل اضافہ 8116 نفر تھا۔اس طرح خیر پور کارداری کی آبادی 1891 میں 43252 مرد، 30160 عورتیں کل 23417 جب کہ 1901 میں یہی تناسب 41425 اور 37202 کے ساتھ کل تعداد 81716 تھی۔اس طرح ان دو سالوں میں 1172 مردوں اور 7132 عورتوں کے ساتھ کل اضافہ 8304 نفر تھا۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ گذشتہ برسوں میں پیداوار اچھی رہی ہے اور عوام کو عمومی طور پر امن نصیب رہا ہے۔یہ ڈائری اصل حالت میں اطلاع کے لیے سپرنٹنڈنٹ کو بھیجی جاتی ہے۔

17 مئی 1901

آج میں نے دو مرحلے طے کیے اور خیر پور کارداری کے علاقے چیلہ واہن میں قیام کیا۔ جن امور کا معائنہ کیا گیا ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

I۔معروف واہ نہر کے معائنہ پر معلوم ہوا کہ یہ نہر جاری ہے۔اس سے نکلنے والی تمام کسیوں کے سروں پر پتھریلی آؤٹ لیٹ (Masonry Outlets) موجود ہیں۔نہر کے آخری سرے پر تقریباً ڈھائی فٹ پانی بہہ رہا ہے۔نیل کی کاشت خوب ہری بھری نظر آئی اور زمینداروں نے کنگنی کی فصل بھی عام طور پر کاشت کی ہوئی ہے۔

II۔تولا واہ کی بہاول واہ شاخ کا معائنہ کیا گیا۔مرکزی نہر جو اس شاخ کے سرے سے لے کر اسرانی گاؤں تک جاتی ہے اس قدر نشیبی ہے کہ اطراف کی زمینوں کو بغیر (لفٹ) مشین کے ذریعے پانی فراہم نہیں ہوسکتا۔کچھ مقامات پر ایسی گہرائیاں ہیں جہاں سے سیلاب کے دنوں میں پانی دریا میں بہہ جاتا ہے۔ بہاول واہ ایک باقاعدہ ڈیزائن شدہ نہر ہے جو اطراف کی زمینوں کو بہاؤ سے سیراب کر سکتی ہے۔تولا واہ کی خامی کو دور کرنے کے لیے بہاول واہ کو اس کے ہیڈ سے چھ میل تک چوڑا کر کے تولا واہ سے جوڑ دیا گیا ہے تا کہ جو پانی اس حصے سے پہلے دریا میں بہہ جایا کرتا تھا وہ اب ضائع نہ ہو بلکہ بہاول واہ کے اطراف کی زمینوں کی آبپاشی میں استعمال ہو۔اس چوڑے کیے گئے حصے کا پانی ایک موڑ (diversion) کے ذریعے تولا واہ میں ڈالا جاتا ہے جسے لفٹ کے ذریعے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بہاول واہ کا توسیعی کام ابھی مکمل نہیں ہوا۔ بہاول پور کے کاردار کو ہدایت دی جائے کہ ایک ہفتے کے اندر باقی تمام حصے صاف کروائے۔ان کا کہنا ہے کہ ان کا محرر انہار "مولچند" اس کام کی نگرانی کر رہا ہے۔میری تجویز ہے کہ محرر اور وہ لمبردار جو خیر پور و بہاول پور سے کھدائی کے کام میں شریک رہے انھیں سالگرہ دربار میں خلعت دی جائے تا کہ دیگر افسران بھی ان کی تقلید کریں۔نہر کے کچھ کناروں پر درخت ایسے مقام پر ہیں کہ سیلاب کے موسم میں وہ گر سکتے ہیں اور نہر کے اندر جا کر رکاوٹ اور گاد کا سبب بن سکتے ہیں۔ایسے درخت فوراً کاٹ کر نہر کے بیڈ سے باہر نکال دیے جائیں۔پانی کے بہاؤ کے اسی موسم میں نشانِ پیمائش (benchmarks) بھی نصب کر دیے

جائیں اور نمبر والے ستون بھی کھڑے کیے جائیں۔اس سلسلے میں مشیر مال کو ہدایت دی جائے۔
یہ ڈائری اصل حالت میں اطلاع کے لیے سپرنٹنڈنٹ کو بھیجی جاتی ہے۔

18 مئی 1901

آج صبح چیلہ واہن سے روانہ ہوکر ریگولیٹر نمبر 1 تک پہنچا اور راستے میں درج ذیل امور کا معائنہ کیا گیا:

I۔حسین واہ کے لیے اس سال دو ہیڈ منتخب کیے گئے ہیں: (الف) اوپری ہیڈ جس کا تذکرہ میری ڈائری مؤرخہ 17 مئی میں ہو چکا ہے۔(ب) زیریں ہیڈ، جس کا آج معائنہ کیا گیا اور جو گذشتہ جاڑے میں کھولا گیا تھا۔ دریا میں پانی کی قلت کے باعث (الف) ہیڈ خشک ہونے کا امکان رکھتا ہے (ب)۔ ہیڈ استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہیڈ دریا سے پکی نہر تک 10 میل اور 5 میل کے فاصلے پر ہے۔فی الحال حسین واہ میں سرے سے حاصل کردہ 4 فٹ پانی بہہ رہا ہے۔

II۔حسین واہ کے پکے ہیڈ کے سامنے دریا کی دھارا بند کرنے کے لیے جو بند پچھلے جاڑے میں ندی میں بنایا گیا تھا تا کہ پانی دریا کی طرف نہ نکل جائے اور دونوں سروں کے لیے محفوظ رہے۔اس بند کا شمالی سرا اتنا طویل نہیں بنایا گیا اور مخالف طرف ایک نالی چھوڑ دی گئی، نتیجتاً اچانک آنے والے سیلاب نے بند کو توڑ دیا اور دونوں سروں کا پانی دریا میں نکل گیا۔تیز بہاؤ کے باعث یہاں شگاف گہرا ہو گیا ہے جسے بند کرنا بہت محنت طلب ہوگا۔مزید یہ کہ اس وقت دریا سے پانی الٹا بہتا ہوا حسین واہ کے سرے تک آ رہا ہے۔(الف) سرا جو 6 یا 7 فٹ بلند ہے، اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتا جب تک بند مکمل طور پر مرمت نہ کیا جائے۔بصورت دیگر، زیادہ اور بلند پانی اس شگاف سے نکل کر دریا میں بہہ جائے گا لہٰذا، جب تک (ب) سرا صاف کیا جا رہا ہے، بند کی مرمت ناگزیر ہے تا کہ بہاؤ کے موسم سے قبل سرا استعمال میں لایا جا سکے بصورت دیگر سیلابی موسم میں دونوں سروں کے پانی کے دباؤ سے بند ٹوٹ جائے گا۔اس صورت حال سے مشیر مال اور کاردار کو مطلع کیا جائے تا کہ سرا صاف ہوتے ہی بند کی مرمت ہو جائے۔

III۔تولا واہ کے آخری سرے کا معائنہ کیا گیا۔اس کا معمول کا صفائی کا کام مکمل ہو چکا ہے اوراس کی کسیوں پرآؤٹ لیٹس تیار ہیں سوائے چند ایک کے جنھیں بنانے کی ہدایت کاردار کو دی گئی ہے۔ابھی ایک میل صفائی باقی ہے جس پر خیر پور کے آب نوش کہتے ہیں کہ وہ بہاول پور کے آب نوشوں کی ذمہ داری ہے جب کہ بہاول پور والے کہتے ہیں کہ یہ خیر پور والوں کا کام ہے لہٰذا دونوں کارداراس تنازع کوفوراً طے کریں تا کہ ایک ہفتے کے اندر کام مکمل ہواور نہر کھول دی جائے۔

IV۔اچرانی، گوٹھ نور محمد، گوٹھ شاہ محمد، کودن، بونگا، اور لال سہانرا کے دیہات میں تقاوی کنوؤں کا معائنہ کیا گیا۔اس کارداری میں کل 23 کنویں منظور کیے گئے تھے جن میں سے 6 مکمل ہو کر کام کر رہے ہیں، 12 زیرِتعمیر ہیں جب کہ 5 ابھی شروع بھی نہیں ہوئے۔کاردار سے وضاحت طلب کی جائے کہ کام میں اتنی تاخیر کیوں ہوئی اورفوری تکمیل کی ہدایت کی جائے۔کودن گاؤں کے چار کنویں جو زیرِتعمیر ہیں قریب ہی دریا پہنچ چکا ہے۔اگر کٹاؤاسی طرح جاری رہا تو یہ کنویں دریا میں بہہ جائیں گے۔آئندہ تقاوی فائلیں تیار کرتے وقت اس قدرتی آفت کوملحوظ رکھا جائے تا کہ زمینداروں کی رقم ضائع نہ ہو۔

V۔حسین واہ کا ریگولیٹر نمبر 4، بھلو واہ اور میر واہ ریگولیٹرز کا معائنہ کیا گیا۔عمارت عمدگی سے مکمل ہو چکی ہے۔صرف میر واہ ریگولیٹر کا درمیانی شہتیر ناقص ہے جسے فوراً درست کیا جائے وگرنہ نیڈل (سوئی نما پٹیاں) ڈالنے پر شہتیر ٹوٹ جائے گا۔تینوں ریگولیٹرز کے نیڈلز موقع پر موجود ہیں۔ یہ ڈائری اصل حالت میں سپرنٹنڈنٹ کوارسال کی جاتی ہے۔

19 مئی 1901

آج ریگولیٹر نمبر 1 سے جھانگیوالی تک ٹور کیا گیا اور درج ذیل امور کا معائنہ کیا گیا:

I۔حسین واہ نہر کی میر واہ شاخ کا معائنہ کیا گیا۔اس کی صفائی منصوبہ بندی کے مطابق مکمل ہو چکی ہے۔افسوس کہ اس نہر کی نشیبی زمینوں کا بڑا حصہ دریا نے کاٹ لیا ہے جب کہ بالائی زمینیں مکمل کاشت کے تحت دیکھی گئیں۔

II ۔حسین واہ کے اس نئے کٹ کا مشاہدہ کیا گیا جو دریا سے نقصان کے باعث گذشتہ

سال کھودا گیا تھا۔ اگر چہ یہ کٹ اب بھی جاری ہے لیکن اس میں ایک بہت بڑی خامی ہے کہ ایک سال گزر جانے کے باوجود اس کے اندر نشانِ پیائش (benchmarks) نصب نہیں کیے گئے اور کناروں پر نمبر والے ستون بھی موجود نہیں۔ محکمہ مال و تعمیرات کو ہدایت دی جائے کہ اس ندی میں فوری طور پر نشانِ پیائش نصب کریں اور موسم بہاؤ کے بعد اس کے مطابق صفائی مکمل کریں۔

III۔ دریا کا بہاؤ ٹھل سُہانرا، چکلا اور کرِ مانی کی طرف ہے جس کے باعث ان گاؤں کی بڑی زرعی زمین دریا میں کٹ چکی ہے۔ اگر چہ کٹی ہوئی زمین دریا کے مخالف کنارے پر ہے اور وہ ریاست کے اپنے چک سے ملی ہے پھر بھی اس تبدیلی سے ریاستی آمدنی کو نقصان پہنچا ہے۔

IV۔ برن واہ کے ہیڈ کا معائنہ کیا گیا۔ اس کی حالت تسلی بخش ہے۔ دریا کا بہاؤ اس سرے کی طرف ہے لیکن فی الحال کٹاؤ کا خطرہ نہیں۔ اس وقت نہر میں 2 سے 4 فٹ پانی بہہ رہا ہے۔

V ۔ برن واہ بند کا مشاہدہ کیا گیا جو مٹی سے بھر کر محفوظ ہو چکا ہے۔ اس بند میں صرف ایک خامی ہے کہ یہ اونچائی میں ناکافی ہے۔ مشیر مال اور مقامی کاردار کو ہدایت دی جائے کہ چند ملازم ریگولیٹر کی نگرانی کے لیے اور دو میر آب دن رات بند پر تعینات کریں تا کہ وہ اس کے شمالی سرے کو ٹوٹنے سے بچا سکیں کیوں کہ سیلابی موسم میں اکثر بند یہیں سے ٹوٹتے ہیں۔

VI ۔ آج کے معائنے کے دوران جو زمینیں دیکھی گئیں وہ تمام زیرِ کاشت تھیں اور ان پر عمدہ فصلیں کھڑی تھیں، جن کی کٹائی جاری تھی۔

VII۔ چکلا، کرِ مانی، سیف پور، جاگیر جمعدار غلام محمد خان، اور جھانگیوالی کے دیہات میں تقاوی کنوؤں کا معائنہ کیا گیا۔ کل 16 کنویں منظور ہوئے، جن میں سے 4 کام کر رہے ہیں، باقی 12 زیرِ تعمیر ہیں۔ کاردار کو ہدایت دی جائے کہ ان کی تکمیل میں تیزی لائے۔

20 مئی 1901

آج صبح جھانگیوالی سے روانہ ہو کر بہاول پور کی طرف سفر کرتے ہوئے میں نے درج ذیل کاموں کا معائنہ کیا:

I۔ پکّا واہ اور غنی واہ کے ریگولیٹرز کا معائنہ کیا گیا۔ ان کی عمارتیں درست حالت میں ہیں

اور موقع پر درکار نیڈلز (Needles) بھی موجود پائے گئے۔

II۔ برن واہ نہر کے تقریباً 5 یا 6 میل حصے کا معائنہ کیا گیا۔ اس کی مغربی پٹی مکمل طور پر خراب ہے یہاں تک کہ معمولی سیلاب میں بھی اس میں شگاف پڑ جاتے ہیں جن سے پانی بہہ نکلتا ہے۔ گذشتہ سال بھی کچھ مقامات پر پانی مغربی کنارے سے باہر نکل گیا تھا جسے بڑی دشواری سے بند کیا گیا۔ سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ دریا مغرب کی جانب واقع ہے اور زمینیں عمومی طور پر نشیبی ہیں۔ جب شگاف پڑتے ہیں تو پورا نہری پانی انہی میں بہہ جاتا ہے۔ ایک اور نقصان دہ امر یہ ہے کہ زمیندار جب کاشتکاری کے موسم میں مصروف ہوتے ہیں تب انھیں شگاف بھرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور پانی بند کر دیا جاتا ہے جو بڑی پریشانی کا باعث بنتا ہے۔ اس آفت سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ صفائی کے کام کے ساتھ ساتھ شگاف بھی بند کیے جائیں بلکہ شگافوں کا بند کیا جانا صفائی سے بھی زیادہ اہم ہے۔ فی الوقت اس نہر کی مکمل مرمت کی جائے تاکہ سیلابی موسم میں پکے سرے سے لے کر سا ہلاں ریگولیٹر تک کسی بھی مقام سے پانی باہر نہ نکل سکے۔ آئندہ کے لیے مشیر مال کو ہدایت دی جائے کہ صفائی کے ساتھ شگافوں کی مرمت بھی آب نوشوں کے ذریعے کروائی جائے۔ اگر آئندہ سال اس حکم کی خلاف ورزی پائی گئی، تو متعلقہ پیشکاروں سے جواب طلبی کی جائے گی۔

III۔ سا ہلاں ریگولیٹر کا معائنہ کیا گیا جو نہر کے مغربی کنارے پر واقع ہے اور زمینوں کو سیراب کرتا ہے۔ اس کے سامنے زمین دو اقسام کی ہے: بائیں کنارے پر زمین اونچی ہے جب کہ دریا کی طرف زمین نشیبی ہے۔ پہلی قسم کی زمین اس وقت تک سیراب نہیں ہو سکتی جب تک ریگولیٹر بند نہ کر دیا جائے جب کہ دوسری زمین دریا کے سیلاب سے سیراب ہو جاتی ہے۔ ان دونوں علاقوں کے درمیان کوئی بند موجود نہیں جو پانی کو روک سکے تاکہ خشک موسم میں بھی زمین سیراب ہو سکے۔ موجودہ گہرے نشیبی مقامات نہری پانی کو دوسری طرف لے جاتے ہیں جس سے پہلی قسم کی زمین محروم رہ جاتی ہے یا ریگولیٹر کو طویل عرصے تک بند رکھنا پڑتا ہے لہٰذا ان نشیبی مقامات کو بند سے محفوظ کر دینا چاہیے تاکہ پانی ضائع نہ ہو اور سیرابی بروقت ممکن ہو۔

IV ۔ خان واہ کے سرے کے بالمقابل واقع برن واہ ریگولیٹر کا معائنہ کیا گیا۔ اس کی

مغربی دیوار کونقصان پہنچا ہوا پایا گیا۔کاردار کا کہنا ہے کہ یہ نقصان ابتدا سے ہی موجود ہے۔اس کے علاوہ درمیان کا شہتیر جو نیڈلز کو سہارا دیتا ہے نا قابلِ اعتماد معلوم ہوتا ہے۔چوں کہ اس سال نہر چل رہی ہے اس لیے فی الحال اس شہتیر کو تبدیل کرنا ممکن نہیں۔جب نہر خشک ہو تو شہتیر کا معائنہ کر کے ناقص حصوں کو تبدیل کیا جائے۔اس بابت مشیر مال کو اطلاع دی جائے۔

V۔تمام کسیوں پر باقاعدگی سے پتھریلے آؤٹ لیٹس بنائے گئے ہیں اوران پر شٹرز نصب ہیں۔

VI ۔نوباہ، گوٹھ شاکر اور ساہلاں کے دیہات میں تقاوی کنوؤں کا معائنہ کیا گیا۔ان دیہات میں 9 کنویں منظور ہوئے تھے جن میں سے 3 کام کررہے ہیں،4 زیرِتعمیر ہیں جب کہ 2 کے لیے ابھی سامان بھی دستیاب نہیں۔کاردار سے وضاحت طلب کی جائے کہ اتنے عرصے کے بعد بھی یہ کنویں کیوں مکمل نہیں ہوئے۔

VII۔آدم واہن پل کے مشرق میں جہاں دریا اپنے کنارے کو کاٹ رہا ہے اس مقام کا معائنہ کیا گیا۔اندیشہ ہے کہ اگر سیلاب آیا تو دریا ایک نئی مشرقی سمت اختیار کر لے گا اور یوں یہ پل ناکارہ ہو جائے گا۔بطور احتیاط، ریلوے حکام نے ریاست سے 550 بیگھہ زمین حاصل کی اور ایک مضبوط بند تعمیر کیا تا کہ سیلاب کے پانی کو مغرب کی طرف داخل ہونے سے روکا جا سکے۔مزید یہ کہ دریا کے کنارے پر پتھروں کا بند بھی تعمیر کیا گیا اور نشیبی علاقے میں ایک بند باندھا گیا تا کہ کٹاؤ کو روکا جا سکے اور دریا کا دھارا موڑ دیا جائے۔نتیجتاً کٹاؤ اب رک چکا ہے اور دریا کا بہاؤ بھی تبدیل ہوتا نظر آ رہا ہے۔

VIII ۔گذشتہ ڈائریوں میں پتھریلی آؤٹ لیٹس کی تفصیل دی گئی تھی۔اب بہاول پور کارداری میں عمومی پیش رفت بیان کی جاتی ہے: کل آؤٹ لیٹس کی تعداد: 1,157۔مکمل ہو چکے: 922۔زیرِتعمیر: 10۔ابھی تک شروع نہیں کیے گئے: 222۔چوں کہ کارداروں کو اختیار دیا گیا ہے کہ آؤٹ لیٹس اپنی صوابدید پر تعمیر کریں یا ترک کریں لہٰذا وہ فوری طور پر فیصلہ کریں کہ کن کسیوں پر آؤٹ لیٹس درکار ہیں اور کن پر نہیں۔اس بارے میں رپورٹ 15 جون 1901 تک پیش کی جائے۔

IXó پوری کارداری میں کل 9 ریگولیٹرز کی منظوری دی گئی جن پر کل لاگت 1-8-2,542 روپے تھی: مکمل: 8۔نامکمل: 1 لاگت 8-9-932 روپے جلد از جلد مکمل کیا جائے۔

X۔17اور 18 مئی کی ڈائریوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمیندار حسین واہ کے ہیڈ کی صفائی دیر سے کر رہے ہیں۔اس کے لیے تو انھیں ادائیگی کی جائے گی لیکن بند کے کام کی ادائیگی نہیں کی جائے گی جو ایک بڑا کام ہے لہٰذا مناسب ہوگا کہ ان تمام لمبرداروں اور زیلداروں کو جنھوں نے بڑی تعداد میں محنت کشوں کی قیادت کی اور خود موجود رہے، سالگرہ دربار میں کاردار اور پیشکار کے ساتھ بلایا جائے اور وزیر کی سفارش پر انھیں خلعت دی جائے علاوہ ان کے جو عمومی طور پر دی جاتی ہیں۔ایسے افراد کی فہرست مشیر مال سے طلب کی جائے۔یہ ڈائری اصل صورت میں سپرنٹنڈنٹ کو پیش کی جاتی ہے۔

21 مئی 1901

20 مئی 1901 کو میں نے سہ پہر ساڑھے تین بجے ریل گاڑی لی اور شام 8 بجے خان پور پہنچا۔21 مئی کو کیے گئے کام درج ذیل ہیں:

I۔کارداری دفتر کا معائنہ کیا گیا۔20 مئی 1901 تک کے بیلنس رجسٹر کے مطابق 48,624-9-6 روپے نقدی درست پائی گئی۔تفصیل حسب ذیل ہے۔

کرنسی نوٹ	240-0-0 روپے
روپیہ سکّے	48,052-0-0 روپے
آٹھ آنے کے سکے	81-0-0 روپے
چار آنے کے سکے	115-0-0 روپے
دو آنے کے سکے	166-0-0 روپے
تانبے کے سکے	0-9-6 روپے
کل	48,624-9-6 روپے

اس کے علاوہ 5,042-7-0 روپے کی 21 مئی 1900 کی وصولی بھی موجود تھی، یوں کل نقدی بیلنس 53,667-6-0 روپے بنتا ہے۔اس کے علاوہ، درج ذیل مدات میں 358-2-2 روپے کی ڈپازٹ رقم موجود پائی گئی۔:

مد	رقم

متفرق اخراجات 2-2-6روپے

چاول کی خریداری9-9-39 روپے

تیرنی0-7-110روپے

کارداری عملے کی تنخواہیں6-15-128روپے

محرروں کی تنخواہیں0-0-12روپے

جنگلات کے ملازمین کی تنخواہیں0-8-24روپے

میرابوں کی تنخواہیں9-7-36روپے

کل2-2-358روپے

تنخواہوں کی ڈپازٹ رقم کو بروقت خرچ کیا جانا چاہیے تاکہ تنخواہوں کی تقسیم کا بیان مکمل ہو سکے۔ اگر رقم مضافات کے لیے ہو تو صدر پیشکار اسے کسی مناسب ذریعے سے بھجوانے کا بندوبست کرے یا کسی مستحق فرد کو اس کی رسید پر ادائیگی کرے جو دعوے دار کی سند پیش کرے۔ ترنی کی ڈپازٹ رقم کو فوری طور پر متعلقہ افراد میں تقسیم کیا جائے۔ اگر مستحقین دستیاب نہ ہوں تو اسے خزانے میں متعلقہ مد کے تحت جمع کرایا جائے۔ ڈاک ٹکٹ رجسٹر کے مطابق ٹکٹوں کی تفصیل بھی درست پائی گئی: عدالتی اسٹامپ0-0-5,031روپے، بل اسٹامپ0-4-1,034روپے، عرضداشت اسٹامپ0-8-87 روپے، رسید اسٹامپ0-0-235روپے، سرکاری ڈاک ٹکٹ0-7-6روپے = کل0-8-6,394

II۔ تھانہ خان پور کا معائنہ کیا گیا۔ وہاں 4 حوالاتی قیدی سب جج خان پور کے اختیار میں موجود تھے۔ ان میں سے 3 اسی ماہ قید کیے گئے تھے اور 1 پچھلے ماہ۔ سب جج کو تاکید کی جائے کہ ان مقدمات کو جلد از جلد نمٹایا جائے۔

III۔ خان پور کے ڈسپنسری کا معائنہ کیا گیا۔ آلات اور عمارت کو صاف ستھرا پایا گیا۔ ریکارڈ کے مطابق: بیرونی مریض:69، داخلی مریض:14، اس کے علاوہ 4 مریض ایسے تھے جن پر بڑے آپریشن کیے گئے جن میں دو کیس پتھری کے آپریشن (lithotomy) کے تھے۔

IV ۔خان پور اسکول کا معائنہ کیا گیا۔ کل 95 طلبا کا اندراج تھا۔ آج کی حاضری

76 جس میں: ہندو طلبا 43, مسلمان طلبا 33, ریاستی طلبا: 53، باہر سے آئے ہوئے: 23, انسپکٹر تعلیم کو ہدایت کی جائے کہ وہ ریاستی عوام کو تعلیم کی طرف زیادہ مائل کرے۔ کاشتکار طبقے کے بچوں کی تعداد بہت کم ہے حالانکہ انہی کو زیادہ تعلیم دی جانی چاہیے۔

V: خان پور کے سب جج کی عدالت کا معائنہ کیا گیا۔ رجسٹروں کے مطابق درج ذیل مقدمات موجود تھے:

فوجداری، دیوانی اور ڈگری کے کل کیس 571 تھے جن میں سے 409 فیصل ہوئے اور زیرالتواء مقدمات کی تعداد 162 خاصی زیادہ ہے۔ چیف جج کے ذریعے سب جج کو ہدایت دی جائے کہ مقدمات کی یہ تعداد اتنی زیادہ نہ رہنے دی جائے۔

VI۔ شام کو ریاست کے ممتاز زمیندار، میونسپل کمشنر اور پنچ افراد سے اجلاس میں ملاقات کی گئی۔ اہم زرعی امور پر تبادلہ خیال ہوا۔ بہتر فصلوں اور جدید کاشتکاری کی ترغیب دی گئی۔ پنچوں نے چراغاں کی اجازت طلب کی جس کی منظوری دی گئی۔

22 مئی 1901

آج صبح ہم خانپور سے روانہ ہوئے اور جہ پہنچے۔ راستے میں درج ذیل مقامات اور کاموں کا معائنہ کیا گیا۔

I۔ میں نے حاجی واہ کی گجن واہ شاخ کا معائنہ کیا۔ یہ تقریباً 5 میل طویل ہے۔ یہ ایک پرانا نالہ ہے۔ چوں کہ اس کی کٹی ہوئی مٹی (spoilbanks) بہت بلند ہے اس لیے پرانی لائن سے 3/4 میل مغرب میں ایک نئی لائن کھودی گئی ہے۔ ریلوے سے نیچے کی جانب یہ نہر دو شاخوں میں تقسیم کی گئی ہے، جن کی کھدائی تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ امید ہے کہ زمیندار اس نئی لائن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ پرانی گجن واہ پر جہاں یہ ریلوے سے گزرتی ہے، ایک پُل موجود ہے، ایک سڑک چاچڑاں کی طرف جاتی ہے، دوسری گڑھی اختیار خان کی جانب۔ اگر نئی لائن پر کام شروع کیا جائے تو وہاں ایک نیا پختہ پُل تعمیر کرنا ہو گا۔ اگر نئی لائن کا سرا پرانی گجن واہ سے ریلوے پُل سے اوپر جوڑ دیا جاتا تو موجودہ پُل ہی کافی ہوتا اور آب نوشوں کو کم کھدائی کرنی پڑتی لیکن یہ بات نقشہ بناتے وقت پیش نظر نہ

رکھی گئی اس لیے اب نئی لائن پر نیا پُل بنانا ناگزیر ہو گیا ہے۔ نہر کے اندر اب تک کوئی نشانِ پیائش (benchmarks) نصب نہیں کیے گئے۔ میری رائے ہے کہ نہر کھولنے سے پہلے ان نشانوں کو ضرور نصب کیا جائے اور کنارے پر نمبر والے ستون (pillars number) بھی نصب کیے جائیں تا کہ آئندہ معمول کی صفائی انہی نشانات کے مطابق کی جا سکے۔ کچھ زیلداروں نے واقعی اس نئے کام میں اچھی کارکردگی دکھائی ہے، انھیں سالگرہ دربار میں خلعت دی جائے۔

II۔ محمد الیاس گاؤں کو محمد واہ جدید سے آبپاشی حاصل ہوتی ہے لیکن یہ نہر کے آخری سرے پر واقع ہونے کی وجہ سے پانی کی کمی کا شکار رہتا ہے۔ اس سال محمد الیاس اور خیر پور کے زمینداروں نے حاجی واہ سے ایک نئی شاخ "محمد واہ" نکالی ہے: لمبائی: 8 میل اور 8 نمبر چوڑائی: 10 فٹ باقی ماندہ کام دو ہفتے میں مکمل ہونے کی امید ہے۔ مزدوروں کے نگران زیلدار "اللہ بچایا" ہیں۔ انھیں میری سالگرہ دربار میں خلعت دیا جائے۔ نہر کھولنے سے پہلے اس کے اندر نشانِ پیائش نصب کیے جائیں اور کنارے پر نمبر ستون کھڑے کیے جائیں۔

III۔ میں نے محمد واہ جدید کا معائنہ کیا جو ایک پرانی نہر ہے۔ چوں کہ اس کی کٹی ہوئی مٹی بہت بلند تھی اس لیے آب نوشوں نے اس کا نیا سرا تین میل مغرب میں نکالا ہے۔ اس تبدیلی کے باوجود چاچڑاں روڈ پر موجود پُل کو نقصان نہیں پہنچا۔ امید ہے کہ اس تبدیلی سے نہر زیادہ پانی کھینچ سکے گی اور زیریں زمینوں کو سیراب کرے گی۔ یہ نہر صفائی کے بعد کھولی گئی ہے۔ نئے تین میل کے حصے پر پبلک ورکس کے ڈیزائن کے مطابق نشانِ پیائش نصب کیے جائیں۔ ریگولیٹر کی عمارت درست حالت میں ہے۔

IV۔ حاجی واہ کی کوریجہ شاخ کا معائنہ کیا گیا۔ لمبائی: 6 میل، صفائی نہر کھولنے سے پہلے مکمل کر لی گئی تھی۔

V ۔ محمد واہ قدیم کا معائنہ کیا گیا۔ صفائی کے بعد یہ نہر جاری ہے۔ اس کی زمینوں پر دھان (چاول) کی فصل کی کاشت کی جا رہی ہے۔

VI۔ حاجی واہ کی بہاول واہ شاخ کا معائنہ کیا گیا۔ لمبائی: 6 میل۔ صفائی کے بعد نہر رواں ہے۔ پُل کی عمارت درست حالت میں ہے۔

VII۔ ماچھی واہ کا مشاہدہ کیا گیا جو صفائی کے بعد بہہ رہی ہے۔

VIII۔ صادق واہ نہر کی اختیار واہ شاخ کا معائنہ کیا گیا۔ یہ مکمل روانی سے چل رہی ہے۔ 8 میل کے فاصلے پر یہ تین شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہے:

کالا واہ۔ خان واہ۔ نور واہ۔ نور واہ کے کنارے بہت بلند ہونے کی وجہ سے آب نوشوں نے ایک نئی لائن نکالی ہے۔ ریگولیٹر کی عمارت مکمل قابلِ اعتماد ہے۔

IX۔ اختیار واہ کی راج واہ شاخ کا معائنہ کیا گیا جو 4 میل فاصلے تک جاتی ہے اور صفائی کے بعد رواں ہے۔

X۔ اختیار واہ کی لکھو واہ شاخ کا بھی آج معائنہ کیا گیا۔ اس کی سمت 1 میل کے فاصلے پر تبدیل کی گئی ہے لیکن نئی لائن ابھی چیک نہیں کی گئی اس لیے ابھی تک نہر کھولی نہیں گئی۔ کاردار کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ فوری طور پر اس شاخ کا معائنہ کر کے اسے کھولے۔

XI۔ شام 6:30 بجے ججہ کے زمینداروں اور پنچوں کو ایک عوامی مجلس میں سنا گیا۔ ان کی کاشتکاری کی بہتری اور متعلقہ امور میں حوصلہ افزائی کی گئی۔

یہ ڈائری اصل صورت میں سپرنٹنڈنٹ کے لیے پیش کی جاتی ہے۔

23 مئی 1901

آج ججہ گاؤں سے روانہ ہو کر غوث پور پہنچا اور راستے میں متعدد امور کا معائنہ کیا گیا۔

I۔ اختیار واہ کی دُنیا واہ شاخ کا معائنہ کیا: لمبائی تقریباً 6 میل ہے۔ صفائی کے بعد نہر جاری ہے۔ اس سے کل 97 کسیاں نکلتی ہیں 81 آؤٹ لیٹس تیار ہیں جب کہ 16 ابھی بننا باقی ہیں۔ اس نہر سے منسلک تمام زمینیں زیرِ کاشت ہیں۔ باقی آؤٹ لیٹس کو فوری مکمل کیا جائے تاکہ پانی سرے سے آخری حد تک یکساں طور پر پہنچ سکے۔

II۔ غازی واہ کی لال واہ شاخ کا معائنہ کیا: لمبائی 7 میل، نہر مکمل روانی سے جاری ہے۔ اس میں 68 پتھریلے آؤٹ لیٹس ہیں، 43 تیار اور 7 زیرِ تعمیر جب کہ 18 شروع بھی نہیں ہوئیں۔ کاردار کو اس سلسلے میں ہدایت دی جائے۔

III ۔اختیار واہ کی غازی واہ شاخ کا معائنہ کیا: لمبائی تقریباً 8 میل، یہ نہر بھی اس وقت جاری ہے۔اس میں 105 پتھر یلے آؤٹ لیٹس ہیں۔71 مکمل اور 9 زیرتعمیر جب کہ 25 ابھی بننے ہیں۔کاردار کوفوری تکمیل کی ہدایت دی جائے۔

IV۔ڈگاّ واہ کی احمد واہ شاخ کا معائنہ کیا: لمبائی تقریباً 4 میل، نہر جاری ہے۔دونوں کناروں پر شگاف پائے گئے جنھیں آب نوش بند کر رہے ہیں، صفائی کے وقت کنارے درست نہ کیے گئے تھے جس کے باعث بہاؤ کے دوران پانی نشیبی زمینوں میں بہہ گیا۔آئندہ ہدایت دی جائے کہ صفائی کے ساتھ دونوں کناروں کی مرمت بھی کی جائے۔اس شاخ میں 23 آؤٹ لیٹس ہیں جن میں سے صرف ایک باقی ہے۔

V۔ڈگاّ واہ کے آخری سرے کا مشاہدہ کیا جو دریا سے نکلتی ہے: پوری روانی سے جاری ہے، نہر کئی جگہوں سے کنارے توڑ چکی ہے اور اطراف کی زمینوں کو سیلابی پانی نے ڈھانپ لیا ہے، تفصیلات وہی ہیں جو سابقہ پیرا میں بیان ہوئیں۔

VI۔شام ساڑھے پانچ بجے غوث پور شہر کے تمام پنچ، پیشکاری غوث پور کے زمیندار اور بدچلنی / بدمعاشی کے مقدمے کے گواہان اکٹھے ہوئے۔غالبًا یہ تھری معاملہ ہے جو تھر سے متعلق فائل میں شامل کیا جائے گا۔

VII۔شام ساڑھے پانچ بجے میں نے غوث پور کے گرن دتا پٹواری کی جریب کا معائنہ کیا، اس کا کام درست پایا گیا۔اسے 2 روپے انعام دیا گیا، اس کی اطلاع مشیر مال کو دی جائے۔

24 مئی 1901

آج غوث پور سے روانہ ہو کر چاچڑاں پہنچا۔راستے میں درج ذیل امور کا معائنہ کیا:

I۔بوجیور گاؤں میں دو تقاوی کنویں منظور ہوئے تھے، دونوں تیار پائے گئے۔

II۔ساموکہ بند جس پر غور کیا جا رہا ہے، کا معائنہ کیا: دریائے سندھ کا رخ دائیں کنارے کی طرف ہو گیا ہے جس سے سیلاب کا خطرہ ختم ہو گیا۔دریائے چناب اور ستلج اس مقام کے قریب پہنچ چکے ہیں جہاں بند تجویز کیا گیا تھا۔دریا کا بہاؤ بائیں طرف ہے جس سے زمینیں کٹ رہی ہیں، اگر بند

تعمیر کیا گیا اور دریا نے اپنا یہی رخ برقرار رکھا تو بند بہہ جائے گا لہٰذا 7 مئی 1901 کی کونسل کی تجویز کے مطابق بند کی تعمیر فی الحال ملتوی کی جائے۔ اگر چناب کا سیلاب رک جائے تو مال گزاری پر شدید اثر پڑے گا۔

III۔ صادقیہ غربیہ کے کنارے جن زمینوں کو دریا نے کاٹ دیا ہے ان کے زمینداروں نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ دریا سے سیراب ہو رہے ہیں لہٰذا ان سے آبیانہ نہ لیا جائے۔ یہ دعویٰ درست محسوس ہوتا ہے۔ آئندہ سال موجودہ ہیڈ سے اوپر واقع زمینوں پر آبیانہ نہ لیا جائے۔ اس بارے میں مشیر مال کو تحریر کیا جائے۔

IV۔ شاخ نمبر 1 کا معائنہ کیا گیا، اس کی صفائی مکمل ہو چکی ہے۔ زمینوں میں پانی بھر جانے کے باعث اس کا سرا بند کر دیا گیا ہے۔ ریگولیٹر کی عمارت درست ہے۔

V۔ آج کے مارچ میں دیکھی گئی زمینیں عمومی طور پر سیلاب سے سیراب ہو رہی تھیں۔ زمینوں پر عمدہ گادجمع تھی، فصلیں کاٹی جا چکی تھیں یا کٹائی جاری تھی۔

VI ۔صادقیہ غربیہ نہر کے ہیڈ کا معائنہ کیا گیا۔ چوں کہ دریا میں سیلاب ہے اس لیے نہر مکمل روانی سے بہہ رہی ہے۔

25 مئی 1901

آج چاچڑاں سے نکل کر ٹھل حسن میں قیام کیا گیا:

I۔ دریائی نالے شیہاں کا معائنہ کیا گیا جس کا گذشتہ سال کا سرا پانی کی واپسی سے بند ہو چکا ہے۔ اس سال ایک نیا سرا ایک میل اوپر بنایا گیا ہے اور نالہ صفائی کے بعد رواں ہے۔ اسی نالے سے گرے واہ، بہادر واہ اور محمد واہ نہریں نکلتی ہیں۔ محمد واہ کے سرے سے تھوڑا نیچے نالے پر بند باندھا گیا ہے تا کہ پانی محفوظ رہے۔ نالے کے اندر ابھی تک نشانِ پیمائش نصب نہیں کیے گئے۔ اگلے موسمِ گرما میں یہ نصب کیے جائیں۔ مشیر مال اور تعمیرات کو ہدایت دی جائے۔

II۔ چاچڑاں میں ایک تقاوی کنویں کا معائنہ کیا گیا جو زیر تعمیر ہے۔ حاجی پور میں ایک کنواں مالک نے نجی خرچ سے بنایا اور دو تقاوی کنویں ہیں، ایک زیر زمین جا رہا ہے دوسرا مکمل نہیں مگر

اینٹیں موجود ہیں۔کاردار کوتکمیل کی ہدایت دی گئی۔

III۔صادقیہ غربیہ نہر کو عبور کر کے خان واہ کے ہیڈ کا معائنہ کیا گیا۔نہر تیزی سے بہہ رہی ہے، ریگولیٹر کی عمارت درست ہے۔

IV۔شاخ نمبر 3 کا معائنہ کیا گیا جو چار سال سے کام کر رہی ہے۔فصلوں کی بہتری کے باعث اسے 5 فٹ چوڑا کیا گیا ہے۔روانی اچھی ہے، ریگولیٹر درست ہے۔

V۔کبیر واہ کو ایک ماہ سے بہتا پایا گیا، ریگولیٹر کی عمارت تسلی بخش ہے۔نہر کا 5 میل تک معائنہ کیا گیا۔دونوں کناروں پر پتھریلے آؤٹ لیٹس موجود ہیں۔دائیں کنارے کے برم بہترین ہیں اور سفر میں سہولت دیتے ہیں۔دونوں جانب کیکر، شیشم، شریہنہ اور دیگر درخت لگانے کی سفارش کی گئی۔

VI۔حاجی پور کے زمینداروں نے شکایت کی کہ ان سے وہ زمینوں پر آبیانہ لیا جا رہا ہے جو دریا کے سیلاب سے سیراب ہوتی ہیں۔اس معاملے کی تحقیقات کی جائیں اور آبیانہ صرف ان زمینوں پر لاگو کیا جائے جو نہر سے سیراب ہوں، سیلابی زمینوں سے مزدور بھی نہ لیا جائے۔

VI۔حاجی پور میں ایک نیا باغ لگایا گیا ہے۔مالکان نے محصول کی معافی کی درخواست کی ہے۔مشیر مال کو ہدایت دی جائے کہ وہ باغ کو سرسبز رکھنے کی شرط پر محصول معافی کی کارروائی کرے۔

26 مئی 1901

ٹھل حسن سے آباد پور تک مارچ کیا گیا اور مندرجہ ذیل امور کو ملاحظہ کیا۔

I ۔ٹھل حسن کی بندوبستی کارروائی کا معائنہ کیا گیا۔کشت وار کی پیائش اور جریب کی پیائش مطابقت رکھتی تھیں۔پٹواری یار محمد کو 2 روپے انعام دیا گیا۔گاؤں کی کشت وار مکمل ہو چکی ہے، اب پٹواری حاجی پور میں مربعے لگا رہا ہے۔

II۔فیض واہ شاخ کا معائنہ کیا گیا۔اس سال اس کے سرے پر نیا ریگولیٹر تعمیر ہوا۔لمبائی 4 میل، صفائی کے بعد رواں ہے۔

III۔فیض واہ کی نکاسی (diversion) کا معائنہ کیا گیا۔اس نہر میں پانی کی کثیر مقدار آئی جو اکثر کناروں کو توڑ کر فصلوں کو ڈبو دیتی تھی اور یوں آبنوشوں کو بیجائی کے موسم میں شگافوں کی

مرمت کی زحمت اٹھانا پڑتی تھی۔اس خرابی کو دور کرنے کے لیے نکاسی کا رخ نہر کے مغربی کنارے سے کیا گیا اور ہیڈ پر ایک پختہ ریگولیٹر تعمیر کیا گیا۔ جب پانی کی مقدار زیادہ ہو تو اسے اسی نکاسی سے دریا کی طرف گزار دیا جاتا ہے اور جب پانی صرف ضرورت کے مطابق ہو تو ریگولیٹر کو فوراً بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک اچھا منصوبہ ہے کیوں کہ آبنوشوں کو اس کی تعمیر کے بعد سے کافی فائدہ پہنچا ہے۔

IV۔خدائے واہ شاخ 9 میل لمبی اور 20 فٹ چوڑی ہے۔کاردار نے ٹیل کی جگہ پر اس کو 5 میل لمبائی اور 5 فٹ چوڑائی میں مزید بڑھا دیا ہے۔ نئے ریگولیٹر کی تعمیر مکمل ہے،نہر صفائی کے بعد جاری ہے۔

V۔گریواہ کی آبی گذرگاہ کا معائنہ کیا گیا،عمارت عمدہ ہے۔اس کا سرا شیہاں کے نالے سے ہے جو 27 میل دور ہے مگر نالہ اتنا نشیبی ہے کہ مفید نہیں۔ فی الحال درستگی ممکن نہیں کیوں کہ آبی گذرگاہ کی چھت مجوزہ نہر کے بیڈ کے مطابق ڈیزائن کی گئی ہے۔ابھی سرے کا حصہ بند ہے جو ٹیل تک کا کام ختم ہونے کے بعد کھولا جائے گا۔

VI۔شاخ نمبر 2 کا معائنہ کیا گیا جس کا پرانا سرا نیچے تھا اور پچھلے پانی کے باعث سیرابی ممکن نہ تھی۔اس سال نیا سرا اوپر بنایا گیا اور اس پر نیا ریگولیٹر تعمیر کیا گیا جو ابھی نہیں کھولا گیا۔کاردار کو جلد کھولنے کی ہدایت کی گئی۔

VII۔شام 6 بجے میں نے گاؤں آباد پور کی پیمائش کا معائنہ کیا جو واحد بخش محرر نے کی تھی۔ پلاٹ نمبر 292 کے شمال مشرقی ستون سے پلاٹ 283 کے جنوب مغربی کونے کے ستون تک اور پہلے پلاٹ کے جنوب مشرقی ستون سے پلاٹ 297 کے کونے تک فاصلہ بالترتیب 158 اور 244 کرم درج تھا، جیسا کہ کشت وار نقشے پر موجود تھا۔ یہ فاصلے نقشے کے پیمانے اور موقع پر جریب کی پیمائش سے درست پائے گئے۔تاہم، مقام 292 کے جنوب مشرقی ستون سے چوکور کے جنوبی جانب تک عمودی فاصلہ نقشے کے مطابق 107 کرم تھا جب کہ جریب سے موقع پر پیمائش 109 کرم نکلی — یوں 2 کرم کا فرق ظاہر ہوا۔ پلاٹ 294 کے حصے ب میں زمین کی نوعیت کا اندراج غلط تھا۔ اس حصے کا ایک جز و ناقابل کاشت تھا مگر محرر نے پوری زمین کو زیرِ کاشت ظاہر کیا۔ایک چوکور کا ایک

پہلو جریب سے ناپا گیا اور 199 کرم نکلا، جب کہ اندراج میں 200 کرم لکھا تھا۔ اس غلطی کے انکشاف پر گرداور نے وضاحت کی کہ نقشے پر چوکور کی ہر لائن تقریباً 2 کرم چھوٹی ہے۔ یہ وضاحت قابلِ قبول نہیں کیوں کہ تین میں سے دو پیمائشیں درست نکلیں، ایک لکیر دو کرم زیادہ اور چوکور کی دوسری لکیر اتنی ہی کم نکلی۔ اگر واقعی شیٹ کی لائنیں چھوٹی ہوتیں تو ہر پیمائش میں یہی فرق آنا چاہیے تھا۔ اس لیے گاؤں کی پیمائش کی تمام کارروائی کو اسسٹنٹ سیٹلمنٹ آفیسر یا سیٹلمنٹ سپرنٹنڈنٹ سے دوبارہ تصدیق کروانا ضروری ہے۔

27 مئی 1901

بستی آباد پور سے روانہ ہو کر آج راجن پور میں قیام کیا گیا:

I۔ آباد پور اور نوناری کے تقاوی کنوؤں کا معائنہ کیا گیا۔ 9 میں سے 7 مکمل اور 2 ابھی شروع نہیں ہوئے۔ کاردار کو جلد کام مکمل کرنے کی ہدایت کی جائے۔

II۔ نوناری میں زمینداروں نے اپنی رقم سے 9 کنویں کھودے جو سب مکمل پائے گئے۔

III۔ محمد واہ۔ بہادر واہ آبی گزرگاہ کا معائنہ کیا گیا۔ عمارت درست ہے مگر نیچے پانی کی روانی نے گڑھا بنا دیا تھا جسے پچھلے سال تعمیرات کے ڈیزائن کے مطابق آب نوشوں نے پلچی مٹی اور سلیگ سے بھر دیا۔ سیلاب کے بعد دیکھا جائے گا کہ یہ بند ٹھہرا یا بہہ گیا۔ شیہاں ڈھنڈ کا پانی مشترکہ ہیڈ سے گزرتا ہے۔

IV۔ نہر کے تقریباً 6-5 میل کنارے کا معائنہ کیا گیا۔ تمام کسیوں پر آؤٹ لیٹس موجود تھے، لیکن کچھ مقامات پر برم کمزور ہیں جس سے پچھلے سیلاب میں پانی نکل گیا تھا۔ تمام شگاف مرمت کیے جائیں۔ مشیر مال اور کاردار کو ہدایت کی جائے۔

V۔ کیکر، اوکانہہ اور اس قسم کے درخت کچھ کناروں اور مقامات پر موجود تھے مگر بعض جگہیں خالی تھیں۔ مغربی کنارے کی برم بہترین ہے جن سے مسافروں کو سیلاب کے دنوں میں فائدہ پہنچے گا۔ مشیر مال کو ہدایت کی جائے کہ مشرقی کنارے پر درخت لگائے جائیں تاکہ ان سے مسافروں کو سایہ مل سکے تاہم کاردار کو موقع پر ہدایت جاری کر دی گئی تھی۔

VI۔شام 5 بجے عام اجلاس ہوا جس میں نوشہرہ کی پیشکاری، زمیندار، لمبردار، مہاجن اور دیگر افراد شریک ہوئے۔زمینداروں کو بہتر فصل، کنویں کھودنے اور پختہ آؤٹ لیٹس بنانے کی ترغیب دی گئی۔

VII۔شام 6 بجے میں نے راجن پور کلاں کی سیٹلمنٹ پیمائش کا معائنہ کیا جو مولا بخش پٹواری نے کی تھی۔میرے معائنے کا نتیجہ درج ذیل ہے:

(1) ایک فاصلہ جو نقشے پر پیمانے سے 314 کرم تھا، اس جگہ پر جریب سے ناپنے پر 321 کرم نکلا اس طرح 7 کرم کا فرق ظاہر ہوا۔

(2) نقشے پر 262 کرم کی ترچھی لائن موقع پر بھی 262 کرم نکلی یعنی کوئی فرق نہ تھا۔

(3) 310 کرم لمبی ترچھی لائن درست پائی گئی۔

مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تین پیمائشوں میں سے صرف ایک ہی درست ہے۔پلاٹ نمبرز 209 تا 229 کے معائنے پر معلوم ہوا کہ ان قطعات کی پیداوار دوہری فصل والی تھی یعنی خریف کی فصل میں چاول اور ربیع کی فصل میں ماسنگ، چنا اور اسون کاشت کیے گئے تھے لیکن پٹواری نے خسرہ میں صرف ماسنگ درج کیا ہے جو ایک سنگین غلطی ہے۔قواعد کی رو سے خریف کی کاشت شدہ اراضی بشمول ربیع کی کاشت، خسرہ میں دوہری فصل کے طور پر درج ہونی چاہیے۔لیکن پٹواری نے اس اصول کی خلاف ورزی کی۔چوں کہ اس شخص کی کشت وار غلط نکلی ہے اور جو تفصیلات درج کی گئی ہیں وہ حقیقت کے برعکس ہیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس کی پیمائشوں کو اسسٹنٹ سیٹلمنٹ آفیسر یا سیٹلمنٹ سپرنٹنڈنٹ سے چیک کروایا جائے۔اسی طرح کاشت کی نوعیت کے اندراجات کو بھی درستگی سے چیک کیا جائے۔مشرقی اور مغربی ڈویژنز کے اسسٹنٹ سیٹلمنٹ آفیسران کو ہدایت دی جائے کہ آئندہ سیٹلمنٹ عملے کو چاہیے کہ وہ کاشت کی تفصیلات اور کشت وار پیمائشوں کو حتی المقدور چیک کریں کیوں کہ محصولات کا تعین زیادہ تر انہی تفصیلات پر منحصر ہوتا ہے۔

28 مئی 1901

راجن پور سے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم سرین پہنچے۔راستے میں درج ذیل امور کا معائنہ کیا:

I ۔خان واہ شاخ نہر کا معائنہ کیا گیا۔اس شاخ کے سرے پر ریگولیٹر ابھی تک تیار نہیں ہوا اور پانی ایک عارضی موڑ کے ذریعے بہایا جا رہا ہے۔عمارت کا سامان ہیڈ پر موجود ہے۔کاردار کو کام کی تکمیل کے لیے فوری طور پر کہا گیا۔

II۔نہر کے کنارے جہاں تک معائنہ کیا گیا بعض مقامات پر خراب حالت میں ہیں اور پانی کی روانی سے ٹوٹنے کا امکان ہے۔گذشتہ سیلابوں میں بھی بعض مقامات پر پانی نکل چکا ہے۔ صادق آباد کے کاردار کو ہدایت کی جائے کہ جہاں جہاں برم خراب ہو چکے ہیں آب نوشوں سے مرمت کروائے تا کہ آئندہ پانی نہروں سے باہر نہ نکلے۔اس نہر کے ساتھ درخت موجود نہیں، اس لیے دونوں جانب برم پر درخت لگائے جائیں۔اس بارے میں کاردار کو حکم دیا جائے۔

III۔جہاں تک نہر کا معائنہ کیا گیا وہاں پتھریلے آوٹ لیٹس مکمل پائے گئے سوائے ان چند کے جن پر مواد موجود تھا مگر تعمیر نہیں ہوئی تھی۔

IV۔میں نے احمد واہ کے اس حصے کا معائنہ کیا جہاں مغربی جانب کسیاں نکلتی ہیں اور نواب سرامام بخش خان، تمندار کی زمینوں کو سیراب کرتی ہیں۔نہر تمندار کی حدود سے ڈیڑھ میل گزرتی ہے اور اس میں سے چھ کسیاں ں تمندار کی ملکیت ہیں جو سیلابی موسم میں ربیع کی فصلیں سیراب کرتی ہیں۔ان کسیوں کی چوڑائی 5 سے 10 فٹ ہے۔اطراف کی زمینیں اونچی ہونے کے باعث صرف سیلاب کے موسم میں سیرابی ممکن ہے۔اس حصے میں 5 یا 6 لفٹس موجود ہیں۔پچھلے سال تمندار نے 2 میل لمبی اور 10 سے 12 فٹ چوڑی نئی کسی نکالنے کا کام شروع کیا مگر ریاستی حکام کی مداخلت کے بعد کام روک دیا گیا۔میں نے اس کسی کی حد بندی دیکھی۔کچھ مقامات پر اوپر والے حصے میں آوٹ لیٹس بھی کھودے جا چکے ہیں۔احمد واہ کے ہیڈ سے ایک میل تک کی زمین بلند ہے لیکن اس کے بعد نشیبی ہے اور نہر سے سیراب ہو سکتی ہے۔اگر یہ کسی نکالی جائے تو تمندار کو فائدہ ہوگا لیکن ریاست کے مفاد کے لیے نہر سے کافی پانی میسر نہ رہے گا۔اس بارے میں میں اپنا حتمی خیال خونن اور جعفر لال کے نالوں کے معائنہ کے بعد دوں گا۔

V۔راجن پور، مکھن بیلا اور سرین کے تقاوی کنوؤں کا معائنہ کیا گیا۔چار کنوؤں کے لیے

تقاوی منظور ہوا تھا جن میں سے تین مکمل ہو چکے تھے اور ایک پر کام شروع نہیں ہوا۔ موقع پر ہی کاردار سے بات کی گئی۔

VI۔ نہر کے آب نوش میرے پاس آئے اور پتھریلے آؤٹ لیٹس کی تعمیر سے معافی کی درخواست کی۔ انھیں بتایا گیا کہ یہ کام انہی کے فائدے کے لیے ہے تاکہ ہر زمیندار کو یکساں پانی ملے اور کسیوں کے سروں پر نہروں کے ٹوٹنے سے فصلیں تباہ نہ ہوں۔

VII۔ شام 5:30 بجے عوامی اجلاس ہوا جس میں زیلدار، لمبردار، پنچ اور بڑے زمیندار شریک ہوئے۔ زمینداروں نے شکایت کی کہ معاہدے کے تحت بنائے گئے پتھریلے آؤٹ لیٹس ایک تو مہنگے ہیں اور دوسرے ناقص معیار کے ہیں جو جلد ٹوٹ جاتے ہیں۔ انھیں بتایا گیا کہ یہ کام ٹھیکے پر اسی صورت میں دیا گیا جب وہ خود کرنے میں ناکام رہے اور اگر وہ اب بھی خود کرنے کا عزم کریں تو ٹھیکیداروں کو فارغ کیا جا سکتا ہے تاہم ان کے اعتراضات بجا ہیں جن پر مشیر مال کو توجہ دلائی جائے۔ میری رائے ہے کہ ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جس میں سرویئر، پیشکار اور کاردار مستری شامل ہوں جیسا کہ ریگولیٹرز کے معاملے میں ہوتا ہے جو ان معاہداتی آؤٹ لیٹس کا معائنہ کرے اور ہر ایک پر ہونے والے اخراجات کی رپورٹ دے۔ ان اخراجات کی ادائیگی زمیندار خود ٹھیکیدار کو کریں۔ اس طریقے سے آؤٹ لیٹس پائیدار ہوں گے اور زمیندار غیر ضروری خرچ سے بچ جائیں گے۔ کارداروں کو ہدایت دی جائے کہ پہلے کسی مالکان کو خود آؤٹ لیٹ بنانے کا موقع دیں اگر وہ ناکام ہوں تو معاہدے پر عمل کیا جائے لیکن معاہدے والے کام کی سخت نگرانی کی جائے کہ مواد، یعنی اینٹ، چونا وغیرہ مناسب مقدار میں استعمال ہو اور ڈیزائن کے مطابق ہو۔

VII۔ شام 6 بجے غلام میراں محرر کی تیار کردہ سرین گاؤں کی بندوبستی پیمائش کی جانچ کی گئی۔ دو قطر نما لکیریں 355 اور 256 کرم کی نقشے اور میدان میں درست پائی گئیں۔ محرر کو 2 روپے انعام دیا گیا۔

29 مئی 1901

آج سرین سے روانہ ہو کر پکا بھٹہ پہنچا اور درج ذیل کاموں کا معائنہ کیا:

I ۔احمد واہ کی آبی گزرگاہ کا معائنہ کیا گیا۔اس کی عمارت عمدہ حالت میں ہے اور کسی مرمت کی ضرورت نہیں ۔نہر بہہ رہی ہے۔

II ۔اس نہر سے نکلنے والی تقریباً تمام کسیوں کے سروں پر پتھر یلے آؤٹ لیٹس تیار پائے گئے۔

III ۔ روتی اور جمال دین والی گاؤں میں دو تقاوی کنوؤں کا معائنہ کیا گیا جو مکمل تھے۔

دوپہر کو طبیعت ناساز ہوگئی،اس لیے شام کا دورہ نہ ہو سکا۔

یہ ڈائری اصل صورت میں سپر نٹنڈنٹ کو پیش کی جاتی ہے۔

30 مئی 1901

آج میں پکا بھٹہ سے بھونگ کی طرف روانہ ہوا اور راستے میں جن کاموں کا معائنہ کیا، وہ درج ذیل ہیں:

I۔میں نے فاضل واہ نہر کا معائنہ کیا۔ یہ نہر 21 میل اور 7 نمبر لمبی ہے اور صفائی کے بعد گذشتہ 15 دنوں سے جاری ہے۔

II۔صادقیہ غربیہ کا معائنہ کیا گیا اوراس کے ساتھ پختہ نکاسیاں مکمل حالت میں پائی گئیں۔

III۔ میں نے خونواہ کی نئی شاخ کا معائنہ کیا جس کے لیے رواں سال میں 12,600 روپے کی رقم منظور کی گئی تھی۔ یہ شاخ گڈوڈھند سے نکالی گئی ہے۔اس کی کھدائی مکمل ہو چکی ہے اور اب صرف سروے افسر کی جانچ باقی ہے۔تحصیلدار کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ سروے افسر کی جانچ کمیٹی کی رپورٹ کی تیاری اور مشیر مال کی منظوری کے بعد نہر کو جلد از جلد کھول دے۔

IV۔خونن ڈھند کا بھی معائنہ کیا گیا جہاں کبھی دریا بہتا تھا۔ دریا کے بہاؤ کے اچانک بدلنے اور مٹی کے جمع ہونے کی وجہ سے اس کا خشک حصہ اب زیادہ تر تمندار کے زیر کاشت ہے۔بعض مقامات پر نشیبی زمین ابھی بھی موجود ہے اور سیلاب کے موسم میں وہاں دریا کا پانی بہتا ہے۔مزاری تمندار نے اپنی کاشت کے مفاد میں اس پانی کو مختلف چھوٹے نالوں میں تقسیم کر کے مناسب مقامات پر بند باندھ دیے ہیں۔ یہی پانی تمن دار کی آبپاشی کا واحد مستقل ذریعہ ہے۔اس صورت حال میں بہاول پور ریاست کے لیے یہ ممکن نہیں کہ خونن ڈھند سے پانی حاصل کرے کیوں کہ اس پانی سے جو

زمینیں پہلے سے تمندار سیراب کر رہا ہے ان کی آبپاشی کی ذمہ داری ریاست پر عائد ہو جائے گی۔ اگر ریاست ایسا کرتی ہے تو خونن ڈھند کا سارا پانی انہی زمینوں پر خرچ ہو جائے گا اور بہاول پور کو ہر سال صفائی کے اخراجات بھی برداشت کرنا پڑیں گے۔ اس صورت میں ریاست کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ خونن ڈھند سے پانی نہ لے۔ ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے، ریاست کے سپرنٹنڈنٹ نے شق نمبر 3 میں مذکورہ ریاستی علاقے میں نئی نہر کی منظوری پہلے ہی دے دی ہے۔

V۔ نذر محمد جھولن گاؤں میں چار کنوؤں کے لیے تقاوی منظور کی گئی جن میں سے ایک مکمل ہو چکا ہے اور تین زیر تعمیر ہیں۔

VI۔ شام کے وقت سردار بہرام خان، دوست محمد خان، غلام حیدر خان اور علی محمد خان نے ملاقات کی۔ ان کے روانہ ہونے کے بعد میں نے وزیر کو ہدایت دی کہ جعفر لال ہیڈ کے بارے میں سردار بہرام خان سے بات کرے اور کیس اگلی صبح میرے سامنے پیش کرے۔ ناسازی طبع کے باعث میں شام کو مزید کوئی کام نہ کر سکا۔ یہ ڈائری اصل صورت میں ریاست کے سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

بیسویں صدی کی پہلی ربع میں بہاول پور کا منظر نامہ
ایک غیر جانبدارانہ نقطہ نظر

پرکاش ٹنڈن کی انگریزی تصنیف ''پنجاب سینچری'' سے انتخاب

(پرکاش ٹنڈن (2004-1911 ہندوستان کی ایک سر برآوردہ تجارتی منتظم شخصیت۔ پہلے دیسی ہندوستانی جو لیور ہندوستان کے چیئر مین بنے۔ان کے والد اس وقت کے ضلع گجرات کی تاریخ کے رہائشی دوسرے ریگولرانجینئر تھے جنھوں نے پنجاب کے محکمہ انہار میں نہری نظام کی تعمیر میں حصہ لیا۔ 1922 کے بعد وہ امپیریل سروس آف انجینئرز میں چلے گئے اور ریاست بہاول پور کے چیف انجینئر کے پرسنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔اس طرح وہ ریاست کی بیوروکریسی کا ایک اہم کل پرزہ تھے۔ بارہ سالہ پرکاش ٹنڈن مڈل کے بعد بہاول پور کے سکول میں داخل ہوئے اور ممکنہ طور پر وہ ایس ڈی ہائی سکول یا صادق ایجرٹن سکول کے طالب علم تھے۔اپنے باپ کی وجہ سے انھوں نے دربار کی زندگی کی تمام جہتوں کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا اس لیے جب انھوں نے انگریزی زبان میں پنجابی ساگا 1987-1857 کے عنوان سے خودنوشت لکھی جو 1961 میں شائع ہوئی تو انھوں نے 24 - 1922 کے دوران بہاول پور میں گزارے برسوں کا تذکرہ اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 155 تا 164 تک کے دس صفحات میں کیا اور اس وقت کے بہاول پور کے معاشرتی، انتظامی اور سیاسی معاملات کو بلاکم و کاست بیان کیا ہے۔اس کے بیان کردہ حقائق کو بہاول پور کے حوالے سے فریق سوم یا تھرڈ پارٹی کی حیثیت حاصل ہے جس سے ہر کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔امکان

غالب ہے کہ اس نے میٹرک بہاول پور سے کیا جس کے بعد انٹر کرنے گجرات کالج چلے گئے۔اس وقت اس کی عمر 13 برس تھی اور یہ عمر چیزوں اور کو دیکھنے، ان کا مشاہدہ کرنے اور انھیں اچھی طرح یاد رکھنے کے لیے انتہائی موزوں ہوتی ہے اس لیے ہم ان کی ان خاصی حد تک "میچور" باتوں کو ایک بچے کی باتیں سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکتے، ان میں سے متعدد باتیں اس کے ذاتی مشاہدات و تجربات ہیں تاہم محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر باتیں اسے "بہاول پور دربار" کی اندرونی بیوروکریسی سے تعلق رکھنے والے والد کی طرف سے وقتاً فوقتاً بتائی جاتی رہی ہوں گی جنہیں اس نے جیسے سنا ہو بہو بیان کر دیا۔(مترجم)

میرے والد کی معمول کی تین سالہ تعیناتی کی مدت پوری ہو چکی تھی اور ہمیں کسی بھی وقت تبادلے کی توقع تھی۔ ہر بار نئی جگہ کا خیال خوشگوار تجسس پیدا کرتا۔کیا اب ہم پھر کسی جنگل کے علاقے میں جائیں گے یا اس بار کسی شہر کا نمبر آئے گا؟ چوں کہ ہم بڑے ہو رہے تھے اس لیے نئی جگہ ہماری تعلیم کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ حال ہی میں والد صاحب کو اُس وقت کے "امپیریل سروس آف انجینئرز" کے لیے منتخب کیا گیا تھا جس کی نگرانی لندن میں بھارت کے سیکریٹری آف اسٹیٹ کرتے تھے لہٰذا وہ اس اعلیٰ سروس میں اپنی پہلی تعیناتی کے بڑے اشتیاق سے منتظر تھے مگر ہمیں کچھ حیرت ضرور ہوئی جب انھیں بہاول پور ریاست جانے کے احکامات موصول ہوئے جہاں انھیں ریاست کے چیف انجینئر کے پرسنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے تعینات کیا گیا۔ یہ وہی سکاٹش افسر تھا جس کے تحت وہ پہلے بھی کام کر چکے تھے اور جس نے دراصل انہی کا انتخاب کیا تھا۔اگر مظفرگڑھ کو پنجاب تصور نہیں کیا جاتا تھا تو بہاول پور تو بالکل اجنبی خطہ محسوس ہوتا تھا۔ یہ ریاست پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے سنگم پر واقع تھی اور اپنی رسوم و رواج، زبان اور طرزِ زندگی کے لحاظ سے زیادہ سندھ و بلوچستان سے مشابہ تھی اور پنجاب سے کم ہی کوئی مطابقت رکھتی تھی۔ چناں چہ "پنجاب سے نکلنے" کے خیال نے ہمیں بے حد پُر جوش کر دیا۔اس جوش کو اُس وقت مزید تقویت ملی جب والد صاحب کی طرف سے، جو ہمیشہ کی طرح تبادلے کے موقع پر ہم سے پہلے نئی جگہ پہنچ گئے تھے، یہ خبر ملی کہ ہمارے نئے گھر میں بجلی موجود ہے۔ اب تک ہم نے بجلی صرف ریل گاڑیوں میں یا لاہور کے چند نایاب دوروں کے

دوران ہی دیکھی تھی۔ 1921 میں پنجاب کے بہت کم شہروں میں ایسی جدید سہولت میسر تھی۔

بہاول پور میں کالج تھا، کلب تھا، باغات تھے اور محلات بھی اور سب سے بڑھ کر اس کی سب سے زیادہ قابلِ فخر اس کی "مال روڈ" تھی، وہی سڑک جس کی موجودگی صرف لاہور، امرتسر اور راولپنڈی جیسے بڑے شہروں میں ہوتی تھی۔ انگلستان کی کسی روایتی سڑک کے نام پر رکھے گئے اس نام "مال روڈ" سے ہمیں شہری آسائشوں کی ایک مکمل دنیا کا گمان ہوتا تھا۔ "مال روڈ" کا نام کسی برطانوی روایتی قصے یا روایت سے جڑا ہوا تھا، اور ہمارے لیے یہ شہری آسائش وتمدن کی علامت بن چکا تھا۔ بہاول پور ہمیں اس لیے دلچسپ لگا کہ وہاں ایک ایسی دنیا آج بھی زندہ تھی جو برسوں پہلے برطانوی پنجاب میں دم توڑ چکی تھی۔ وہ ایک غیر ترقی یافتہ دنیا تھی۔ سازشوں اور ظلم کی وہ فضا جسے دیگر علاقوں میں اصلاحات اور انصاف نے پیچھے چھوڑ دیا تھا لیکن یہاں اس میں ایک رنگینی اور ایک شاہانہ جھلک باقی تھی۔ ہمارے لیے اس میں اصل بادشاہ یا نواب، اُس کا محل، دربار اور شاہی نظام ایک الگ ہی سنسنی اور جاذبیت رکھتے تھے۔ بہاول پور کے حکمران عباسی خاندان کی جڑیں کئی صدیوں پہلے مغرب کی جانب سے آ کر یہاں پیوست ہوئیں۔ نوجوان نواب کی حیثیت مرکزی تھی اور اُن کے دربار اور خاندان کا دائرہ بہت وسیع تھا ایسا دائرہ جس میں کوئی بھی فرد کسی قسم کا عملی کام نہیں کرتا تھا۔ ان کے والد کی کئی بیویاں تھیں اور ہر بیوی کا خاندان نکاح کے بعد کسی بھی کام کاج سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ شاہی وقار کا تقاضا تھا کہ وہ سب کام چھوڑ کر فقط شاہی سرپرستی پر زندہ رہیں۔ پھر دادا کی متعدد بیویوں کے باقی بچنے والے رشتہ دار بھی اس خاندان کا حصہ تھے۔ نواب خود تو ایک نوجوان تھا لیکن اٹھارہ برس کی عمر سے پہلے ہی اس کی ایک سے زیادہ شادیوں کا بندوبست ہو چکا تھا۔ اس کی پہلی شادی حسبِ روایت اپنی ماموں زاد سے ہوئی، جیسا کہ اکثر مسلم خاندانوں میں رواج تھا۔ اسی خاندان کا ایک نوجوان لڑکا ہمارے اسکول میں بھی داخل تھا اور ہماری دلچسپی کا خاص مرکز بنا ہوا تھا۔ اسے اسکول بھیجنے کا فیصلہ ہی چونکا دینے والا تھا۔ اساتذہ اُس سے مرعوب تھے اس لیے وہ تعلیم اور امتحانات سے بالکل مستثنیٰ تھا۔ اُسے محنت سے سخت نفرت تھی لیکن وہ اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ امتحانات دینے والوں کے لیے یہ عمل کس قدر صبر آزما ہے چناں چہ وہ ہمارے لیے ہمدردی کا اظہار کرتا۔ وہ مستقبل میں شاہی عملے کا رکن بننے کی

تیاری کر رہا تھا۔ فی الحال وہ گاڑی چلانا، بندوق چلانا اور لمبے عرصے تک کچھ نہ کرنے کی صلاحیت حاصل کرنے میں مصروف تھا۔ وہ جنسیات کے اَسرار اور اس کے لامتناہی پہلو بھی سیکھ رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ یہ علم اس کے لیے صرف ذاتی لطف نہیں بلکہ ایک ''اہم اہلیت '' کی حیثیت رکھتا ہے۔ کچھ سینئر طلبا اس کے محل کی باندیوں سے تعلقات کے پر جوش قصے بھی سنتے تھے۔ باندیاں — یعنی "بندھی ہوئی عورتیں — "حرم کی خدمت گزار تھیں جو اکثر انہی خواتین خادماؤں کی بیٹیاں ہوتی تھیں۔ جوانی کی عمر میں وہ اکثر اپنے آقاؤں کے ہاتھوں شکار بن جاتیں۔نو جوانوں کے لیے پہلی مہم کی حیثیت رکھتیں اور بوڑھوں کے لیے ''تبدیلی کے لیے نازک لقمہ ''۔ان باندیوں سے اولاد پیدا ہوتی جنھیں عموماً محل کے خادموں سے بیاہ دیا جاتا جو اکثر خود باندیوں کے بیٹے ہوتے تھے۔

خاندان کی بزرگ خواتین اس نظام کو جزوی طور پر برداشت کر لیتی تھیں اس لیے کہ یہ گھر کے لیے سستا مزدور مہیا کرتا تھا جو خاندانی حدود کا پابند رہتا کیوں کہ ان کا کہیں اور کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا لیکن شاید اس میں یہ فائدہ بھی تھا کہ جوان لڑکوں کو اپنی ہم عمر کزنوں کے ساتھ تجرباتی روابط یا باہر کی طوائفوں سے تعلقات قائم کرنے سے روکا جا سکے تا کہ وہ بعد میں انہی کزنوں سے شادی کرتے وقت کسی بیماری کا خطرہ نہ لائیں۔ یہ باندیاں خاندان کا حصہ بن چکی ہوتیں اور چوں کہ ان کا خون بیرونی ذرائع سے مسلسل تازہ ہوتا، وہ عموماً خوب صورت اور صحت مند ہوتیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ خواتین کبھی لمبے عرصے تک کسی مرد کے ساتھ تعلق قائم نہ رکھتی تھیں اور نہ ہی خاندان کے مردوں پر کوئی دیرپا اثر یا اختیار قائم کر پاتی تھیں۔ تاریخ میں کئی طوائفیں حکمرانوں کی مقرب بن کر اقتدار میں شریک ہوئیں لیکن شاید ہی کوئی باندی ایسی ہو جس نے نمایاں مقام حاصل کیا ہو۔ کبھی کبھار حویلی کی ایک معمر باندی، جو فہم و فراست میں یکتا ہو، کسی نوعمر لڑکے کے لیے حرم کی کسی نوجوان لڑکی کو اس کی ابتدائی مہم جوئی کے لیے راہ میں ڈالنے کا بندوبست کرتی۔ ہمارے معصوم ہم جماعت شہزادے نے اپنے پہلے تعلق کو ایک عظیم کارنامہ گردانا حالانکہ وہ "معصوم اور انکاری" باندی دراصل پہلے سے تیار کردہ منصوبے کا حصہ تھی۔ بعد میں جب وہ نوجوان واقعی شکار بنانا سیکھ گیا اور جب وہ اپنے جاگیروں کے دورے پر جاتا تو دیہات کی لڑکیوں کو پردے میں رکھا جاتا کہ کہیں وہ ان کی عزت پر ہاتھ نہ ڈال

دے۔ اگر کوئی لڑکی اسے پسند آ جاتی تو وہ اس سے شادی کر لیتا اور اُسے اپنے کسی بلند و بالا محل میں قید کر دیتا اور اگر دل بھر جاتا تو کچھ رقم دے کر اُسے اُس کے خاندان کو واپس کر دیتا۔ خاندان والے چاہے دانت پیستے رہیں، کر کچھ نہ سکتے تھے۔ غربت اور سادگی نے انھیں تقدیر کا پابند کر دیا تھا اور وہ خوش ہو جاتے اگر ان کی بیٹی حرم میں جگہ پا جاتی۔ کبھی کبھار کوئی امیر اُمرا کسی اور کے گھر کی عورت پر نگاہ ڈال دیتا اور یہ بے عزتی کھلے عام نہیں بلکہ سازش کے ذریعے بدلہ لیتی عموماً زہر دے کر۔ اس موقع پر سازشوں کے ننھے پہیے تیزی سے مگر خاموشی سے گردش میں آ جاتے۔ اگر فریقِ مخالف کو سازش کی بھنک بھی پڑ جاتی تو اُس کی جانب سے ردِعمل کہیں زیادہ برق رفتاری سے ظاہر ہوتا۔ حرم کی عورتیں عوام کی نگاہوں سے دور رکھی جاتی تھیں۔ ہمارے بہاول پور پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ہی یہ خبر سننے کو ملی کہ محل کی خواتین پرانی آبائی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہونے والی ہیں۔ پولیس کو سالوں کی مشق کے ذریعے اس عمل کو ایک خاموش مشین کی طرح چلانے کی تربیت دی گئی تھی۔ شہر کے نقارچی ڈھول بجا کر گلی گلی اعلان کرتے پھرتے کہ مقررہ دن کی دوپہر کو محل سے ریلوے اسٹیشن جانے والی سڑک اور اُس سے جڑی تمام گلیاں ویران ہونی چاہییں نہ کوئی مرد نہ عورت حتیٰ کہ گھر کی کھڑکیوں سے بھی کوئی جھانکتا نظر نہ آئے۔ جن کے گھروں کی جھلک بھی اُس سڑک پر پڑتی اُنہیں ہدایت کی گئی کہ نچلی منزلوں کے کمروں میں محدود رہیں۔ یہ سب احتیاطی تدابیر اس کے باوجود تھیں کہ خواتین مکمل پردے والی کاروں میں سفر کرنے والی تھیں جن پر کالے شیشے اور موٹے کپڑوں کے پردے ڈالے گئے تھے، صرف ڈرائیور کے لیے سامنے کی کھڑکی کھلی رہتی۔ دو گھنٹے پہلے ہی پولیس نے سڑکیں خالی کروانا اور دروازے و کھڑکیاں بند کرانا شروع کر دی تھیں۔ سیٹیاں بجتی تھیں اور جو کوئی نظر آتا اُس پر چیخا جاتا۔ پھر وہ لمحہ آیا جب سناٹا چھا گیا — ایسا سناٹا جو دن کی روشنی میں بھی کسی قید خانے یا موت کی دھمکی جیسا خوفناک محسوس ہو رہا تھا۔ ہم دونوں بھائی اپنی تجسس بھری فطرت کو نہ روک سکے اور چھت پر جا کر دیوار کے پیچھے دبک گئے۔ ماں نے جب دیکھا تو ہمیں نیچے بلایا مگر خوف سے خود اوپر نہ آ سکیں اور نہ ہی زور سے پکار سکیں کہ کہیں پولیس سُن نہ لے۔ اچانک سیٹیاں بجنے لگیں۔ ہر پولیس والا سڑک سے منہ موڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا، سر جھکائے۔ پھر کاروں کا قافلہ آندھی کی طرح نمودار ہوا کالے شیشوں والی، کپڑے

سے لپٹی ہوئی کاریں، صرف سامنے کی کھڑکی کھلی تاکہ ڈرائیور دیکھ سکے۔ عقبی حصے میں جہاں خواتین تھیں وہاں پر بھی پردہ پڑا تھا۔ جیسے ہی قافلہ نظروں سے اوجھل ہوا، سیٹیاں پھر بجیں اور زندگی دوبارہ سڑکوں پر لوٹنے لگی۔ ریلوے اسٹیشن پر یہ کاریں ایک خاص پردہ دار سائیڈ پر لے جائی گئیں جو دونوں طرف اونچی دیواروں سے گھری ہوئی تھی۔ گاڑیاں پلیٹ فارم تک چلی گئیں جہاں پہلے سے بند پردوں والے شاہی ڈبے تیار کھڑے تھے۔ سامنے کی کاروں سے چند عمر رسیدہ باندیاں نکلیں اور کار سے کوچ تک پردے کا راستہ بنا لیا۔ اس دوران ڈرائیور پیچھے ہٹ کر منظر سے غائب ہو چکے تھے۔ جب خواتین محفوظ طریقے سے کوچ میں بیٹھ گئیں، دروازے بند کر دیے گئے اور پولیس محافظ پیٹھ کیے سر جھکائے کھڑے ہو گئے۔ پھر انجن آیا اور ڈبے لے کر روانہ ہو گئے۔ دوسری جانب بھی یہی کارروائی دوہرائی گئی اور جب خواتین محل میں داخل ہو گئیں، تو اُن کی سال کی واحد "سیر و تفریح" ختم ہو گئی — یہ اُن کی واحد باہر کی جھلک تھی۔ نوابوں کی بہنوں کو، روایت کے مطابق، شادی کی اجازت نہ تھی۔ شمالی ہندوستان میں "سالہ" (بیوی کا بھائی) کا لفظ کسی طرح گالی یا طنز کا مطلب اختیار کر گیا تھا اس لیے نواب اس بات کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے کہ وہ کسی کے "سالہ" بنیں چناں چہ وہ اپنی بہنوں کی شادیاں کروانے کے بجائے انھیں غیر شادی شدہ ہی رکھتے مگر انھیں محل میں رکھنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا، کیوں کہ کسی رسوائی یا اسکینڈل کا اندیشہ رہتا۔ چناں چہ اُنہیں صحرا کے اندرون ایک پرانے اور دور افتادہ قلعے میں جلا وطن کر دیا جاتا۔ وہاں سخت پہرے میں وہ اپنی طویل تنہائی بھری زندگی گزارتی تھیں گویا قیدی بن کر دنیا سے کٹ چکی ہوں۔ اُن کی زندگی کا واحد روشن لمحہ شاید بچپن کی مختصر خوشی کا دور ہوتا۔ رشتہ دار بھی شاذ و نادر ہی ان سے ملنے آتے اور قلعے کے نگہبانوں سے بھی اُنہیں محض رسمی توجہ ملتی۔ لیکن اس "زندہ مُردوں کے قلعے" میں بعض پراسرار واقعات کی چہ میگوئیاں عام تھیں۔ (کہا جاتا ہے کہ آخری نواب نے اس رسم کو منسوخ کر دیا تھا۔ مترجم) قلعہ دراوڑ شاید کئی صدیوں پہلے تعمیر ہوا ہوگا۔ یہ قریبی قصبے سے چھبیس میل دور، ایک لق و دق صحرا میں واقع تھا جہاں نہ کوئی سڑک تھی نہ آبادی، صرف ہرنوں کے جھنڈ یا بکھرے ہوئے اونٹ بان۔ ہم نے ایک بار اسے ایک پرانی "ٹی ماڈل فورڈ" میں دیکھا جو اپنے بلند ڈھانچے اور ہلکے وزن کی وجہ سے واحد گاڑی تھی جو اُس سفر کے

قابل تھی۔ بار بار جب گاڑی کے پہیے ریت میں دھنس جاتے اور ہمیں اُسے دھکا دینا پڑتا، بسا اوقات اسے اٹھا کر نکالنا پڑتا۔ ہرن ہمیں معصومیت سے گھورتے اور جونہی ہم کوئی حرکت کرتے، وہ پتلے پتلے پیروں پر سبک رفتاری سے جھاڑیوں اور ٹیلوں کو عبور کرتے ہوئے دوڑ جاتے۔ اونٹوں اور دبلے انسانوں کے اس ویران علاقے میں ان کا موٹاپا عجیب لگتا تھا۔ جیسے ہی ہم ایک ڈھلوان پر پہنچے، دراوڑ اچانک صحرا سے ابھرتا نظر آیا، ایک شاندار قلعہ، جو مٹی اور زرد پتھر سے بنا تھا۔ اس کی فصیلیں سیدھی ریت سے بلند ہوتی تھیں۔ لکڑی کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی یوں لگتا جیسے وقت صدیوں پیچھے چلا گیا ہو۔ چھوٹے چھوٹے کچے مکانات، تنگ اور پیچیدہ گلیاں، گدھوں کے پیچھے چلتے یا اونٹوں کی نکیل تھامے لوگ — یہ منظر پنجاب کے کسی بھی قصبے سے کہیں زیادہ قدیم محسوس ہوتا تھا۔ یہ لوگ لمبے قد، تیز نقوش، گھنی داڑھیوں والے، ڈھیلی شلواریں اور لمبے کُرتے پہنے ہوتے جو اکثر سیاہ یا نیلگوں رنگ کے ہوتے اور اُن کے سروں پر گہرے سرخ رنگ کی ڈھیلی پگڑیاں ہوتیں۔ عورتیں بھی لمبی اور دبلی، مردوں جیسے کپڑوں میں، ویسے ہی پُراثر نظر آتی تھیں۔ کچھ مردوں کے پاس تلواریں تھیں، کچھ کے پاس پرانی توڑے دار بندوقیں۔ ہم ایک خاص خاندان کے پاس سے گزرے، ایک غیر معمولی قامت کا، شاندار وجاہت کا حامل شخص جو وقار سے تن کر کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کا چھوٹا بیٹا، بیوی اور اونٹ تھے۔ اس کے سر پر سرخ رنگ کی چھوٹی سفید بیل بوٹوں والی پگڑی تھی، گھٹنوں تک سفید قمیض جس کے بٹنوں پر چاندی کی زنجیریں اور جھالر، سرخ مخملی واسکٹ جس کے کنارے سونے کی گوٹ سے مزین، نیلی شلوار تلے دار جوتی اور کمر سے سرخ مخملی میان میں لٹکی تلوار۔ اس کی گود میں اُس کا بیٹا تھا جس کی آنکھوں میں گہرا سرمہ، سجے سنورے کپڑے اور لمبے سیاہ بال تھے — بالکل باپ کی طرح، جس کے بال گھنگھریالے تھے جو شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور پگڑی کے پیچھے سے جھاڑ کی مانند نکلتے تھے۔ اس کی بیوی کے لب سرخ، آنکھیں گہرے سرمے سے بھری ہوئیں اور بالوں کی لمبی، نفیس مینڈھیاں کانوں کے گرد لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ فخر سے اس کے پیچھے چل رہی تھی اور اُن کے اونٹ کی نکیل تھامے ہوئے تھی جو خود بھی سرخ جھالر اور خوب صورت زین سے آراستہ تھا۔ بلاشبہ وہ کسی شادی کی طرف جا رہے تھے۔ دراوڑ کی آبادی کم تھی کیوں کہ پانی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ لوگ بارش

کے نایاب قطروں کو زمین دوز گڑھوں یا ٹوبوں میں جمع کرتے۔ قلعے کے اندر صرف شاہی کنواری لڑکیاں ہی نہیں بلکہ کچھ بھولے بسرے مرد بھی قید تھے جنھیں کبھی کسی نواب کی وقتی ناراضی کی سزا میں قید کر دیا گیا تھا۔ اب نہ کوئی انھیں یاد کرتا تھا اور نہ رہائی کا امکان تھا۔ دراوڑ قلعے کا گورنر بھی اپنی حیثیت پر افسوس کرتا ہوگا گویا وہ بھی قیدی ہو — یہ کوئی قابلِ رشک عہدہ نہ تھا اور شاید کسی لغزش کی سزا یا کسی حریف کی کامیاب سازش کا نتیجہ۔ یہی تھا دراوڑ — بہاول پور کے مشرق اور راجستھان کے مغرب میں پھیلے ہوئے ان سینکڑوں پرشکوہ قلعوں میں سے ایک۔

نواب صادق محمد خان نوجوان، نہایت خوبرو اور دلکشی سے بھرپور شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے چہرے پر اداسی کے نقوش نمایاں ہوتے، لباس دیسی عوام جیسا، بال لمبے اور خوب صورت گھنگریالے ہوتے جو تیل سے چمکدار ہو کر پگڑی کے پیچھے سے جھانکتے۔ وہ ذہین تھے، پرکشش تھے اور بظاہر شاہی روایات سے بغاوت کا جذبہ رکھتے تھے۔ چوں کہ اُن کے پاس کرنے کو کچھ زیادہ نہ تھا توانائی کے اظہار کی کوئی صورت نہ تھی اس لیے وہ اکثر بے چین اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتے جیسے جب وہ اپنی گاڑی روک کر کسی تانگے والے کو ڈانٹتے کہ وہ اُن کے احترام میں تانگے سے نیچے کیوں نہ اترا۔ اُن کی تمام گاڑیوں میں ایک خاص قسم کا ہارن نصب تھا — ربڑ کا گولا، لمبی کروم کی نلی اور آخری سرے پر مگرمچھ کے منہ کی شکل کا ہارن جو کار کے بمپر پر نصب ہوتا۔ اُس کی آواز گونجدار اور موسیقیت لیے ہوتی۔ جیسے ہی ان کی کار گزرے، ہر راہ گیر سے توقع ہوتی کہ وہ اپنی سواری سے اُتر کر سڑک کے کنارے مؤدبانہ کھڑا ہو۔ کبھی کبھی تو گاڑی پہچانی بھی نہ جاتی اور وہ گرد و غبار میں لپٹی گزر جاتی مگر احتیاطاً لوگ کھڑے ہو جاتے کہ کہیں وہ پیچھے مڑ کر آئینے میں نہ دیکھ رہے ہوں۔ کچھ نایاب مواقع پر وہ ایسی گستاخی پر کوڑے بھی مار دیتے تھے۔ خود چوں کہ نہایت باوقار اور خوش اخلاق نوجوان تھے دوسروں کی بدتہذیبی برداشت نہ کرتے تھے۔ ایک بار تو ہمیں اپنی والدہ کو تانگے سے کھینچ کر نیچے اتارنا پڑا، خوش قسمتی سے ہم وقت پر اُتر گئے۔

ان کے پاس قیمتی گاڑیوں کا خزانہ تھا — آرمسٹرانگ سِڈ لے، ڈائملر اور رولز رائس کی مخصوص کاریں مگر یہ گاڑیاں اتنی نرم رفتار اور خاموش تھیں کہ عوام کے لیے پریشانی کا باعث بن جاتی

تھیں کیوں کہ وہ دن رات بہاول پور اور دیہی محل کے درمیان سفر میں رہتے، ہر وقت ہوشیار رہنا پڑتا تاہم کچھ ہی عرصے میں وہ لوگوں کی آداب بجالانے کی فکر چھوڑ بیٹھے اور اُنہیں کوئی پروا نہ رہی کہ کوئی تعظیم میں کھڑا ہوا یا نہیں۔ جب نواب اٹھارہ برس کے ہوئے تو حکومتِ ہند نے اُنہیں تخت نشین کرنے کی منظوری دے دی، اور خود لارڈ ریڈنگ، وائسرائے ہند، اس رسمِ تاج پوشی کے لیے بہاول پور تشریف لائے۔ اس موقع کے لیے زبردست تیاریاں کی گئیں۔ ریلوے اسٹیشن، جہاں وائسرائے اپنی خاص ٹرین میں پہنچنے والے تھے اور اس سے محل تک کے پورے راستے کو خوب دھو کر صاف کیا گیا، جگہ جگہ محرابیں، پودے، جھنڈیاں، قمقمے اور خیر مقدمی نعروں سے سجایا گیا۔ مہمان محل کو نئے فرنیچر سے آراستہ کیا گیا۔ بڑے دربار کی تیاری کی گئی جہاں نواب کو مکمل اختیارات کے ساتھ ریاست کا حکمران مقرر کیا جانا تھا۔ اسی شب ضیافت کا بندوبست بھی کیا گیا۔ برطانوی افسروں، اُن کی بیویوں اور خود وائسرائے کے ذوق کا خیال رکھتے ہوئے، لاہور سے — جو تقریباً ڈھائی سو میل دور تھا — اپنے ہمراہ تمام اشیائے خورونوش سمیت خصوصی گوا کے کھانے پکانے والے اور ویٹر لائے گئے۔ کھانے میں انگریزی طرز کی اشیاء شامل تھیں: سوپ، ڈبہ بند گوشت کا پیسٹ، ٹن میں بند سالمن مچھلی، سفید ساس کے ساتھ، طرح طرح کے بھنے ہوئے پرندے، کیریمل کسٹرڈ پڈنگ، کیمپ کی بوتل بند کافی اور ٹوسٹ پر رکھا جانے والا چٹپٹا نوالہ۔ مقامی مہمان گوان کھانے سے بہت مایوس ہوئے۔ اُن کے لیے یہ بے ذائقہ، سپاٹ کھانے جیسے ابلی ہوئی مچھلی، ابلا ہوا انڈہ سفید ساس میں، بغیر نمک و مرچ کے بھنا گوشت اور اجنبی قسم کے چمچ کانٹے — گویا ایک امتحان بن گئے۔ اُنہیں شاہی محل کے خوشبودار، زعفرانی پکوانوں کی شدید یاد ستارہی تھی۔

دربار اس دن وفاداری اور مبارکباد کے اظہار کا مقام تھا۔ اعزازات عطا کیے گئے اور نواب نوجوان سے "حضرت نواب سر صادق محمد خان، کے سی آئی ای" بنا دیے گئے جنھیں پندرہ توپوں کی سلامی کا پروٹوکول حاصل ہوا۔ اُن کا ذاتی خزانہ ریاست کے کل چالیس لاکھ روپے آمدن میں سے تین لاکھ روپے سالانہ مقرر کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی اُن کے لیے بے شمار سہولیات تھیں، سب کچھ ٹیکس سے مستثنیٰ۔ وائسرائے نے خاص طور پر نواب کی "ترقی پسند سوچ" کی تعریف کی۔ نواب نے

ایک روز قبل ہی ایک عوامی لائبریری کا سنگِ بنیاد رکھا تھا اگرچہ اس منصوبے کی تکمیل کئی برس مؤخر رہی۔ اگلے دن شکار کا پروگرام تھا جس کی تفصیلات پہلے سے طے تھیں۔ شکار کے اعداد وشمار طے کیے گئے: وائسرائے کو سینکڑوں مرغابیوں کا سب سے بڑا شکار ملنا تھا، نواب کو کچھ کم تعداد والا تا کہ مہمان کی شوٹنگ کی مہارت کا لحاظ رکھا جا سکے۔ یہ پروٹوکول انگریز و ہندوستانی افسران کے درمیان نپے تلے انداز میں تقسیم ہوا لیکن اتنی بڑی تعداد میں مرغابیوں کے شکار کو یقینی بنانے کے لیے خاص انتظامات کیے گئے۔ جھیلوں پر بڑے بڑے جال بچھائے گئے اور سینکڑوں پرندے پھنسائے گئے۔ اُن کے پر احتیاط سے تراشے گئے تا کہ چند دن تک وہ زور سے اُڑ نہ سکیں۔ یہ تدبیر خوب کارگر ثابت ہوئی اور شکار کے دن ہزاروں پرندے مارے گئے۔ نواب، وائسرائے اور اُن کے ساتھی خاکی وردی میں، بندوقوں پر جھکے ہوئے، اپنے سامنے مردہ مرغابیوں کے ڈھیر کے ساتھ تصویریں اور فلم بنواتے رہے۔ اس تقریب کی فلم بندی کے لیے بمبئی سے خصوصی فلم یونٹ بلایا گیا تھا۔ یہ تھی اُس زمانے کی نوابی دنیا — ایک ماضی پرست زندگی جس میں جدیدیت کی صرف جھلکیاں تھیں: رولز رائس کاریں، یورپ کے کبھی کبھار دورے یا محلوں کے لیے کچھ نئے فوارے یا فانوس۔ من پسند لوگ آتے اور جاتے، راتوں رات اقتدار ملتا اور اگلے دن رخصتی۔ ایک بار ایک بوڑھا، سفید داڑھی والا، ان پڑھ مگر چالاک وزیرِ اعظم بھی اقتدار کی بلندی پر پہنچ گیا۔ اُس کے وقت میں نہ اختیارات کی تقسیم کا سوال تھا نہ مشورے کا، ہر بات اُس ایک شخص سے ہو کر گزرتی۔ معمولی ترین تقرریاں بھی اُس کی منظوری سے ہوتی تھیں مگر پھر ایک دن، جب وہ اپنے عروج پر تھا، اُسے حکم ملا کہ چند گھنٹوں کے اندر ریاست چھوڑ دے۔ آدھی رات تک وہ ملتان میں تھا — خستہ حال، بے دخل، اور بہت جلد فراموش کر دیا گیا۔

تقدیر کا پہیہ کبھی نہیں رکتا۔ ایک دن جو عروج پر ہوتا، دوسرے دن خاک میں ہوتا۔ جو اس پہیے پر چڑھتے، وہ اس کھیل کی سختی کو قبول کرتے، جو گر پڑتے، وہ پھر سے چڑھنے کی کوشش کرتے۔ جو اوپر پہنچتے وہ اسے روکنے کی بے سود کوشش کرتے۔ سازشوں کا کھیل صرف اقتدار کے لیے نہیں بلکہ خود اس کھیل سے لطف لینے کے لیے بھی کھیلا جاتا تھا۔ ایک بار ریاست کے اکاؤنٹنٹ جنرل کو ہٹانے کے لیے ایک امیدوار سامنے آیا۔ اُس کے پاس کوئی قابلیت نہ تھی، لیکن مسئلہ یہ نہ تھا۔ موجودہ افسر نہایت

ایماندار شخص تھا لیکن آہستہ آہستہ یہ بات پھیلائی گئی کہ وہ بوڑھا ہو رہا ہے۔ ایک دن جب وہ مصروف دن کے بعد دفتر سے نکلنے کو تھا، چیکوں کا ایک پلندہ دستخط کے لیے لایا گیا۔ متعلقہ کلرک نے صفحہ دبانے والی پیڈ ہاتھ میں لے کر ہوشیاری سے اُس سے تمام چیکوں پر دستخط لے لیے۔ اُن چیکوں میں ایک جان بوجھ کر ایسا بھرا گیا تھا جس کی مالیت اتنی زیادہ تھی کہ ریاست کا خزانہ کئی سالوں کے لیے خالی ہو جاتا۔ خزانے نے فوراً وہ چیک واپس کر دیا اور فوراً نواب کو اطلاع دے دی گئی کہ ریاست کی مالی حالت شدید خطرے میں ہے۔ یہ اُس ایماندار افسر کی "ذہنی کمزوری" کا ثبوت بنا اور فوراً اُسے سبکدوش کر دیا گیا۔ ایک اور شخص، جو وزیر تھا اور مکمل طور پر ناخواندہ، جب بھی کوئی معاملہ خراب ہو جاتا تو ہمیشہ ہدایات سے انکار کر دیتا۔ ایک بار ایسا ہی واقعہ ہوا تو اُس کے دستخط کے ساتھ تحریری حکم نامہ پیش کیا گیا۔ اُس نے صرف اتنی ہی لکھائی سیکھ رکھی تھی کہ اپنا دستخط بنا سکے۔ اس نے بڑی چالاکی سے کاغذ طلب کیا، اُسے اپنے چہرے کے سامنے لایا اور بڑی تیزی سے اپنی زبان سے دستخط چاٹ ڈالے۔ پھر اس نے ماتحت کو جھاڑ دیا کہ اُس نے جھوٹا حکم نامہ جاری کیا ہے کیوں کہ اُس نے تو ایسا کچھ بھی دستخط نہیں کیا تھا۔ اسی طرح ایک اسکول انسپکٹر بھی تھا جس نے اپنی تعیناتی کے وقت صرف دستخط کرنا سیکھا تھا۔ ریاست کے اسپتالوں کا انسپکٹر جنرل پہلے کسی جیل کا انچارج رہا تھا۔ ملازمت کے لیے اہلیت محض ایک بے وقعت بات تھی جو کبھی بھی انتخاب کی راہ میں حائل نہ ہوتی۔ اصل چیز تھی دلیری، اثر و رسوخ اور یہ اعتماد کہ ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

ریاست کی انتظامیہ، کم از کم کاغذوں پر پنجاب سے کئی سال آگے جدید خطوط پر قائم تھی۔ ایک کابینہ تھی جسے شاید "کابینہ" کہنا ہی مبالغہ ہو۔ ہر وزیر نواب کو اپنی طرف کھینچتا، سب ایک دوسرے کے معاملات میں دخل دیتے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے۔ محکمے تو موجود تھے: داخلہ، خزانہ، قانون، تعمیرات عامہ وغیرہ لیکن ذمہ داریوں کی تقسیم اور اختیارات کی شراکت محض رسمی باتیں تھیں۔ پھر کچھ سیکرٹری حضرات بھی تھے جن میں ایک "خارجہ امور" کا بھی تھا جسے ریاست کے بیرونی معاملات دیکھنے ہوتے حالانکہ درحقیقت یہ دائرہ مکمل طور پر برطانوی ریزیڈنٹ کے قبضے میں تھا اور اس دائرے میں نواب خود بھی قدم رکھنے سے ہچکچاتے۔ ریزیڈنٹ ایک خوش مزاج، فربہ

اندام آئرش شخص تھا جس نے مارشل لا کے دنوں میں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے بدنامی کمائی تھی۔اس کی نظر آنے والی دلچسپیاں محض یہ تھیں: بھنے ہوئے بٹیر کھانا، وسکی پینا اور اپنے گنٹھیا کا خیال رکھنا۔اس کا اصل کام نواب پر نگاہ رکھنا تھا۔ ریزیڈنٹ عام طور پر اعلیٰ منتظم ہوتے تھے اور اگر انھیں دو چار مشیر مل جاتے تو وہ بڑی تعمیری تبدیلی لا سکتے تھے۔ پنجاب کے اُن کے ساتھی، جن کے اختیارات نسبتاً کم تھے وہاں ملک کو نئے سرے سے سنوار رہے تھے لیکن یہاں کے ریزیڈنٹ گویا قرونِ وسطیٰ کے ایک "عجائب گھر" کی حفاظت پر مامور تھے جس میں کسی چیز کو چھیڑا نہ جائے۔ جیسے کہ بہاول پور کے نور محل میں جہاں آویزاں قرآنِ پاک کے خطاطی شدہ روشن نسخے، ایرانی قالین، صدیوں پہلے دفن ہو چکے اجداد کی تلواریں اور زرہیں اور موروثی چیزیں جن کے لیے خونریز جنگیں لڑی گئیں۔ ان کے ساتھ برطانیہ کے شاہی خاندان کی روغنی تصویریں، گھوڑوں اور شکاری کتوں کی تصویریں، جنھیں "اسکیچ" اور "ٹیٹلر" جیسے رسائل سے کاٹ کر سنہرے فریموں میں لگایا گیا تھا، سب ایک ساتھ رکھے گئے تھے۔

جب بہاول پور چھوڑنے کا وقت آیا تو ہم بچوں کو بہت افسوس ہوا۔ نواب صاحب، اُن کی روز بدلتی گاڑیاں، محلات، دربار، جلوس، ہاتھی، اونٹ، پولو، خیمہ بازی، درباری سازشوں کی کہانیاں — یہ سب کچھ ہم آئندہ کسی ٹھوس، نظم و ضبط والے برطانوی ضلع کی تعیناتی میں یاد کرنے والے تھے مگر وقت آگے بڑھ رہا تھا۔ ہم نے اپنا تانگا اور گھوڑی "بجلی" جو موسیقی پر مارچ کرتی، دایاں پاؤں اٹھا کر سلام کرتی تھی اور اپنے چاروں پاؤں ایک فٹ کے چوکور تختے یا سٹول پر رکھ سکتی تھی، بیچ دی تھی اور اگلے اسٹیشن کے لیے نئی شیورلیٹ کار کا آرڈر دے دیا تھا اور امید تھی کہ شاید اب جہاں بھی ہم جائیں گے شاید بجلی بھی موجود ہوگی۔ بہاول پور سے میں واپس گجرات گیا تا کہ حال ہی میں کھلنے والے انٹرمیڈیٹ کالج میں داخل ہوسکوں اور دو سال بعد لاہور چلا آیا جہاں میں نے مزید دو سال رہ کر اپنی ڈگری مکمل کی۔

☆☆☆☆☆

برطانوی-بہاول پور اتحاد کے سو سال

(The Centenary of

The British-Bahawalpur Alliance)

ایک مختصر تاریخی جائزہ

ناشر: دربارِ بہاول پور

نوٹ۔ اے فور سائز کاغذ کے آدھے سائز کے 30 صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ بہاول پور دربار کی جانب سے اپنے اور برطانوی تعلقات کے سو سال مکمل ہونے پر جولائی 1933 کے دوران شائع کیا گیا کیوں کہ اس میں آخری واقعہ کے طور پر بہاول پور کے آخری نواب صادق محمد خاں کی 1931 میں برطانوی شہنشاہ سے ملاقات کا سرسری تذکرہ ہے۔ یہ کتابچہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں عباسی داد پوتروں اور حکمرانوں کی تاریخ کے بارے میں دربار کا سرکاری نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں انگریزوں کے "ریاست کے محافظ" ہونے کا بھرپور تاثر دیا گیا ہے اور انگریزوں کی مختلف جنگوں میں بہاول پور کی ریاستی افواج کی بھرپور مدد اور کارروائیوں کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے اور اختصار کے ساتھ برطانوی حکومت کے ساتھ کیے گئے پہلے معاہدے اور دیگر معاہدوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مختصر کتابچہ انگریزوں کے ساتھ ریاست کے تعلقات کی ایک صدی مکمل ہونے پر خوشی اور تشکر کے جذبات کے اظہار کے طور پر بھی سامنے آتا ہے۔ (مترجم)

اس کتابچے کا مقصد ان فوائد کا اعادہ کرنا ہے جو ریاست بہاول پور کو اس وقت حاصل ہوئے جب اس نے برطانوی حکومت کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کیے اور اس بات کا جائزہ لینا بھی

مقصود ہے کہ کس حد تک اور کس درجے میں بہاول پور کے حکمرانوں نے بالادست طاقت کے ساتھ تعاون کیا تاہم ایسا بیان اُس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ ریاست اور اس کے موجودہ حکمرانوں کی مختصر تاریخی جھلک پیش نہ کی جائے۔ موجودہ ریاست بہاول پور کہلانے والا خطہ ماضی میں بے شمار انقلابات، شورشوں اور امن کے ادوار سے گزرا یہاں تک کہ اس پر عباسی حکمرانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اُوچ، جو شاید اس خطے کا سب سے قدیم شہر ہے، اُس وقت ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور الادریسی کے مطابق تجارت، دولت اور وہاں کے باشندوں کی خوشحالی کی وجہ سے مشہور تھا۔ سکندر اعظم کی یلغار سے متعلق متعدد واقعات میں ایک واقعہ یہ بھی درج ہے کہ اُوچ کے قرب و جوار میں بسنے والی آکسی ڈریکائی نامی قوم نے بلا شرط اطاعت قبول کی اور دوسرا واقعہ موسیقانوس کے بارے میں ہے جس کی ریاست الور، جنرل ہیگ کے مطابق، بہاول پور کے اضلاع پر مشتمل تھی۔

مستند تاریخ دراصل 495ء سے شروع ہوتی ہے جب رائے خاندان نے دیبل جو کراچی کا پیش رو تھا، سے لے کر مغربی پنجاب تک حکومت کی۔ عرب حملہ آوروں نے 636ء میں خلافت حضرت عمرؓ کے دور میں مغیرہ کے تحت دیبل پر حملہ کیا اور 638ء میں حُرّس کے تحت دوبارہ چڑھائی کی مگر اصل یلغار 712ء میں ہوئی جب محمد عمادالدین بن قاسم نے رائے داہر کے خلاف ایک فوجی مہم کی قیادت کی جس میں رائے داہر شکست کھا کر مارا گیا۔ صرف دو مہینے میں دیبل سے ملتان تک، جس میں اوچ اور موجودہ ریاست بہاول پور شامل تھی، پورا علاقہ فتح کر لیا گیا۔ اموی خلفا کی طرف سے آخری گورنر منصور تھا اور عباسی خلفا کی طرف سے پہلا گورنر عبدالرحمٰن مقرر ہوا۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں ملک نے بے مثال خوشحالی دیکھی تاہم 870ء کے بعد عباسی خلافت کا زوال شروع ہوا اور سب سے پہلے سندھ ان کے انتظام سے نکل گیا۔ ملک دو خودمختار ریاستوں میں تقسیم ہو گیا: منصورہ اور ملتان، جن میں سے ملتان میں موجودہ ریاست بہاول پور بھی شامل تھی۔ 985ء میں قرامطہ نے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا جو سندھ سے لے کر ملتان تک پھیلا ہوا تھا یہاں تک کہ محمود غزنوی نے 1005ء میں ملتان فتح کیا۔ 1010ء میں محمود دوبارہ ملتان آیا کیوں کہ وہاں کا حکمران آنند پال اُوچ بھاگ گیا تھا۔ 1025ء میں محمود ایک بار پھر ملتان آیا اور یہاں سے ایک بڑی فوج کے

ساتھ سومنات کی مہم پر روانہ ہوا اور سقوط سومنات کے بعد واپسی پر دوبارہ بہاول پور کے علاقے سے گزرا۔ چوں کہ راجاؤں کے نزدیک غزنویوں کی حکومت برائے نام تھی جس پر راجاؤں نے قبضہ جما لیا۔ سلطان معزالدین غوری نے اوچ شہر کو بزور شمشیر فتح کیا۔ خاندان غلاماں کے دور میں یہ علاقہ قباچہ کے قبضے میں تھا جسے بعد میں خراسان کے جلال الدین کو خراج دینا پڑا۔ 1228ء میں قباچہ کو التمش نے شکست دی اور اوچ پر قبضہ کر لیا۔ یہ علاقہ اب منگول حملوں کی زد میں آ گیا کیوں کہ اُوچ سرحدی مقام پر واقع تھا۔ منگولوں نے اُوچ کا محاصرہ بھی کیا جو شاید فتح ہو جاتا اگر بلبن ذاتی طور پر حملہ کر کے ان کی واپسی کا راستہ بند نہ کر دیتا۔ خلجیوں کے دور میں منگول اسلام قبول کرنے لگے اور ان نومسلموں کو 1296ء کے دوران دہلی کے قریب مغلپورہ اور اوچ کے قریب اوچ مغلاں میں بسایا گیا۔

تیمور کی آمد

1400 میں تیمور نے دریائے ستلج عبور کیا اور موجودہ منچن آباد تحصیل کے علاقے سے گزرا۔ پندرہویں صدی میں لنگاہ اور ناہار افغان قبائل نے یکے بعد دیگرے اس علاقے پر حکومت کی۔ ناہار افغانوں کی حکمرانی 1700ء تک قائم رہی۔ وہ مغل بادشاہ اکبر کو خراج ادا کرتے تھے تاہم موجودہ ریاست بہاول پور اس وقت مختلف چھوٹے چھوٹے سرداروں میں منقسم تھی جب عباسی حملہ آوروں نے یہاں اپنی بالادستی قائم کی۔

عباسی خاندان: ریاست بہاول پور کے حکمران حضرت عباسؓ۔ جو نبی کریم حضرت محمدؐ کے جلیل القدر چچا تھے، کی براہ راست اولاد میں سے ہیں۔ عباس کی نسل سے عبدالعباس سفاح نے عباسی خلافت کی بنیاد رکھی۔ اُس نے آخری اموی خلیفہ مروان کو شکست دی اور 750ء میں خلافت عباسیہ قائم کی اور یوں وہ اسلامی دنیا کا تسلیم شدہ حکمران بن گیا۔ عباسی خاندان نے 750ء سے بغداد میں حکومت کی۔ خلیفہ ابوجعفر المنصور (775-754 ء) نے بغداد کی بنیاد رکھی جو بعد میں مشرق میں علم، ثقافت اور تجارت کا مرکز بن گیا۔ ہارون الرشید (809-785ء) عباسی حکمرانوں میں سب سے عظیم تھے۔ ان کی حکومت دانائی اور انصاف پر مبنی تھی۔ وہ ایک شاندار دربار سے گھرے رہتے اور علم و فن کے عظیم سرپرست تھے۔ اسی طرح ان کے صاحبزادے مامون الرشید (833-813) بھی عظیم

المرتبت حکمران تھے۔ ان کا دور اسلامی تاریخ کے روشن ترین ابواب میں شامل ہے جو ادب، سائنس اور فلسفے کا سنہری دور تھا۔ مامون الرشید نے اہل علم، شعرا، اطباء اور فلاسفہ کو اپنی سرپرستی میں رکھا۔ یونانی فلاسفہ، علما، مؤرخین اور ریاضی دانوں کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ ان کے دور میں تاریخ، سیاحت، طب، کیمیا اور نجوم پر کئی کتابیں لکھی گئیں اور ایک رصدگاہ بھی قائم کی گئی۔ جب 1258ء میں ہلاکو خان نے بغداد کے آخری خلیفہ المستعصم باللہ کو قتل کیا تو عباسی خاندان کے ایک فرد ابوالقاسم مصر چلے گئے جہاں سلطان نے ان کا شاندار استقبال کیا اور انھیں جائز خلیفہ تسلیم کیا۔ مصر میں عباسی خلفا کا سلسلہ تقریباً ڈھائی صدیوں تک قائم رہا۔ خلافت اور ہندوستان کے بادشاہوں کے درمیان تعلقات آٹھویں صدی ہجری میں قائم ہوئے جب محمد تغلق نے عباسی خلیفہ کی طرف وفد بھیجا اور اس سے ہندوستان میں فرماں روائی کے فرمان کی درخواست کی۔

ہندوستان پر حملہ:

خلیفہ المستنصر باللہ کی نسل مصر میں چار پشتوں تک رہی۔ شاہ مزمل کے بیٹے سلطان احمد ثانی، عباسی خلیفہ ابوالفتح المعتضم باللہ کے دور میں کئی ساتھیوں کے ساتھ مصر سے روانہ ہوئے اور کیچ و مکران کے راستے ہندوستان آئے تا کہ دہلی دربار میں حمایت حاصل کی جا سکے۔ اس وقت سندھ کا حکمران رائے دھورنگ تھا جو اس جری حملہ آور کا مقابلہ نہ کر سکا اور صلح پر مجبور ہو گیا۔ اس نے سلطان احمد کو اپنی ریاست کا ایک تہائی حصہ دیا اور اپنی بیٹی کی شادی بھی اس سے کر دی یوں سلطان احمد خان نے سندھ میں اپنی بالادستی قائم کی، زمین کی کاشت کا آغاز کیا اور اپنی حکومت کو مضبوط کرنے میں لگ گیا۔

شہزادہ مراد کا دورہ ملتان: سلطان احمد کے جانشینوں میں سب سے ممتاز امیر محمد چنی خان تھے جو ایک بااثر اور طاقتور حکمران تھے۔ انہی کے دور میں مغل بادشاہ اکبر نے سندھ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اکبر کے بیٹے شہزادہ مراد جب ملتان آئے تو مقامی سرداروں نے ان کا استقبال کیا۔ جب شہزادے کو امیر چنی خان عباسی کی اعلیٰ نسبی کا علم ہوا تو اس نے انھیں عزت دی، پنج ہزاری کا خطاب عطا کیا اور دہلی حکومت کی جانب سے اُباوڑ و سے لاہوری بندر تک کا محصول جمع کرنے کا اختیار دیا۔ امیر چنی خان کے دو بیٹے تھے: محمد مہدی اور داؤد خان۔ اپنی وصیت میں امیر چنی خان نے حکم دیا کہ

دستارِ امارت مہدی خان کے سر پر رکھی جائے اور وہ مقدس قرآن اور تسبیح جو خلافت بغداد کے زمانے سے خاندان میں تھیں، داؤد خان کے سپرد کی جائیں۔

داؤد پوترہ اور کلہوڑے:

مہدی خان زیادہ عرصہ حکومت نہ کر سکے۔ ان کی وفات کے بعد جانشینی کا تنازع کھڑا ہو گیا۔ ایک طرف ان کے بیٹے کلہوڑہ تھے دوسری طرف ان کے بھائی داؤد خان۔ سندھ کے قبائل کلہوڑہ کے حامی تھے جب کہ عرب النسل باشندے امیر داؤد کے حامی تھے۔ آخر کار داؤد خان نے اپنا دعویٰ ترک کر دیا اور شاہ وجی میں آباد ہو کر دیہات بسائے اور اپنی طاقت کو مجتمع کیا۔ یہ خاندان اتار چڑھاؤ سے بھرپور زندگی گزار چکا ہے۔

ریاست بہاول پور:

نواب صادق محمد خان جو امیر داؤد خان کی اولاد میں سے تھے، نے 1727ء تا 1746ء کے دوران ایک آزاد ریاست، موجودہ ریاست بہاول پور کی بنیاد رکھی۔ کلہوڑہ حریفوں سے مسلسل جنگوں کی وجہ سے انھوں نے سندھ میں اپنے مقبوضات ترک کر دیے۔ 1726ء میں امیر صادق محمد خان ڈیرہ غازی خان آئے اور یہاں سکون سے آباد ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد مخدوموں کی دعوت پر وہ اوچ آئے۔ ملتان کے گورنر نے انھیں علاقہ چودری بطور جاگیر عطا کیا۔ کچھ ہی عرصے میں انھوں نے اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اللہ آباد شہر کی بنیاد رکھی اور دراوڑ قلعہ راول اکھی سنگھ سے چھین لیا۔

نادر شاہ کا حملہ:

نادر شاہ، جو فارس (ایران) کا بادشاہ تھا ایک بڑی فوج کے ساتھ بنگش درے کے راستے ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ سب سے پہلا علاقہ جو اس کے قدموں تلے روندا گیا وہ ڈیرہ جات تھا۔ امیر صادق محمد جو ایک بصیرت افروز اور دوراندیش حکمران تھے حملہ آور سے دشمن کے طور پر نہیں بلکہ دوست بن کر آدھے راستے میں ملاقات کے لیے گئے۔ نادر شاہ ان سے بہت متاثر ہوا اور انھیں "نواب" کا خطاب دیا۔ ساتھ ہی لاڑکانہ، شکار پور، دراوڑ اور سیوستان کے پرگنے بھی بطور جاگیر عطا کیے۔

1746ء میں ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے بہاول خان اول (1749-1746) جانشین بنے۔ نواب بہاول خان اول نے 1162 ہجری یعنی 1748 عیسوی میں بہاول پور شہر کی بنیاد رکھی۔ ان کے عہد میں کئی اور شہر بھی آباد ہوئے۔ ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی لہٰذا ان کے چھوٹے بھائی نواب محمد مبارک خان نے ان کی جگہ سنبھال لی۔ نواب مبارک خان نے کئی نئے شہر اور قلعے تعمیر کیے جن میں مبارک پور، سردار گڑھ، پھلڑہ، خیر پور اور کوٹ سبزل شامل ہیں۔ انھوں نے پاکپتن، دُنیا پور، کہروڑ اور میلسی کو بھی فتح کیا۔ ان کے زمانے میں کئی سیلابی نہریں بھی کھودی گئیں۔

احمد شاہ ابدالی :

1751 میں احمد شاہ ابدالی کی فوجوں نے اپنے جرنیل جہان خان کی سربراہی میں اُوچ اور بہاول پور پر حملہ کیا مگر خیر پور کے قریب ایک جنگ میں انھیں شکست ہوئی۔ نواب مبارک خان 1772ء میں وفات پا گئے۔ چوں کہ ان کا کوئی وارث نہیں تھا اس لیے ان کے بھتیجے نواب جعفر خان (جو تاریخ میں نواب محمد بہاول خان دوم کے نام سے جانے جاتے ہیں) جانشین بنے۔ وہ بہادر، جری، رحم دل اور دانا منتظم تھے۔ ان کی حکومت کے ابتدائی 34 سال بدامنی اور شورش سے بھرپور تھے۔ عبدالنبی کلہوڑہ کی سندھ سے یلغار، تیمور شاہ کی دراندازی اور مقامی سرداروں کی سازشوں نے ان کے لیے کافی مشکلات پیدا کیں مگر آخر کار انھوں نے سب پر قابو پا لیا۔ نواب محمد بہاول خان دوم کے دورِ حکومت میں بہاول پور میں سکہ سازی کا آغاز ہوا اور پہلی بار 1802ء میں ریاستی سکوں کی ڈھلائی کا کام ہوا۔ اسی سال کابل کے شاہ محمود نے نواب کو خلعت بھیجی اور انھیں موروثی خطاب "مخلص الدولہ" سے نوازا۔

انگریزوں سے تعلقات:

عباسی حکمرانوں اور برطانوی حکومت کے درمیان دوستانہ اور وفادارانہ تعلقات کا آغاز بھی انہی کے دور میں ہوا۔ 1808ء میں جب عزت مآب مونٹ اسٹورٹ الفنسٹن کابل بطور سفیر جا رہے تھے تو بہاول پور میں نواب نے ان کی مہمان نوازی کی۔

مغل بادشاہ سے خطابات: نواب نے دہلی دربار سے بھی خوشگوار تعلقات قائم کیے اور شاہ عالم ثانی کو تحفے بھیجے۔ بادشاہ نے انھیں موروثی خطابات عطا کیے۔ رکن الدولہ،نصرت جنگ اور حافظ الملک۔ 1809ء میں ان کی وفات کے بعد ان کے دوسرے بیٹے عبداللہ خاں جو نواب صادق محمد خان دوم کے نام سے جانے گئے، جانشین بنے۔ انھوں نے ریاستی انتظام کو منظّم کیا اور مختلف محکموں کے لیے افسران مقرر کیے۔ ان کا 17 سالہ دور سازشوں اور بغاوتوں سے بھرا ہوا تھا۔ 1825ء میں وہ وفات پا گئے اور ان کے بڑے بیٹے نواب بہاول خان سوم نے اقتدار سنبھالا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ:

نواب صادق محمد خان دوم کو ایک ہم عصر مہاراجہ رنجیت سنگھ جیسے طاقتور حریف سے مسلسل خطرہ لاحق رہا جو جب چاہتا ریاست کے خلاف کارروائی کر لیتا تھا۔ اس وقت ریاست کی سرحدیں ستلج کے دائیں کنارے سے آگے تک پھیلی ہوئی تھیں اور بہاول پور کے علاوہ منٹگمری (ساہیوال)، ملتان، مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے علاقے بھی شامل تھے۔ 1809ء میں برطانوی حکومت اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درمیان اتحاد کا ایک معاہدہ ہوا جس میں طے پایا کہ دونوں فریق مکمل اتحاد اور ہم آہنگی سے رہیں گے۔ مہاراجہ کو پابند کیا گیا کہ وہ ستلج کے بائیں کنارے پر کسی سردار کی زمین یا حقوق میں مداخلت نہیں کرے گا۔ اس معاہدے سے مہاراجہ کی پیش قدمی رک گئی اور اس نے جنوب کی طرف توجہ دینا شروع کی۔

ڈیرہ غازی خان پر حملہ:

1819ء میں رنجیت سنگھ نے ملتان اور ڈیرہ غازی خان پر حملے کی مہم ترتیب دی۔ راستے میں بہاول پور کے علاقوں کو لوٹا اور ڈیرہ غازی خان پر قبضہ کیا تاہم بعد میں اسے نواب صادق محمد خان کو سالانہ ایک لاکھ روپے لیز یا پٹے پر واپس کر دیا۔ 1825ء میں نواب صادق محمد خان دوم کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے صاحبزادہ رحیم یار خان نے نواب بہاول خان سوم کے نام سے حکومت سنبھالی۔

سکھ جارحیت اور انگریزوں سے الحاق:

رنجیت سنگھ، جواب ملتان سے آگے بڑھ چکا تھا، کی نظر بہاول پور ریاست اور سندھ کے پرگنوں پر بھی تھی۔ نواب کی جانب سے پٹے کی ادائیگی میں تاخیر کو بہانہ بنا کر 1830ء میں اس نے فرانسیسی جرنیل ونٹورا کو ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ کیا تا کہ ڈیرہ غازی خان پر قبضہ کرے اور ستلج کے دائیں کنارے کے علاقوں پر بھی حملہ کرے۔ نواب کے پاس دفاع کی تیاری کا موقع بھی نہ تھا کہ سکھ فوج نے ریاست کے متعدد علاقے چھین لیے جن میں ساہیوال کے 34 دیہات، ملتان کے 331 دیہات، مظفر گڑھ کے 19 دیہات اور ڈیرہ غازی خان کے 36 دیہات شامل تھے۔ اب مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک سنگین خطرہ بن چکا تھا اور نواب کو مسلسل تشویش لاحق رہتی۔ دوسری طرف سندھ کے میر بھی خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ اسی دوران رنجیت سنگھ نے سردار شام سنگھ اٹاری والہ کی قیادت میں ایک بڑی فوج خفیہ ہدایات کے ساتھ روانہ کی تا کہ بہاول پور کے نواب پر حملے کا بہانہ تلاش کرے۔ نواب نے برطانوی حکومت کی نیک نیتی پر بھروسا کرتے ہوئے فوراً اپنا سفیر لارڈ ولیم بینٹنک (گورنر جنرل) کے دربار بھیجا اور ان سے تحفظ اور اتحاد کی درخواست کی۔ گورنر جنرل نے خوشی سے نواب کی درخواست قبول کی اور دونوں حکومتوں کے درمیان پہلا مخلصانہ اور پائیدار اتحاد کا معاہدہ طے پایا، جو آج تک قائم ہے۔ اسی دوران برطانوی حکومت نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے دریائے سندھ پر تجارتی آمدورفت کے بارے میں بھی ایک معاہدہ کیا۔

1833ء کا معاہدہ:

1833ء کے معاہدے کی ابتدائی چار دفعات میں آنرایبل ایسٹ انڈیا کمپنی اور نواب محمد بہاول خان، اُن کے وارثین اور جانشینوں کے مابین دائمی دوستی اور اتحاد کے قیام کی توثیق کی گئی۔ ان دفعات میں برطانوی حکومت کی جانب سے یہ پُر زور عہد شامل ہے کہ وہ بہاول پور کے حکمرانوں کی موروثی یا دیگر املاک میں کسی بھی قسم کی مداخلت نہیں کرے گی نیز یہ اعلان کیا گیا کہ نواب ریاست کے اندرونی انتظام اور رعایا پر اپنے حاکمانہ حقوق کے استعمال میں مکمل طور پر آزاد ہوں گے، جیسا کہ معاہدے سے قبل تھا۔ برطانوی حکومت کی جانب سے جو افسر نواب کے دربار میں تعینات کیا جانا تھا،

اسے حکم دیا گیا کہ وہ ریاست کے انتظامی امور میں مداخلت سے باز رہے گا اور دونوں حکومتوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو قائم رکھنے میں معاون رہے گا۔ باقی بارہ دفعات کا تعلق تجارتی امور سے تھا جن میں دریائے سندھ اور ستلج پر اور ریاست بہاول پور کے اندرونی راستوں پر ہونے والی تجارت کے ضوابط شامل تھے۔

1835ء کا معاہدہ:

1835ء میں ضروری سمجھا گیا کہ 1833ء کے معاہدے کے نفاذ کے دوران پیش آنے والی بعض مشکلات کے پیش نظر ایک ترمیمی معاہدہ طے کیا جائے۔ یہ معاہدہ زیادہ تر تجارتی امور سے متعلق تھا اور صرف ایک شامل دفعہ نمبر 4 تھی جس میں برطانوی حکومت نے یہ عہد کیا کہ مٹھن کوٹ کے قریب مقیم برطانوی افسر ریاست بہاول پور کے اندرونی انتظام میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گا۔

1838ء کا معاہدہ:

1838ء کا معاہدہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس کے ذریعے ریاست بہاول پور اور برطانوی حکومت کے درمیان تعلقات مزید گہرے ہوئے اور دونوں کے باہمی مرتبوں میں بھی ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ دفعہ 1 میں دونوں حکومتوں کے مابین دائمی دوستی، اتحاد اور باہمی مفادات کے رشتے کو اس حد تک تسلیم کیا گیا کہ ایک فریق کے دوست دوسرے کے دوست اور ایک کے دشمن، دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ یہ اتحاد بہاول پور کے لیے نہایت فائدہ مند ثابت ہوا کیوں کہ اس نے ان پرآشوب ایام میں ریاست کو بیرونی حملوں سے مکمل تحفظ فراہم کیا۔ دفعہ 2 میں برطانوی حکومت نے بہاول پور کی ریاست اور اس کے علاقوں کے تحفظ کی مکمل ضمانت دی جو دفعہ 1 کے مقصد کی وضاحت کرتی ہے۔ دفعہ 3 کے تحت نواب بہاول خان، اُن کے وارثین اور جانشینوں نے برطانوی حکومت کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے اس کے ساتھ وفادارانہ تعاون کرنے اور کسی دوسری ریاست یا سردار سے سیاسی تعلق نہ رکھنے کا عہد کیا۔ دفعات 4، 5 اور 6 میں اس معاہدے کے عملی نفاذ کے طریقہ کار کی وضاحت کی گئی ہے۔ دفعہ 7 کے مطابق ریاست کے داخلی معاملات میں

نواب اوران کے جانشین مطلق العنان حکمران ہوں گے۔اسی معاہدے کے تحت برطانوی حکومت کا ایک نمائندہ نواب کے دربار میں تعینات کیا گیا۔ 1838ء میں دریائے ستلج اور سندھ پر چلنے والی کشتیوں پر عائدٹول ٹیکس کی شرحیں مقرر کی گئیں اوراس کا باقاعدہ ریکارڈ تیار کیا گیا۔

کابل مہم اورشاہ شجاع کی واپسی:

22 دسمبر 1838ءکوشاہ شجاع الملک،سرمیکناٹن اور جنرل ناٹ کی قیادت میں ایک عظیم فوج کے ہمراہ بہاول پور کی حدود میں داخل ہوئے۔ یہ فوج کابل پر قبضہ کرنے کے لیے برطانوی حکومت کی جانب سے فراہم کی گئی تھی۔نواب کے نمائندگان نے ان کا استقبال کیا بعدازاں نواب نے بہ نفسِ نفیس بہاول پور میں اُن کا پرتپاک خیرمقدم کیا۔ دونوں فریقین کے درمیان خوشگوار ملاقاتیں ہوئیں اور جب فوج آگے روانہ ہوئی تو نواب نے سوسواروں پر مشتمل ایک دستہ ان کی خدمت کے لیے ہمراہ کردیا۔ 17 نومبر 1839ءکوکابل کی فتح کی خبرگورنرجنرل نے نواب کو"سرکاری پیغام رساں" کے ذریعے دی۔ اس موقع پر بہاول پور اور احمد پور میں توپوں کی سلامی دی گئی اور چراغاں کیا گیا۔

امیرعلی خان کاخط:

کابل کے امیر دوست محمد خان کے بیٹے امیرعلی خان نے نواب کوایک خط کے ساتھ 100 پستول،ایک دوربین،ایک بندوق،ایک قطب نما اور دیگر اشیاءبھیجیں۔خط میں لکھا تھا": ہم نے سر الیگزینڈر برنس کوقتل کردیا ہے اورانگریزوں کا سارا ساز وسامان ہمارے قبضے میں آ گیا ہے۔ یہاں کے فقیربھی اب انگریزی خزانے سے مالدار ہو گئے ہیں۔اس ملک کی اب یہ حالت ہے،اب آپ کو چاہیے کہ دومسلمان ریاستوں کے مابین دوستی کوآگے بڑھائیں۔"

نواب نے یہ خط برطانوی حکومت کوروانہ کردیا اور قاصد کو ذلت کے ساتھ دریا پار نکال دیا۔ گورنرجنرل نے نواب کوان کی وفاداری اوراخلاص پرشکریہ ادا کیا۔ 1843ءمیں امیرعلی کی جانب سے ایک اورخط موصول ہوا جسےنواب نے اسی طرح برطانوی حکام تک پہنچادیا۔

1842ء کا معاہدہ خیر پور:

1842ء میں برطانوی حکومت نے سندھ کے امرائے خیر پور سے ایک معاہدہ کیا جس کی پہلی دفعہ کے مطابق ": پرگنہ بھونگ بھارا ضلع سبزل کوٹ اور گھوٹکی، مالا دی، چنوگا، دادولا، عزیز پور کے دیہات اور خیر پور کے تمام علاقے یا اُن میں سے جو بھی نواب بہاول پور کے موجودہ علاقوں اور روہڑی کے مابین واقع ہوں، وہ ہمیشہ کے لیے نواب آف بہاول پور کے سپرد کیے جاتے ہیں۔"

چوں کہ نواب بہاول خان نے کابل مہم میں گراں قدر امداد فراہم کی اور خلوصِ نیت سے دوستی نبھائی اس لیے گورنر جنرل نے انھیں بطور انعام بھونگ بھارا اور کوٹ سبزل کے علاقے مستقل طور پر عطا کیے۔ اسی سال برطانوی حکومت نے ابوھڑ (ضلع واٹن) کی سرحدیں وسیع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جو ریاست بہاول پور کا حصہ تھا۔ یہ ارادہ مسٹر رابرٹ ہیملٹن اور کپتان موریسن نے نواب سے ملاقات میں بیان کیا۔ نواب نے نہایت فیاضی سے اس تجویز کو قبول کیا اور اپنی رضامندی ایک "سرکاری پیغام رساں" کے ذریعے گورنر جنرل کو ارسال کی۔

مول راج کی بغاوت:

1839ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد پنجاب کے اکثر علاقے برطانوی قبضے میں آ گئے تاہم ملتان پر ابھی بھی دیوان مول راج کی حکومت تھی جو دیوان ساون مل کا بیٹا تھا۔ ابتداء میں دیوان مول راج نے برطانوی حکومت سے وفاداری کا وعدہ کیا لیکن جلد ہی اپنے فیصلے سے پھر گیا اور بغاوت کر دی۔ 20 اپریل 1848ء کو اس کے سپاہیوں نے کپتان اینڈرسن پر قاتلانہ حملہ کیا جس کے بعد برطانوی حکومت کے خلاف عام بغاوت شروع ہو گئی۔ 21 اپریل 1848ء کو مسٹر وانز ایگنیو نے نواب بہاول پور کے دربار میں مقیم فوجی افسر پیر ابراہیم خان کو مدد کے لیے پیغام بھیجا۔ 17 مئی 1848ء کو نواب نے لاہور میں برطانوی نمائندے کو خط کے ذریعے اطلاع دی کہ ان کی فوج دیوان مول راج کی افواج کے خلاف کارروائی کے لیے تیار ہے۔ نواب نے تجویز دی کہ ریاست بہاول پور کی فوجیں ملتان کے جنوبی علاقے اور وہاں کے قلعوں پر قبضے کے لیے استعمال کی جائیں۔

نواب بہاول خان کی عسکری تیاری اور ملتان کی مہم

نواب بہاول خان نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے فوراً ایک مضبوط فوج کی تیاری کا بندوبست کیا جسے اُنھوں نے ذاتی نگرانی میں منظّم کیا۔ یہ فوج دو ہزار سپاہیوں، مؤثر توپخانے اور ماہر افسران پر مشتمل تھی۔ یہ لشکر 22 مئی 1848ء کو دریائے ستلج عبور کر کے پوری جرأت اور سپاہیانہ جوش و جذبے کے ساتھ روانہ ہوا، جیتنے یا شہید ہو جانے کے عزم کے ساتھ۔ فوج کی روانگی کے بعد نواب نے 23 جمادی الثانی 1264ھ (مطابق 27 مئی 1848ء) کو گورنر جنرل کے لاہور میں نمائندے کو سرکاری مراسلہ بھیجا جس میں کارروائی کی اطلاع دی گئی۔ بہاول پور کی فوج شجاع آباد تک پہنچی اور وہاں کیمپ قائم کیا جہاں وہ مزید احکامات کی منتظر رہی۔ نواب نے محض افواج بھیج کر اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی بلکہ جنگی حکمتِ عملی اور جلد کامیابی کے لیے مشورے دے کر براہِ راست مہم میں شریک بھی ہوئے۔ ان کے دو سرکاری مراسلات — ایک 26 جمادی الثانی 1264ھ (8 مئی 1848ء) کو جنرل ایڈورڈز کے نام اور دوسرا 3 رجب 1264ھ (6 جون 1848ء) کو گورنر جنرل کے نمائندے کے نام، اُن کے غیر معمولی خلوص و دلچسپی کے عکاس ہیں۔ شروع میں بہاول پور کی فوج کو ثانوی کردار کے لیے استعمال کیا گیا لیکن جب بغاوت شدت اختیار کر گئی اور جلد ختم ہوتی نظر نہ آئی تو زیادہ سخت اقدامات ناگزیر ہو گئے۔

پیر ابراہیم خان کو گورنر جنرل کے نمائندے کی جانب سے ہدایت ملی کہ وہ نواب کو درخواست کریں کہ ان کی فوج کے افسران برطانوی فوج کے ساتھ مل کر قلعہ ملتان پر حملے میں شریک ہوں۔ اسی اثنا میں 31 مئی 1848ء کو ایک اور سرکاری مراسلہ گورنر جنرل کے نمائندے کی جانب سے موصول ہوا جس میں نواب سے گزارش کی گئی کہ وہ برطانوی فوج جس کی قیادت جنرل کورٹ لینڈ کر رہے ہیں، کا انتظار کیے بغیر ملتان کی طرف پیش قدمی کریں۔ نواب کی فوج اس وقت تک 1,500 گھڑسوار اور توپ خانے اور 7,139 پیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھی جن کی قیادت دو کمانڈنٹ کر رہے تھے۔ دیوان نے برطانوی فوج کے پہنچنے سے پہلے بہاول پور کی افواج پر ضرب لگانے کے لیے اپنی فوج روانہ کی۔ 28 مئی کو علی پور کے قریب زبردست جنگ ہوئی جس میں دیوان

کی فوج بری طرح شکست کھا گئی۔ بہاول پور کی فوج 3 جون کو سلطان پور پہنچ گئی۔ سر رابرٹ ایڈورڈز، جو اپنی فوج کے ساتھ دریائے سندھ کے پار سے ملتان کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے، نے بہاول پور کی فتح کی خبر سنی تو 5 جون 1848ء کو ڈیرہ غازی خان سے نواب کو سرکاری مراسلہ روانہ کیا جس میں اُنہوں نے نواب کی افواج کی قابلِ قدر مدد کو سراہا اور فتح پر مبارکباد پیش کی۔ سر رابرٹ ایڈورڈز نے 7 جون کو دریائے سندھ عبور کیا اور اعلان کیا کہ وہ ایک ہفتے میں بہاول پور کی فوج سے آ ملیں گے۔ دونوں افواج 1 جولائی 1848ء کو ملتان کے نواح میں پہنچیں جہاں یہ اطلاع ملی کہ دشمن کی فوج نزدیک آ پہنچی ہے جس پر قافلہ رک گیا۔ کچھ دیر بعد دشمن نمودار ہوا اور خونریز معرکہ ہوا جس میں دیوان کی فوج کو شکست ہوئی۔ فاتح افواج ملتان کی طرف بڑھیں اور 22 جولائی 1848ء کو شہر کے نواح میں پہنچ گئیں۔ اس پیش قدمی کے دوران دشمن مختلف علاقوں میں پھیلا ہوا تھا، اور متعدد جھڑپیں ہوئیں۔

1 جولائی 1848ء کی جنگ خاص طور پر اہم تھی جس میں بہاول پور کی فوج نے غیر معمولی شجاعت کا مظاہرہ کیا اور برطانوی کمانڈروں سے دادِ تحسین حاصل کی۔ گورنر جنرل کے نمائندے نے 9 جولائی 1848ء کو ایک سرکاری مراسلے میں بہاول پور کے افسران و سپاہیوں کی شجاعت کی زبردست تعریف کی۔

برطانوی حکومت کا اعتراف و انعام:

برطانوی حکومت نواب کی دوستی اور بے لوث امداد سے مکمل طور پر مطمئن ہوئی اور ان کی خدمات کو دل سے سراہا۔ گورنر جنرل کے نمائندے نے واضح کیا کہ اس مہم کی کامیابی کا بیشتر سہرا نواب کی افواج کے تعاون کو جاتا ہے۔ اگست کا مہینہ کسی بڑے واقعے کے بغیر گزر گیا۔ 1 ستمبر 1848ء کو دشمن نے قلعہ کے باہر ایک مقام پر حملہ کیا مگر زبردست لڑائی کے بعد پسپا ہو گیا۔ دیوان نے کھلے میدان میں آنے کی ہمت نہ کی اور 1 ستمبر 1848ء سے 20 جنوری تک قلعہ کا محاصرہ جاری رہا۔ اس عرصے میں پنجاب سے انقلابی سکھ دستے دیوان کی مدد کو پہنچے لیکن مختلف محاذوں پر ہونے والی جھڑپوں میں ہمیشہ محاصرہ کرنے والی فوج کو فتح نصیب ہوئی۔ آخر کار قلعے پر عمومی حملے کا منصوبہ بنایا گیا اور برطانوی و بہاول پور افواج نے بھرپور مشترکہ کارروائی کی جس سے دیوان مایوس ہو گیا اور صلح کی

درخواست کے ساتھ اپنے نمائندے روانہ کیے۔ درخواست منظور ہونے پر دیوان خود برطانوی کیمپ میں حاضر ہوا اور فوری طور پر حراست میں لے لیا گیا۔ یوں ملتان کی جنگ کا اختتام ہوا، اور برطانوی افواج نے مکمل فتح حاصل کی۔

بہاول پور کو خراجِ تحسین:

29 جنوری 1849ء کو کیپٹن ایڈورڈ کیل نے جنرل سر ہربرٹ ایڈورڈز کی جانب سے بہاول پور کے کیمپ کا دورہ کیا۔ افسران کو خلعتیں اور اسناد دیں اور ان کی شاندار خدمات کا ذکر لاہور میں گورنر جنرل کے نمائندے کو تحریری پیغام میں کیا۔ انھوں نے نواب بہادر کو سرکاری مراسلہ بھیجا اور بہاول پور کی افواج کو پرجوش الوداع کہا۔ نواب کی خدمات کے اعتراف میں گورنر جنرل نے نہ صرف ان کی بھرپور تعریف کی بلکہ تمام اخراجات کی ادائیگی کی منظوری دی اور نواب کو تاحیات ایک لاکھ روپے سالانہ پنشن عطا کی۔

گورنر جنرل کی ملاقات اور جانشینی:

پنجاب کے 1849ء میں برطانوی ہندوستان سے الحاق کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے 25 دسمبر 1849ء کو ملتان کا دورہ کیا۔ نواب بہاول خان بہادر نے اُن سے ملاقات کی۔ ملتان کی مہم میں امداد کے صلے میں لارڈ ڈلہوزی نے نواب کو اپنے ہاتھوں سے تلوار اور ڈھال پیش کی اور ان کی بروقت اور مخلصانہ مدد پر شکریہ ادا کیا۔ نواب محمد بہاول خان بہادر کے چھ بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے صاحبزادہ حاجی خان تھے مگر نواب کو اپنے تیسرے بیٹے صاحبزادہ سعادت یار خان سے خصوصی محبت تھی۔ 1850ء میں نواب نے حاجی خان کو جانشینی سے ہٹا کر سعادت یار خان کو ولی عہد نامزد کرنے کی تجویز دی۔ گورنر جنرل نے فیصلہ دیا کہ " حکومت نوابِ عالی وقار کی جانب سے اپنے جانشین کے انتخاب میں مداخلت نہیں کرے گی۔ "یوں نواب کو وارث منتخب کرنے میں مکمل آزادی مل گئی۔

انتقالِ اقتدار اور خلفشار:

نومبر 1849ء میں بہاول پور اور جیسلمیر و بیکانیر کے درمیان سرحدی تنازعات کا فیصلہ

برطانوی افسر کیپٹن ہچر نے کیا اور رکن پور، اسلام گڑھ اور برسال پور سمیت مختلف مقامات پر حد بندی کے ستون نصب کیے گئے۔ 1852ء میں نواب بہاول خان چہارم کے انتقال پر صاحبزادہ سعادت یار خان تخت نشین ہوئے اور نواب صادق محمد خان سوم کہلائے۔ بڑے بھائی حاجی خان کو قلعہ دراوڑ میں قید کر دیا گیا۔ جلد ہی نواب نے اپنے بھائیوں سے سخت سلوک کر کے ریاستی سرداروں اور داؤد پوتروں کو ناراض کر دیا۔ عوام میں بے چینی پھیلائی گئی اور اس قدر مہارت سے بغاوت برپا کی گئی کہ بغیر کسی جانی نقصان کے نواب کو معزول کر دیا گیا۔ قلعہ دراوڑ بغیر لڑائی کے فتح ہوا۔ صاحبزادہ حاجی خان نے نواب فتح خان کے لقب سے حکومت سنبھالی اور اپنے بھائی کو قید میں ڈال دیا۔ برطانوی حکومت نے اپنی غیر مداخلت کی پالیسی کے تحت معاملے کا بیرونی مشاہدہ کیا اور نواب فتح خان کو تسلیم کر لیا تاہم سر جان لارنس، چیف کمشنر پنجاب نے مطالبہ کیا کہ سعادت یار خان کو برطانوی حدود میں بھیجا جائے۔ نواب نے اس شرط پر رضامندی ظاہر کی کہ سعادت یار خان اپنے دعوے سے دستبردار ہو جائیں۔ کمشنر ملتان مسٹر اینج ورتھ کی وساطت سے ایک تحریری دستبرداری نامہ تیار ہوا جس پر سعادت یار خان نے دستخط کیے۔ انھیں ریاستی خزانے سے ماہانہ 1,600 روپے پنشن مقرر ہوئی۔ 1854ء میں سعادت یار خان نے دعویٰ کیا کہ انھوں نے کبھی اپنا حق ترک نہیں کیا۔ اس پر انھیں قلعہ لاہور میں قید کر دیا گیا۔ اسی سال ریاستی افسران نے ملتان کے ڈپٹی کمشنر سے مشاورت کے بعد مجرمین کی حوالگی کے ضوابط مرتب کیے۔ 1855ء میں نواب کے لیے 17 توپوں کی سلامی مقرر ہوئی۔ 1856ء میں درآمدات و برآمدات پر ٹرانزٹ محصولات کو اٹھارہ سے پندرہ اعشاریہ نو فیصد سے کم کر کے 2 اور 1 فیصد کر دیا گیا۔ کشتیوں کے محصول بھی دوبارہ منظم کیے گئے۔ 1857ء کی بغاوت کے دوران بغاوت کو دبانے کی حکمت عملی کے باعث دریائے ستلج پر آمدورفت بند کر دی گئی۔

نواب فتح خان کا انتقال:

1858ء میں نواب فتح خان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے صاحبزادہ رحیم یار خان تخت نشین ہوئے اور نواب بہاول خان چہارم کہلائے۔ ان کا دور مختصر اور پرآشوب رہا۔ تخت نشینی کے بعد کچھ جلاوطن کیے گئے ریاستی افسران نے جو برطانوی علاقے میں پناہ گزین تھے سازشیں شروع کر

دیں۔ انھوں نے بیکانیر میں پگل کو مرکز بنایا لیکن برطانوی حکومت کے دباؤ پر ریاست سے نکالے گئے۔ ایک باغی رہنما کو 1864ء میں سندھ کے کمشنر نے گرفتار کر کے نواب کے حوالے کیا۔ دوسرے باغی کو ملتان کے کمشنر نے گرفتار کر کے قید میں رکھا۔ 1865 میں چند باغیوں نے دریائے چناب عبور کر کے برطانوی حدود میں پناہ لے لی جہاں انھیں برطانوی افسران نے فوراً غیر مسلح کر دیا گیا۔

نواب محمد بہاول خان کی وفات اور جانشینی:

نواب محمد بہاول خان 1866ء میں وفات پا گئے۔ ان کے بعد ان کے آٹھ سالہ بیٹے نواب سر صادق محمد خان چہارم نے تخت سنبھالا۔ اس وقت تک ریاست میں بغاوت مکمل طور پر کچلی نہیں گئی تھی۔ نواب کی کم عمری اور عملی منظر سے غیر موجودگی نے بغاوت کو تقویت دی۔ باغیوں نے فوراً نواب بہاول خان سوم کے بھائی جعفر خان کو نواب قرار دے دیا۔ دربار نے باغیوں اور غاصب کو سزا دینے کے لیے افواج روانہ کیں اور ساتھ ہی برطانوی حکومت سے مداخلت کی درخواست کی گئی۔ حکومت نے مسٹر فورڈ کو ریاست بھیجا تا کہ وہ حالات کا بذاتِ خود جائزہ لیں۔ باغی سردار کو گرفتار کر کے برطانوی حدود میں قید کر دیا گیا اور دربار کی افواج نے مکمل فتح حاصل کی۔ 1866ء میں مسٹر فورڈ کو ریاست بہاول پور کا سیاسی ایجنٹ مقرر کیا گیا۔ اس وقت سے لے کر 1879ء میں نواب سر صادق محمد خان چہارم کی باقاعدہ تخت نشینی تک ریاست برطانوی نگرانی میں چلائی جاتی رہی۔

برطانوی نگرانی کا دور:

1866ء کے آخر میں احمد پور شرقیہ میں جعفر خان کے حق میں افواج کو بغاوت پر اکسانے کی ایک اور سازش کو مسٹر فورڈ نے ناکام بنایا۔ بعد ازاں انھوں نے ریاست میں کئی اہم اصلاحات نافذ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ کچھ عرصے بعد کیپٹن منچن ان کے جانشین بنے۔ وہ ریاست کے تمام عدالتی، مالیاتی اور انتظامی معاملات میں حتمی اختیار رکھتے تھے، سوائے سزائے موت یا عمر قید کے۔ اس وقت ریاست کی کل آمدنی 14,55,210 روپے متعین ہوئی۔ کیپٹن منچن نے منچن آباد تحصیل کی بنجر زمینیں بیکانیر اور پنجاب سے آنے والے کسانوں کو کاشت کے لیے دیں جس سے آمدنی میں اضافہ ہوا۔

انھوں نے خان واہ نہر پر ایک نیا ہیڈ تعمیر کرایا جس سے وسیع رقبہ دوبارہ سیراب ہونے لگا۔ اسی تحصیل میں 15 میل طویل ایک اور نہر بھی کھودی گئی۔ 1868ء میں مسٹر برنس نے کرنل منچن کی جگہ سنبھالی اور اپنے پیش رو سے بھی زیادہ سرگرم اور پُرعزم ثابت ہوئے۔ ریاست نے ایک دہائی میں تقریباً دو لاکھ روپے نہری نظام کی تعمیر و صفائی پر خرچ کیے۔

نظامِ انصاف:

برطانوی نگرانی سے پہلے ریاست میں جزوی طور پر مذہبی اور جزوی طور پر سیکولر قوانین نافذ تھے۔ مسلمانوں کے دیوانی مقدمات قاضی اور ہندوؤں کے مقدمات ان کے مُکھیوں کے ذریعے طے ہوتے تھے۔ فوجداری قانون تحریری یا مرتب شدہ نہ تھا اور جرائم کی سزاؤں کے لیے کوئی واضح ضابطہ موجود نہ تھا۔ کرنل منچن نے تجرباتی طور پر بیوفورٹ کے قانونی مجموعے کے مطابق فیصلے کا طریقہ رائج کیا جس میں قاضی شریعتِ محمدی کی وضاحت کرتا تھا۔ جلد ہی انھوں نے باقاعدہ عدالتی محکمہ قائم کیا اور برٹش انڈیا کے لیے رائج ضوابط ریاست میں نافذ کر دیے۔ انھوں نے انتظامیہ اور عدلیہ کو دو الگ شاخوں میں تقسیم کیا۔ ایسا انتظام ہندوستان میں منفرد مثال تھا۔ 1875ء میں کرنل منچن نے ذیلداری اور لمبرداری کا نظام نافذ کیا اور دیہاتی سطح پر چوکیداری نظام بھی متعارف کرایا جو ان کی کئی مفید اصلاحات میں سے ایک تھا۔

پٹواری و بندوبست:

ریاست کے پٹواری صرف شست پٹی یا مثلثی پیمائش کے نظام سے واقف تھے۔ کرنل منچن نے تربیت یافتہ پٹواریوں اور گرداوروں کی پہلی مرتبہ تقرری کی۔ برطانوی نگرانی کے دوران نئی زمینیں کاشت کے لیے کھولی گئیں اور مسلسل بندوبست کیے گئے۔ کسانوں کی حالت بہتر بنانے اور باہری آبادکاری کی حوصلہ افزائی سے پنجاب اور بیکانیر سے لوگ ریاست میں آ کر آباد ہونے لگے جس سے نہ صرف افرادی قوت میں اضافہ ہوا بلکہ ریاست کی خوشحالی بھی بڑھی۔

مالی و بلدیاتی نظام:

ایجنسی نے ریاست کے حسابات (اکاؤنٹس) کے نظام کو بھی بہتر بنانے پر توجہ دی جو اُس وقت انتہائی ناقص تھا۔ اسے پنجاب کے رائج طریقہ کار کے مطابق ترتیب دیا گیا۔ بلدیاتی نظام کا تصور بھی ایجنسی نے متعارف کرایا۔ 1873ء میں کرنل منچن نے بہاول پور شہر میں پہلی میونسپلٹی قائم کی اور اگلے سال یہ نظام کئی دوسرے قصبوں تک بڑھا دیا گیا۔ آج ریاست میں 28 بلدیاتی ادارے قائم ہیں جن کی سالانہ آمدنی تقریباً 4 لاکھ روپے ہے۔ پبلک ورکس اور نہری محکمے بھی 1879ء میں با قاعدہ طور پر الگ محکموں کے طور پر قائم کیے گئے۔

سرحدی حد بندی و محصولات:

برطانوی نگرانی کے دوران ریاست اور ڈیرہ غازی خان ضلع کے درمیان مستقل سرحدی حد بندی کی گئی۔ اسی طرح ساہیوال، مظفر گڑھ اور ملتان کی سرحدوں پر بھی ضروری اقدامات کیے گئے۔ 1877ء میں نمک پر کسٹم ڈیوٹی ختم کر دی گئی اور برطانوی حکومت نے ریاست کو اس کے عوض سالانہ 80,000 روپے دینے پر اتفاق کیا۔ اس وقت تک ریاست کی آمدنی 20 لاکھ روپے ہو چکی تھی۔ 1879ء میں سر رابرٹ ایجرٹن نے نواب صادق محمد خان چہارم کو باضابطہ تخت پر بٹھایا۔

پہلی افغان جنگ:

ایک نہایت اہم واقعہ جس نے ریاست بہاول پور اور تاجِ برطانیہ کے مابین تعلقات کو مزید مستحکم کیا وہ پہلی کابل مہم تھی۔ ریاست کو یہ سعادت دوبارہ ملی کہ وہ کوئٹہ یونٹ کی امداد میں اپنی وفاداری اور اخلاص کا مظاہرہ کرے۔ ریاست کی جانب سے حکومت کو 20,000 سے زائد اونٹ اور وافر مقدار میں رسد فراہم کی گئی۔ اس کے علاوہ 2,800 تلواریں، بیل، گھوڑے اور خچر بھی بڑی تعداد میں مہیا کیے گئے۔ ریاست کے 500 پیادہ اور 100 سوار سپاہی بھی وائسرائے کی منظوری سے پیش کیے گئے۔ اگرچہ یہ سپاہی براہِ راست میدانِ جنگ میں شامل نہ ہو سکے تاہم انھوں نے ڈیرہ غازی خان کے سرحدی مورچوں پر تعیناتی کے ذریعے نمایاں خدمات انجام دیں جنھیں سپہ سالار نے بھی

سراہا۔ان خدمات کے اعتراف میں وائسرائے لارڈ رِپن نے 1880ء میں ریاست کے دورے کے موقع پر نواب کو "جی سی ایس آئی" (G.C.S.I.) کے اعزازات پیش کیے۔نواب کی وفات 1899ء میں ہوئی اور ان کے بعد نواب محمد بہاول خان پنجم، جو اس وقت صرف 15 برس کے تھے، جانشین ہوئے۔ کرنل گرے کو ایک بار پھر نگران اعلیٰ مقرر کیا گیا۔نوجوان نواب کو انگریز ٹیوٹر، مسٹر آرتھر ایول کے سپرد کیا گیا اور انھیں تعلیم مکمل کرنے کے لیے ایچیسن کالج بھیجا گیا۔ 1901ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ ریاست واپس آئے اور کرنل گرے سے فنِ حکومت کی تربیت حاصل کی۔ 1903ء میں نواب نے با قاعدہ طور پر اقتدار سنبھالا اور اپنی رعایا کی فلاح کے لیے کئی اصلاحات نافذ کیں۔

ریاستی فوج:

ریاست کی ابتدائی فوج سوار، پیادہ اور ملیشیا پر مشتمل تھی جو وقتِ ضرورت نواب کے حکم پر مختلف تمن داروں کی طرف سے فراہم کی جاتی تھی۔ یہ 10,000 سے زائد فوج ملتان کی مہم میں حکومت کے سپرد کی گئی۔ 1866ء میں جب ریاست برطانوی نگرانی میں تھی تو فوج کو نئے سرے سے منظّم کیا گیا۔ 1879ء میں ریاست کی پیادہ فوج کو پولیس فورس میں تبدیل کر دیا گیا۔ 1888ء میں ایک فوجی بینڈ قائم کیا گیا اور اسی سال نواب نے سرحد پر خدمات کے لیے ریاستی افواج حکومت کو پیش کیں۔ یہ فوج بعد ازاں امپیریل سروس فورس کے طور پر جانی جانے لگی اور فوجی محکمہ کے ضوابط کے مطابق برقرار رکھی گئی۔ برطانوی حکومت کے معائنہ افسران با قاعدگی سے اس فورس کی جانچ کرتے تھے۔ جنوری 1900ء میں جنوبی افریقہ کی جنگ کے لیے 20 گھوڑے اور ساز و سامان مہیا کیا گیا۔ اسی سال چین کی جنگ کے دوران بھی ریاستی فوج کی خدمات پیش کی گئیں۔ 1901ء میں حکومت کی ہدایت پر امپیریل کیولری اور انفنٹری کو برخاست کر کے اونٹوں کی نقل و حمل کی کور تشکیل دی گئی۔ 1904ء میں بہاول پور کے حکمران نے تبّت مشن کے لیے اپنی اونٹ کور فراہم کی۔

ذرائع مواصلات:

برطانوی حکومت سے تعلقات ریاست کے لیے بے شمار فوائد کا ذریعہ بنے۔ ان میں

سب سے نمایاں فائدہ ذرائع آمد و رفت میں بہتری اور ان میں نئی سہولیات کا اضافہ تھا جس نے نہ صرف ریاست کے عمومی حالات کو بدلا بلکہ عوام کی زندگی کا زاویہ نظر بھی بدل دیا۔ 1880ء میں نارتھ ویسٹرن ریلوے ریاست سے گزرتی ہوئی بچھائی گئی جو 300 میل سے زائد کا علاقہ طے کرتی ہے۔ بعد ازاں کئی شاخیں کھولی گئیں اور آج ریاست کے پاس پانچ ریلوے لائنیں ہیں۔ 1870ء میں ریاست نے محکمہ ڈاک و تار کے ساتھ خطوط کی ترسیل کے لیے معاہدہ کیا، جو آج تک بخوبی جاری ہے۔

نواب کی وفات اور ریجنسی کونسل:

1907ء میں نواب محمد بہاول خان دورانِ سفر حج بیت اللہ، جوانی میں انتقال کر گئے۔ اس کے بعد ریاست کا انتظام ایک بار پھر برطانوی افسروں پر مشتمل ریجنسی کونسل کے تحت چلایا گیا۔ موجودہ نواب جو اُس وقت نابالغ تھے، انگریز اساتذہ کے زیر تربیت رہے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ 1924ء میں وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے نوابِ عالی وقار کو تخت پر بٹھایا اور ریجنسی کونسل ختم کر دی گئی۔

عظیم جنگ(1914) :

ایک اور اہم موقع جب ریاست بہاول پور نے تاجِ برطانیہ سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا، 1914ء کی عظیم جنگ تھی۔ ریاست نے سلطنت کے مطالبے پر بھرپور لبیک کہا اور افراد اور مالی امداد فراہم کی۔ اونٹ، گھوڑے اور کیمپ کا سامان بھی بڑی فیاضی سے مہیا کیا گیا۔ لاہور میں واقع بہاول پور ہاؤس کو جنگی اسپتال کے طور پر استعمال کیا گیا۔ دربار نے تقریباً ایک کروڑ روپے جنگی قرضہ فنڈ میں عطیہ کیے اور زخمیوں کی امداد کے لیے بنائے گئے دیگر فنڈز میں بھی دل کھول کر حصہ لیا۔

ستلج ویلی منصوبہ:

ریاست بہاول پور اور برطانوی حکومت کے سیاسی تعلقات میں ایک اور سنگِ میل ستلج

ویلی منصوبہ تھا جس کے تحت دونوں فریق شراکت دار بنے۔ یہ شراکت باہمی مفادات کے تحفظ کی ایک روشن مثال ہے جو مستقبل میں بھی اس تعلق کو دوام بخشے گی۔

موجودہ نواب کی شاہِ برطانیہ سے ملاقاتیں

ریاست بہاول پور کے حکمرانوں کو مختلف مواقع پر ہندوستان کے وائسرائے اوران کے نمائندوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا لیکن تاج برطانیہ کے شاہ معظم سے ذاتی ملاقات کی سعادت محض موجودہ نواب کو حاصل ہوئی۔نوابِ عالی نے دو بار لندن میں شاہِ معظم سے شاہی محل میں ملاقات کی۔:۔

- پہلی بار 1930ء میں جب شاہ نے انھیں .G.C.I.E کے اعزازات سے نوازا
- اور دوسری بار 1931ء میں جب نواب نے دوبارہ لندن میں حاضری دی

چھاپہ خانہ: ریپن پرنٹنگ پریس، ہُل روڈ، لاہور

طباعت کنندہ: مرزا محمد صادق

اگر چہ اس پمفلٹ یا کتابچے کی اشاعت کی تاریخ موجود نہیں تاہم اس کی اشاعت کا ممکنہ مہینہ جولائی اور سال 1933 ہے جب اس ضمن میں باقاعدہ تقاریب کا انعقاد کیا گیا۔(مترجم)

☆☆☆☆☆

حکایات بہاول پور

(7)

وہ ایک گاؤں کا دکاندار ہے۔اس کی لین دین کی سرگرمیاں اگر چہ زیادہ بڑی نہیں لیکن وہ کسانوں کو خاصی رقوم ادھار پر دیتا ہے۔کبھی کبھار نقد قرضے اور کھاتے ملا کر اس کی واجب الادا رقوم چند ہزاروں تک جا پہنچتی ہیں۔اس کے مقروض پورے تحصیل میں بکھرے ہوئے ہیں اور وہ سال بھر پرانے قرضے وصول کرنے اور نئے قرضے جاری کرنے میں مصروف رہتا ہے۔کچھ سال پہلے اس کے گھر میں آگ لگ گئی۔ بے حد کوششوں کے باوجود وہ چند ایک چیزوں کے سوا کچھ نہ بچا سکا گویا کہ اس کی ساری قانونی دستاویزات جل کر خاک ہوگئیں اور اس کا کاروبار تباہی کے دہانے پر تھا لیکن اس نے یہ راز چھپا لیا اور خاموشی سے نئے کھاتے تیار کیے اور کام معمول کے مطابق چلتا رہا۔اس نے مجھ سے حال ہی میں بتایا کہ اس نے پرانی دستاویزات کے جلنے کے بعد نئے کھاتے اس طرح ترتیب دیے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مجھے یہ بات کچھ زیادہ ہی حیران کن لگی، میں نے پوچھا": مگر یہ کیسے ممکن ہوا؟ آپ کے قرض دار تو جانتے تھے کہ آپ کا ریکارڈ جل چکا ہے وہ کیسے اتنے ایماندار بن گئے کہ نئی رسیدیں اور وعدہ نامے بنا کر دے دیے؟"اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا": دیکھو صاحب، سب سے ایسا کرنے کی توقع نہیں تھی۔ میں نے ان کی نفسیات کو بخوبی سمجھتا تھا۔ میں نے اپنے حافظے سے ہر قرض دار کی فہرست بنائی اور ہر ایک کے ذمے واجب الادا رقم لکھی۔ پھر وقفے وقفے سے ہر قرض دار کو ایک نوٹس بھیجتا رہا اور اس میں اصل رقم سے دگنا مطالبہ کرتا رہا۔اس طریقے سے اگر چہ ہر ایک نے احتجاج کیا لیکن میری غرض پوری ہوگئی۔ ہر نوٹس کے جواب میں قرض دار اپنی اصل واجب الادا رقم لکھ کر بھیجتا اور نیا دستخط شدہ کھاتہ ساتھ لگا دیتا۔ یوں چند ہفتوں میں میرے پاس تازہ دستاویزات آگئیں اور قرضوں کی وصولی اطمینا ن بخش رفتار سے جاری ہوگئی۔

انتظامی رپورٹ ریاست بہاول پور 05-1904

نوٹ۔ ریاست بہاول پور (1955-1727) کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کم وبیش 230 سال کے عرصے میں کل بارہ عباسی نوابوں نے اِس ریاست پر حکمرانی کی۔ ریاست کے قیام کے تقریباً ایک صدی بعد ریاست کو انگریزوں نے اپنی سرپرستی میں لینا شروع کیا۔ اگر ریاست انگریزوں کے سایہ عاطفت میں نہ آتی تو شاید منظر مختلف ہوتا۔ نواب بہاول خاں چہارم کا جب 1866ء میں انتقال ہوا تو اُس کے بیٹے صادق خاں چہارم کی عمر صرف ساڑھے چار سال تھی۔ محلاتی سازشوں اور خاندانی رقابتوں کے بیچ گھرے ہوئے ننھے نواب کو انکی والدہ کی درخواست پر انگریزوں نے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور 18 سال کی عمر تک پہنچنے تک ریاست کا انتظام وانصرام برٹش ایجنسی نے سنبھال لیا۔ کم عمر نواب کی تربیت ماہر اساتذہ کے سپرد کی گئی اور اسے ایچی سن کالج (چیفس کالج) لاہور داخل کرادیا گیا۔ 28 نومبر 1879 کو ''تعلیم یافتہ اور ترقی پسند نواب'' کی نور محل میں تاج پوشی کی گئی۔ انگریزوں کی رہنمائی میں اس دور میں ریاست کی ترقی کا ایک نیا منظر نامہ سامنے آنا شروع ہوا۔

14 فروری 1899ء میں نواب صادق محمد خان چہارم نے جب انتقال کیا تو نواب بہاول خاں پنجم کی عمر صرف 12 سال تھی اور وہ ابھی زیر تعلیم تھے۔ ماضی کی طرح ریاست کا کنٹرول ایک کونسل کے ذریعے انگریزوں نے سنبھال لیا۔ 14 سال کی عمر میں نواب کو ایچی سن کالج میں داخل کرادیا گیا اور اسے ریونیو بندوبست کی خصوصی تعلیم دی گئی۔ 18 سال کی عمر میں 12 نومبر 1903ء کو وائسرائے اور ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ کرزن نے بہاول پور آ کر نواب کو ریاست کی اتھارٹی سپرد کی۔ اس نواب کا عرصہ حکمرانی صرف چار سال ہے لیکن ان چار سالوں میں اس ''تعلیم یافتہ اور ترقی پسند'' نواب نے ریاست کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ اِس دوران ریاستی عوام کی بھلائی کے متعدد

کام کیے گئے۔ یتیم خانہ کا قیام' صادقیہ کینال کی توسیع' زرعی صنعت کی ترقی' بہاول وکٹوریہ ہسپتال کی تعمیر کا آغاز' تعلیمی اداروں کی ترقی و قیام' انتظامی اصلاحات' آبادکاری و بندوبست میں پیش رفت' بہاول کلب کا قیام اور کئی دیگر اقدامات نے ریاست بہاول پور کو ہندوستان کی ترقی یافتہ ریاست بنادیا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ 15 فروری 1907ء کو حج سے واپسی پر دوران سفران کا انتقال ہوا تو کم عمر نواب کی عمر چار سال سے بھی کم تھی لہذا ایک بار پھر کونسل آف ریجنسی کے قیام کے بعد نواب کو ایچی سن کالج لاہور' ملٹری کالج کوئٹہ اور انگلینڈ میں انتظامی و فوجی امور کی تربیت دی گئی۔ نواب برٹش کور میں کیپٹن کے عہدے تک پہنچے جب انھیں 1924ء کو ریاست کی حکمرانی کا اختیار دیا گیا۔ (1946ء میں انکا عہدہ میجر جنرل کا تھا)۔ اب تک بیان کیے گئے تاریخی حقائق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ 1866ء سے 1924ء کے درمیان انگریزوں نے ریاست کے معاملات کی براہِ راست نگرانی کی اور ریاست کو تین تعلیم یافتہ اور جدید امور سلطنت میں تربیت یافتہ نواب دیئے جنھوں نے ریاست کو قدامت پرستانہ انداز حکمرانی سے نکال کر نئے دور کے مطابق ترقی دی۔ ان تینوں نوابوں میں نواب بہاول خان پنجم کا عرصہ حکمرانی صرف چار سال بنتا ہے۔ اس نواب نے گذشتہ کے تسلسل میں ریاست کو آگے بڑھایا اور ایسے کاموں کی بنیاد رکھی جو آئندہ کی ریاستی ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ ذیل میں ریاست بہاول پور کے سال 1905-1904ء کی ایک انتظامی رپورٹ کی تلخیص پیش کی جارہی ہے۔ جس میں اس سال کے اہم واقعات اور مختلف شعبوں میں ہونے والے ترقیاتی و انتظامی اقدامات شامل ہیں۔ اس رپورٹ کے آخر میں نواب بہاول خاں کے کومنٹس بھی شامل ہیں۔

عمومی واقعات (1904-05)

1- اِس سال کی سب سے بڑی خبر 29 ستمبر 1904ء رات 11.15 منٹ پر ریاست کے ولی عہد کی پیدائش ہے۔ گولے کے پھٹنے کی ہر سمت میں اٹھنے والی آوازوں سے یہ خبر کوبکو پھیل گئی اور بہاول پور میں موجود ریاست کی اشرافیہ نے محل میں اکٹھے ہوکر نواب کو مبارکباد پیش کی۔ نواب نے

مبارک کو قبول کیا اور اس خوش خبری سے ریاست کے تمام سرداروں اور ذاتی دوستوں کو بذریعہ ٹیلی گرام مطلع کیا گیا۔ اگلی صبح توپوں کے گولے داغ کر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ عوام نے فضا میں رنگ بکھیر کر اپنی خوشی ظاہر کی۔ 10 بجے صبح عوام کی خواہش پر نواب نے اپنی کار پر بازار کا چکر لگا کر عوام کی مبارکباد وصول کی۔ دفاتر میں ایک ہفتے کی چھٹی کر دی گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو دربار کی طرف سے کھانا پیش کیا گیا۔ شام کو نواب نے ہاتھی پر سوار ہو کر ایک جلوس کی صورت غریبوں میں خیرات تقسیم کی۔ رات کو شہر بھر میں چراغاں کیا گیا۔ یکم اکتوبر کو نواب نے نور محل مسجد میں شکرانے کی نماز ادا کی جب کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی عبادت گاہوں اور مساجد میں شکرانے کی عبادت کی۔ نواب کی ذاتی جانچ پڑتال کے بعد 80 قیدیوں کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اسی شب نواب نے نور محل باغ میں ریاست کے افسران اور اشراف کے اعزاز میں ایک ضیافت کا اہتمام کیا۔ نواب نے ہر ایک سے ہاتھ ملایا اور پھر تمام شرکاء نے آتش بازی کا مظاہرہ دیکھا جس سے نواب بہت لطف اندوز ہوئے۔ 13 اکتوبر کو فوجی کھیلیں پیش کی گئیں۔ اسی رات کالج کے اساتذہ نے شیکسپیئر کے معروف ڈرامے ''کنگ آرتھر'' اور ''مرچنٹ آف وینس'' پیش کیے جس پر نواب نے انھیں انعامات دیئے۔ 4 اکتوبر کو 'دربار' منعقد کیا گیا جس میں شہری انتظامیہ اور دیگر افسران نے تہنیتی خطاب کیے۔ اسی رات دربار کی طرف سے ایک ضیافت دی گئی جس میں بہاول پور کے امراء اور افسران نے شرکت کی۔ اس میں نواب نے شہنشاہ برطانیہ کی درازی عمر اور صحت کی دعا کی تجویز پیش کی جس سے تمام درباریوں نے اتفاق کیا۔ ریاست بہاول پور کے لیے یہ ہفتہ بہت مبارک اور شاندار رہا۔

2۔ ریونیو منسٹر نے بحیثیت سیٹلمنٹ کمشنر اور کلکٹر لالہ گوپال چند کے زیر نگرانی سال کے آخر تک خیر پور اور منچن آباد میں سیٹلمنٹ کے اہم کام نپٹائے۔

3۔ میسرز کریگ اینڈ کنولی کو ملتان اور منٹگمری کے اضلاع اور ریاست بہاول پور کے درمیان مستقل سرحدوں کی پیائش اور تعین پر مامور کیا گیا اور انکی معاونت کے لیے ریونیو منسٹر سردار محمد خان اور ناظم ملک محمد دین کو ہدایت کی گئی۔ حد بندی کا کام مکمل ہو گیا اور آخری فیصلے کے لیے رپورٹس سٹیٹ کونسل کو پیش کر دی گئی ہیں۔

4۔ ماسوائے ستلج، دریاؤں کی صورتحال اس سال اچھی نہیں رہی۔ گذشتہ موسم سرما میں غیر معمولی سردی کے باعث ربیع کی فصل کو بہت نقصان پہنچا۔

5۔ وکٹوریہ کی مناسبت سے یادگار کی تعمیر کے کاغذات سٹیٹ کونسل کو پیش کر دیئے گئے ہیں اور امید ہے جلد فیصلہ ہو جائیگا۔

6۔ موسم سرما کے آغاز پر بڑے ریلوے سٹیشنوں پر مسافروں کے طبی معائنے کا حکم دیا گیا تھا اور اللہ کے فضل سے ریاست پلیگ کی موذی مرض سے پاک ہے۔

7۔ بہاول پور دربار نے پاکپتن کے بالمقابل دریائے ستلج پر ایک ہیڈ ورکس کی تجویز حکومت کو پیش کی تھی جو ابھی زیر غور ہے اور اس پر فیصلے کا بے چینی سے انتظار ہو رہا ہے۔ ریاست نے اس بات کی اجازت بھی طلب کی ہے کہ ستلج پر دوامی نہر نکالنے کے منصوبے کی تیاری کے لیے ایک اہل انجینئر کی خدمات حاصل کی جائیں۔

8۔ ریاست کی طرف سے حکومت ہند کو پیشکش کی گئی تھی کہ ہماری کیمل کور اور ٹرانسپورٹ ٹرین کو تبتی مشن میں استعمال کیا جائے۔ چوں کہ مشن کو کیمل ٹرانسپورٹ کے استعمال کا کوئی بہتر موقع میسر نہیں آیا لہذا حکومت ہند نے ہماری درخواست کو قبول کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ تاہم حکومت ہند نے نواب کی اس مخلصانہ پیشکش کو بنظر استحسان دیکھا۔ گذشتہ موسم سرما میں مظفر گڑھ ٹریننگ کیمپ میں بہاول پور ماؤنٹڈ ایسکارٹ اور ٹرانسپورٹ کور کے دو منتخب دستوں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ ان دستوں کو کمانڈنٹ کرنل سردار واحد بخش خاں اور سٹیٹ افواج کے کمانڈر انچیف سردار عبدالرحمان خاں کی سربراہی میں بھیجا گیا جنھوں نے جنگی مشقوں اور فوجی نقل وحرکت کی تربیت میں آخر تک حصہ لیا۔ کرنل والٹر کچنر نے نواب کو لکھے گئے ایک خط کے ذریعے ہمارے دستوں کی مشترکہ فوجی مشقوں میں کارکردگی اور لگن کی تعریف کی۔

9۔ اِس سال ریاست میں آنے والے اہم افراد میں میجر ڈنلپ سمتھ پولیٹیکل ایجنٹ (وہ ایک سے زائد بار تشریف لائے) کے علاوہ جناب نوبل چیمبرلین اور جنرل سر والٹر کچنر کے نام شامل ہیں۔ گذشتہ جنوری کے آخر میں ایک شکار پارٹی کا اہتمام کیا گیا جس میں مندرجہ بالا اصحاب کے علاوہ

منٹگمری کے ڈپٹی کمشنر کیپٹن بک' ڈیرہ غازی خاں کے ڈپٹی کمشنر مسٹر کیسن' سکھر کے کلکٹر مسٹر کیڈل اور پولیٹیکل ایجنٹ کے پرنسپل اسسٹنٹ مسٹر کلاڈ سٹریم نے شرکت کی۔

10۔نواب نے پہلا دورہ احمد پور اور بہاول پور تحصیلوں کا کیا جو 14 سے 24 اکتوبر 1904ء تک جاری رہا۔ اس دورے میں سیلابی نہروں کا معائنہ کیا گیا۔ اس دورے کی تفصیلات ''نواب صاحب کی ڈائریاں'' میں بیان کی گئی ہیں جنھیں متعلقہ حکام کو بھجوا دیا گیا تھا اور ہفتہ وار حکومتی گزٹ میں شائع کیا گیا۔ دوسرا دورہ 5 نومبر سے 23 نومبر 1904ء تک جاری رہا۔ اس دورے کا بڑا مقصد مجوزہ مستقل نہر کی جگہ اور صادقیہ شرقیہ نہر کے منصوبے کا معائنہ تھا جو صحرا کی سیرابی کے لیے نکالی گئی اور اب اسے وسیع اور چوڑا کیا جا رہا تھا۔ دورے کا تمام وقت صحرا کے قابل کاشت اضافی رقبے کے جائزے اور دوامی نہر میں پانی کی مطلوبہ مقدار کی تحقیق میں گزارا گیا۔ دورے کا آخری حصہ ریاست کے انتہائی زرخیز خطے منچن آباد تحصیل کے معائنے کا تھا۔ وہاں پر ان کنوؤں کو بطور خاص دیکھا گیا جن کے لیے کچھ عرصہ قبل تقاوی قرضے دیئے گئے تھے۔ وہ لوگ جو ریاست کے ملحقہ ضلعوں اور مقامی ریاستوں سے نئی نہر پر زمینوں کے حصول کے لیے آئے ہوئے تھے انھیں غور سے سنا گیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ صحرا میں سفر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آک کے درختوں کی افزائش کا بھی معائنہ کیا گیا جنھیں بہاول پور جیل کی فیکٹری میں قالین بافی میں استعمال کیا جانا تھا۔ اس دورے کے دوران نواب نے میکلوڈ گنج ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک شہر کا سنگ بنیاد رکھا جہاں پر علاقے کے اہل ثروت ایک منڈی کے قیام کے خواہاں تھے۔ تیسرا دورہ 20 مارچ سے اواخر ماہ تک جاری رہا۔ یہ خیر پور تحصیل کے وسطی و داخلی علاقوں پر مشتمل تھا جہاں نہروں کا نکاسی کا نظام دیکھا گیا اور شکار کے لیے مختص ایسی جگہوں کا معائنہ کیا گیا جو کاشت کے لیے استعمال کی جاتی تھیں ریاست کے عین درمیان چلنے والی جی ٹی روڈ کے دونوں اطراف شجر کاری کا حکم دیا گیا۔

نواب کو پنجاب یونیورسٹی کا فیلو نامزد کیا گیا تھا۔ انھوں نے 3 دسمبر 2004ء کے کانووکیشن جلسے میں شرکت کی اور فیلو کے لباس میں فیلو کے تمام آداب انجام دیئے۔ لاہور میں قیام کے دوران ریاست کے انتظامی امور سے متعلق بات چیت کے لیے سر چارلس ریواز سے ملاقات کی۔ پٹیالہ کے

راجے سے ایک غیر رسمی ملاقات کی اور لاہور میں افسران بالا سے تعارفی ملاقاتیں کیں۔ 24 دسمبر کو دس روزہ تفریحی دورے پر روانہ ہوئے جس کے دوران سہارن پور، شاہجہان پور، مرادآباد، لکھنؤ، اجودھیا، کان پور اور دہلی گئے۔ اسی دوران دو افسران کا وفد کلکتہ پہنچا تا کہ لارڈ کرزن کو وائسرائے اور گورنر جنرل آف انڈیا کا عہدہ دوبارہ سنبھالنے پر مبارکباد دی جا سکے۔ وفد واپسی پر وائسرائے کا ذاتی خط بنام نواب لے کر آیا۔ نواب صاحب نے وائسرائے سے ذاتی ملاقات کے لیے حکومت ہند سے اجازت طلب کی جو مرحمت کر دی گئی اور اسی طرح یکم فروری 1905ء کو کلکتہ روانہ ہوئے۔ پٹیالہ ریاست کے دو افسران نے انکا استقبال کیا اور ریاست کی طرف سے انھیں ناشتہ پیش کیا گیا۔ بٹھنڈا سے براستہ پٹیالہ کلکتہ روانہ ہوئے۔ پٹیالہ میں پھلکیاں اور بہاول پور ریاستوں کے پولیٹکل ایجنٹ میجر ڈنلپ سمتھ نے ان کے ہم سفر ہونا تھا لہذا نواب صاحب 4 بجے پٹیالہ سٹیشن پہنچے۔ مہاراجہ آف پٹیالہ کی چیفس کالج لاہور موجودگی کے باعث پٹیالہ کی ریجنسی کونسل اور پولیٹیکل ایجنٹ نے انکا استقبال کیا۔ پلیٹ فارم کو بھی سجایا گیا تھا۔ پٹیالہ دربار کی طرف سے ریجنسی کونسل نے اُن کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ نواب نے شکریہ ادا کیا اور کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے اور 4 فروری کو کلکتہ پہنچے۔ 5 فروری کو وائسرائے نے انھیں پولیٹیکل ایجنٹ کے ہمراہ لنچ پر بارک پور مدعو کیا جس کے بعد انکی وائسرائے سے آدھ گھنٹہ ملاقات ہوئی۔ 6 فروری کو وائسرائے نے اُن کے اعزاز میں شام کا کھانا دیا اور 7 فروری کو وائسرائے کی قیام گاہ گئے۔ کلکتہ میں قیام کے دوران انھوں نے چڑیا گھر، پبلک لائبریری، بلیک ہول کی جگہ اور دیگر جگہوں کا دورہ کیا۔ انھوں نے سر اینڈریو فریزر، لارڈ کچنر، سر ڈیزل ابسٹن، ارل رچرڈز اور کلکتہ کے اعلیٰ افسران سے ملاقاتیں کیں۔ نواب صاحب اس دورے سے بہت لطف اندوز ہوئے اور بطورِ خاص انھیں لارڈ کرزن کی نواب صاحب اور ریاستی امور میں دلچسپی نے بہت خوشی دی۔ 9 فروری کو نواب نے کٹک، پوری، پٹنہ، چندرنگر، الہ آباد، کان پو اور دہلی کا دورہ کیا اور 18 فروری کو بہاول پور لوٹ آئے۔

11۔ تمام محکمہ جات کی کارکردگی کے ایک محتاط مطالعے کے بعد نواب اس نتیجے پر پہنچے کہ ایسے تعلیم یافتہ نوجوان جو کم از کم انٹرنس کا امتحان پاس کر چکے ہیں انھیں حکومت کے بندوبست، پولیس

اور انجینئر نگ کے محکموں میں تربیت کے لیے بھیجا جائے تا کہ انھیں اس قابل بنایا جا سکے کہ وہ اپنے منتخب کردہ شعبوں میں ریاست کی بہتر خدمت کر سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے پولیٹیکل ایجنٹ کو درخواست کی گئی کہ وہ ایسے نوجوانوں کو تربیت کے لیے ان علاقوں میں بھجوائیں جہاں پر بندوبستی منصوبوں پر عملدرآمد ہو رہا ہو اور کچھ کو لائل پور بھیجا جائے جہاں وہ حکومت پنجاب کے نہری نظام سے واقف ہو سکیں۔ پانچ ایسے نوجوان جن میں ایک بی اے ہے کو کرنال اور حافظ آباد کے بندوبستی علاقوں اور ایک کو لائل پور بھیجا گیا۔ اُن کی واپسی پر ایک اور دستے کو دیگر شعبوں میں بھیجا جائے گا۔

12۔ جون 1903ء کو ایک کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا جس کے ذمے ریاست کے محکمہ تعلیم میں اصلاحات کی رپورٹ کی تیاری کا کام لگایا گیا تھا۔ وہ رپورٹ پیش کر دی گئی ہے۔ ریاست کے محکمہ تعلیم کی اپ گریڈیشن کا معاملہ نواب صاحب کے زیر غور ہے۔ وہ سٹیٹ کونسل سے مشاورت کے بعد مجوزہ سکیم کی منظوری کے احکام جلد جاری کر دیں گے۔

13۔ ریاستی پولیس ٹریننگ سکول کی کارکردگی تسلی بخش ہے اور اب تک اس نے 100 کانسٹیبلوں اور افسران کو تربیت دی ہے۔

14۔ دسمبر 1904ء میں ایک پولیس کانفرنس منعقد ہوئی جسمیں ملحقہ اضلاع مظفر گڑھ' ملتان اور ڈیرہ غازی خاں کے ضلعی سپرینٹنڈنٹ پولیس اور ریاست بہاول پور کے وزیر خارجہ بھی شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں باہمی تعاون کے بہت مؤثر قوانین تیار کیے گئے جو حکومت کو برائے منظوری بھجوائے گئے ہیں اور ادھر سے جواب کا بے چینی سے انتظار کا جا رہا ہے۔ اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ پولیس سپرنٹنڈنٹس کی ایسی میٹنگز مختلف مقامات پر ہوتی رہنی چاہئیں۔

15۔ اسی سال شمال مغربی ریلوے لائن پر ریاست بہاول پور میں دو نئے ریلوے اسٹیشن شروع کیے گئے جو ریاست کی صدر پیداوار یعنی غلہ کی تجارت کو فروغ دیں گے۔ اب ریاست میں کل ریلوے اسٹیشنوں کی تعداد 42 ہو گئی ہے۔ اس سال غلہ جات کی برآمد 18,58,900 من ہوئی۔ درآمد 1,3,7,300 من رہی۔ برآمد عمومی طور پر پنجاب' سندھ اور بیرونی ممالک براستہ کراچی کی جاتی ہے۔

16۔ منچن آباد میں قلمی شورہ کی دو فیکٹریاں چل رہی ہیں۔ خان پور میں 3 اور اللہ آباد‘ نوشہرہ‘ صادق آباد اور کوٹ سمابہ میں ایک ایک چاول کی چھڑائی اور کپاس کی جننگ فیکٹریاں چل رہی ہیں جب کہ بہاول پور میں ایک فلور مل کام کر رہی ہے۔

17۔ بہاول پور جیل میں تمام اقسام کے قالین اور دریاں بن رہی ہیں جب کہ بہاول پور‘ احمد پور اور خیر پور کے شہروں میں سلک اور کاٹن کی لنگیاں‘ قالین‘ کھیس‘ دھات کے برتن معروف ہیں۔

18۔ کرزن واٹر ورکس پر ابتدائی کام ہو گیا ہے اور تخمینے کے لیے دستاویز مارٹن اینڈ کمپنی کلکتہ کو بھیج دی گئی ہیں جن کے واپس آتے ہی کام شروع ہو جائیگا۔

☆ ریاست کے درجہ اول کے جاگیردار اور اپنی پرہیز گاری اور اچھائی کے لیے معروف مخدوم حامد گنج بخش انتقال کر گئے۔ جمعدار گل محمد خاں کا بھی انتقال ہو چکا جو مقتدر خاندان کے رشتہ دار تھے اور انھوں نے 40 سال تک ریاست کی مختلف حیثیتوں میں خدمت کی۔

19۔ عدالت (سپریم کورٹ) کی تشکیل کی گئی ہے جس میں نواب صاحب کے علاوہ مشیر اعلیٰ (چیف منسٹر) فارن منسٹر اور دربار آفس انچارج (سیکریٹری سٹیٹ کونسل) جج کے فرائض انجام دیں گی۔ دیوانی‘ فوجداری اور مال کی تمام اپیلیں اس عدالت میں پیش کی جائیں گی اور نگران پر آخری فیصلہ نواب صاحب کی منظوری سے مشروط ہوگا۔

20۔ محکمہ مال:

(i) 05-1904ء کے دوران 36114 بیگھہ 2 کنال اور 16 مرلے لیز پر دیئے گئے جس سے 3353 روپے آمدنی کا تخمینہ لگایا گیا جب کہ گذشتہ سال 50775 بیگھہ 3 کنال 8 مرلے لیز سے 2965 روپے 5 آنے آمدنی ہوئی تھی۔ اس سال لیز پر 14661 بیگھہ 12 مرلے کی کمی ہوئی مگر آمدنی میں 11-387 روپے اضافہ ہوا۔

(ii) 205 دیہات دریا بردی کی زد میں آئے جس سے 41667 بیگھے 2 کنال اور 9 مرلے دریا برد ہوئے جس سے ریونیو میں 8-10-97293 روپے کی کمی ہوئی جب کہ 40031 بیگھہ 2 کنال 13 مرلے زمین قابل کاشت رقبے میں شامل کی گئی جس سے 11852 روپے ریونیو کا

تخمینہ لگایا گیا۔اس طرح ریونیو میں اضافہ 4-6-4558روپے ہوا۔

(iii) منچن آباد اور خیر پور کی تحصیلوں میں 9 دیہات دریا بردی کی زد میں آئے۔8266بیگھہ 2 کنال 9 مرلے سٹیٹ لینڈ برطانوی سائیڈ پر چلی گئی جب کہ برطانوی سائیڈ کی 888بیگھہ زمین ریاستی زمین میں شامل ہوئی۔

(iv)9-0-4520روپے سے 30پانی کے کھال٬ 39264روپے سے 119 کنوؤں سے پانی کے وسائل میں اضافہ کیا گیا۔مئوخرالذکر رقم میں 10362 روپے کے تقاوی قرضہ جات شامل ہیں۔الہ آباد میں بہاول واہ اور محمود واہ کے نام سے دو نہریں نکالی گئیں جن پر1,46,000 روپے خرچ ہوئے۔تمام اخراجات لوگوں نے خود برداشت کیے۔

(v) سال کے آخر میں تقاوی قرضوں کا بیلنس 9-9-672631 روپے تھا۔ اسی سال 8-15037 روپے کے قرضہ جات دیئے گئے۔اسی طرح9-1-6,87,669 روپے کے کل قرضہ جات میں0-1-99,505روپے واپس ہو چکے ہیں اس طرح کل بیلنس9-0-588164 ہے۔

(vi)اس سال45604بیگھہ ایک کنال8 مرلے زمین کی فروخت اور7260بیگھہ 1 کنال 10 مرلے بیج سے 8-10-215819 روپے اور 6-2-43474 روپے آمدنی ہوئی۔نہری زمین کی اوسط قیمت 5روپے 10آنے 11 پیسے فی ایکڑ جب کہ بارانی زمین کی اوسط قیمت ایک روپیہ 8آنے اور 4 پیسے رہی۔مالکانہ حقوق والی زمین کی قیمت نہری5روپے 8آنے اور بارانی دو آنے9پیسے فی ایکڑ رہی۔

(vii)اس سال 307افراد دیگر اضلاع سے ریاست میں زمین لیز پر لے کر آباد ہوئے۔

(viii) اس سال 244 بیگھہ 3 کنال 4 مرلے زمین نئی نہروں کے لیے لی گئی اور 18-2-1 ریلوے کو بطور تلافی دی گئی جس کی کل قیمت48روپے12آنے بنتی ہے۔

محکمہ تحفظ وانصاف:

1۔پولیس کی کل نفری مع افسران 536 تھی جس پر64440روپے کے اخراجات آئے

اس طرح گذشتہ سال کی نسبت 6-9-8201 روپے کے اخراجات زیادہ ہوئے۔ یہ زائد رقم نئی سکیم کے تحت سپرنٹنڈنٹ پولیس کے رینک اور 3 انسپکٹرز کی نئی پوسٹوں اور دفتر کے قیام پر خرچ ہوئی۔ نئے SP کی تقرری تک سید سراج الدین کو عارضی SP بنایا گیا اور ریاست کو 3 پولیس سرکلز میں تقسیم کیا گیا ہے

2۔ اس سال قابل دست اندازی پولیس کے کل 2097 مقدمات رپورٹ ہوئے جو گذشتہ سال سے 94 زیادہ تھے۔ گذشتہ سال چوری شدہ جائیداد کی کل قیمت 7-15-62692 تھی جس میں 2-6-28410 روپے کی ریکوری کی گئی۔ بلا لائسنس زمینی نمک بنانے پر 25 کیس درج کیے گئے اور اسی ضمن میں کل 31 مجرموں میں سے 28 کو سزا ہوئی۔ 3 بری ہوئے۔ 3 پولیس کے ملازمین کے خلاف عدالتی کاروائی کی گئی۔ دو کو سزا ہوئی اور ایک بری ہوا۔ میونسپل کمیٹی کا کل محکمہ 118 ملازمین پر مشتمل ہے جن پر میونسپل فنڈ سے 1-872913 روپے خرچ ہوئے اس سال پولیس کی کارکردگی اطمینان بخش رہی اور سنجیدہ نوعیت کے کیسز میں بھی کمی دیکھنے میں آئی۔ قتل کے تمام مقدمات میں ملوث افراد کو گرفتار کر کے عدالتوں میں چالان پیش کیے گئے۔

3۔ نئی سکیم میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کی آسامی پیدا کی گئی ہے جس کے لیے پنجاب پولیس سروس کا کوئی اچھا افسر لینے کی تجویز ہے۔ تمام ریاست کو تین پولیس سرکلز میں تقسیم کیا گیا ہے ہر ایک کی سربراہی انسپکٹر کرے گا۔ سید محمد سراج الدین جنرل سیکریٹری دربار فی الحال SP کی عارضی ڈیوٹی سنبھالے ہوئے ہیں۔

تعلیم:

☆ 1904ء کے دوران تعلیمی اداروں میں کوئی ترمیم و تبدل نہیں ہوا۔ چیف جج مولوی رحیم بخش کے پاس ستمبر 1904ء تک ڈی پی آئی کا اعزازی چارج رہا جن کے بعد مولوی محمد دین وزیر پبلک ورکس کو چارج دے دیا گیا۔ اس سال شعبہ تعلیم کے کل اخراجات بلا ترمیم 34188 روپے رہے۔

☆ صادق ایجرٹن کالج اور ہائی سکول میں کالج کلاس کے کل 9 طلبا تھے جن میں ایک مسلمان اور 8 ہندو تھے۔ اس سال گذشتہ سال کے مقابلے میں ایک طالب علم کا اضافہ ہوا۔ گذشتہ انٹرمیڈیٹ امتحان میں کل چار طلبا شریک ہوئے اور 2 کامیاب ہوئے۔ سکول کی کلاس میں داخل

شدہ طلبا کی کل تعداد 32 تھی۔(10 مسلمان اور 22 ہندو) جب کہ اوسط حاضر طلبا 30 تھے۔میٹرک کے امتحان میں 17 طلبا شریک ہوئے جب کہ 7 کامیاب ہوئے۔

☆ فیسوں سے کل آمدنی 309 اور کل اخراجات 0-7-6279 روپے تھی۔گذشتہ سال کے مقابلے میں اس سال 47 روپے کم آمدنی ہوئی جب کہ اخراجات میں 1-0-7 روپے کا اضافہ ہوا۔

☆ مڈل سکولوں میں طلبا کی کل تعداد 1016 تھی جن میں 520 مسلمان اور 496 ہندو تھے۔اوسط حاضر طلبا 805 تھے۔گذشتہ سال کے مقابلے میں 110 طلبا کی کمی ہوئی۔انسپکٹر سکولز نے تھرڈ مڈل امتحان کے لیے تمام سکولوں سے 60 طلبا کا انتخاب کیا جن میں سے 42 پاس ہوئے۔ فیسوں کی آمدن 6-12-1220 روپے جب کہ اصل اخراجات 3-7-11134 روپے رہے۔

☆ دینی مدرسوں میں 164 طلبا داخل ہوئے جب کہ اوسط حاضر طلبا کی تعداد 134 تھی ان مدرسوں پر 2-5-3840 کے اخراجات ہوئے۔دینی مدرسوں کے طلبا سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔

☆ پرائمری سکولوں میں کل طلبا 1105 تھے (مسلمان 836 ٗ ہندو 269) جب کہ اوسط حاضر طلبا 971 تھے۔ان پر کل اخراجات 1-1-5102 تھے۔پرائمری سکول کے طلبا سے فیس نہیں لی جاتی۔☆ ریاستی انسپکٹر سکولز معمول کے معائنے کرتے رہتے ہیں جب کہ ملتان سرکل کے انسپکٹر سکول بھی مڈل، ہائی سکول و کالج کا معائنہ کرتے ہیں۔

پریس:

☆ ریاستی پریس سرکاری فارموں کی چھپائی کرتا ہے۔ریاستی ہفتہ وار گزٹ ''صادق الاخبار'' باقاعدگی سے شائع کیا گیا۔نواب صاحب اور ریاستی افسران کے ٹور کے دلچسپ واقعات کو بھی اس میں باقاعدہ جگہ دی جاتی ہے۔اس کی کل سرکولیشن 400 کا پیاں ہیں۔اس کی آمدنی اور خرچ بالترتیب 10-10-13901 اور 6-2-10960 روپے تھے۔اس طرح 4-8-2941 روپے کی بچت ہوئی جو سابقہ سال کی نسبت 3-14-216 زیادہ تھے۔

شعبہ میڈیکل:

☆ صادقیہ شرقیہ کینال کے مزدوروں کے لیے ایک عارضی ہسپتال قائم کیا گیا ہے۔ دو ہسپتال اسسٹنٹس نے گذشتہ سال امتحان پاس کر کے سٹیٹ سروس جوائن کی تھی ان میں سے ایک بہاول پور ڈسپنسری میں عام ڈیوٹی پر فائز لالہ کیول رام ہے جب کہ دوسرا شیخ ریاض الحسن سپرنٹنڈنٹ ویکسی نیشن ہے۔ دونوں کی تنخواہ فی کس مبلغ 25 روپے ماہوار ہے۔ 9 روپے ماہوار تنخواہ کی میڈیکل Pupil کی پوسٹ کو دولت خانہ ہسپتال شفٹ کر دیا گیا۔ مس فوکس کی نصف تنخواہ کی چھٹی کے باعث مس ڈی سوزا کو 125 روپے ماہوار پر رکھا گیا۔ اس کے لیے میڈیکل اتفاقیہ اخراجات سے 25 روپے الاؤنس بھی منظور کیا گیا۔

2۔ اس سال آؤٹ ڈور مریضوں کی تعداد 203315 رہی جب کہ ان ڈور تعداد 23523 تھی۔ آؤٹ ڈور مریضوں کی روزانہ اوسط 99-558 اور ان ڈور اوسط 64.25 تھی۔ ان ڈور مریضوں پر فی کس اوسط خرچ فی دن 4-1-0 روپے تھا۔ عام بیماریوں میں ملیریا' ڈائریا' جوڑوں کا درد' آنکھ' کان اور زنانہ بیماریاں شامل تھیں۔

☆ اِس سال 414 آپریشن کیے گئے 28 کو خارج کر دیا گیا' 370 صحت یاب ہوئے 7 چھوڑ گئے۔ 6 فوت ہو گئے اور 3 ابھی تک زیر علاج ہیں۔ اس سال معمولی آپریشنز کی تعداد 9765 رہی جو گذشتہ سال سے 1541 کم تھی۔

☆ اس سال ریاست وبائی امراض سے پاک رہی۔

☆ اس سال 7-15-1862 کے اخراجات پر 20065 بچوں کو حفاظتی ٹیکہ جات لگائے گئے جو گذشتہ سال سے 2665 زیادہ تھے۔

☆ اس سال اوسط بارش 4.89 انچ رہی جو گذشتہ سال سے 3.93. کم تھی۔ زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت 110 فارن ہائٹ (43.33 سنٹی گریڈ) رہا۔

☆ اس سال شعبہ طب پر حفاظتی ٹیکوں سمیت 10-19-29272 روپے خرچ ہوئے جو دو ہسپتال اسسٹنٹس کی تقرری کے باعث گذشتہ سال سے 4-7-503 زیادہ تھے۔

شعبہ اکاؤنٹس:

☆مالی سال کے اختتام 31مارچ1904ءکو بینک آف بنگال لاہور میں پرومیشری نوٹ کے ذریعے 10لاکھ کی انوسٹ منٹ سمیت کل بیلنس6-8-25821422 تھا۔اس سال محصولات کی آمدن 2-4-2805606 سمیت کل 8-12-5388028 تھا جب کہ ادائیگی 1-9-2272021رہی۔

سٹڈ ہارس فارم:

گذشتہ سال کے آخر تک سٹڈ فارم میں جانوروں کی کل تعداد45 تھی۔اس سال16کے اضافے سے کل تعداد 61 ہوگئی ان میں سے 3فروخت ہوئے 2مر گئے۔دو دیگر تحصیلوں کو منتقل ہوئے اور باقی تعداد 54رہ گئی جن میں سے 30 گھوڑیاں' ایک گھوڑا(برائے نسل کشی)' 3 گدھے' دو گدھیاں اور 18 بچھڑے 7 گھوڑے۔7 گدھے) تھے۔اس کے علاوہ دیگر تحصیلوں میں نسل کشی کے 5 گھوڑے اور 4 گدھے موجود ہیں۔

☆اس فارم کے کل اخراجات 7-13-8878 روپے تھے۔

ملٹری ڈیپارٹ منٹ۔الف۔امپیریل سروس کیمل کور:۔کیمل کور کی تعداد اور اس پر اخراجات کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

1۔ Baggage Corps کمیشنڈ افسران 4' نان کمیشنڈ Men -326 ' 14 Followers 'اونٹ966۔2۔ماؤنٹڈ ایسکارٹ۔کمیشنڈ افسر 5'نان کمیشنڈ20'Men 136' Followers 13'اونٹ- 158

امپیریل سروس ماؤنٹڈ ایسکارٹ دو کمپنیوں پر مشتمل ہے جس میں لغاری' پنجابی مسلمان اور پٹھان شامل ہیں۔ امپریل سروس کے لیے دو لاکھ وقف تھے جن میں سے تنخواہوں پر 10-12-160366روپے اور متفرق اخراجات 9-6-26492 روپے شامل ہیں۔5-12-3140 روپے کور کے اکاؤنٹ میں بچت کے طور پر پڑے ہیں۔ معائنہ افسران' ایڈجوٹنیٹ جنرل Musketoyاور پولیٹیکل ایجنٹ کے معمول کے معائنوں کے علاوہ سول چیف ماسٹر اسلحہ خانہ نے

دوران معائنہ کور کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا۔ نواب صاحب نے بھی کور کا کئی دفعہ تفصیلی معائنہ کیا۔

☆ ملٹری ہسپتال میں 558 اندرونی مریض آئے جو گذشتہ سال سے 108 زیادہ تھے۔ بیرونی مریضاں کی کل تعداد 5760 رہی جو گذشتہ سال سے 214 کم تھے۔

☆ ریزرو کمپنی...... ریزرو کمپنی کا کل بجٹ 10677 روپے تھا جن میں سے 9752-4-4 روپے خرچ ہوئے اور یہ اخراجات دو لاکھ کے مختص کردہ بجٹ کے علاوہ ہیں۔

ب...... ریاستی باقاعدہ فوج:۔ ریاست کی گارڈ اینڈ واچ کے فرائض کی ادائیگی کے لیے باقاعدہ فوج میں نظام رجمنٹ (ملٹری فورس) 492، باڈی گارڈ کیولری 103 اور بینڈ 42 نفوس شامل تھے۔ ریاست کی افواج کے انتظامی اخراجات پر کل 3-7-62661 روپے کے اخراجات آئے جن کو ملا کر کل ملٹری اخراجات بشمول پیلس گارڈز 0-6-313786 روپے رہے جو گذشتہ سال 13-15-13396 روپے کم تھے۔

جنگلات:

☆ گذشتہ سال کے اختتام پر کل جنگلات 54208 ایکڑ 17 مرلے رقبے پر مشتمل تھے۔ 18-1-4493 ایکڑ لیز پر دیئے گئے 9-0-1358 روپے کی آمدنی ہوئی اور 16-1-42056 ایکڑ دریا برد ہوگئے اس سال کے آخر میں جنگلات کا کل رقبہ 3-1-495544 ایکڑ تھا انہی جنگلات سے ریلوے کو لکڑی کا ایندھن فراہم کیا جاتا ہے۔

☆ تمام آمدنی و بقایات جات سے ملنے کے بعد جنگلات سے کل آمدنی 2-4-171139 ہوئی جن میں سے 4-5-160094 روپے نقدی کی شکل میں وصول ہوئے۔ تنخواہوں پر کل اخراجات 0-6-12733 آئے۔ باغات کے کل اخراجات 4-6-32736 تھے۔

☆ اس سال اپریل سے ستمبر تک دریائے ستلج کا اوسط چڑھاؤ 24.08 فٹ رہا جب کہ اکتوبر 2004 اور مارچ 2005 میں یہ 1.8 فٹ رہا۔ ☆ دوران سال نہروں کے ذریعے سیراب شدہ کل رقبہ 785516 ایکڑ (خریف 442566۔ ربیع 281512 ایکڑ) رہا۔ جنگلات یا دیگر رقبہ کی سیرابی 61438 ایکڑ رہی جو گذشتہ سال کے مقابلے میں 27032 کم ہے۔

☆ تمام سال کے دوران نہروں سے پانی کا ڈسچارج 71-18871 کیوسک رہا جو اوسط فی ایکڑ 83.06 بنتا ہے۔

☆ دوران سال نہروں پر جو کام کروائے گئے اُن کی تفصیل مع لاگت یہ ہے۔

☆ کینال ہیڈز: 324 روپے نہروں اور برانچوں کی چوڑائی وتوسیع 2162 روپے نئے نالہ جات کی تعمیر 2-3-1066 روپے بند کی تعمیر 25 روپے نہروں کی صفائی 11-4-731098 کل خرچ 1-8-7,34,675 بنتا ہے جس میں سے 4-4-10965 روپے ریاست نے مہیا کیے 9-3-723710 روپے کو status labour سے کروایا گیا۔

کومنٹس انتظامی رپورٹ 05-1904

﴿از نواب بہاول خاں پنجم﴾

05-1904ء کی انتظامی رپورٹ جب منظوری کے لیے نواب بہاول خاں پنجم کو بھیجی گئی تو انھوں نے اس پر اپنے کمنٹس دیئے جو رپورٹ کی اشاعت میں شامل کر دیئے گئے۔

1۔ میں میجر ڈنلپ سمتھ کا دلی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے تمام مواقع پر میری مدد کی۔ میں نے ریاست سے اُن کی عارضی عدم موجودگی کو بہت محسوس کیا مگر یہ جان کر خوشی بھی ہوئی کہ ان کی جگہ ایک دردمند دل رکھنے والے تجربہ کار افسر میجر ڈیلس نے لی ہے۔

2۔ ریاست کے مشرقی حصہ کے بندوبستی امور میں منچن آباد اور خیر پور تحصیلوں کے سامنے واقع صحرا کی پیمائش میں احتیاط برتی جانی چاہیے۔ یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس صحرائی زمین کو کاشت شدہ زمین میں بدل دیا جائے اور اس مقصد کے لیے عنقریب ایک پروجیکٹ تیار کیا جائے گا۔

3۔ مجھے خوشی ہے کہ برطانوی اضلاع منٹگمری اور ملتان اور میری ریاست کے درمیان حد بندی کے امور کو اطمینان بخش طریقے سے مکمل کر لیا گیا ہے اور چند عمومی نوعیت کے مسائل کو بھی بہتر انداز میں حل کر لیا جائے گا۔

4۔ گذشتہ موسم سرما کی سخت سردی نے تمام قسم کے پھلدار درختوں اور فصلوں بالخصوص دالوں پر برے اثرات مرتب کیے۔

5۔ وکٹوریہ کی یادگار جو پہلے عیدگاہ کی طرز پر ڈیزائن کی گئی تھی وہ زیادہ تر مذہبی نوعیت کی بن گئی تھی۔ اب افسران کے مشورے سے فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس کی بجائے ایک ہسپتال تعمیر کی جائے گا۔

6۔ بہاول پور دربار کی طرف سے دریائے ستلج کے پانی کے نصف حصے کی تجویز گورنمنٹ کے غور کی متقاضی ہے۔

7۔ میں خوشی محسوس کرتا ہوں کہ بہاول پور کیمل کور کو مظفر گڑھ کی مشقوں میں استعمال کیا گیا اور کور کی شاندار کارکردگی کا سارا کریڈٹ ریاستی افواج کے کمانڈر انچیف سردار عبدالرحمان خان کو جاتا ہے۔

8۔ ٹورز کے دوران یہ بات سامنے آئی ہے کہ مضافات میں متعین کیے گئے عملے کے ارکان سپرد کیے گئے کام سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے اور توقع ہے کہ نوجوانوں کی ایک خاصی تعداد کو برطانوی اضلاع میں تربیت کے لیے بھیجنے سے ریاستی سروس کے لیے اہل افراد میسر آئیں گے۔

9۔ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن بہاول پور کی طرف سے ریاستی تعلیمی نظام میں اصلاحات متعارف کرانے کی تجاویز کو میں نے دیکھا ہے اور میں نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ ریاستی نظام تعلیم میں فوری اہم تبدیلیاں کی جائیں۔

10۔ مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ پولیس کی تعداد کو بتدریج بہتر بنایا جا رہا ہے پولیس افسران کی مختلف مقامات پر میٹنگز کے ریاستی پولیس انتظامیہ پر اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔

11۔ غذائی غلہ کی برآمد گذشتہ سال 7,41,100 من کے مقابلے میں اس سال 1858900 من رہی جو ریاست کی خوشحالی کی علامت ہے۔

12۔ مجھے ان دو لوگوں سے محرومی کا شدید احساس ہے کہ جن کی بہترین مشاورت کا میں ہمیشہ معترف رہا ہوں۔

13۔ مجھے اس بات کا ذاتی تجربہ ہے کہ مضافات میں کام کرنے والے چند ملازمین کو اپنی

پوسٹوں کا مطلوبہ تجربہ نہیں ہے ان میں سے چند ایک کے پاس تو کام کا بہت زیادہ بوجھ ہے۔ 300 میل طویل ریاست کے 20 ہزار میل رقبے پر مشتمل 6 تحصیلوں میں کچھ تبدیلیاں مطلوب ہیں سپریم کورٹ کا اجراء اور ریونیو، آبپاشی اور پولیس کے محکموں میں ضروری تبدیلیوں اور سٹیٹ کونسل میں شیخ نصیر الدین جیسے تجربہ کار شخص کی شمولیت سے توقع ہے کہ ریاستی مشینری کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

14۔اس سال کل ریونیو محاصل کی رقم 2-13-1952340 رہی جو گذشتہ سال سے زیادہ ہے تاہم 3-6-293699 روپے ابھی وصول کیے جانے ہیں جن کے ذمہ دار تحصیل دار ہیں۔موجودہ مشیر مال سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بقیہ محاصل جمع کریں گے۔لیز پر دی گئی زمین گذشتہ سال سے کم ہے مگر اس مد سے حاصل کیے گئے محاصل گذشتہ سال سے زیادہ ہیں۔ ریونیو منسٹر اور ناظمین کو آبادکاری سکیم پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔اس سال دریائے ستلج کا کٹاؤ ریاست کے لیے بہت نقصان دہ رہا اس سے 9000 ایکڑ برطانوی حدود میں چلے گئے جب کہ 8 سو ایکڑ ریاست بہاول پور کے حصے میں آئے۔تقاوی قرضوں کی رقوم بڑھتی جارہی ہیں جنھیں واپس آنا چاہیے۔ریونیو ڈیپارٹمنٹ کو ریاست میں بسنے کے لیے آنے والے آبادکاروں کو ہر قسم کی سہولت بہم پہنچانی چاہیے۔

15۔ پولیس کے نظام میں بہتری آئی ہے اور فوجداری عدالتوں نے بھی اچھے نتائج دیئے ہیں مگر جرمانوں کی رقوم بہت زیادہ اور ابھی وصول کی جانی ہیں جرمانہ نافذ کرتے وقت عدالتوں کو احتیاط سے اپنے اختیار کو استعمال کرنا چاہیے۔

16۔ فی قیدی کل اوسط آمدنی 10-3-26 روپے اور فی قیدی خرچہ 3-9-43 ہے اس لحاظ سے اوسط خرچہ فی قیدی 4-5-17 آمدنی سے زیادہ ہے یہ خرچ سابقہ سال سے 12 آنے کم ہے۔

17۔ دیوانی عدالت کے نتائج بہت اچھے ہیں رجسٹریشن کی آمدنی میں 32 روپے کا اضافہ ہوا ہے۔

18۔صادقیہ شرقیہ کینال کی چوڑائی وتوسیع کا کام ابھی جاری ہے مگر دوامی نہر کی تجاویز کو سٹیٹ کونسل محتاط انداز میں زیرغور لائے۔اس سال کل کاشت کردہ رقبہ گذشتہ سال کی نسبت 27000

ایکڑ کم تھا جو قدرتی وجوہات کے ساتھ اِس سے وابستہ ملازمین کی عدم دلچسپی کا مظہر ہے۔

19۔محکمہ جنگلات کی آمدنی گذشتہ سال کی نسبت تھوڑی سی زیادہ ہے اور کچھ جنگلات کو قابل کاشت رقبے میں تبدیل کیا جارہا ہے۔

20۔سال میں مختلف میونسپلٹیز پر چار ہزار روپے خرچ کیے گئے۔

21۔یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ سٹیٹ کی آمدنی میں 287000 روپے کا اضافہ ہوا ہے جب کہ پچھلے سال کے اخراجات میں 259000 کی کمی ہوئی ہے۔سال کے آخر میں میزان آمدنی 31,16,007-3-7 روپے تھا جن میں سے 29,15,964-6-11 ٹریژری میں پڑے ہوئے ہیں جب کہ ایک لاکھ روپے کے قرضہ جات دے دیئے گئے۔

22۔محکمہ صحت کا کام اطمینان بخش رہا۔اس سال بارش کی اوسط گذشتہ سال کی نسبت کم رہی۔

☆☆☆☆☆

یعقوب خاں بنگش کی کتاب ''ایک نوابی قضیہ'' A Princely affair مطبوعہ 2015 سے بہاول پور سے متعلق چند اہم تحقیقی و تاریخی اقتباسات

(1) ریاست بہاول پور کا پاکستان سے الحاق

ریاست بہاول پور جسے 17 توپوں کی سلامی حاصل تھی، اُن تمام نوابی ریاستوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھی جو بعد میں پاکستان کا حصہ بنیں۔ اس ریاست کا رقبہ 16,434 مربع میل تھا اور 1931ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی تقریباً دس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی جن میں سے بارہ فیصد غیر مسلم تھے۔ اُس وقت ریاست کے حکمران نواب سر صادق محمد خان عباسی پنجم تھے۔ وہ 1907ء میں صرف دو سال اور اڑھائی ماہ کی عمر میں تخت نشین ہوئے؟ جب ان کے والد عدن کے ساحل کے قریب ایک بحری سفر کے دوران اچانک انتقال کر گئے لہٰذا ریاست کا نظم و نسق ایک ریجنسی کے تحت جاری رہا یہاں تک کہ نواب صادق نے 1924ء میں مکمل حکمرانی سنبھالی۔ چوں کہ ان کی تعلیم سیاسی محکمے کے زیرِ نگرانی ہوئی تھی اور ریاست کا انتظام زیادہ تر برطانوی ہند کے افسران کے ہاتھ میں تھا اس لیے بہاول پور نے اُن کے دورِ حکومت میں خاطر خواہ ترقی کی۔ سر پنڈرِل مون جو 48-1947 میں بہاول پور کے وزیرِ مالیات اور تعمیراتِ عامہ تھے، نے لکھا کہ ": بہاول پور اس وقت سیاسی طور پر نہایت اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ یہ واحد ریاست ہے جو سائز، دولت، مسلمان حکمران اور مسلمان آبادی سب کو یکجا کرتی ہے۔" چوں کہ بہاول پور کی سرحدیں پاکستان اور بھارت دونوں سے ملتی تھیں اس

لیے اصولی طور پر یہ دونوں ممالک میں سے کسی کے ساتھ الحاق کر سکتا تھا لیکن 1947ء کے آغاز تک نواب کی صحت ذیابیطس اور دیگر امراض کے باعث خراب ہو چکی تھی۔ معالجین نے انھیں گرمیوں کا موسم انگلینڈ میں گزارنے کا مشورہ دیا مگر 1947ء کا موسمِ گرما ریاست کی تاریخ کے نازک ترین لمحات میں سے ایک تھا اور نواب کی عدم موجودگی میں مستقبل سے متعلق کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو سکا۔

اپریل 1947ء میں سر رچرڈ کرافٹن جو 1942ء سے ریاست کے وزیرِ اعظم تھے، رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے یونینسٹ سیاست دان مشتاق احمد گورمانی کو عبوری وزیرِ اعظم مقرر کیا گیا۔ گرمانی پہلے ہی ایک کابینہ تشکیل دے چکے تھے جب تقسیم کے مظالم اور بالادستی کے خاتمے کا عمل شروع ہو، طاقت کی منتقلی قریب آتے ہی ریاست کے غیر مسلم پڑوسی ہندو ریاستوں کی طرف منتقل ہو گئے جب کہ راجپوتانہ سے مسلمان مہاجرین بہاول پور میں داخل ہونے لگے۔ اس افراتفری اور بین المذاہب فسادات کے باعث روزمرہ حکمرانی دشوار تر ہو گئی۔ نواب کی غیر موجودگی نے ریاست کے مستقبل پر مزید غیر یقینی کے سائے ڈال دیے۔ بہاول پور حیدرآباد جیسی خودمختار ریاست نہ تھی، نہ ہی اس کے پاس ایسا کوئی نظام تھا۔ 1947ء کے اوائل میں پنجاب کے اسٹیٹس ریزیڈنٹ نے کہا": بہاول پور ابھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے تیار نہیں۔ اگر حاکمِ وقت قربانی نہ دیں تو ریاست کی حالیہ ترقی کا سلسلہ رک سکتا ہے۔" کرافٹن دور سے قبل کے افسران میں بدعنوانی جڑ پکڑ چکی تھی تاہم قائداعظم جناح کی نرم پالیسی کی بدولت بہاول پور کو بہتر برتاؤ کی امید تھی۔ " تقسیم کرو اور چھوڑ دو" یا Divide And Quit کے مصنف پینڈرل مون کے مطابق": یہ بات عام تھی کہ جناح، کانگریس رہنماؤں کے برعکس، حکمران نوابوں کے مخالف تھے نہ ہی ان کے اختیارات سلب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ "مزید کہا": مجھے توقع تھی کہ بہاول پور پاکستان سے خاموشی سے الحاق کرے گا۔ لاہور میں مسلم لیگ رہنماؤں سے اور پاکستانی وکیل ظفر اللہ سے مشاورت نے اس بات کی تصدیق کی تاہم بہاول پور کا الحاق اتنا آسان نہ تھا۔ جب اختیارات کی منتقلی (Transfer of Power) کی تاریخ قریب آئی تو افواہیں گردش کرنے لگیں کہ بہاول پور بھارت کے ساتھ الحاق کا خواہاں ہے۔ بعدازاں، فروری 1948 میں ماؤنٹ بیٹن نے بادشاہ کو

رپورٹ دی کہ کچھ غیر رسمی کوششیں ضرور ہوئیں لیکن انھیں مسترد کر دیا گیا۔ یہ بھی افواہ تھی کہ اپریل 1947 میں مسٹر گورمانی نے پنجاب کی ریاستوں کے درمیان ایک علاقائی اتحاد (Regional Union) کی تجویز پیش کی تھی۔

15 اگست 1947 کو صادق محمد خاں عباسی نے خود کو "امیر" اور "جلالت الملک، اعلیٰ حضرت" یعنی بہاول پور کا مکمل خودمختار حکمران قرار دیا۔ یہ لقب برطانوی زیرِحکومت ریاست سے ایک آزاد ریاست میں منتقلی کی علامت تھا۔ دس دن بعد انھوں نے بہاول پور کے مستقبل کو ایک اسلامی ریاست کے طور پر پاکستان کے ساتھ کسی نوع کی وابستگی میں ظاہر کیا۔ انھوں نے اعلان کیا:

"ریاستیں ایک بار پھر مکمل طور پر آزاد اور خودمختار خطے بن گئی ہیں... میری ریاست کی جغرافیائی حیثیت اور پاکستان ڈومینین کے ساتھ اس کی ثقافتی و اقتصادی وابستگیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے نمائندے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی کاوشوں، غوروفکر اور مشاورت میں حصہ لیں تاکہ دونوں ریاستیں ایک اطمینان بخش آئینی بندوبست تک پہنچ سکیں۔"

حکومت پاکستان اس نئے لقب اور اعلان سے پریشان ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہاول پور صرف وابستگی چاہتا ہے مکمل الحاق نہیں۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے کرنل شاہ (اے بی ایس شاہ جوائنٹ سیکرٹری وزارت امور خارجہ و دولت مشترکہ) کو ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ بہاول پور کا الحاق دیگر ریاستوں کی طرز پر یقینی بنائیں۔ انھوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ ": میں نے حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ وہ حکمران کے اختیار کردہ نئے لقب کو تسلیم نہ کرے۔ یہ نئے القاب بے جوڑ معلوم ہوتے تھے کیوں کہ نواب کے پاس پہلے یہ القاب نہیں تھے۔" سیاسی محکمے کو حکمرانوں کی طرف سے بلا جواز القابات اختیار کرنے پر سخت اعتراض تھا اور خودمختاری کا یہ دعویٰ ناقابل قبول تھا۔ مذاکرات تعطل کا شکار ہو گئے کیوں کہ نواب انگلستان واپس چلے گئے اور جولائی تا ستمبر 1947 کے دوران (جنرل افتخار، اکرام اللہ ICS وغیرہ کے) سفارتی دورے بھی کوئی نتیجہ نہ دے سکے۔ اگرچہ یہ دعویٰ کیا گیا کہ گورمانی کے بھارت کے ساتھ الحاق کے خفیہ منصوبے تھے لیکن مذاکرات کے دوران یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ پاکستان سے الحاق کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ صرف تاخیر نواب کے دستخط میں تھی جو بالآخر

حاصل کر لیے گئے۔ گورمانی نے الحاق کا معاہدہ جناح کو پیش کیا، جنھوں نے 5 اکتوبر 1947 کو اسے قبول کر لیا۔ بہاول پور کا الحاق حکومتِ پاکستان کے لیے بے حد فائدہ مند ثابت ہوا کیوں کہ اس سے نہ صرف پاکستان کی زمینی حدود میں اضافہ ہوا بلکہ یہ واحد علاقہ بھی شامل ہوا جس کا بجٹ فاضل تھا اور جہاں معیشت ترقی کی راہ پر گامزن تھی۔

(2)۔ مسلم ریاستیں اور بہاول پور

''ایک استخراجی نقطہ نظر''

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ریاستیں اور حکمران جنھوں نے پاکستان سے الحاق کیا، ان کا آغاز اور ارتقا بھارت کی دیگر ہم مرتبہ ریاستوں سے بالکل مختلف تھا۔ ایک امریکی مؤرخ پروفیسر باربرا این۔ راموسیک نے اپنی کتاب The Indian Princes and their States میں اس عمومی تصور کو چیلنج کیا ہے کہ ہندوستانی نواب اور راجے صرف برطانوی نوآبادیاتی نظام کے کٹھ پتلی تھے۔ وہ یہ دلیل دیتی ہیں کہ بہت سی ریاستوں کے حکمران چالاک سیاست دان تھے جنھوں نے آزادی سے قبل تک قابلِ ذکر خودمختاری برقرار رکھی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ریاستیں عام طور پر راموسیک کی درجہ بندی میں فٹ نہیں بیٹھتیں۔ سچ یہ ہے کہ ان ریاستوں کے لیے سب سے مناسب درجہ بندی سوائے کسی حد تک بہاول پور اور خیر پور کی "قبائلی ریاستیں" ہے۔ بلوچ اور سرحدی ریاستیں قبائلی معاشروں پر مشتمل تھیں اور وفاقی یا جاگیردارانہ انداز میں چلتی تھیں۔ ان ریاستوں کا حکمران قبیلے کا سربراہ ہوتا اور اسی حیثیت میں حکومت کرتا رہتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قبیلہ ایک مراعات یافتہ طبقہ ہوتا اور ریاست کے فوائد سے بڑا مستفید ہونے والا بھی۔ حکمران اپنے طاقت کے بنیادی مرکز کو ناراض کرنے کا متحمل نہ ہوسکتا تھا اس لیے اسے قبیلے کے لوگوں سے قریبی تعلق رکھنا پڑتا تھا۔ اسی قبائلی انحصار کی وجہ سے کوئی بلوچ یا سرحدی حکمران "خداداد سلطنت" یا حکمران کی کسی خاص حیثیت کے تصور کو فروغ نہ دے سکا۔ امراء بخوبی جانتے تھے کہ قبائلی اختلاف ان کی حکمرانی کے خاتمے کا سبب بن سکتا

ہے۔ سر اولاف کیرو، گورنر NWFP، نے اس بارے میں لکھا": تمام پٹھان معاشروں میں 'اولوس' (قبیلے کے لوگ جو اپنی روایتی مجالس اور گروہوں میں بیٹھتے ہیں) کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے اور اگر حکمران قبیلے کے جذبات کا خیال نہ رکھے تو وہ اپنی جگہ اور وقار قائم نہیں رکھ سکتا۔"

بلوچ اور سرحدی معاشروں کی برابری پر مبنی نوعیت کا مطلب یہ بھی تھا کہ ان ریاستوں کے کسی حکمران میں وہ شاہانہ انداز پیدا نہیں ہو سکتا تھا جو اکثر دیگر ریاستوں میں دیکھنے کو ملتے تھے جیسے شان دار محلات، قیمتی ملبوسات، زیورات و عیش و عشرت۔ قبائلی جنگی ذہنیت اور قلیل وسائل نے اس بات پر بھی قدغن لگائی کہ کوئی نمایاں شاہی شناخت ابھرے۔ صرف بہاول پور میں عباسی خلفاء کے ساتھ تعلق، مغل و سکھ درباروں سے روابط اور ریاست کی نسبتاً خوشحالی نے شاہانہ شناخت کو جنم دیا۔ بہاول پور کے نواب خود کو خلفائے عباسی کے وارث اور عوام پر حکمرانی کے لیے خدا کے برگزیدہ تصور کرتے تھے۔ پاکستان کی نوابی ریاستیں باقی ہندوستانی ریاستوں سے بہت مختلف تھیں، خواہ وہ مسلم ہوں یا ہندو، مغل یا دیگر مسلم ریاستوں میں جو بادشاہت کی کلاسیکی نظریاتی بنیادیں تھیں وہ پاکستانی امراء کے ہاں مفقود تھیں۔ ان ریاستوں کی بنیادیں اکثر فارسی یا افغان حکمرانی میں تھیں اور ان کا سماجی ڈھانچہ زیادہ تر قبائلی تھا جو انھیں باقی ہندوستانی ریاستوں سے مختلف بناتا تھا۔ ”راج دھرما“ جیسے تصورات ان حکمرانوں کے لیے اجنبی تھے۔ صرف چند ہی امراء نے یہ سوچا کہ وہ رعایا کے لیے کوئی ذمہ داری رکھتے ہیں سوائے قانون و نظم کے قیام کے۔ سوائے بہاول پور کے، پاکستانی ریاستیں خلیجی عرب شیوخ ریاستوں سے زیادہ مشابہت رکھتی تھیں بہ نسبت باقی ہندوستانی ریاستوں کے۔ 1946ء میں فرنٹیئر ریاستوں پر لکھتے ہوئے سر اولاف کیرو نے بھی اس فرق کو پہچانا: ”انھیں دیگر ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ ایک ہی درجے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ قبائلی ڈھانچوں کی ترقی یافتہ شکلیں تھیں جہاں چودھراہٹ کی روایت قبیلوں میں عربوں کی طرح جاذبیت رکھتی تھی۔۔۔ یہ ریاستیں بادشاہت نما قبائلیت کی حالت میں تھیں جو عرب شیوخ ریاستوں کے انداز سے کچھ مختلف نہ تھیں۔“ یہ ریاستیں عموماً سلطنتوں کے زوال کے بعد ابھریں (جیسے عربوں میں عثمانی سلطنت) جہاں مقامی قبیلے کا رہنما بین القبائلی گفت و شنید سے ابھرتا اور پھر انگریزوں کے آنے کے بعد اُسے حکمران تسلیم کر لیا جاتا۔

اگر چہ یہ اصطلاح ان کی مقامی ثقافت میں نئی تھی مگر طاقت کا اصل سرچشمہ قبیلے کی حمایت ہی تھا۔ مثال کے طور پر، کویتی خاندان الصباح نے اپنی طاقت قبیلہ "اُتُوب" سے حاصل کی جو وسطی عرب سے ہجرت کر کے کویت آیا۔ اسی طرح ابوظہبی و دبئی کے حکمران خاندان "بنی یاس" قبیلہ کے ایک حصے سے تھے۔ پاکستانی ریاستوں اور عرب شیوخ ریاستوں میں، برطانوی حکومت نے اگر چہ بادشاہت کی ضمانت دی تھی لیکن ان حکمرانوں کی حقیقی طاقت قبیلے میں تھی۔ بہت کم امراء ایسے تھے جو اتنا شاہی روپ دھار سکے کہ قبیلے کے عام افراد سے نمایاں ہو جائیں۔ اس لیے، بہاول پور کے سوا، پاکستانی ریاستوں میں بادشاہت کی نوعیت محدود مغلیہ اور برطانوی درباری روایت کے ساتھ "قبائلی بادشاہت" ہی کی تھی۔

(3) نوابی ریاستوں کا پاکستان سے الحاق۔ چند حقائق

1947 ہندوستان کی نوابی ریاستوں کے لیے ایک نہایت نحوست بھرا سال ثابت ہوا۔ نہ صرف یہ کہ برطانوی تاج کے ساتھ کیے گئے وہ معاہدے جو ان نوابوں کو تحفظ اور تسلسل کی ضمانت دیتے تھے یکطرفہ طور پر منسوخ کر دیے گئے بلکہ انھیں چند ہی مہینوں میں اپنے مستقبل کے بارے میں انتہائی مشکل فیصلے بھی کرنے پڑے۔ زیادہ تر نواب اس وقت تک خود غرضی یا غفلت کا شکار ہو چکے تھے اور اپنے ریاستی مستقبل کے بارے میں سمجھ دار فیصلے کرنے کی اہلیت کھو بیٹھے تھے۔ ایسے حالات میں انھوں نے اپنی تمام تر امیدیں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے وابستہ کر لیں جو اس وقت برطانوی نمائندے کے طور پر ہندوستان میں موجود تھے اور جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے مفادات کا مکمل تحفظ کریں گے تاہم ماؤنٹ بیٹن اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ نوابی ریاستوں کا مستقبل برطانوی ہند کے آئندہ ڈھانچے کے ساتھ ہی وابستہ ہے اور سب سے بڑی ریاستوں کو بھی مکمل آزادی کا خواب نہیں دیکھنا چاہیے خصوصاً جب برطانیہ ہندوستان سے رخصت ہو رہا ہو گا۔ جولائی 1947 میں چیمبر آف پرنسز کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن کے دلائل نے نوابوں کو ششدر کر دیا کیوں کہ وہ اپنے سب سے بڑے محافظ کو ہندوستان اور پاکستان کے مستقبل کے حکومتی

ڈھانچے کی وکالت کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ایک ممتاز پاکستانی سیاست دان نے اس صورتِ حال کو یوں بیان کیا: "شاید نوابوں کا انجام ویسے بھی مٹ جانا ہی تھا لیکن جس ''چرواہے'' پر وہ سب سے زیادہ بھروسہ کرتے تھے اگر اسی نے انھیں دھوکہ دے کر ذبح خانے تک پہنچایا تو یہی اس منظر کو اور زیادہ دردناک بنا دیتا ہے یہاں تک کہ لارڈ ویول بھی ماؤنٹ بیٹن کے رویے پر حیران ہوئے جنھوں نے 15 اگست 1947ء سے بہت پہلے ہی کانگریس کی نامزدگی کے مطابق ہندوستان کا گورنر جنرل بننے جیسا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا اور ریاستوں پر کھلے عام دباؤ ڈالنے لگے تھے کہ وہ بھارت سے الحاق کریں۔لارڈ ویول نے لکھا کہ: ''ماؤنٹ بیٹن بہت حد تک کانگریس کے پلڑے میں جا بیٹھے ہیں... ''وہ کہتے ہیں کہ جناح ایک غیر منطقی اور غیر مدلل بات کو نا ماننے والے انسان بن چکے تھے جب کہ نہرو نے خود کو اکسی قدر معتدل انسان ثابت کیا ہے۔" ماؤنٹ بیٹن نے نہ صرف نوابوں کو مستقبل کی حکمتِ عملی کے بارے میں کوئی مناسب مشورہ نہیں دیا بلکہ اس معاملے کو اپنی وائسرائے کی مدت کے بالکل آخری لمحوں تک نظر انداز کیے رکھا اور پھر بالآخر اُنھیں مجبور کیا کہ وہ بھارت یا پاکستان میں سے کسی ایک سے الحاق کرلیں۔ابتدائی طور پر مسلم لیگ نے نوابی ریاستوں کے مسئلے پر بہت زیادہ توجہ نہ دی کیوں کہ حاکمیتِ اعلیٰ (paramountcy) کے خاتمے کے بعد ریاستوں کی مکمل آزادی کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کرنا ہی ان کے لیے زیادہ آسان تھا۔اس وقت تک پاکستان کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا اور مسلم لیگ کے پاس نہ تو وہ انتظامی صلاحیت، نہ افراد اور نہ ہی مشینری موجود تھی جو ہندوستان کے اسٹیٹس ڈیپارٹمنٹ کا مقابلہ کر سکتی۔ جہاں ہندوستانی اسٹیٹس ڈیپارٹمنٹ 5 جولائی 1947ء سے فعال تھا وہیں پاکستان کا متعلقہ محکمہ 11 اگست 1947ء تک غیر فعال رہا جب اُس نے مسلم اکثریتی علاقوں کے نوابوں سے ابتدائی رابطے شروع کیے۔

پاکستانی حکومت اُس وقت اتنے مسائل میں گھری ہوئی تھی کہ اس کے پاس اس بات کے کوئی شواہد نہیں ملتے کہ کسی اور ریاست نے پاکستان سے الحاق کی کوشش کی ہو۔مثال کے طور پر، منی پور ریاست، جو مشرقی بنگال سے متصل تھی، اگرچہ مسلم اکثریتی نہ تھی لیکن جغرافیائی قربت کے باعث پاکستان سے الحاق کی ایک معقول وجہ بن سکتی تھی تاہم، بظاہر، منی پور کے مہاراجہ سے کوئی رابطہ ہی نہ کیا

گیا اور 11 اگست 1947ء کو یہ ریاست بھارت سے جا ملی۔ اسی طرح، کچھ Khasi Hill ریاستوں، جو آسام اور بنگال کی سرحد پر واقع تھیں، نے بھی 1947ء میں پاکستان سے الحاق کی درخواست دی تھی اور پاکستان کی کابینہ نے نومبر 1947ء میں اس درخواست کو منظور بھی کر لیا تھا لیکن یہ الحاق عملی طور پر کبھی مکمل نہ ہو سکا کیوں کہ بعد ازاں یہ تمام کاغذات کہیں کھو گئے اور 1950ء تک پاکستان کی وزارتِ خارجہ یا سیفران (SAFRON) کو بھی یہ علم نہ ہو سکا کہ آیا یہ ریاستیں قانونی طور پر پاکستان کا حصہ بنی تھیں یا نہیں۔ ایک اور دلچسپ معاملہ ریاستڈ وجانہ کے نواب کا تھا جنھوں نے اگست 1947ء میں پاکستان سے الحاق کی پیشکش کی۔ ڈوجانہ، دہلی کے قریب واقع ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس کا رقبہ تقریباً 100 مربع میل تھا۔ اگرچہ اس کے باسی اکثریتی طور پر ہندو تھے لیکن اس پر ایک مسلمان نواب حکمرانی کرتا تھا۔ سیفران کے سیکرٹری کے مطابق، پاکستان نے نہ صرف اس الحاق کی درخواست کو رد کیا بلکہ نواب کو مشورہ دیا کہ وہ واپس بھارت چلے جائیں جہاں اس کے امکانات زیادہ بہتر ہو سکتے ہیں۔ سیکرٹری نے لکھا: "جب 1947ء میں دہلی اور گرد ونواح میں فسادات پھوٹے تو ڈوجانہ کا نواب پاکستان منتقل ہوا اور الحاق کی درخواست دی۔ یہ الحاق واضح وجوہات کی بنا پر قابلِ قبول نہ تھا تاہم نواب نے گزر بسر کے لیے مالی معاونت کی درخواستیں دینا جاری رکھیں... نواب کو یہ مشورہ دیا جاتا کہ وہ بھارت میں ہی رہے جہاں اسے ایک معقول شاہی وظیفہ مل سکتا تھا۔ ہم ہرگز ایک ایسی ریاست کا الحاق قبول نہیں کر سکتے تھے جو بھارت کے دارالحکومت کے بالکل قریب واقع ہو چناں چہ ہم اسے صرف ایک "بے گھر" شخص تصور کر سکتے ہیں، گو ہمیں اس سے ہمدردی ضرور ہے۔ 1947ء کے اختتام تک، نو ریاستیں — جونا گڑھ، بہاول پور، خیر پور، دیر، سوات، چترال، امب، ہنزہ، اور نگر پاکستان سے الحاق کر چکی تھیں۔ ان میں سے جونا گڑھ کا الحاق، جسے محمد علی جناح نے 15 ستمبر 1947ء کو تسلیم کیا، جلد ہی بھارت نے کالعدم قرار دے دیا۔ بھارتی افواج نے اس پر قبضہ کیا اور اسے بھارت میں ضم کر لیا۔ پاکستان نے اس کارروائی پر زبانی احتجاج کیا لیکن جیسے کہ Spear نے اوکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا میں نشاندہی کی: ''یہ معاملہ اتنا چھوٹا تھا اور اس میں قانونی جواز اتنا کمزور تھا کہ پاکستان محض احتجاج پر اکتفا کر گیا۔'' جونا گڑھ کا سب سے بڑا سبق یہ تھا

کہ اگر کسی ریاست کے الحاق کو اس بنا پر چیلنج کیا جا سکتا ہے کہ وہاں کا حکمران اور رعایا مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں اور عوام کی رائے کو نظر انداز کیا جائے تو کیا بھارت یہی اصول کشمیر پر بھی لاگو کرے گا؟ جناح اور لیاقت علی خان دونوں اسی اصول کی بنیاد پر کشمیر کے معاملے میں بھارت کی نیت آزمانا چاہتے تھے جہاں ایک ہندو مہاراجہ ایک ایسی آبادی پر حکمرانی کر رہا تھا جو 77 فیصد مسلم تھی اور جس کا جھکاؤ بھارت کی طرف ہوتا جا رہا تھا۔ پاکستان سے باہر رہ جانے والی واحد ریاست اب صرف قلات تھی جس کی ماتحت ریاستیں خاران اور لسبیلہ بھی آزادی کے دعوے پر سخت مزاحمت کر رہی تھیں۔ پاکستان سے ان نو ریاستوں کا الحاق اس لیے نسبتاً آسانی سے ممکن ہوا کہ ان ریاستوں میں سیاسی اور معاشی ترقی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاست بہاول پور نے ابتدا میں آزادی کی راہ پر غور کیا لیکن جلد ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ اس کا مستقبل پاکستان کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ چوں کہ ان ریاستوں میں مسلم اکثریت تھی اور ان پر مسلمان نواب حکمرانی کرتے تھے اس لیے بھارت نے ان ریاستوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی اور نہ ہی یہ نواب بھارت میں شامل ہونے کے خواہشمند تھے۔

(4) بہاول پور کے نواب: روحانی یا مقامی

بہاول پور کے نواب، جو عباسی داؤد پوترے تھے، اپنے مقام و مرتبے کے حوالے سے محتاط حد تک آگاہ تھے اور وہ بغداد کے عباسی خلفاء کے خاندان سے نسب کا دعویٰ کرتے تھے۔ بہاول پور کے نوابوں کے لیے یہ دعویٰ ان کی حکمرانی کو ایک حد تک قانونی حیثیت اور مذہبی جواز فراہم کرتا تھا بالخصوص ایک مسلمان اکثریتی ریاست میں۔ یہ دعویٰ اُن بنیادوں سے مشابہ تھا جن پر بعض ہندو راجے اپنی حکمرانی کی روایت کو قائم رکھتے تھے جو اپنے نسب کو ہندو دیوی دیوتاؤں سے جوڑتے تھے لیکن مسلم اکثریتی ریاستوں جیسے حیدرآباد یا بھوپال کے حکمرانوں نے کبھی اس طرح کا دعویٰ نہیں کیا کہ ان کی حکمرانی کو مسلم خلفاء سے نسب ملنے کی وجہ سے جواز حاصل ہے کیوں کہ ایسی بات اُن کے

لیے ایک ہندو اکثریتی آبادی میں وقار حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بن پاتی۔ عباسی خلفاء سے بہاول پور کے نوابوں کے نسب کا "افسانوی دعویٰ" ان کی شاہی حیثیت کے بڑے دلائل میں شامل تھا اور اسے درباریوں اور ہمدرد مصنفین کے ذریعے بڑے پیمانے پر پھیلایا گیا۔ بہاول پور کی پہلی تاریخ جو انگریزی میں 1848ء میں لکھی گئی، اس نے نوابوں کے حسب ونسب کے بارے میں تفصیل سے بحث کی تاہم بالآخر دو متضاد روایات سامنے آئیں۔ پہلی روایت وہ تھی جو عباسی خلفاء سے نسب کے روایتی دعوے پر مبنی تھی۔ کتاب The History of Bahawalpur میں مصنف شہامت علی نے بغداد میں عباسی خلافت کی خوش حالی کا تذکرہ کیا جو ساتویں صدی میں امویوں کے ہاتھوں سندھ کی فتح سے شروع ہو کر تیرہویں صدی میں منگولوں کے ہاتھوں خلافت کے زوال تک جاری رہی۔ پھر شہامت علی نہایت احتیاط سے عباسی خلفاء کے نسب کو براہِ راست بیان کرتے ہیں اور ان کے بعد مصر ہجرت کا ذکر کرتے ہیں۔ شہامت علی مزید بیان کرتے ہیں کہ عباسی کس طرح برصغیر میں داخل ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں": پانچ پشتوں تک مصر میں خلافت کا تسلسل براہِ راست نسل میں جاری رہا جس کی ابتدا سلطان احمد سے ہوئی لیکن آخری سلطان احمد نے تخت وتاج اپنے جانشین کے حق میں چھوڑ کر، 12,000 سواروں کے لشکر کی قیادت میں سندھ کی مہم کا آغاز کیا۔ یہ لشکر زیادہ تر عباسی نسل پر مشتمل تھا۔ اس نے مکران کو اپنی یلغار کا ابتدائی مرکز بنایا۔" شہامت علی آگے بیان کرتے ہیں کہ مکران میں پُر امن طور پر علاقہ حاصل کرنے کے بعد، سلطان احمد کو "امیر" کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ اس کے بعد عباسیوں نے مشرق کی طرف پیش قدمی کی، جب چنی خان سردار تھا جو شہنشاہ اکبر کے بیٹے پرنس مراد کی عملداری میں بلند عہدے پر فائز ہوا اور سندھ میں جاگیر حاصل کی اور ساتھ ہی پورے صوبہ سندھ سے محصول (ٹیکس) جمع کرنے کی اضافی ذمہ داری بھی لی۔

شہامت علی کی تفصیلی روایت ان نسلوں کو بیان کرتی ہے جو اس سلسلے میں آئیں۔ وہ دلیل دیتے ہیں کہ 'داؤد پوترہ' نام داؤد خان دوم سے ماخوذ ہے جو چنی خان کی نسل سے تھا۔ نادر شاہ کے دورِ حکومت میں، شہامت علی بیان کرتے ہیں کہ سندھ کے صوبے کو انحصوں میں تقسیم کیا گیا: شکار پور، سُرکانا، سِیوستان اور کچھی، اور پھر شہر چتوڑ تک کا علاقہ داؤد پوتروں کو دے دیا گیا۔ یہی وہ پہلا عطیہ

زمین تھا جس سے خاندان کے بعد کے افراد نے اپنی طاقت کو مجتمع کیا — پہلے نادر شاہ کے تحت اور پھر اٹھارویں صدی میں احمد شاہ ابدالی کے تحت۔ جب انیسویں صدی کے آغاز میں درّانی سلطنت زوال پذیر ہوئی تو بہاول پور کے حکمرانوں نے عملی طور پر (defacto) کابل کے بالادست حکمران سے آزادی حاصل کر لی۔ بعد ازاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں سکھ طاقت کے ابھار نے بہاول پور کے حکمرانوں کو برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے تعلقات قائم کرنے کی کئی کوششیں کرنے پر مجبور کیا تاہم یہ تمام کوششیں ناکام رہیں جب تک کہ 1833 میں ایک معاہدہ طے نہ پا گیا جس کے تحت بہاول پور نے کمپنی کی بالادستی (paramountcy) کو تسلیم کر لیا۔ یہ پہلی محفوظ تاریخِ بہاول پور ایک عجیب نوعیت کی تصنیف ہے کیوں کہ اگرچہ یہ حکمران خاندان کے عباسی خلفاء سے نسب کے دعوے کو تسلیم کرتی ہے تاہم یہ اس کے ساتھ ایک متبادل روایت بھی پیش کرتی ہے۔ ایسی روایت جو دعویٰ کرتی ہے کہ وہ محض محنت کش طبقے کی اولاد (progeny) تھے۔ کتاب کے اختتام پر "داؤد پوتروں کے بارے میں ضمنی بیان "Supplementary Account of the) (Daoodputras میں درج ہے۔ داؤد پوترہ، بالخصوص وہ شاخ جس کے سربراہ بہاول خان ہیں، حضرت عباسؓ جو نبی کریمؐ کے چچا تھے سے نسب کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کی اصل نسبت ایک بالکل مختلف ذریعہ سے ملتی ہے۔ ان کے جد امجد داؤد، شکار پور کے رہنے والے تھے اور اُس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جنھیں ''جولاہے'' (Spinners) کہا جاتا تھا۔ روایت ہے کہ ان کے پانچ بیٹے تھے: عرب، عباس، حسن، حسیب اور قاسم؛ ان میں سے پہلے چار کی اولادیں عربانی، عباسی، حسینی، اور حِسبانی داؤد پوترہ کہلاتی ہیں۔ اس متن کے لیے کسی مصنف کا حوالہ (citation) موجود نہیں شاید اس لیے کہ حکمران خاندان کی سرکاری نسب نامے سے اختلاف خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ یہ کتاب ہندوستان کے بجائے لندن میں شائع ہوئی جو اس بات کا عندیہ دیتا ہے کہ اگر یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہوتی تو شاید اس میں ایسا " ضمیمی بیان " (account supplementary) شامل کرنا ممکن نہ ہوتا۔ صرف دور دراز انگلستان میں ایک ایسی کتاب کے آخر میں جو سرکاری مؤقف کی توثیق کرتی ہو، اس طرح کی تحریر شامل کی جاسکتی تھی تاہم اس کے باوجود

ایک اہم بات یہ ہے کہ اصل متن کا آغاز مصنف نے سندھ اور ملتان کے بعض علاقوں کی پہلی مسلم فتح سے کیا کیوں کہ یہ واقعہ بہاول پور کے حکمران خاندان کے تشخص کے لیے نہایت اہم علامت تھا۔ بہاول پور کے نوابوں نے خود کو ہندوستان کے دوسرے مسلم حکمرانوں سے اس بنیاد پر ممتاز کیا کہ ان کyنسب کی جڑیں بغداد میں عباسی خلافت کے قیام اور نبی کریمؐ کے چچا کے خاندان سے وابستہ تھیں۔عباسیوں کے نسلی سلسلے کی تفصیلی وضاحت ان کے بغداد سے مصر اور پھر دیگر علاقوں کی طرف ہجرت کے بیان کے ساتھ آگے بیان کی گئی ہے۔نبی کریم حضرت محمدؐ کے چچا حضرت عباسؓ سے لے کر 1848ء تک کے حکمرانوں کا نسب نامہ جب کتاب کے آخر میں نواب بہاول خان سوم تک شامل کیا گیا تو اس سے یہ واضح ہوا کہ اس افسانوی نسب کو بہاول پور کے حکمران خاندان کے لیے کس قدر اہمیت حاصل تھی۔اس دعوے نے انھیں شرافت بلکہ بعض اوقات تقدس کے درجے تک پہنچایا اور ریاست کی اکثریتی مسلم آبادی کے لیے ان کی حکمرانی کو ایک بڑا دینی جواز فراہم کیا۔ یہ تصور کہ داؤپوترہ عباسی خلفاء کی نسل سے تھے،ان کی بطور حکمران خود ساختہ یہ تصور کہ داؤپوترہ عباسی خلفاء کی نسل سے تھے،ان کی بطور حکمران خود ساختہ تصویر کشی کا مرکزی نکتہ تھا۔چوں کہ بہاول پور کے نواب رسمی معنوں میں "بادشاہ" نہیں تھے اس لیے عباسی نسب کا حامل ہونا انھیں یہ اجازت دیتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کے طرزِ حکمرانی کا حصہ تصور کریں اور اپنی ابتدائی حکمرانی کی مشروعیت دینی جواز سے اخذ کریں۔1947ء میں نواب نے "امیر" کا لقب اختیار کیا، جو اسی تصور کا تسلسل تھا اور براہِ راست خلفائے مسلمین کے لقب ("امیر المؤمنین") یعنی مؤمنین کا پیشوا یا سپہ سالار سے ماخوذ تھا۔ یوں بہاول پور کے نواب، باوجود اس کے کہ ان کے پاس شاہی القاب نہ تھے،قوم کے قائد و رہنما مانے جاتے تھے بالکل ان خلفائے مسلمین کی مانند جو صرف حکمران ہی نہیں بلکہ زمین پر "اللہ کے نائب" سمجھے جاتے تھے۔نواب صادق محمد خان عباسی پنجم، جنھوں نے 1907ء سے ریاست کے پاکستان میں انضمام تک حکومت کی؟؟؟ وہ بھی خلفائے مسلمین کی پیروی کرتے ہوئے، چھپ کر بھیس بدل کر اپنی ریاست کا دورہ کیا کرتے تھے جیسا کہ ریاست کے انضمام کے بعد کی تاریخ میں درج ہے..." :وہ اپنی ریاست میں پیش آنے والے تمام معاملات سے بخوبی باخبر رہتے ہیں۔ جب ان کے ہندو رعایا

کی کسی تحریک کی اطلاع ملی تو وہ ایک سردرات کو اونٹ بان کا بھیس بدل کر ڈیرہ نواب صاحب سے بہاول پور آئے تا کہ براہ راست حالات معلوم کرسکیں۔" یہ واقعہ ابتدائی مسلم خلفاء کی یاد دلاتا ہے جو اپنے علاقوں میں عوام کے درمیان عام آدمیوں کے روپ میں گھوما کرتے تا کہ خود صورت حال کا مشاہدہ کریں۔نواب صادق محمد خان عباسی پنجم بلاشبہ خود کو اسی عظیم نسب سے تعلق رکھنے والا دکھانا چاہتے تھے۔ پاکستان سے الحاق کرنے والی ریاستوں میں بہاول پور کا حکمران خاندان اس دعوے میں منفرد حیثیت رکھتا تھا کہ وہ مسلم حکمرانوں کے قدیم نسب سے تعلق رکھتا ہے۔دیگر کسی ریاست نے اس نوعیت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا کیوں کہ ان میں سے بیشتر یا تو حال ہی میں قائم کی گئی ریاستیں تھیں یا انھوں نے انیسویں صدی میں محض رسمی طور پر''نوابی'انداز اور لقب''اختیار کیا تھا اور وہ بھی زیادہ تر اُس وقت جب وہ برطانوی حکومت یا دیگر ہندوستانی نوابی ریاستوں کے ساتھ رابطے میں آئیں۔

☆☆☆☆☆

حکایات بہاول پور

(8)

مجھے اپنی پوری زندگی میں کبھی ایسی شاندار حسِ مزاح دیکھنے کو نہیں ملی جیسا کہ آج سے تقریباً بیس برس پہلے ایک پرانے بہاول پوری زمیندار نے کر دکھایا۔ میں اپنے والد سے ملنے ڈیرہ نواب صاحب گیا تھا اور وہاں سے ایک رشتہ دار کی شادی کے سلسلے میں بہاول پور جانے کے لیے ان کے ہمراہ مقامی بس میں روانہ ہوا۔ یہ وہی ایک بس تھی جو دونوں شہروں کے درمیان چلتی تھی۔سامنے کی نشست پہلے ہی ایک بزرگ سکھ نے سنبھال رکھی تھی جو بڑی سفید پگڑی اور اسی طرح سفید داڑھی والے تھے۔میرے والد اور میں ڈرائیور کے پیچھے والی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ڈرائیور بھی سکھ تھا۔ان دنوں ڈیرہ نواب صاحب سے بہاول پور جانے والی سڑک پختہ نہیں تھی اور نہ ہی آج کی طرح ہموار اور

کشادہ۔مقامی مسافرٹریفک قوانین سےبھی زیادہ واقف نہ تھے۔گھوڑا گاڑیاں اوراونٹوں کی قطاریں اکثر دائیں بائیں بےترتیبی سےچلتی تھیں اورصرف ریاست کےحکمران یا دارالحکومت کو جانے والی بس کے لیےتھوڑا بہت راستہ چھوڑ دیتی تھیں جو دن میں تین چار چکر لگاتی تھی۔راستے میں ہم ایک حادثے کا شکار ہوگئے۔راستے پرایک خطرناک موڑ تھا۔سکھ ڈرائیورتقریباً چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سےموڑ کاٹ رہا تھا کہ اچانک ایک بہت بڑا ریوڑ سامنے آ گیا شاید سوگز سےبھی کم فاصلے پر۔ڈرائیور نے اونچی آواز میں چند مغلظات بکیں اور چرواہےکو کوسنے لگا پھر تیزی سے ایک لمبا ہارن دیا اور ایک طرف گاڑی کو موڑا لیکن بریک لگانا بھول گیا۔بس غیر ہموار سڑک کےگڑھوں میں پھنس کر پچاس گز تک لڑھکتی گئی اور آخرکار ایک درخت سےٹکرا گئی۔تصادم زیادہ شدید تو نہ تھا مگر اتنا ضرور تھا کہ مسافر اپنی نشستوں سے اچھل کر ایک دوسرے سےٹکرا گئے۔سامنے بیٹھے بزرگ براہِ راست ونڈ اسکرین سےٹکرا گئے۔ان کی پگڑی نیچےگر گئی اور افراتفری میں زخمی ہوکر ہاتھ بھی چھلوا بیٹھے۔سب مسافروں کا دماغ ماؤف ہوگیا تھا۔سکھ ڈرائیور مڑ کر ایک پچکی ہوئی کیچڑ آلود مڈگارڈ کےقریب جھکا ہوا تھا۔اسی دوران وہ بزرگ نیچےاترے،اپنی پگڑی اٹھائی اورڈرائیور کے پاس جا پہنچے۔ڈرائیور نے ان کےزخمی ہاتھوں کو دیکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا": اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بڑی مصیبت سے بچالیا،سر۔" بزرگ نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا": ہاں،اللہ کا شکر ہے مگر سردار جی،اگر یہاں یہ درخت نہ ہوتا تو آپ اپنی بس کیسے روکتے ؟"اس سوال پر پورے بس کے مسافر،جو ابھی چند لمحے پہلے خوف سے بے حال تھے،ہنسنے پر مجبور ہوگئے۔

(9)

ریاست بہاول پور کے دیہی اور شہری علاقوں میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو نہ دندان ساز ہیں،نہ جراح اور نہ ہی حکیم مگر دانت یا داڑھ بغیر کسی اوزار یا دوا کے نکالنے کی مہارت رکھتے ہیں۔وہ صرف اپنی انگلی دانت پر رکھتے ہیں،چند مخصوص اور دھیمی آواز میں دعائیں یا ورد پڑھتے ہیں اور دانت درد کے بغیر خود بخود نکل آتا۔

بھارت سے شائع ہونے والی اینابیل لائڈ کی کتاب

Bahawalpur-A Vanished Kingdome

سے 6 دلچسپ ابواب کا ترجمہ

نوٹ: کتاب "بہاول پور: ایک گمشدہ ریاست" Bahawalpur The KingdomThatVanished) کی مصنفہ اینابیل لائڈ (Anabel Loyd) ایک برطانوی ہیں اور طویل عرصے سے انڈین ٹیلیگراف کی کالم نگار ہیں۔ وہ جنوبی ایشیا کی تاریخ، خاص طور پر تقسیمِ ہند سے قبل کے دور میں گہری دلچسپی رکھتی ہیں ۔ یہ کتاب نواب بہاول خان پنجم کے پوتے، صلاح الدین عباسی کے ساتھ ہونے والی گفتگوؤں پر مبنی ہے جس میں انھوں نے سابق ریاست بہاول پور کی تاریخ، وراثت اور زوال پذیر اقتدار پر روشنی ڈالی ہے۔ 2020 میں یہ کتاب انڈیا سے شائع ہوئی جسے ایک طویل جدوجہد کے بعد برطانیہ میں مقیم میرے ایک دوست نے امیزون سے خریدا اور پاکستان آنے والے کسی دوست کے ذریعے یہ کتاب مجھ تک پہنچی۔ اس کتاب کو مستند بنانے کے لیے زبانی گفتگوؤں کے علاوہ متعدد کتب و رسائل کے حوالہ جات کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس میں بہت سے غیر معلوم حقائق کا پہلی بار ذکر کیا گیا ہے۔ عباسیوں سے جذباتی وابستگی رکھنے والوں کے جذبات مجروح بھی ہو سکتے ہیں مگر چوں کہ اس کتاب کی تصنیف و تالیف اور اشاعت کے پس منظر میں آج کے نواب صلاح الدین کی خواہش اور کوشش کارفرما ہے جسے گھر کا بھیدی کہنا چاہئے لہذا بیان کیے گئے حقائق سے اتفاق یا اختلاف ہر ایک کا بنیادی حق ہے۔ کتاب میں دی گئی نادر و نایاب تصاویر موجودہ عباسی نواب نے فراہم کیں جن میں اس پلنگ کی تصویر بھی ہے جس پر ایک مختصر مضمون بھی شامل ہے۔ اس ضمن میں پیش لفظ اور تعارف کے دونوں ابواب بہت اہم ہیں۔)

(1)

پیش لفظ یا Foreword

یہ سب کچھ دہلی میں دسمبر 1911ء میں منعقد ہونے والے بادشاہِ معظم جارج پنجم اور ملکہ میری کے تاجپوشی دربار کی منظرکشی سے شروع ہوتا ہے۔ 14 دسمبر کو ہونے والی عسکری پریڈ میں، ہندوستانی ریاستوں کے سربراہان نے اپنی اپنی ریاستی افواج کی قیادت خود کی۔ ان میں سب سے کم عمر شہزادہ وہ تھا جس پر سب کی نظریں مرکوز تھیں — بہاول پور کا نواب، جس کی عمر صرف سات برس تھی، جس نے اپنے اونٹ سوار دستے کی قیادت کی، خود اونٹ پر سوار تھا، ایک سنجیدہ اور وفادار سپاہی کے آگے۔ خاکی وردی، جس میں سنہری کڑھائی والے دامن تھے، زیب تن کیے اس ننھے شہزادے نے پورے اعتماد سے بادشاہِ معظم کا سامنا کیا اور جب سلامی کا مقام آیا تو ایک شیرخوار بچے کی طرح اپنا دایاں بازو مکمل طور پر اٹھایا اور ہر حرکت میں کامل درستگی اور وقت کی ہم آہنگی کے ساتھ اپنی ننھی تلوار کو سلامی کے لیے نیچے جھکا دیا۔ شاید ستر یا اسی برس بعد، وہ اُن جری سپاہیوں میں واحد بچا ہوگا جو اُس دن بادشاہ جارج کے سامنے سے گزرے تھے۔

ستر سال بعد، یہی درخشاں بچہ — جنرل، جلالۃ الملک، رکن الدولہ، سیف الدولہ، حافظ الملک، مخلص الدولہ و معین الدولہ، الحاج نواب سر صادق محمد خان بہادر عباسی پنجم، نصرتِ جنگ، امیر مملکتِ خداداد بہاول پور، GCSI، GCIE، KCVO ایک ایسی ریاست کا حکمران تھا جو ڈنمارک کے برابر رقبہ رکھتی تھی۔ جہاں پنجاب کی پانچ عظیم ندیاں مل کر پنجند بناتی ہیں لیکن وہ پانچ برس قبل اپنی انگریزی قیام گاہ میں وفات پا چکا تھا۔ اُس وقت تک نہ وہ حکمران رہا تھا نہ ریاست باقی رہی تھی؛ ملک تقسیم ہو چکا تھا اور بہاول پور ریاست مغربی پاکستان کے ایک وحدانی وجود میں ضم ہو چکی تھی۔ اُس کے جسدِ خاکی کو واپس بہاول پور لایا گیا، صادق گڑھ محل اور وہاں سے توپ گاڑی میں صحرا کے اندر لے جا کر اُس کے خاندانی مقبرے میں آخری آرام گاہ تک پہنچایا گیا۔

میں نے کبھی بہاول پور کا نام بھی نہ سنا تھا۔ 1911ء کے دربار کے چشم دید مؤرخ جان

فورٹسکیو نے ہندوستانی عوام کے بارے میں سچ ہی لکھا": کوئی ایک انسان، خواہ اس کے پاس کاریں، ہوائی جہاز یا ریلوے ہو، اُن اٹھارہ لاکھ مربع میل کے علاقے کا صدیوں میں بھی ایک فیصد حصہ نہیں دیکھ سکے گا جہاں وہ لوگ آباد ہیں۔ کسی ایک انسان نے ان سب زندہ اور مردہ شہروں کی سیر نہیں کی نہ ہی کبھی کر سکے گا جو ان لوگوں نے آباد کیے۔" پھر بھی، بھارت آنے والے ہر سیاح کی طرح، جس نے جنوبی ایشیاء کی تاریخیں یا سیاحوں کی کہانیاں پڑھی ہوں، مجھے یہ گمان تھا کہ میں نے ان سابق ریاستوں کے نام کم از کم کبھی نہ کبھی ضرور سنے ہوں گے لیکن میرا یہ گمان سراسر غلط نکلا۔ جب میں نے آزادی کے وقت موجود تمام 565 ریاستوں کی فہرست دیکھی۔ ان میں اکیس توپوں کی سلامی والی بڑی ریاستیں شامل تھیں، جنھیں ایک برطانوی وائسرائے نے یادرکھنے کے لیے یہ جملہ بنایا:

Hot Skippers make good breakfast یعنی حیدرآباد، کشمیر، میسور، گوالیار اور بڑودہ؛" — یہی بہترین شاہی ریاستیں تھیں اور دوسری طرف، ایک چھوٹا سا گاؤں "ویجانونس"(Vejanoness) گجرات میں، جس کا رقبہ صرف 0.76 مربع کلومیٹر اور آبادی 206 افراد تھی۔ بہاول پور کا شمار "(kippers") کشمیر کے قریب تر ریاستوں میں ہوتا تھا — رقبے میں راجستھان کی ریاست بیکانیر سے ذرا چھوٹا جس کے ساتھ وہ شریکِ کار رہا اور جے پور سے بڑا۔ یہ بھی ان ہی کی طرح سترہ توپوں کی سلامی حاصل کرنے والی ریاست تھی لیکن پھر یوں ہوا کہ سیاحت سے بھرپور ہمسائے راجستھان کے برعکس، بہاول پور کا نام غیر ملکی نقشوں سے مٹتا چلا گیا، کم از کم اُن کی نگاہوں سے جو باہر سے آتے تھے۔ وہ اب ایک ایسی سرزمین کے عقب میں چھپ چکا تھا جو ابھی تک غیر دریافت اور شاید...... سخت ملک (Hard Country) پاکستان تھا۔ میرے لیے اس نام سے عدم واقفیت میری اپنی جغرافیائی اور ادبی جہالت کی دلیل تھی — خاص طور پر تقسیم کے تناظر میں جب بہاول پور ہندوستان کے ساتھ پیدا ہونے والی خلیج کے بالکل اگلے مورچوں پر تھا۔ دہلی میں، پرانی نسلوں کی یادداشتیں کسی دھندلی روشنی میں ابھریں، لاہور یا کراچی میں پرانے خاندانی گھروں کے ان والدین اور دادا دادی کی جنھوں نے تقسیم سے پہلے کا زمانہ دیکھا تھا اور بہاول پور کے بارے میں — ایک امیر پنجابی ریاست کا تصور، شان دار نواب، رولز رائس گاڑیوں کے قافلے اور وہ عالی شان محلات جو اب نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

جب یہ ریاست پنجاب میں ضم کی گئی تو یہ ایک کم حیثیت یافتہ گوشہ بن کر رہ گئی" — بالائی پنجاب کے طاقت ور طبقے" نے اسے نظر انداز کر دیا، جہاں نہ دولت تھی نہ لوگ اور نہ ہی کوئی کاروباری سرگرمیاں جنوب کی طرف آتی تھیں حتیٰ کہ لاہور اور اسلام آباد کے بھی کم ہی لوگ بہاول پور گئے تھے۔ وہ جانتے تھے اور کبھی کبھار محلوں کے نام بھی لے لیتے تھے جو فوج نے 'بچا لیے' تھے۔ انھیں عدالتی مقدمات میں الجھے خاندانی جھگڑے یاد تھے اور زیر زمین سرنگوں اور دفن شدہ خزانوں کی پراَسرار اور مبالغہ آمیز کہانیاں بھی۔ ان سب افواہوں سے آگے، لوگ صرف ایک شخصیت سے واقف تھے مگر انتہائی نجی شخصیت 'نواب صاحب یعنی صلاح الدین عباسی جو نواب صادق محمد خان پنجم کے پوتے تھے۔ وہ صرف ایک ہی معاملے میں لب کشا ہوئے، وہ وعدے جو اُن کی قوم کے ساتھ حکومتوں نے بار بار کیے اور توڑے۔

ہمہ گیر گوگل نے انیسویں صدی کے محلات کی تصاویر، عباسی خاندان کے مبہم شجرہ ہائے نسب جو اسلام کی پیدائش سے بھی پہلے کے زمانے تک پھیلے ہوئے تھے اور میرے لیے سب سے بڑی کشش، قلعہ دراوڑ کی حیرت انگیز تصاویر فراہم کیں جس کی عظیم الشان اینٹوں کی فصیلیں چولستان کے ریگزار میں پیوست ہیں۔ میں دراوڑ کے قریبی عزیز (قلعہ بھٹنیر) جسے ہنومان گڑھ بھی کہا جاتا ہے، جا چکی تھی بس کچھ ماہ قبل۔ یہ قلعے اُنہی دفاعی سلسلوں کا حصہ تھے جو وسط ایشیا سے ہندوستان میں داخل ہونے والے راستوں کی حفاظت کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ دراوڑ کی طرح یہ قلعہ بھی کبھی بھٹی راجپوتوں کی جاگیر رہا کرتا تھا۔ صدی پرانی تصاویر میں ہنومان گڑھ بھی دراوڑ کی مانند سنسان ریگستان میں تنہا کھڑا دکھائی دیتا ہے، بیکانیر ریاست کی ایک پیش قدمی چوکی کے طور پر اور آج، یہ ایک منڈی کے ایک مشہور قصبے کے وسط میں واقع ہے جو اب راجستھانی سے کہیں زیادہ پنجابی دکھائی دیتا ہے۔ یہاں مکانات قلعے کی عظیم فصیلوں سے تقریباً چمٹ کر بنے ہوئے ہیں؛ فصیلوں کے حجم کو دیکھنے کے لیے یا تو کسی کی چھت پر چڑھنا پڑتا ہے یا چائے کے ساتھ مقامی فوٹوگرافی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ قلعے کا اندرونی حصہ کھنڈر بن چکا ہے، لیکن آثار قدیمہ کے سروے آف انڈیا (SOI) کی طرف سے نصب شدہ زنگ آلود تختیاں اب بھی کچھ امید دلاتی ہیں اور دیواروں پر تھوڑا بہت مرمتی کام ضرور دکھائی دیتا ہے۔

اب میں نے ایک صحرائی مہم کا تصور کیا — ممکنہ طور پر اونٹوں پر جس میں دراوڑ کی تلاش ہو

اور اُن شکستہ قلعہ بند حصاروں کی جو کسی زمانے میں ہندوستان کے خزانے کی حفاظت کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ میں نے لندن میں اپنے پاکستانی دوستوں سے پوچھا کہ دراوڑ کیسے پہنچا جائے؟ اور فوراً ہی سب کچھ آسان ہو گیا۔ سب کے کسی نہ کسی کزن، بہن، بھائی، ماموں یا ایک وسیع خاندان کے ساتھ تعلقات ہیں جو دنیا بھر میں پاکستانی تارکینِ وطن کی صورت پھیلا ہوا ہے۔ میرا یقین ہے کہ پاکستان کے سماجی بندھنوں کے سلسلے کے ذریعے شاید آپ کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ یہ وطن سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ مہمان نواز ہے۔ مسافر، خاندان کے ہاتھوں سے ہاتھوں میں ایسے منتقل ہوتا ہے جیسے کوئی قیمتی تحفہ ہو، جس کا خیال رکھا جائے، جس کی ضیافت ہو، جسے کھلایا پلایا جائے اور اُس کی خواہشات کے مطابق اِدھر اُدھر لے جایا جائے اور میرے لیے بھی دراوڑ کا سفر ایسا ہی تھا۔

بس تھوڑی سی اداسی یہ تھی کہ آخر میں وہاں اونٹ نہیں تھے۔ یہ ایک جدید اکیسویں صدی کا عام سا دن تھا، ایک چار پہیوں والی آرام دہ گاڑی میں سفر اور عباسی خاندان جو 1733ء سے قلعے کے محافظ رہے ہیں، کے ساتھ ایک شاہانہ پکنک کی ضیافت۔ شاندار دراوڑ نے ہر توقع کو پورا کیا اگرچہ حالیہ برسوں میں اس کی داخلی بربادی اور یہ اندیشے کہ اس کے نادر خزانوں کی دیکھ بھال کرنے والا اب کوئی نہیں، اُس شان پر کچھ سایہ ڈال گئے۔ تین سو برس سے یہ عظیم قلعہ اُن شہزادوں کی کہانی کا مرکز رہا ہے جو یہاں سونے سے مرصع سنگ مرمر کی قبروں اور فیروزی ٹائلوں والے تابوتوں میں دفن ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آخری حکمران کو بالآخر اپنے آباؤ اجداد کے درمیان، ایک ٹھنڈے، پرسکون کمرے میں، ہمیشہ کے لیے لایا گیا تھا۔ میرے لیے، قلعہ دراوڑ کی بلند و بالا فصیلیں اور وہ پُرسکون اور خوب صورت مقبرے ایک ایسی منزل تھے جو بالآخر حاصل ہوئی اور ساتھ ہی یہ ایک خاندانی داستان کے آغاز کا نشان بھی تھے جسے بیان کیا جانا تھا۔ بعد میں بہاول پور شہر کے باہر، ڈیرہ نواب صاحب میں، بوسیدہ صادق گڑھ محل کے پیچھے، اپنے پڑدادا یا شاید اس سے بھی پرانے کسی دادا کی، نانی کے بنگلے کے باغ میں جس کے بارے میں وہ خود بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا، میں نے پرانے زمانے کی انگریز آیا کی متروک یادیں صلاح الدین عباسی کے ساتھ بانٹیں جو اب بھی بہاول پور کے مذہبی لقب 'امیر' کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ مکان آسیب زدہ ہے۔ بلاشبہ، وہ اُن گھروں میں سے

ایک ہے جہاں فروری کی سرد شام میں جب بجلی کی روشنی کبھی جھلملاتی ہے اور کبھی مدھم ہو جاتی ہے اور گیس کا ہیٹر ٹھیک نو بجے بند ہو جاتا ہے تو انسان کا ذہن خود بخود اُن لوگوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے جو کبھی اس مکان میں بستے تھے۔ اُس مکان میں ویانا کے کسی محل جیسا ماحول ہے، ایسا احساس کہ جیسے کوئی، جس کی تصویر قریبی میز پر رکھی ہے، ابھی ابھی اس کمرے سے نکلا ہو یا پھر کتابوں کی الماری کے سائے میں کھڑا ہو کر موجودہ نسل کو وہ کھیل کھیلتے ہوئے دیکھ رہا ہو جو نہ صرف حیران کن ہے بلکہ سخت مقابلے پر مبنی بھی — یعنی ـWhist) تاش کے پتوں کا کھیل)

''بچپن کی اُن تکالیف کو چھوڑ کر، جیسے انگریز آیا کے ہاتھوں ناشتے میں ساگو پڈنگ کھلایا جانا جس پر میں آج بھی یقین نہیں کر پاتا، صلاح الدین — اپنی گود میں بیٹھے " کوکو" نسل کے پیکینیز کتے کو سہلاتے ہوئے اپنے خاندان کی طویل تاریخ سنانے لگے۔ اُن کی پیدائش 29 جولائی 1946 کو ہوئی بطور ایک شاہی گدی کے وارث کے پہلے فرزند کے۔ یہ خبر وائسرائے لارڈ ویول کو باقاعدہ تار کے ذریعے دی گئی۔ صرف ایک سال بعد، ہندوستان آزاد ہوا اور بہاول پور نے نو آزاد ملک پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیا۔ یہ کتاب 2016 میں اسلام آباد اور لاہور میں کئی ہفتوں پر محیط صلاح الدین سے ہونے والی مزید ار گفتگوؤں پر مبنی ہے۔ اُن کی خواہش تھی کہ وہ اپنی کہانی ایک غیر ملکی کو سنائیں جو پاکستان کے بارے میں کم علم رکھتی تھی اور عباسی خاندان کے بارے میں تو اور بھی کم تا کہ اُن تمام نقطہ ہائے نظر، آدھی سچائیوں اور متضاد تعبیرات سے بچا جا سکے جو پاکستان کی ہر کہانی کو کسی نہ کسی رنگ میں رنگ دیتی ہیں اور — جن میں " گڈ مارننگ " کہنا بھی کبھی سیاسی بیان، کبھی وعدہ، اور کبھی دھمکی بن جاتا ہے۔ یہ داستان، جہاں تک ممکن ہو، صلاح الدین کی اپنی نظر سے دیکھی گئی خاندانی تاریخ، ان کے وطن اور آزادی و تقسیم کے بعد کے پاکستان کی ان کی مخصوص تعبیر ہے اور وہ بھی میری طرح اسکول میں شیکسپیئر کا ڈرامہ TheTempest پڑھ چکا ہے۔ گذشتہ ستر برسوں میں کئی ایسے مواقع آئے ہیں جب اسے یہ ماننے کا پورا جواز ملا کہ: "یوں محسوس ہوتا رہا جیسے دوزخ سنسان ہو اور سب شیطان اِسی دنیا میں آ بسے ہوں۔

(2)

تعارف (Intruduction)

جس طرح یادداشت کسی فرد کی شناخت کا ذریعہ ہوتی ہے، اسی طرح تاریخ کسی قوم یا برادری کی شناخت کا ذریعہ بنتی ہے۔ تاریخ افراد کو یہ شعور عطا کرتی ہے کہ وہ کن گذشتہ نسلوں سے وابستہ ہیں جن سے اُنہوں نے اپنے مذہبی عقائد، اخلاقی اقدار، سماجی وقانونی ادارے اور مجموعی طور پر اپنی پوری تہذیب وراثت میں پائی ہے۔

27 سے 29 جولائی 1946 کے دوران بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ (AIML) کی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا جس میں مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کی آئینی تجاویز کی سابقہ منظوری واپس لے لی جو متحدہ ہندوستان کی آزادی کے لیے پیش کی گئی تھیں۔ اس کے بجائے، مسلم لیگ نے "براہِ راست اقدام" کا لائحہ عمل اختیار کیا تاکہ ایک آزاد اور مکمل خودمختار ریاستِ پاکستان کے فوری قیام کو ممکن بنایا جاسکے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب برصغیر کی تقسیم اور ایک نئے ملک کے قیام کی داستان کا آغاز ہوا۔
اسی سال 29 جولائی کو صلاح الدین عباسی کی ولادت مغربی ہمالیہ کی وادیوں میں واقع "الہلال" میں ہوئی جو کہ ان کے دادا کی جانب سے 1930 کی دہائی میں پالم پور کے چائے کے باغات کے درمیان تعمیر شدہ ایک گرمیوں کا رہائشی مکان تھا۔ ان کی والدہ جو صرف پندرہ برس کی تھیں ان کے والد کی نہایت محبوب اور واحد بیوی تھیں اور ان کے دادا کے سابق استاد اور محسن مولوی غلام حسین کی نواسی تھیں۔ انھیں نوابزادہ محمد عباس خان جو کہ نواب کا چہیتا انگریز مزاج بیٹا تھا، کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے پاکستان کی ساری غیر متوقع، پُرآشوب تاریخ، حکمرانوں کی بدعنوانیوں، اپنے شوہر کی جبری سرکاری مصروفیات اور اپنے سب سے بڑے بیٹے کی ان تمام ناانصافیوں کے خلاف جدوجہد کی چشم دید گواہ رہی ہیں، جو ریاست بہاول پور کے ساتھ روا رکھی گئیں۔

11 اگست 1947 کو آزادی سے صرف تین روز قبل، محمد علی جناح نے پاکستان کی نئی دستور ساز اسمبلی سے صدارتی خطاب کیا۔ انھوں نے یاد دلایا کہ اقتدار کے ساتھ بڑی ذمہ داری بھی

آتی ہے۔سب سے پہلی ذمہ داری قانون ونظم کا قیام ہے؛ بدعنوانی کو' آہنی ہاتھ' سے روکا جانا چاہیے؛ اقربا پروری کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے اور خاص طور پر غریب عوام کی فلاح و بہبود کو اولین ترجیح دی جانی چاہیے . ۔انھوں نے واضح کیا کہ کسی بھی برادری، ذات یا عقیدے کے مابین امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ مذہبی وابستگی کو ہر فرد کا ذاتی معاملہ سمجھا جانا چاہیے لیکن تمام افراد ریاست کے مساوی شہری ہوں گے۔ انھوں نے اس بات کی نشاندہی کی کہ ہندوستان میں مختلف برادریوں کے 'اختلافات' آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم بہت پہلے آزاد ہو چکے ہوتے۔ جناح نے یہ بھی کہا": جیسا کہ آپ جانتے ہیں، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انگلینڈ میں، کچھ عرصہ قبل، حالات آج کے ہندوستان سے کہیں بدتر تھے۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کو ظلم کا نشانہ بناتے تھے۔ آج بھی کچھ ایسی ریاستیں موجود ہیں جہاں مخصوص طبقات کے خلاف امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ان دنوں میں آغاز نہیں کر رہے۔ ہم ایسے دور کا آغاز کر رہے ہیں جہاں امتیاز ہے نہ ایک برادری اور دوسری کے درمیان کوئی تفریق، نہ ایک ذات یا عقیدے اور دوسرے کے درمیان کوئی امتیاز۔ ہم اس بنیادی اصول کے ساتھ آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ریاست کے برابر کے شہری ہیں۔"

صلاح الدین عباسی کی زندگی کے ابتدائی برسوں میں ہی وہ خواب لہولہان ہو چکا تھا اور وہ تشدد جو قیامِ پاکستان کے وقت برپا ہوا، اس خواب کو مزید خاک آلود کرنے کا سبب بنا۔ آنے والی دہائیوں میں، انھوں نے جناح کے اُس پاکستان کے تصور کو دفن ہوتے دیکھا۔صرف سفارش، اقربا پروری اور بدعنوانی کے سہارے چلنے والے ریاستی اداروں کے نیچے نہیں بلکہ اُس فریبِ نظر کے تحت جو 'اسلامی ریاست' کے سراب کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔

روزمرہ کی زندگی میں مذہب کے فرسودہ اور زبردستی کے طور پر نافذ ہوتے مظاہر نے ایک جدید اور ترقی پسند ریاست کے قیام میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور جناح کی اس خواہش کی بحالی کو تقریباً ناممکن بنا دیا جو قومی وحدت پر مبنی تھی نہ کہ مذہبی اکثریت پر۔ایک سادہ مگر قابلِ حصول مقصد یہ تھا کہ حکومت اور ریاستی مشینری فرد کے بجائے پوری قوم کی بہتری کے لیے کام کرے۔ یہی وہ بنیاد تھی

جس سے نئی فہم وبصیرت جنم لے سکتی تھی مگر جو "ہرکولیس" آ کر حکومت کی گندگی صاف کرتا وہ اب تک نمودار نہیں ہوا۔

کسی بیرونی فرد کے لیے پاکستان کا مشاہدہ کرنا دشوار ہے مگر ان لوگوں کے لیے کہیں زیادہ کٹھن ہے جو اسی ملک میں بستے ہیں اور جن کی روح اس ملک کی بددیانتی اور بدعنوانی میں گھری سیاست نے چوس لی ہے۔ وہ آسانی سے مایوسیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کی اس طویل فہرست سے آگے نہیں دیکھ پاتے۔ زیادہ سہل یہی ہوتا ہے کہ انسان ایک طویل دینی امید پر مبنی تصوراتی مستقبل میں پناہ ڈھونڈے۔ قوم آج بھی ستر برس کی وعدہ خلافیوں، عزت، احترام، تاریخ اور ورثے کی پامالی کا شکار ہے اور پھر بھی وہ نسل جو آزادی کی گواہ رہی آج بھی اس خواب کو یاد کرتی ہے کہ جس وقت پاکستان وجود میں آیا تھا تو ان کے دلوں میں کتنی بلند امیدیں تھیں اور وہ آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ وہ خواب ایک دن ضرور شرمندۂ تعبیر ہوگا، انشاءاللہ۔

صلاح الدین عباسی کی خوش دامن، ثُریّا اسلم، جو کہ ایک ماہرِ حیاتی کیمیا (Bio Chemistry) ہیں اور ان کی والدہ کی چھوٹی بہن بھی ہیں، آج بھی اس سیاسی جدوجہد میں مصروف ہیں تاکہ ان کے وطن کی حکمرانی کا نقشہ قائداعظم کے تصور کے زیادہ قریب لایا جا سکے۔ وہ اپنے بھانجے سے زیادہ پُرامید ہیں اور محسوس کرتی ہیں کہ تاریخ کا پہیہ دوبارہ گھومنا شروع ہو چکا ہے۔ پاکستان تحریکِ انصاف (PTI) کے توسط سے جس کی بنیاد 1996 میں عمران خان نے رکھی۔ بدقسمتی سے پی ٹی آئی کا اعتدال پسند، عوامی مقبولیت پر مبنی، بدعنوانی کا مخالف تصور، جس میں ایک مساوات پر مبنی، جمہوری، جدید اسلامی فلاحی ریاست کا تصور تھا جو بیرونی مداخلت سے محفوظ ہو اور جناح کے اصولوں پر قائم ہو، عملی سطح پر اتنا آسان ثابت نہ ہو سکا جتنا نظریاتی سطح پر تھا۔ 2013؟ کے انتخابات میں کامیابی کے باوجود، پاکستان آرمی کی خاموش حمایت اور عوام کو موجودہ نظام کے خلاف احتجاجی ریلیوں میں نکالنے کی صلاحیت کے باوجود، عمران خان وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے جس کے وہ متمنی تھے۔ جیسے جیسے ان کا پیغام مذہبی معاملات میں مصلحت پسندی اور پرانے طرز کے سیاستدانوں کے ساتھ وابستگی کے باعث دھندلا ہوتا گیا، ویسے ویسے اس بات کا سوال اٹھنے لگا کہ آیا ان کی روشنی مزید

بڑھے گی یا ماند پڑ جائے گی۔اس راہ میں ایک اور بڑی رکاوٹ خود نظام میں پھیلی وہ بدعنوانی ہے جو ان کے حمایتیوں کو بھی عام لوگوں میں سے کسی ایسے شخص کو ووٹ دینے سے روکتی ہے جو ممکنہ طور پر اُنہیں کچھ دے ہی نہ سکے۔

پاکستانی معاشرہ اب پہلے سے کہیں زیادہ تقسیم کا شکار ہے۔ بزرگ نسل کو شاید اپنی قوم میں پیدائش کی تکالیف یاد ہوں مگر آج کی "سیلفی نسل" کے لیے یہ سب محض ماضی کی بات بن چکا ہے۔ان کے لیے، ہندوستانی ہمسایوں کے خلاف وراثت میں ملی نفرت ہی پاکستان کی پرتشدد پیدائش کی واحد زندہ یاد ہے۔نئی نسل اب تاریخ اور ورثے میں اتنی دلچسپی نہیں رکھتی جتنی پہلے رکھتی تھی۔یہی ان کا المیہ ہے مگر پرانے اور خوشحال طبقات کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ماضی کے خزانے محفوظ رکھ سکیں جب کہ نوجوانوں کو سب سے پہلے مستقبل کی طرف دیکھنا چاہیے۔پاکستان آج بھی ذات، مذہب اور طبقے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے لیکن نوجوان اب بھی ایک بہتر کل اور مساوات کی امید پر خواب دیکھ رہے ہیں۔ جو لوگ انتہائی غربت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اُنہیں آسانی سے انتہا پسند اسلام کے وعدوں سے بہکایا یا مجبور کیا جاسکتا ہے — ایک ایسے عظیم بعد از مرگ مستقبل کا تصور جو اُنہیں تسکین دے سکے یا اس دنیا کی قلیل اور سخت زندگی میں تعلیم یا عوامی خدمات کی کمی کا مداوا بن سکے۔

امتیازی حیثیت رکھنے والوں یعنی اُن افراد کے لیے جنھوں نے رتبہ وراثت میں پایا یا بے پناہ دولت کے حصول کے ذریعے حاصل کیا، بیرونِ ملک تعلیم اب معمول بن چکی ہے تاہم سبھی طویل عرصے تک بہتر زندگی یا مزید دولت کے لالچ میں ہجرت سے متاثر نہیں رہتے۔ جو نوجوان فارغ التحصیل واپس آتے ہیں وہ کاروباری ذہن رکھتے ہیں، تخلیقی ہوتے ہیں اور ملک میں پھیلی بدعنوانی سے اوپر اٹھنے یا اسے چکمہ دینے کے طریقے تلاش کرتے ہیں تاکہ آگے بڑھ سکیں۔ان میں سے کئی پہلے ہی اقربا پروری اور بدعنوانی کے اس نہ ختم ہونے والے جال میں الجھے ہوتے ہیں جو پاکستانی سیاست اور سماج کے بالائی طبقات میں خاندانی روابط کے ذریعے قائم ہے۔ کچھ تو آسان مواقع سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اقتدار پر قابض چہروں اور خاندانوں کی اندرونی بددیانتی اور مسلسل چکر کھاتی طاقت کی ساخت سے بیزار ہوتے ہیں، جو ترقی کا گلا گھونٹتے ہیں اور محض ذاتی مفاد

کے لیے ملک کو مزید غربت کی طرف دھکیلتے ہیں۔

جغرافیائی لحاظ سے اگر چہ پاکستان ایک نوجوان ملک ہے لیکن دنیا پچھلے ستر برسوں میں یکسر بدل چکی ہے۔ نئی نسل ایک ایسے ہزارے (Millenniun) میں جوان ہوئی ہے جو مکمل طور پر مختلف ہے۔ پاکستان ماضی کی طرف دیکھتا ہے، مذہبی خالص پن کی تلاش میں، ایک ایسی قومی شناخت اور وحدت کے خواب کی طرف جو تقسیمِ ہند کے بعد کبھی پوری نہ ہو سکی لیکن اب پاکستان ماضی کی اس عظیم تاریخ کی طرف بھی نہیں دیکھتا جو اسے ایک وسیع تر تہذیبی سلسلے کا حصہ بناتی تھی۔ وہ ماضی تو تقسیم کی گہری کھائی میں دفن ہو چکا ہے۔ آج پاکستان نہ پیچھے دیکھتا ہے نہ آگے بلکہ صرف انفراسٹرکچر کے ظاہری مظاہر جیسے ٹرانسپورٹ کے نئے نظام، شاپنگ مالز اور شہری توسیع تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ تبدیلیاں غریب طبقے کو اسی جگہ چھوڑ دیتی ہیں جہاں وہ ہمیشہ بے سروسامانی میں تھا اور حکومت کی جانب سے دل لبھانے والے اعلانات کے باوجود یہ کسی بھی باہر کے فرد کو اندر آنے کی دعوت دینے میں ناکام رہتی ہیں۔ شاید نئی نسل وہ تبدیلی لے آئے جو اقربا پروری اور بدعنوانی کی تہوں کو چیر کر ایک دور اندیش قومی شعور پیدا کرے جو اُن خوابوں کو حقیقت دے سکے جو قیامِ پاکستان کے وقت دیکھے گئے تھے۔

بہاول پور اور اس کے حکمرانوں کی کہانی بھی قاری کو ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے ماضی کے اس طویل سفر پر لے جاتی ہے جو برصغیر کی تاریخ ہے۔ پھر بات جاتی ہے نبی کریم حضرت محمدؐ اور اسلام کے ابتدائی پھیلاؤ کی طرف۔ جب 1947 میں نواب صادق محمد پنجم نے محمد علی جناح کے مسلم وطن کے تصور کی پیروی کا فیصلہ کیا تو اس نے ان کے خاندان اور ریاستِ بہاول پور کے ماضی اور مستقبل کے درمیان وہی تقسیم پیدا کر دی جو بھارت اور پاکستان کی تاریخ، حال اور مستقبل کے درمیان ہے۔ بہاول پور کی 1959 کی ایک تاریخ (صادق نامہ) کے مصنف (بریگیڈیئر سید نذیر علی) نے اُس لمحے کا ذکر کیا ہے جب امیر نے 20 دسمبر 1954 کو پاکستان کے حق میں ریاست کی خودمختاری کے آخری نشانات پر دستخط کیے، اور سوال اٹھایا: "* کیا یہ تسلیم تھا یا قربانی؟"

آخری نواب کی کہانی کے بھی دو رُخ ہیں۔ نہیں، یہ پاکستان ہے، یہاں سچ، آدھے سچ، اساطیر، افواہیں اور جھوٹ سب ایک ساتھ چلتے ہیں مگر اُن کی رنگین زندگی نے انھیں ان شاہی

ریاستوں کے ان جدید حکمرانوں کی صف سے خارج نہیں کیا جنھوں نے انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں تعلیم وصحت جیسے شعبوں میں اصلاحات کیں۔ ان کے ہم مذہب حکمرانوں میں بھوپال اور رامپور بھی شامل تھے لیکن بہاول پور واحد ریاست تھی جہاں حاکم بھی مسلمان تھا اور عوام کی غالب اکثریت بھی۔ صرف مذہبی اکثریت ہی نہیں بلکہ بہاول پور کا تمدنی و ثقافتی تعلق بھی اپنے ہمسایہ راجستانی ریاستوں سے زیادہ تھا بہ نسبت اُن چھوٹی چھوٹی قبائلی ریاستوں کے جو مسلسل باہم برسرِ پیکار تھیں اور آج کے پاکستان میں پھیلی ہوئی ہیں۔

ستلج ویلی نہری آبپاشی کے منصوبے کا قرض جو نواب کی نابالغی کے دوران برطانوی حکومت نے مسلط کیا، طویل عرصے تک ان کے سر پر بوجھ بنا رہا اور ان کے اختیارات کو محدود کرتا رہا۔ دوسری جنگ عظیم نے کچھ آسودگی فراہم کی کیوں کہ زرعی اراضی کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ تقسیم کے وقت، بہاول پور نے نہایت عمدگی سے اپنے شہریوں کی حفاظت کی وہاں مفت صحت کی سہولیات، ابتدائی و ثانوی تعلیم میسر تھی اور ریاست نے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ بھی مکمل کیا۔ سر رچرڈ مارش کرافٹن، جو 1942 سے 1947 تک بہاول پور میں برطانوی وزیر اعظم تھے، کے مطابق فوج پر خرچ جو نواب کا پسندیدہ شعبہ تھا تین گنا بڑھ چکا تھا۔ علاوہ ازیں، 1951 میں انھوں نے صادق پبلک اسکول قائم کیا جو آج بھی پانچ سو ایکڑ پر محیط ہے۔

بہاول پور نے سب سے پہلے پاکستان سے الحاق کیا اور الحاق کے دستاویزی مراحل اور 1955 کے حتمی انضمامی معاہدے کے ذریعے مکمل طور پر پاکستان میں ضم ہو گیا۔ اُس وقت تک سابق نواب نے ایک فعال فلاحی ریاست، اپنی منظّم فوج، خزانے سے ملنے والی وسیع مالی معاونت، زرعی خوشحالی اور صنعتی ترقی کے واضح امکانات کے ساتھ ایک مکمل ریاست پاکستان کے سپرد کر دی تھی۔ اس سب کے علاوہ، وہ اپنی زمینیں، محلات، قلعے، جائیدادیں، دستاویزات اور طویل تاریخی ورثہ اُس ریاست کے حوالے کر رہے تھے جو اس عظیم قومی ورثے کی حفاظت کے لیے نہ تو تیار تھی اور نہ ہی پرواہ کرتی تھی۔ یہ سب نواب صادق محمد خان کے خاندان کی اندرونی لڑائیوں کی بھینٹ چڑھ گیا — یہی اُن کی بدترین میراث تھی۔

تسلیم یا قربانی؟ 1955 تک ان کے اختیارات جو 1947 کے بعد سے ہی محدود ہو چکے تھے بالآخر مکمل طور پر ختم ہو گئے۔ صادق محمد خان نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ انگلستان میں گزارا۔ شاید وہ سب کچھ بھول جانا چاہتے تھے لیکن ان کا بیٹا اور جانشین امیر محمد عباس خان عباسی اپنے ورثے کی قیمت بھگتتا رہا۔ پہلے ذوالفقار علی بھٹو کی سوشلسٹ پالیسیوں کے نیچے اور پھر ضیاء الحق کی اسلامائزیشن کے دباؤ تلے۔ عباس خان کی بہو اور صلاح الدین کی بیوی، منیبہ کہتی ہیں کہ وہ نہایت نرم دل اور شریف انسان تھے۔ اُن کی جلد موت، جو موروثی ذیابیطس کی وجہ سے ہوئی شاید گھریلو جھگڑوں اور سیاسی دباؤ کی شدت سے اور تیز ہو گئی۔ ملک کے حکمرانوں میں سے ہر ایک نے پاکستان کے خواب کو اپنی صورت میں ڈھالنے کی کوشش کی اور اان کے خاندان نے خود کو اندر سے ناکارہ کر دیا۔

ان کا بڑا بیٹا، صلاح الدین، ایک پُرعزم مجاہد ثابت ہوا۔ ہمیشہ سے وہ مضبوط انسان رہا جس کی اسے ضرورت تھی کیوں کہ اپنی پوری بلوغت کی زندگی میں وہ اس جدوجہد میں مصروف رہا کہ بہاول پور کے ماضی کا جو کچھ بچا ہے اُسے بچایا جائے یا بحال کیا جائے۔ جو کچھ حکومت یا فوج نے حالیہ دہائیوں میں چھین لیا، اسے واپس لیا جائے اور وہ صوبائی حیثیت حاصل کی جائے جو آزادی کے وقت ریاست کو وعدے کے تحت دی گئی تھی جب بہاول پور نے سب کچھ بغیر کسی شرط کے پاکستان کو دے دیا تھا تاکہ جناح کے خواب کو حقیقت بنایا جا سکے۔ صلاح الدین کی یہ جدوجہد کہ بہاول پور کو اُس خواب کا حصہ دلایا جا سکے، اُس کی زندگی میں اتنی ہی مرکزی رہی ہے جتنی اُس کی بیوی اور اولاد۔ برٹش لائبریری میں موجود انڈیا آفس ریکارڈز کے وسیع ذخیرے نے بہاول پور کے چند شہزادوں کی زندگیوں کی تفصیلات فراہم کی ہیں لیکن یہ سب برطانوی نقطہ نظر سے درج کی گئی ہیں۔ انیسویں صدی کے قدیم ریکارڈز جو گمنام کاتبوں کے مدھم ہوتے، گھومتے ہوئے خط میں درج تھے، اب آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو رہے ہیں لیکن پھر بھی اتنا کچھ باقی ہے کہ بہاول پور کے نسبتاً حالیہ ماضی اور اس کے حکمران نوابوں کی ایک جزوی تصویر، اُس اعلیٰ حکومتی نقطہ نظر سے سامنے آ سکے۔ برطانوی راج کے خادمین کو کبھی محض خوب صورت، گھنگریالے بالوں والے نوجوان شہزادوں کی کشش جو قیمتی کڑھائی والے لباس اور ہیروں کے تاج پہنے ہوتے، آسانی سے متاثر نہ کر سکی خاص طور پر جب اُن کے مالی

حسابات خسارے میں ہوتے یا اُن کا طرزِ عمل نا قابلِ قبول ہوتا۔ بعض اوقات، کسی قریب کے مشیر یا نگران کا ہمدردانہ رویہ ایک نوجوان شہزادے کے حق میں سخت گیر اصولوں پر غالب آ جاتا۔ وہ ریکارڈز اور وقتاً فوقتاً شائع ہونے والی کتابیں جیسے کہ سر پینڈرَل مون کی تقسیمِ ہند کے دوران بہاول پور کے بارے میں عینی شاہد کی حیثیت سے تحریر کردہ روایت اس کے باوجود اکثر طور پر مروجہ خاندانی یادداشت سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ صلاح الدین عباسی کی زندگی اور ان کے ملک کے قیام کے دوران، ایک نئی ریاست کو معاصر ترقی اور اسلامی ریاست کے مثالی تصور سے ہم آہنگ نئی تاریخ دینے کا جو عزم تھا اُس نے ماضی کو یا تو بھلا دیا یا جان بوجھ کر نظرانداز کر دیا۔ عدم توجہی، دلچسپی کا فقدان اور بعض اوقات دانستہ تباہی نے سب کچھ ضائع کر دیا۔ دستاویزات اور ریکارڈز یا تو جلا دیے گئے یا پانی، کیڑے مکوڑوں یا آگ کی نذر ہو گئے۔ تاریخی محلات، عمارتوں اور قومی یادگاروں کی کھلم کھلا تباہی نے ہماری مادی وراثت کا بیشتر حصہ مٹا دیا ہے۔ قدیم فنونِ لطیفہ اور ہنرمندی کی کوئی قدر باقی نہیں رہی۔ لاہور میں شہنشاہ جہانگیر کے مقبرے کی مرمت پر مامور 200 ماہر پتھر تراش کاریگروں کی ٹیم اب بارہ سال میں سمٹ کر آٹھ کم اجرت پانے والے ناراض افراد پر آ گئی ہے۔ اب اُن میں سے اکثر اپنے بیٹوں کو یہی مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے موروثی فن کو چھوڑ کر سڑکوں اور نئی رہائشی اسکیموں کی تعمیر میں لگ جائیں۔ یقیناً یہ بھی ضروری ہیں مگر پاکستان کی تاریخ کی قیمت پر نہیں۔

صلاح الدین کے لیے موت یا خاندانی تنازعات کی صورت میں بھی کئی محرومیاں سامنے آئیں یا پھر ریاست اور ملک کی خدمت کی شدید ضرورت کے تحت، اُن کا یہ ذاتی فیصلہ کہ وہ قائم شدہ سیاسی گروہوں سے آزاد رہیں اور اردگرد کی چیخ و پکار اور تکلیف میں خاموشی اختیار کیے رکھیں۔ لندن کے یونیورسٹی کے دنوں کے دوست کب کے دور ہو چکے؛ پاکستان میں پرانے دوست اب اپنی وفاداریوں میں الجھے ہوئے ہیں اور مجبوراً اپنا راستہ خود تلاش کرتے ہیں۔ پاکستان کی معیشت، سیاست اور خاندانی رشتوں کی بھول بھلیوں سے گزر کر اور کئی ایسے بھی ہیں جنھوں نے یہ غیر مساوی جدوجہد ترک کر کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے پاکستانی تارکینِ وطن کے بیچ اپنی جگہ بنالی ور اکثر خاصی کامیابی کے ساتھ۔ بہاول پور میں جو خاندان ایک صدی قبل پھیلا ہوا تھا، اب چند پھوپھیوں،

چچاؤں اور آپس میں جھگڑتے قریبی یا دور کے رشتہ داروں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، سبھی بہاول پور کی بکھری ہوئی جاگیر کا کوئی نہ کوئی حصہ اپنا حق سمجھتے ہیں۔

اِدھر صلاح الدین آج بھی ماضی کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے میں مصروف ہے۔ کبھی کسی پرانی پینٹنگ کی مرمت کر رہا ہوتا ہے، کبھی اسلام آباد میں کسی منہدم خاندانی گھر سے بچائی گئی لکڑی سے مسجد کا سقف تیار کر رہا ہوتا ہے۔ وہ گھر جس میں وہ بچپن میں کراچی میں رہا کرتا تھا وہ اکثر کہتا ہے کہ اگر حالات مختلف ہوتے تو شاید وہ بڑھئی ہوتا۔ اُس کا بیٹا بہاول، جو لندن کی یونیورسٹی سے واپس آیا ہے، اب اپنی الگ سی سوچ کے ساتھ سیاحتی وراثت، درخت لگانے اور بہاول پور کے کھنڈرات میں نئے باغات کی تعمیر میں مصروف ہے اور امید رکھتا ہے کہ ایک دن بیرونی مدد کے ساتھ، ماضی کی تصویر کو محلوں کے عجائب گھروں میں اور سب سے بڑھ کر قلعہ دراوڑ کی فصیلوں کے اندر دوبارہ زندہ کیا جا سکے گا۔

کون جانتا ہے کہ کیا ممکن ہے؟ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں حکومتیں بددیانت ہوتی ہیں، وعدے ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں، اور نقصان ہی نقصان ہوتا ہے — ایسا ملک جہاں مایوسی اور غربت کے خلا کو پُر کرنے کے لیے توہمات اور مذہب کی شدت آ گھستی ہے۔ طاقتور افراد ایک نہ ختم ہونے والا پرانا شاہی رقص (پوان) کرتے ہیں، وقت کی مجبوریوں کے مطابق اپنے ساتھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس رقص کے قدم جو خاندانی تعلقات اور سرپرستی کے پہچانے گئے سانچوں پر قائم ہیں، کبھی نہیں بدلتے۔ کبھی کبھار کچھ اور بھی جھلک دیتا ہے شاید یہ ماضی کی ریاستی عظمت کی کسی بے وقت یاد کی بازگشت ہو یا پھر کسی دیانت دار، اصولوں پر قائم شخص کے لیے ایک نایاب سا احترام، جو اپنے وطن کے لیے نیک نیتی سے کچھ کرنے کی کوشش کرتا رہا ہو۔

اسلام آباد کے وسط میں ایک سیکیورٹی چیک پوسٹ پر تعینات ایک پولیس اہلکار نے صلاح الدین عباسی کی گاڑی کو روکا جس پر مخصوص سفارتی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی سے جھک کر بولا: ''نواب صاحب ہیں؟'' نہیں، کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ نہیں، اُسے کوئی دنیوی چیز نہیں چاہیے تھی۔ وہ بہاول پوری بھی نہیں تھا مگر صلاح الدین کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ اُس نے کہا کہ گاڑی روکنے پر معذرت خواہ ہے، بس اتنی خواہش تھی کہ نواب صاحب سے مصافحہ کر سکے۔

(3)

جدیدیت کے جال(Trappings of Modernity)

اگر پاکستان نے ایک مختلف راستہ اختیار کیا ہوتا؛ اگر بہاول پور محمد علی جناح کے وعدے کے مطابق ایک صوبہ بن گیا ہوتا؛ اگر ذوالفقار علی بھٹو نے سابق حکمرانوں یا اُن افراد کو ختم کرنے کا تہیہ نہ کیا ہوتا جنھیں روایتی وفاداریاں حاصل تھیں اور اس طرح سوشلسٹ اصولوں کی آڑ میں سب کو محکوم نہ بنا دیا ہوتا؛ اگر فوج اتنی طاقتور نہ ہوتی؛ اگر پاکستان نے اندرونی سکڑاؤ کے بجائے بیرونی وسعت کی راہ لی ہوتی؛ اگر کرپشن کم ہوتی اور حقیقی اسلامی ریاست کے ناممکن خواب سے چمٹے رہنے کا رجحان کم ہوتا؛ اگر خوف اور دہشت کم ہوتے، ماضی کا حد سے زیادہ جشن منانے کا رجحان کم ہوتا، تاریخ کو محفوظ کرنے اور سمجھنے کی زیادہ آرزو ہوتی اور دوسروں کے ساتھ اس کا تبادلہ کرنے کی خواہش پیدا ہوتی تو بہاول پور آج دنیا کے اہم ترین سیاحتی مقامات میں شمار ہوتا۔ یہ لاہور اور ملتان کے ساتھ ایک اور ' گولڈن ٹرائی اینگل' کا حصہ ہوتا، جیسے دہلی، آگرہ اور جے پور بھارت میں ہیں — ایک ایسا سیاحتی سلسلہ جس میں موہنجوداڑو، ہڑپہ، ٹیکسلا اور وادی سندھ کی قدیم تہذیب کے آثار شامل ہوتے۔ پھر شاید شمال کی طرف سفر جاری رہتا: حسین وادی سوات، گلگت اور ہنزہ، جن کے نام طویل عرصے سے انگریزوں کے کانوں میں گونجتے رہے ہیں یا پھر وہ راستہ جو افغانستان کی جانب جانے والے ''ہپی ٹریل''('HippieTrail') کے نام سے مشہور ہوا۔ 1960 اور 1970 کی دہائیوں میں مغرب کی بیزار نسل کے ذریعے منشیات جیسے چرس، بھنگ، اور ایل ایس ڈی کے آزادانہ استعمال اور روحانی، فطری اور آزاد زندگی کی طرف مائل ہونے کی خواہش پر مشتمل "ہپی کلچر'' وجود میں آیا اور انھوں نے جنوبی ایشیا کا رخ کیا۔ اس متبادل دنیا میں سیاح کے پاس دیگر انتخاب ہوتے، کراچی کے ساحلی ریستوران، سندھ کے مزارات یا شاندار چولستان، اس کے عظیم قلعے، جنھیں 'ورثہ ہوٹلوں' میں بدلا جاتا اور خانہ بدوش قبائل کی رنگا رنگ روایات و موسیقی۔ اس سے قبل کہ حکومتوں کی سرپرستی میں عرب

شہزادے اُن قبائلی لوگوں کا آخری بچا کھچا وجود بھی شکار کر جاتے، یہ صحرائی زمینیں اپنے پرندوں اور جانوروں سے بھری ہوتیں، اگر حالات مختلف ہوتے۔

یہ بمشکل ڈیڑھ صدی پہلے کی بات ہے کہ نواب صادق خان چہارم نے قدیم ورثے میں اضافے کے لیے ایک پُر اثر تعمیری منصوبہ شروع کیا۔ انھوں نے بہاول پور کو جدید شہر میں تبدیل کیا جسے غیر معمولی طرزِ تعمیر اور شاندار عوامی عمارات سے آراستہ کیا گیا تا کہ ایک نوجوان، پُر وقار، امیر اور مہذب حکمران کی شان ظاہر ہو۔ نئے شہر آباد کیے گئے، صنعتیں قائم ہوئیں، قدیم عمارات کی تجدید و تزئین کی گئی؛ برطانوی ایجنسی اور میجر منچن کی کوششیں ریاستی نظام کے قیام میں شامل ہوئیں اور ساتھ ہی ایک پر جوش اور تصویری شواہد کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ خود پسند حکمران نے بہاول پور کو اس کے ہم عصروں میں ممتاز مقام دلانے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ دو انتہاؤں پر چلنے کی یہ روش اس کی زندگی کو جلد ختم کر گئی اور اگر چہ اس کی ذاتی زندگی ہموار نہ تھی پھر بھی یہ اس کے کارناموں یا جدیدیت کی خواہش کو کم نہیں کرتی۔ اس مشعل کو اس کے پوتے، صادق محمد خان پنجم نے سنبھالا اور بہاول پور ریاست کے خاتمے اور اس کے ہیرے جڑے تاج والے شہزادوں کے قصے تاریخ میں داخل ہو گئے۔

انیسویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کے اوائل تک، برصغیر کی نیم خود مختار ریاستیں جن میں بہاول پور، حیدرآباد، بیکانیر اور دیگر شامل تھیں برطانوی حکمرانی کے ایک ایسے تصوراتی حصار میں سانس لے رہی تھیں جسے مؤرخین ''برطانوی امن کا جلوہ''(Aura of BritannicaPax) کہتے ہیں۔ یہ دراصل برطانوی سلطنت کے بنائے گئے ایک سیاسی، تہذیبی اور اخلاقی رعب کا نام تھا جس کے تحت مقامی حکمران خود کو امن، استحکام اور بین الاقوامی تحفظ کے حصار میں محفوظ تصور کرتے تھے۔ اس "رعب" کا اثر اتنا گہرا تھا کہ متعدد نواب، مہاراجے اور رئیس اپنی داخلی خود مختاری کی محدودیت کے باوجود سلطنتِ برطانیہ کے مہذبانہ نظام کے خیر خواہ اور تابعدار نظر آتے تھے۔ درحقیقت، یہی "aura" ان ریاستوں کی سیاسی غفلت اور مرکزِ اقتدار سے ان کی دوری کا باعث بنی جس نے بالآخر آزادی کے بعد ان کی حیثیت کو زوال پذیر کر دیا۔ اگر "پیکس برٹینیکا" کا تاثر چھوٹے مگر مہنگے مقامی مسائل تک نہ پہنچتا جنھیں اکثر برطانوی نوآبادیاتی افسر شاہی کے تکبر نے اور بڑھا دیا تو

انیسویں صدی کے آخری تیس سالوں میں نوابی ریاستوں کے درمیان باہمی جنگوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اگرچہ ہندوستانی قوم پرستی 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے اجلاس کے بعد ابھرنے لگی تھی تب بھی بنگالی نشاۃ ثانیہ کی فضا میں سانس لینے کی گنجائش باقی تھی اور حکمرانوں نے جنگ کی کامیابی کے بجائے دولت و وقار سے شاہی وقار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نئی شاہانہ جھلکیاں خاندانی اور درباری جھگڑوں، حسد اور بگڑے ہوئے شہزادوں کی خود تباہ کن حرکات کے خلاف کوئی ضمانت نہ تھیں لیکن ان کے محلات، یادگاریں اور خزانے اس دور میں وسعت اور خوب صورتی اختیار کر گئے اور اب جدید سیاحت کا مرکز بن چکے ہیں۔ وہ شاہی ہند کی رنگینی اور جاہ وجلال کی علامت بن چکے ہیں۔

کچھ نواب تو 1887ء میں ہی، جب ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی تھی، یورپ کے سفر پر جانا شروع ہو چکے تھے لیکن ہندوستان کا بلاشبہ حسن وزیبائش سے بھرپور تصور اس موقع پر مکمل طور پر حقیقت بن کر سامنے آیا جب بے شمار "چمکتے دمکتے شہزادے" لندن پہنچے۔ اس موقع پر اثرات کا دروازہ مزید کھلا — صادق محمد خان چہارم جیسے نوابوں نے اپنے بیٹوں کو برطانوی پبلک اسکول کے طرز پر تعلیم دینے کا آغاز کیا۔ برطانوی استادوں کی خدمات ریاستی درباروں میں معمول بن گئیں۔ The Spectator کے 1887ء کے ایک مضمون میں کہا گیا کہ: ''یہ انگریزوں کی عمومی رائے ہے کہ سفر کو عادت بنانا ہندوستانی شہزادوں کے لیے بہت مفید ہے۔'' لیکن مضمون یہ بھی کہتا ہے کہ شہزادے اکثر اتنے متاثر نہیں ہوتے جتنا انگریز سمجھتے ہیں اور ''یورپیوں سے میل جول ہمیشہ ان کے لیے پسندیدگی کا باعث نہیں بنتا۔" شہزادوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا لیکن مختلف ثقافتوں کا سامنا کرنے سے ان کے ذوق کو وسعت ملی اور انھوں نے یا ان کے نمائندوں نے اگلے پچاس برسوں میں یورپی فنون اور اشیائے تعیش کے ماہرین سے بہت کچھ خریدا، چاندنی جھاڑ (Chandliers)، موٹر کاریں، قیمتی آرٹ پیس، سب کچھ ان کے محلات اور ذخائر میں شامل ہوا۔

صادق محمد خان کا تعمیراتی منصوبہ، شاید جدیدیت کے داعی میجر منچن اور ان کے ساتھیوں کے زیر اثر، ان کے کئی ہمسایہ حکمرانوں سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ بیکانیر میں لال گڑھ پیلس کی تعمیر، جوانڈو-اسلامک طرز تعمیر کا ایک شاہکار ہے، 1896ء میں شروع ہوئی؛ اسی طرز کے دیگر محلات

جیسے لکشمی ولاس پیلس (برودا)، میسور اور کپورتھلہ بعد میں بنے۔ اندور میں مانک باغ اور جودھپور کا امید بھون جیسے آرٹ (ڈیکو شاہکار) جدیدیت، نفاست، جیومیٹری، چمکدار رنگوں، قیمتی مواد اور ہموار لکیروں پر زور دینے والا طرز تعمیر تو بعد کی بات ہے۔ کچھ شہزادے، جیسے مہاراجہ جیاجی راؤ سندھیا نے برطانوی مسلط کردہ اس طرزِ تعمیر کو مسترد کر کے یورپی طرز کا ملا جلا اسلوب اپنایا جیسے جے ولاس پیلس گوالیار جو 1875ء میں مکمل ہوا۔

بہاول پور میں نور محل بھی اسی سال مکمل ہوا۔ ایک یورپی اطالوی طرز کا محل جو ریاست کے انجینئر مسٹر ہینن نے منفرد تخیل کے ساتھ ڈیزائن کیا۔ یہ محل نواب اور ان کی پسندیدہ بیوی کے لیے مرکزی رہائش گاہ بننے والا تھا لیکن نہ آرکیٹیکٹ اور نہ نواب نے اس کے پہلو میں واقع ملوک شاہ کے قبرستان کو محسوس کیا۔ بیوی نے، جب کھڑکی سے اس منحوس نظارے کو دیکھا تو مزید ایک رات بھی وہاں گزارنے سے انکار کر دیا اور یوں یہ محل سرکاری مہمان خانہ اور تقریبات کے مقام میں تبدیل ہو گیا۔

بہاول گڑھ محل (1876)، دولت خانہ (1886) ء (خوب صورت باغ اور 400 فٹ کا تالاب اور صادق محمد خاں کے بیٹے کے عہد میں گلزار محل (1902) کے آثار اب تقریباً منظر سے معدوم ہو چکے ہیں۔ دولت خانہ کے گرد اصل بلند دیواریں اب فوجی احکامات کے تحت مزید بلند کر دی گئی ہیں اور داخلہ صرف فوجی اہلکاروں کے لیے مخصوص ہے۔ صرف صادق گڑھ محل نسبتاً نمایاں حالت میں موجود ہے جسے جارج برڈ ووڈ نے افسوسناک انداز میں "بدترین کلاسیکی طرزِ تعمیر" قرار دیا۔ اسے ایک نامعلوم اطالوی آرکیٹیکٹ نے ڈیزائن کیا اور تعمیر کے دوران نواب کی تصویر بھی کھینچی گئی۔ یہ محل ڈیرہ نواب صاحب کے قریب احمد پور میں نور محل کی جگہ تعمیر ہوا۔ یہ 1896ء میں مکمل ہوا۔ چنیوٹ کے روایتی کاریگروں نے اس میں نقاشی کی اور پیرس کے "کرسٹوفل" ادارے نے بارہ میٹر اونچا فوارہ، بڑے آئینے اور چاندی کا تخت فراہم کیا۔ اب یہ محل تقریباً کھنڈر بن چکا ہے اور محض نام کی حد تک نواب صلاح الدین عباسی کی نجی ملکیت میں باقی ہے۔ ان کی تمام کوششیں بھی اس محل اور اس کے نوادرات کو لٹیروں اور چوروں سے بچانے میں کامیاب نہ ہو سکیں جو اب باغ کے کناروں تک پہنچ چکا ہے اور نہ ہی ان جھگڑوں سے جو فوج، حکومت اور باہمی جھگڑالو رشتہ داروں کے درمیان چل رہے ہیں۔

آر ڈی میکینزی کے مطابق، جو ایک مشرقی نواب کی پر کشش، رنگین منظر کشی 1899ء میں امریکی رسالہ سنچری میگزین کے لیے لکھ رہے تھے، محمد صادق خان چہارم کو بڑے شاہانہ محلات کی بجائے ایک چھوٹے "محل" میں رہنا زیادہ پسند تھا، ایسا محل جو چوکور، پست قامت اور ہموار چھت والا تھا، جو باغیچے میں واقع کئی ایسی عمارات میں سے ایک تھا جو اب شکست و ریخت کا شکار ہیں۔ میکینزی کا سانس روک دینے والا انداز بیان اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ہندوستانی حکمرانوں کی زندگیوں نے یورپ میں کتنی دلچسپی پیدا کی، خاص طور پر جب ان کی شہرت غیر ممالک میں بڑھنے لگی اور جب 1869ء میں نہر سویز کے کھلنے کے بعد ہندوستان تک رسائی آسان اور فیشن کا حصہ بن گئی۔ یہ مضمون قارئین کے تخیل کو جھنجھوڑ دیتا ہے: شکار، ناچ، سور کے شکار کی کہانیاں، سونے سے بھری جیبیں، جواہرات جڑی تلواریں اور مشہور ہیرے کا تاج۔ یہ سب کچھ اُس نواب کی غیر معمولی توانائی کا پتہ بھی دیتا ہے۔ اگرچہ وہ توانائی شراب نوشی اور منشیات کی علت سے زائل ہو چکی تھی جو غالباً ان کی وقت سے پہلے موت کا اصل سبب بنی۔ میکینزی صادق گڑھ محل کی منظر کشی کے آغاز ہی پر ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں:

"یہ محل ان حیران کن تضادات میں سے ایک ہے جو یورپی سیاحوں کو کبھی کبھار مقامی ریاستوں میں چونکا دیتے ہیں۔ یہ فرانسیسی باروک اور کلاسیکی طرز تعمیر کا حامل پالے دولکسمبرگ (Palai du Luxembourg) لگتا ہے۔ پاکستان میں لاہور ہائی کورٹ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور اور موہن جودڑو میوزیم جیسی عمارات میں بھی نوآبادیاتی دور کی کلاسیکی اور باروک طرزِ تعمیر کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ صحرائی گرد اور دھوپ اتنی شدید ہے کہ ایسا لگتا ہے جیسے آنکھیں اور دماغ دھوکہ دے رہے ہوں۔" لیکن اسی وقت یہ فریب اتنا بھی شدید نہ تھا کہ وہ اس بات پر غور نہ کر سکے کہ "وہ کاسٹ آئرن کے فوارے جو کبھی نہیں چلتے اور جب آپ اُس خشک اور کٹی پھٹی صحرائی ریت کو دیکھتے ہیں جس پر آپ کھڑے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ آخر کسی نے کبھی یہ سوچا بھی کیسے کہ وہ فوارے چلیں گے! محل کے اندرونی حصے کا رنگ و آہنگ بھی میکینزی کے ذوق سے میل نہیں کھاتا تھا: گلابی اور زرد دیواریں، ساتھ میں شوخ سبز پردے؛ "ایک عظیم الشان گوتھک آئینہ، چھوٹے پیمانے پر ویسٹ منسٹر ایبے جیسا اور کم از کم پندرہ ایک ہی طرز کے رنگ برنگے گلدانوں کی نقلیں" جو کٹ کرسٹل یا

سنہری فرنیچر سے مزین تھیں لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہیچ لگتا ہے جب صادق محمد خان کا مشہور نقرئی موسیقی پیدا کرنے والا بستر سامنے آتا ہے۔ اگرچہ میکینزی نے اس پر کچھ خاص روشنی نہیں ڈالی، شاید وہ اسے دیکھ کر چونک گئے ہوں۔ اس بستر کی کئی تصویریں موجود ہیں جو 1882ء میں پیرس کے معروف کاریگر Christofle نے آرڈر پر تیار کیا۔ یہ بستر حیرت انگیز مگر خوفناک شاہکار تھا — چند ایسے نوابوں کے لیے بنایا گیا جنھیں یورپی خواتین کا شوق تھا اور یہی شوق اُن کے پوتے صادق محمد خان پنجم میں بھی تھا جو بعد میں اس بستر کا شکار ہوئے۔ یہ بستر گلابی لکڑی (روزوُڈ) سے بنا ایک بڑا میوزیکل باکس تھا جس پر چاندی کی ملمع کاری تھی اور چاروں کونوں پر انسانی قد کے برونز مجسمے تھے — برہنہ خواتین کے — جن کے بال مختلف رنگوں میں تھے اور ہر ایک کے ہاتھ میں شتر مرغ کے پر یا گھوڑے کی دُم کا پنکھا تھا جو سوتے ہوئے نواب کو جھلتے تھے اور آنکھ مارتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بستر فرانسیسی موسیقار Gounod کے مشہور اوپیرا Faust کی دھن بجاتا تھا اور اس کا منظر گویا کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہ تھا۔ محل میں ایک فوارہ بھی تھا جو لندن کے W.T Allen & Thames Co of Upper نے تیار کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے تحفے میں دیا گیا تھا اگرچہ اس کی صداقت پر شک ہے۔ (مکینزی کا مکمل مضمون اور پلنگ پر لکھی گئی تحریر کے اردو تراجم اس کتاب میں شامل ہیں۔ مترجم) ایک اور دلچسپ افواہ آج بھی انٹرنیٹ پر گردش کر رہی ہے جسے صلاح الدین عباسی کے خاندان والے دل لگی سے دیکھتے ہیں کہ دراوڑ کے ایک سنگ مرمر کے مقبرے میں ملکہ معظّمہ کی کسی بیٹی کی باقیات دفن ہیں جس کی شادی کبھی نواب سے ہوئی تھی۔ شاید یہ الجھن اس ایک وکٹوریہ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو جو صادق محمد خان پنجم کی سب سے محبوب انگریز بیوی تھی اور جس کے لیے نواب نے صادق گڑھ کے باہر "مبارک منزل" تعمیر کروائی جہاں آج بھی ان کے پوتے قیام کرتے ہیں۔ یہی فوارہ پہلے صادق گڑھ کے سامنے نصب تھا جسے صادق محمد خان پنجم نے بعد میں بہاول پور شہر میں منتقل کروایا۔ یہ آج بھی موجود ہے، البتہ اب ان نیم برہنہ دیویوں (nymphs) کے بغیر جن سے یہ اصل میں آراستہ تھا۔ یہ سب کچھ ملکہ وکٹوریہ کے ذوق سے خاصا بعید معلوم ہوتا ہے۔

صادق محمد خان چہارم کی بے شمار تصاویر بھی موجود ہیں جو جتنا اُن کی شاندار پوشاکوں کا

مظہر ہیں اتنا ہی اُن کی شخصیت کا۔ ان کے بیش قیمت جبے اور کوٹ جن پر خالص سونے کی کڑھائی تھی اور اندر سے باریک ریشمی کپڑے کی تہوں سے آراستہ تھے، آج بھی موجود ہیں، میٹر کے میٹر، جو خالص سونے کی تاروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ میکینزی نے نواب کا حلیہ یوں بیان کیا ": وہ تقریباً چھتیس برس کے، چھ فٹ لمبے اور متناسب جسم والے تھے۔ چہرہ پرکشش، گھنے سیاہ بال، قرینے تراشی ہوئی داڑھی اور بڑی بڑی گھنگھریالی مونچھیں جو انگوٹھی کی مانند جھکی ہوئی تھیں۔ وہ بہت حساس تھے، ان کی قوتِ ارادی بہت مضبوط تھی، جسمانی لحاظ سے فولادی اور مزاجاً حد درجہ شکی اور حسد کا شکار، جو کہ ان کے منصب کی فطری پیداوار ہے۔ ان کی کل گھڑیوں کی تعداد سترہ سو بتائی گئی جن میں سے وہ بیک وقت دو یا تین پہنتے تھے۔ سنچری میگزین نے اُن کی ایک تصویر بھی شائع کی جس میں وہ ہیرے کے تاج کے ساتھ دکھائے گئے تھے، تاج کے کناروں پر بڑے موتیوں کی جھالر تھی۔ لگتا ہے میکینزی کو ان کے زیورات میں سب سے عمدہ دکھائے گئے جن میں پندرہ غیر تراشے ہوئے سرخ یاقوت بھی شامل تھے، ہر ایک کا قطر ڈیڑھ انچ سے زیادہ اور اُن پر مغلیہ شہنشاہوں کے نام کندہ تھے۔

میکینزی لکھتے ہیں ": یہ بالکل فطری بات ہے کہ کوئی بھی جوان شہزادہ، جب اتنی دولت اس کے ہاتھ لگے، تو اُسے خرچ کرنے کی خواہش پیدا نہ ہو۔ "ان کی "سالانہ آمدنی تقریباً پندرہ لاکھ روپے " تھی۔ وہ ایک " مکمل خودمختار بادشاہ " تھے، اور "اگر اُن کا دل چاہے " تو ہفتہ وار دربار منعقد کرتے تھے جہاں ہر طبقے کا آدمی آ کر اپنی عرضی پیش کر سکتا تھا۔ ان کے محافظ 400 گھڑسوار بلوچ تھے، "وحشی، میلے کچیلے مگر نہایت دلکش اور لاپرواہ سوار جو میں نے کبھی دیکھے۔ "

ان کے پاس 2000 گھریلو ملازم، 300 شکاری، 150 انگریز اور عرب نسل کے گھوڑے اور دو دریائی جہاز (steamers) ہمیشہ دریائے ستلج پر تیار رہتے۔ دیگر ہندوستانی شہزادوں کی طرح، انھوں نے بھی اپنا شیر مارا تھا اور جیسا کہ دستور تھا، ایک انگریز استاد سے تعلیم حاصل کی اور بہترین انگریزی بولتے تھے۔ صرف اُن خواتین کے نام محفوظ ہیں جنھوں نے یا تو نواب صادق محمد خان چہارم یا پنجم کو طلاق دی یا جنھیں طلاق دی گئی اور جو اپنے ساتھ نواب کے برتاؤ یا زیادہ تر مالی تصفیے سے اس قدر ناراض ہوئیں کہ انھوں نے برطانوی حکام سے شکایت کی۔ ایسے تمام شواہد انڈیا آفس ریکارڈز

میں ملتے ہیں۔

عام طور پر، رہائشی افسران، گورنروں، پرائیویٹ سیکرٹریوں اور کبھی کبھار وائسرائے کے مابین ان خواتین کے حوالے سے ہونے والی خط و کتابت ایک جھنجھلاہٹ اور مایوسی کا اظہار کرتی ہے جس میں اکثر یہ احساس پایا جاتا ہے کہ دولت مند شہزادے کو حاصل کرنے کی خواہش لے کر آنے والی عورتیں شاید وہ نہیں تھیں جو انھیں ہونا چاہیے تھا۔ جیسا کہ اسی شہزادے کی انگریز آیا نے بھی اسی قسم کا اظہار کیا۔ ہندوستانی بیویوں کا ذکر تو بہت کم دستاویزات میں آتا ہے، سوائے ان صورتوں کے جہاں شادی فریقین کے لیے خاص طور پر فائدہ مند ہو۔ ایسے میں صرف خاندان یا دلہن کا نام تحریر کیا گیا یا اگر بیوہ بیگم اپنے کم عمر بیٹے کے لیے بطور قائم مقام ریاست سنبھالتی تو اس کا تذکرہ ہوتا۔ عباسی خاندان کی بیٹیاں شاذ و نادر ہی دیگر خاندانوں میں شادی کے لیے دی جاتیں اور ساری زندگی والد، بھائیوں یا چچاؤں کے زنان خانے میں ہی گزارتیں۔

دیگر کئی خواتین کی طرح، صادق محمد خان کی کم عمر انگریز بیوی کا نام بھی وقت کے ساتھ محو ہو چکا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ دراوڑ میں کہیں دفن ہو لیکن اس کا مقام، وقت اور سبب سب کچھ فراموش ہو چکا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ نواب کو اس کی موت نے اس قدر غمزدہ کر دیا تھا کہ انھوں نے بہاول پور کے مشہور صوفی شاعر، خواجہ غلام فرید (1845–1901) سے التجا کی جن سے ان کا تعلق گہرا تھا۔ خواجہ غلام فرید کو برطانوی حکومت سے سخت نفرت تھی لیکن ریاست بہاول پور کے لیے ان کی خدمات، چاہے دور سے ہی سہی، ایک طرح سے افسانوی حیثیت رکھتی ہیں جیسا کہ صلاح الدین عباسی نے ایک واقعہ میں بیان کیا۔ وہ واقعہ کچھ یوں ہے: برطانیہ نے نوجوان نواب کے قرضوں کی ادائیگی کے بدلے، ریاست کا چوتھائی حصہ رحیم یار خان کا ضلع حاصل کرنے کی پیشکش کی۔ نواب نے، غالباً اپنی کسی انگریز بیوی کے زیرِ اثر، اس معاہدے پر دستخط کر دیے۔ جب دربار کے ایک افسر نے 150 میل کا فاصلہ طے کر کے خواجہ غلام فرید کو یہ بات بتائی، تو اُنہوں نے فوراً جواب دیا: "ایک بات سمجھ لو: صادق محمد خان نے تو ریاست لکھ دی ہے مگر غلام فرید نے نہیں۔" جب قاصد محل واپس آیا، تو ایک ہنگامہ مچ گیا۔ وہ دستاویزات غائب ہو چکیں تھیں اور کبھی دوبارہ نہیں ملیں۔ بعد ازاں خواجہ غلام فرید

خود صادق گڑھ محل پہنچے اور نواب کی غیر ذمہ داری پر اسے تنبیہ کی۔ بدقسمتی سے، برطانوی حکومت نے اس واقعے پر کوئی ردِعمل محفوظ نہیں رکھا۔ جب نواب کی بیوی کا انتقال ہوا تو اُس نے خواجہ فرید سے التجا کی کہ وہ اس کی بیوی کو ایک بار پھر زندہ کر دیں تا کہ وہ اسے آخری بار دیکھ سکے۔ خواجہ غلام فرید نے اس شرط پر اجازت دی کہ نواب نہ تو اس سے بات کرے گا اور نہ ہی اسے چھوئے گا۔ روایت ہے کہ جب وہ عورت ظاہر ہوئی، نواب اُسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ ضبط نہ کر سکا اور ہاتھ بڑھا کر اُسے چھو لیا۔ اس لمحے وہ منظر غائب ہو گیا اور نواب کو احساس ہوا کہ وہ صرف خواجہ غلام فرید کا ہاتھ تھامے کھڑا ہے۔
نواب، شاید برطانوی حکام کی طرح، 1890ء کی دہائی میں ایک اور انگریز خاتون جو اپنے آپ کو ”سارہ، بیگمِ بہاول پور“ کہتی تھی، کی موت پر بھی خوش ہوا ہوگا۔ حکام نے بہت سی رپورٹس اور وقت صرف کیا تا کہ یہ سمجھ سکیں کہ صادق محمد خان اور اُس عورت جسے پہلے "مسز سکنر" کہا جاتا تھا، کے درمیان حقیقت میں تعلق کیا تھا۔ برطانوی حکام نے اس معاملے کو ”ہر لحاظ سے نہایت شرمناک معاملہ“ قرار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ سارہ پہلے میرٹھ کے ایک مشہور اینگلو انڈین، مسٹر سکنر کی بیوی رہی جو جیمز سکنر کی مشہور رجمنٹ سکنر ہارس کے نسل سے تھا۔ اس کے ازدواجی تعلق کا انحصار اس بات پر تھا کہ اُس نے واقعی اپنے شوہر کو طلاق دی تھی یا نہیں وہ بھی اس بنیاد پر کہ وہ اپنے ایک یا دو "مسلمان خادموں" کے ساتھ بدچلنی کی مرتکب ہوئی تھی۔ اگر یہ طلاق قانونی طور پر مان بھی لی جاتی تو معاملہ شادی یا کسی اور مالی معاہدے کے گرد گھومتا: جہیز، رقم، وعدے جو کیے گئے یا توڑے گئے۔ یہ کہانی خاصی " کھلی" ہے کیوں کہ سارہ، چاہے کبھی ”مسز سکنر“ رہی ہو یا نہیں، درحقیقت ایک ایسے شخص " آدم جی" کے ذریعے نواب کے پاس لائی گئی جو اس کے ذوق سے واقف تھا اور شاید اسی مقصد کے لیے نواب کے لیے کام کرتا تھا۔ مارچ 1897ء میں ملتان کے سیشن جج، جان جی ایم رینی نے اس معاملے کا خلاصہ کرتے ہوئے صاف گوئی سے لکھا”: سب سے پہلے تو یہ سمجھنا نادانی ہوگی کہ وہ عورت نواب سے محبت میں بہاول پور آئی تھی، چاہے ادنیٰ درجے کی ہی سہی۔ وہ یہاں وہی لینے آئی تھی جو حاصل کر سکتی تھی اور یہ ماننا زیادہ سختی کی بات نہ ہوگی کہ اُس نے پہلے ہی سے ارادہ کر رکھا تھا کہ نواب سے جو کچھ بنے گا، وہ لے گی۔ رینی نے عورت کی کچھ حد تک رعایت کرتے ہوئے لکھا کہ نواب نے

خود کو ”نیم پاگل پن کی حالت“ میں پہنچا لیا تھا اور وہ کسی بھی لمحاتی خواہش پر قابو پانے والا انسان نہ تھا۔نواب نے ایک عورت کے معاملے میں جب ارادہ کرلیا تو کچھ بھی کرنے کو تیار تھا یہاں تک کہ وہ "محبت بھرے خطوط" بھی خود لکھے جنھیں سارہ نے بطور ثبوت پیش کیا اور کہا کہ نواب نے کہا تھا: "اگر میری خوشی کی بات ہو تو میں تمہیں آدھی ریاست دے دوں گا۔ رینی نے سارہ کے اس دعوے کو بھی جھوٹا قرار دیا کہ اس نے "اسلام قبول کر کے مسیحیت ترک کی"، کیوں کہ سکنر خاندان کی بڑی تعداد پہلے ہی مسلمان تھی اور ان کی عمومی وضع قطع بالکل عام دہلی کے مسلمانوں جیسی تھی۔ بہرحال، سارہ کی طرف سے فراہم کردہ خطوط اور نواب کی جانب سے دیے گئے زیورات اور بارہ ہزار روپے کے تحفے کے ساتھ ایک بیان ریکارڈ پر موجود تھا”: ہم اس تحریر سے ایک دوسرے کو طلاق دے رہے ہیں لہٰذا اب تم مجھ پر کوئی حق نہیں رکھتیں اور نہ ہی میں تم پر۔سارہ اُس وقت ایک مقامی ریاست کے وسط میں، کسی بھی قابل اثر شخصیت سے کوسوں دور اور جسمانی خطرے کی حالت میں تھی۔ جون 1897ء میں، پنجاب کے گورنر کی جانب سے، لوئس ڈین کے ذریعے اس معاملے پر حتمی رائے دی گئی: اگرچہ تمام فریقین کا رویہ شرمناک تھا، لیکن سارہ سکنر نواب سے صرف اسی رقم کی حقدار تھی جو دی گئی۔ (12,000روپے) اور ”اس معاملے میں حکومتی مداخلت کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ یہ فیصلہ بہاول پور دربار کے مہتمم یا چیمبرلین کو بھی بھیجا گیا جس میں گورنر نے افسوس کا اظہار کیا کہ ”اتنا بدنما مقدمہ اُس کے سامنے آیا ہی کیوں۔ ”اگر اکیسویں صدی سے پیچھے دیکھیں، تو یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ خوبرو نواب، لیوپولڈ گرے کے مطابق جدید ہندوستانی اشرافیہ کا نمائندہ، جواہرات سے سجا ہوا، ایک فیشن ایبل نوجوان جو ہر تصویر میں جگمگاتا دکھائی دیتا ہے، اسی کے بارے میں عثمانی دور کی گردشی سازشیں، زہرخورانیاں، قید و بند اور پراسرار اموات کی کہانیاں بھی ملتی ہیں لیکن جب دوبارہ غور کریں، تو شاہانہ اختیارات اور بے لگام خواہشات کا امتزاج، جب تک کہ برطانیہ کو مداخلت نہ کرنی پڑے، ایسے ہی مناظر کو جنم دیتا ہے اور جب ان تمام پرانے واقعات کو برطانوی نوکرشاہی کی خشک زبان میں تحریر کیا جاتا ہے تو وہ "الف لیلہ" کی کسی سرکاری رپورٹ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ سارہ سکنر کے معاملے کے ساتھ ساتھ، لوئس ڈین کی جانب سے بھیجے گئے بے شمار کاغذات ظاہر کرتے ہیں کہ

برطانوی مداخلت بہاول پور کے غیر اطمینان بخش حالات میں کتنی گہری ہو چکی تھی۔ صادق محمد خان کی حد سے بڑھی شراب نوشی اور منشیات کا استعمال جو اُنہیں دو دو تین تین دنوں تک بے ہوشی میں رکھتا تھا، بہاول پور کا وزیر حکومت کی توجہ میں لا چکا تھا۔ شاید یہ کہ اپنی پسندیدہ بیوی کے اثر میں آ کر، نواب اپنے سب سے بڑے زندہ بیٹے، محمد مبارک خان، جو اُس وقت تیرہ یا چودہ برس کا تھا، کو ولی عہد بنانے کے بجائے اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جانشینی کے اس پیچیدہ معاملے میں لیوپولڈ گرے نے اپنی یادداشتوں میں ایک اخلاقی کہانی کی طرح ایک دلچسپ اضافہ کیا کہ نوجوان شہزادوں کی پرورش کس طرح کی جانی چاہیے۔ محمد مبارک خان، نواب کا پہلوٹھا بیٹا نہ تھا۔ 1879ء میں، جب نواب کو ریاست کی باگ ڈور ملی تو اُن کی بیوی نے ایک بیٹے کو جنم دیا اور خوب جشن منایا گیا۔" گرے نے سپاٹ لہجے میں لکھا: "ہمیشہ کی طرح، لڑکے کو بگاڑ دیا گیا؛ ہندوستان میں نواب زادوں کو چاپلوسی اور تابعداری بچپن سے ہی گھیر لیتی ہے۔" جب وہ چار یا پانچ برس کا تھا تو ایک بار وہ اپنے خادم کے ساتھ کھیلتے ہوئے ایک تہوار کے لیے رکھے گئے آتش بازی کے ٹوکرے پر پہنچا اور اسے جلانا چاہا۔ خادم نے منع کیا مگر بچہ جسے کبھی کسی نے روکا نہ تھا، ضد میں اور بڑھ گیا۔ گرے لکھتا ہے: "خادم کون ہوتا ہے کہ شہزادے کی مرضی کی مخالفت کرے؟" لہٰذ، جیسے ہی خادم نے کمزور سی مزاحمت کی، لڑکے نے آتش بازی جلا دی اور دونوں کو اُڑا دیا۔ اس بیوی کے ہاں پھر کبھی کوئی اور بیٹا پیدا نہ ہوا اور گرے نے لکھا": جانشینی میرے دوسرے وارڈ کو مل گئی جو کہ نواب کی نفرت زدہ حریف بیوی کا بیٹا تھا۔" بیچارہ محمد مبارک خان۔ اسے قلعہ دراوڑ میں طویل قید میں رکھا گیا جہاں اسے مناسب تعلیم و تربیت تک رسائی حاصل نہ ہو سکی پھر، برطانوی دباؤ پر، اُسے آزاد کر کے احمد پور کے ایک گھر میں اس کی ماں اور دادی کے ساتھ رکھا گیا۔ ایک اور مبہم داستان، جو سرکاری دستاویزات سے اخذ کی گئی، کے مطابق نواب نے اپنی نئی پسندیدہ بیوی " گاما خاتون بیگم " کو اُس وقت پایا جب وہ خود بہاول پور جیل میں قید تھی۔ روایت ہے کہ یہ جوان عورت، جو ایک مویشی چوری کرنے والے صحرائی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی، نواب کی جیل آمد پر اُس کی طرف دیکھنے کے بجائے قرآن کھول کر بیٹھ گئی۔ نواب اُس کے تقویٰ سے اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت اُس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ نواب کی عورتوں کے ساتھ سابقہ رومانوی یا

نکاحی تعلقات پر نظر ڈالی جائے تو کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اس بیگم کی شخصیت سے بھی اتنا ہی متاثر ہوا جتنا اُس کی دینداری سے۔ بہرکیف وہ عورت بے حد طاقتور ہوگئی۔ اس نے ایک اور بیوی کے تین سالہ بیٹے حاجی خان کو اپنا بیٹا بنالیا اور اپنے بدنام بھائی کی مدد سے کوشش کرنے لگی کہ اس بچے کو ولی عہد نامزد کروایا جائے۔ ان تمام کوششوں کو نواب کی بگڑتی صحت اور دماغی کیفیت نے مزید پیچیدہ بنا دیا۔ فروری اور مارچ 1897ء میں بہاول پور کے وزیر نے برطانوی حکام سے بیک وقت درخواستیں کیں کہ نواب کی نشے کی عادات کا علاج کرنے کے لیے کوئی برطانوی ڈاکٹر بھیجا جائے۔ عباسی خاندان میں پرانی روایت تھی کہ گاما خاتون بیگم نواب کو زہر دے رہی ہے اور وزیر کو اُمید تھی کہ برطانوی ڈاکٹر اس بات کو دریافت کر کے نواب کو بیوی کے تسلط سے نکال لیں گے۔ اُس کے کردار اور سازشوں کے بارے میں مشہور باتوں کے پیش نظر یہ خیال بعید از قیاس نہیں تھا تاہم ڈاکٹروں نے صرف اتنا کہا کہ نواب کی "دماغی اور جسمانی ناتوانی" کی وجہ افیون، شراب، کلورال اور برومائیڈ جیسی دواؤں کا شدید استعمال ہے۔ لاہور میں قیام کے دوران سرد موسم میں نواب کو وہم ہونے لگے کہ اُس کے منہ میں تین یا چار زبانیں ہیں یا گیندیں ہیں یا دھاگے ہیں۔ 11 مارچ کو، سرجن میجر کوٹس نے لوئس ڈین کو اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ نواب پاگل پن کے دہانے پر ہے اور اگر اُس کے طرزِ زندگی میں مکمل تبدیلی نہ کی گئی تو اُسے جلد از جلد نگرانی میں لینا پڑے گا۔ کچھ بہتری اور تمام منشیات (سوائے افیون کے) کی بندش کے بعد برطانوی ڈاکٹروں کی ٹیم نے حالت میں تھوڑی بہتری محسوس کی اور غیر ملکی سفر کی تجویز دی۔ اپریل کے آغاز میں نواب نے خود خط لکھ کر گورنر اور ڈاکٹروں کی کوششوں پر شکریہ ادا کیا۔ نواب نے ولی عہد کے خلاف درخواستوں کا سلسلہ جاری رکھا مگر برطانوی حکومت "پہلوٹھے بیٹے کو جانشین بنانے" کے اصول پر قائم رہی۔ برطانوی حکومت نے اس بات پر بھی زور دیا کہ صاحبزادے کو ایچی سن کالج بھیجا جائے تا کہ اسے بہاول پور میں درپیش ممکنہ خطرات سے دور رکھا جائے۔ اگرچہ یہ بھی رپورٹ ہوا کہ اس کی والدہ اُس کے کھانے کی تیاری اور چکھنے کی نگرانی خود کرتی تھی۔ لوئس ڈین نے تسلیم کیا کہ دراوڑ میں قید کے دوران مبارک خان کی ذہنی نشوونما کے بارے میں اسے تشویش ہے۔ مخالف گروہ کی طرف سے ایسی افواہیں بھی پھیلائی گئیں کہ اس کے دماغ پر سنجیدہ اثرات پڑے ہیں

چناں چہ ڈین نے تجویز دی کہ اُسے برطانوی استاد کی نگرانی میں دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے مسٹر آرتھر ایول کو دھرم سالہ سے روانہ کیا گیا جو نواب کے ساتھ اُس کے بالغ ہونے تک مقیم رہے۔ زندگی کے ان ابتدائی پیچیدہ حالات کے باوجود، شہزادہ ایک نہایت قابل طالب علم ثابت ہوا اور پنجاب یونیورسٹی کے داخلہ امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر میکورتھ ینگ نے اُسے سراہتے ہوئے کہا ": پنجاب کی ریاستوں کے حکمرانوں میں یہ پہلا حکمران ہے جس نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ یہ میرے دورِ اقتدار میں ایک بڑی خوشی کی بات ہے۔ اس کے بعد، جب وہ حکمران بنا تو وائسرین میری منٹو نے 1906ء میں اُسے "نہایت امید افزا شہزادہ" قرار دیا۔ یہ ایک افسوسناک وعدہ تھا جو پورا نہ ہو سکا کیوں کہ وہ بھی اپنے والد کی راہ پر چلتے ہوئے تاریخ میں گم ہو گیا اور ایک اور نونہال بچہ تخت پر آنے کے لیے جدوجہد کرتا رہ گیا۔ صادق نامہ کے مطابق، صادق محمد خان چہارم کو برصغیر کے مسلمان "صبحِ صادق" کے لقب سے جانتے تھے تاہم، ان کی بادشاہت کا جاہ و جلال اُن کے دور کے آخر میں ماند پڑ چکا تھا۔ تواریخ بتاتی ہیں کہ وہ 7 فروری 1899ء کو شدید بیمار ہوئے اور 14 فروری کو انتقال کر گئے۔ یہ قیاس کرنا آسان ہے کہ اُن کی موت شاید انہی لوگوں کے ہاتھوں ہوئی جو وراثتی جھگڑے میں مایوس ہو چکے تھے اگرچہ وہ ان کے لیے زندہ رہ کر شاید زیادہ کارآمد تھے۔ ممکن ہے اُنہیں کسی درباری یا کونسل کے رکن نے مار دیا ہو جیسا کہ اُن کا وزیر جو اُن کی حکمرانی سے مایوس ہو چکا تھا یا شاید جیسا کہ ان کے پڑپوتے نے کہا، برطانوی حکومت نے مقامی ایجنسی کے ذریعے اس قتل کو انجام دیا ہو؟ یہ سب غیر معمولی کہانیاں ہیں لیکن نواب کی صحت کے پیشِ نظر جو دو سال پہلے ہی بگڑ چکی تھی یہ قرینِ قیاس ہے کہ وہ شراب، منشیات اور اگر زہر دیا گیا ہو تو اُس کے مجموعی اثر سے ہی چل بسے۔ صادق نامہ کی چمکدار منظرکشی کے برعکس، لیوپولڈ گرے، جو نواب کی موت کے بعد ریٹائرمنٹ سے واپس بلوائے گئے، لکھتے ہیں ": میں نے ریاست کو اہل افراد سے خالی پایا؛ سابق نواب نے تقریباً ہر قابل شخص کو نکال باہر کیا تھا اور وہ کچھ خودستائی سے یہ بھی کہتے ہیں ": اگر مجھے چند سالوں کے لیے بہاول پور میں نواب کی راہنمائی کا موقع دیا جاتا تو مجھے بیس سال بعد چار سال اُس کی خرابیوں کو سدھارنے میں نہ گزارنے پڑتے۔" (صادق نامہ)

(4)

آخری نواب (The Last Nawab)

نواب صادق محمد خان پنجم کی شخصیت کا خاکہ جو انڈیا آفس کی مفصل رپورٹس، خطوط، واقعات اور بعض چشم دید یادداشتوں کی بنیاد پر بنایا گیا ہے بیک وقت پیچیدہ اور منفرد ہے۔ بہاول پور میں برطانوی مالی مفادات خصوصاً ستلج ویلی پراجیکٹ اور اس سے جڑی ریاستی مقروضیت نے نواب کی حکمرانی پر غیر معمولی شرائط اور زندگی کے تمام پہلوؤں پر کڑی نگرانی مسلط کر دی تھی۔ جیسا کہ پینڈرَل مون نے لکھا ''برطانوی حکومت نے اپنے اختیارات کی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے نہ صرف یہ منصوبہ نافذ کیا بلکہ اس کا مالی بوجھ بھی ایک کمسن حکمران پر ڈال دیا جس کی نگہداشت دراصل ان ہی کی ذمہ داری تھی۔ ہندوستانی حکومت نے اپنے مفادات کی حفاظت کی خاطر نواب اور ریاست پر ایسی پابندیاں لگائیں جو اُسے کبھی مکمل اختیارات یا ایک باوقار حکمران بننے کا موقع ہی نہ دے سکیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ انسان بھی نہ بن پایا جو بن سکتا تھا''۔

برطانوی حکام کو نواب کے طرزِ زندگی کے اثرات، بہاول پور کی صورتِ حال اور اپنے مالی مفادات پر اس کے اثرات کی فکر لاحق رہی یہاں تک کہ دوسری جنگِ عظیم نے حالات کو بدل دیا اور بہاول پور نے غیر متوقع طور پر عمدہ کارکردگی دکھائی۔ وہی ریاست جو محمد علی جناح کا ساتھ دیتے ہوئے پاکستان کا حصہ بنی، ایک قیمتی خزانہ ثابت ہوئی جس نے نومولود ملک کے لیے اپنے خزانے کے دروازے کھول دیے۔

اس سے پہلے، جب تک برطانوی قرض کا بوجھ غالب رہا جس کی اصل ذمہ داری بھی خود انہی پر تھی۔ نواب کے تمام افعال کو سختی سے دیکھا اور نوٹ کیا جاتا حتیٰ کہ وائسرائے یا اس کا نمائندہ وقتاً فوقتاً اُسے روک ٹوک کر یا انگلی دکھا کر باز رکھتا۔ تعجب ہے کہ صادق محمد خان نے ان تمام پابندیوں کو نہایت خندہ پیشانی سے کیوں برداشت کیا۔ اگرچہ اس کے پاس اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا پھر بھی

حیرت کی بات ہے کہ اُس نے برطانوی افسران اور وائسرائے کی دلجوئی کے لیے سرکاری تقاریب جاری رکھیں اور ہمیشہ تاجِ برطانیہ سے وفاداری اور انگلستان سے محبت قائم رکھی۔ شاید ''پرلاک'' میں بچپن کے دنوں کی کوئی گرمجوش یادیں دل میں بسی ہوں یا شاید وہ اپنے آباء کی اس روایت کا امین رہا جو وفاداری میں کامل تھے۔

نواب کے اتالیق، مسٹر بولسٹر نے حکومتِ ہند کو اطلاع دی کہ نوجوان حکمران کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے ایسی حدود بندی ضروری تھی جو اُسے بے راہ روی سے بچا سکے لیکن نوابی ریاستوں کے تجربہ کار افسران جیسے پینڈرَل مون کو ان پالیسیوں پر شک تھا۔ ان کے نزدیک ایک حکمران کا وقار صرف اس کی ذات کے لیے نہیں بلکہ پورے ماحول کے لیے اہم تھا۔ صادق محمد جو اس وقت نیا شادی شدہ تھا، جب تحریک خلافت کا شور برپا تھا، اپنی اٹھارہویں سالگرہ تک پہنچا تب اس کے قریب ترین لوگوں میں کئی ایسے تھے جو اسے برطانوی ہدایات سے بغاوت پر اُکساتے تھے تاکہ اپنے ذاتی مقاصد حاصل کر سکیں۔ نواب ایک تنہا شخصیت بن کر رہ گیا تھا۔ مسلسل زیرِ نگرانی اور دو مخالف اور مداخلت پسند گروہوں کے درمیان کھینچا تانی کا شکار یہاں تک کہ اپنے تخت نشین ہونے کے بعد بھی اسے مکمل اختیار حاصل نہ ہو سکا۔ تعجب کی بات نہیں کہ وہ ایک مثالی شہزادہ نہ بن سکا مگر جیسا کہ مون نے کہا وہ کبھی غیر مقبول بھی نہیں ہوا اور آج بہاول پور میں اُسے تقریباً عقیدت سے یاد کیا جاتا ہے۔

سیاسی خدمات سے منسلک لیفٹیننٹ کرنل ہنری سینٹ جون نے 1922ء میں نواب کی اٹھارہویں سالگرہ سے کچھ عرصہ قبل صادق محمد کو ایک سادہ مزاج، ناتجربہ کار اور کمزور فطرت کا نوجوان قرار دیا۔ بظاہر وہ خوش اخلاق اور خوش گفتار تھا لیکن بقول سینٹ جون، اُس کے مزاج میں ضد اور دھوکہ دہی کی ہلکی سی جھلک بھی موجود تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک خوش مزاج اور فیاض نوجوان تھا تاہم "وہ نمایاں طور پر سست اور عیش پرست تھا اور اگر یہ خامیاں نہ روکی جاتیں تو شاید تباہی کا سبب بن جاتیں۔ جسمانی طور پر وہ کمزور نہیں لگتا تھا بلکہ جب میں نے اُسے دیکھا تو وہ تندرست اور چاق و چوبند تھا اور اس میں جسمانی لحاظ سے عدم توازن کا کوئی نشان نہیں تھا۔ مجموعی طور پر مجھے بہاول پور یا اس کے حکمران کے مستقبل کے بارے میں مایوسی کی کوئی خاص وجہ دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن سب کچھ اچھا نہیں

تھا۔ مسٹر بولسٹر کے مشاہدات کہیں زیادہ تنقیدی تھے اور ایک ممکنہ بحران کی جانب اشارہ کرتے تھے۔ ان کے مطابق، نواب کی دلچسپیاں صرف فوج، ڈاک ٹکٹوں کو جمع کرنا اور سنیما تک محدود تھیں اور وہ ایک مشکل فطرت رکھنے والا نوجوان تھا، حسیات کا اسیر، جذباتی، اسراف پسند، مذہبی تعصّبات کا شکار اور اپنے آباء کی روایات و رسوم سے جُڑا ہوا۔

بولسٹر نے شکوہ کیا کہ ریجنسی کونسل نے نوعمر نواب کو بے روک ٹوک اپنی مرضی کرنے کی اجازت دی۔ وہ خاص طور پر اس بات سے ناراض تھے کہ دربار نے ایک موٹر ٹریکٹر خریدنے کا حکم صرف اس لیے دیا کہ نواب نے اچانک یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اسے ڈیرہ نواب صاحب میں اپنے باغ کے لیے استعمال کرے حالانکہ اس کے لیے بجٹ میں کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ بولسٹر نے نواب کی شراب نوشی سے نفرت کی تصدیق کی لیکن اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ وہ زنان خانے کی لذتوں میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا۔ انھوں نے 'بیرونی عورتوں' کے آنے کا ذکر بھی کیا اور اس بات پر بھی ناراضگی ظاہر کی کہ نواب کی شادی اس کے استاد کو اعتماد میں لیے بغیر طے کر دی گئی تھی۔ ان کے نزدیک، نواب کے لیے سب سے بڑا خطرہ اس کی عیش پرستی اور جنسی خواہشات تھیں اور وہ درست تھے۔ یہی خصوصیات تھیں جنھوں نے نواب کی ساکھ کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور برطانوی حکام کے ساتھ اس کا رشتہ پیچیدہ بنا دیا۔ گویا ایک روایتی ریاست میں یہ سب کچھ ایک ایسی پیش گوئی کے مصداق تھا جو خود اپنی تکمیل کی طرف بڑھ رہی ہو، ایک ایسی ریاست جسے برطانوی پسماندہ قرار دیتے تھے اور اسی رویے سے پیش آتے تھے۔

دو نسلیں قبل، لیوپولڈ گرے نے صادق محمد خان چہارم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا، "جیسا کہ قیاس کیا جا سکتا ہے، بہاول پور کے نواب نے نہ تو نہروں میں دلچسپی لی جو کاشتکاری کی بنیاد ہیں نہ ہی مالیات میں۔" مگر بیسویں صدی کے آخر میں وہ نسل جو ہندوستان کے سیاستدانوں، تاجروں اور مصلحین کی بنیاد بنی، اپنی ریاستوں اور مجموعی طور پر ملک کے مستقبل میں گہری دلچسپی رکھتی تھی۔ 1905 سے 1910 تک وائسرائے رہنے والے لارڈ منٹو نے ریاستی خودمختاری کے تحفظ اور ہندوستانی کانگریس کے اثر کو توازن میں لانے کے لیے "کونسل آف پرنسز" کی تجویز دی اور ریاستوں میں عدم

مداخلت کی نئی پالیسی کی حمایت کی۔ ''محکمہ سیاسیات کے افسران کے لیے ہدایاتی دستورالعمل'')
(The Manual of Instructions to the officers of Political
Dept.) کی تمہید میں افسران کو ہدایت کی گئی: "جب تک بدانتظامی تہذیب کی بنیادی اقدار کو پامال نہ کرے، دخل اندازی نہ کی جائے۔" تاہم، جب کہیں مالی مفادات یا اخلاقی تشویشات آڑے آئیں تو افسران ضرور حرکت میں آتے۔ 1921 میں " کونسل آف پرنسز" کے قیام کے بعد، اس میں شمولیت کو بہانہ بنا کر برطانوی حکام نے نواب کی شخصی آزادیوں خصوصاً بیرون ریاست یا ملک، سفر کی پر پابندیاں لگائیں کیوں کہ ان سے ریاستی خزانے پر بوجھ پڑسکتا تھا۔ دوسری جانب، بولسٹر نے یہ بھی اعتراف کیا کہ صادق محمد کو انگریزی، فرانسیسی، فارسی، حساب اور انتظامی علوم کی اچھی تعلیم دی گئی تھی۔ وہ کھیلوں میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا، پولو اور ٹینس ترک کر چکا تھا اگرچہ کبھی کبھار بیڈمنٹن کھیل لیا کرتا تھا۔ وہ اس وقت کوئٹہ میں سینٹرل انڈیا ہارس کے ساتھ دو ماہ کے تربیتی کورس پر تھا اور اس کی 30 ستمبر کو اٹھارھویں سالگرہ کے بعد اسے جیل، فوج، تعلیم اور عدلیہ کے محکموں کا ذمہ سونپنے کی منصوبہ بندی تھی۔ اُسے نہری نظام، محصولات اور عوامی تعمیرات کے محکموں کی عملی تربیت دی جانی تھی اور ستلج ویلی پراجیکٹ کی عملی سوجھ بوجھ حاصل کرنی تھی مگر اس منصوبے سے وابستہ قرض کے بوجھ نے ہمیشہ اس کے سر پر تلوار لٹکائے رکھی۔ چناں چہ اپنے دادا کے برعکس، وہ زبردستی اس منصوبے میں ملوث کیا گیا اور وہ اسے دل سے ناپسند کرتا تھا اور وہ افراد بھی جو برطانوی حکام سے نفرت کرتے تھے، نواب کے اس موقف کے حامی تھے کیوں کہ وہ اسے بہاول پور کی روایات اور اپنی حیثیت کے تحفظ سے تعبیر کرتے تھے۔

مسٹر بولسٹر کو اس بات پر افسوس تھا کہ صادق محمد ایچی سن کالج میں تعلیم کے دوران بہاول پور کے مصاحبوں کے ایک گروہ میں گھرے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان لوگوں کے اثر نے کالج کے اساتذہ کی تمام کاوشوں کو بے اثر کر دیا۔ تاہم انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ شہزادے کا برطانیہ میں ولی عہد شہزادہ ویلز کے ساتھ چھ ماہ کا تقرر 'نہایت مفید اور اثرانگیز' ثابت ہوا۔ اسی شاہی خدمت کے اعتراف میں فیصلہ ہوا کہ ان کی سالگرہ کے موقع پر انھیں کے سی وی او (KCVO) کا خطاب اور برطانوی فوج میں اعزازی لیفٹیننٹ کا عہدہ دیا جائے گا۔ بولسٹر کی رائے میں نواب کو اپنے آبائی ماحول کے برے

اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک سینیئر برطانوی کیپٹن یا میجر کو اُن کا مصاحب مقرر کیا جانا چاہیے تھا جس کی ذمہ داریوں میں نواب کے انگریزی خطوط لکھنا بھی شامل ہوتا کیوں کہ ان کی " تحریر اور ہجے نہایت قابلِ افسوس تھے۔

نوابِ صادق محمد کی کم عمری میں اُن پر پڑنے والے خطرناک اثرات کے بارے میں برطانوی حکام کی تشویش ابتداء میں کونسل آف ریجنسی کے گمنام اراکین پر مرکوز تھی جنھیں وہ 'متعصب مسلمان' قرار دیتے تھے جو خلافت تحریک سے خفیہ طور پر ہمدردی رکھتے تھے لیکن جب صادق محمد تخت نشین ہوئے تو برطانوی تنقید کا سارا زور 'مولوی' غلام حسین پر مرکوز ہو گیا۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی واقعی نواب پر گہرا اثر رکھتے تھے۔ آخر وہی ان کی زندگی کا سب سے مستقل اور قریب ترین فرد تھا۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ برطانوی خود بھی ایک طاقتور اور رجعت پسند مخالف کے خلاف تعصب رکھتے تھے جو اُن کے اثر ورسوخ کے لیے چیلنج بن سکتا تھا۔ ریکارڈز صرف ایک رخ کی کہانی بیان کرتے ہیں اس لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ مولوی غلام حسین کا نواب کی کٹھ پتلی حکومت کے پیچھے رہ کر ریاست پر حکمرانی کا مقصد صرف ذاتی فائدہ اور دولت کا حصول تھا یا ان کی اصل تحریک برطانوی حکومت سے نفرت اور ان کے تسلط کو چیلنج کرنا تھا۔ ان کا اس بات پر کامل یقین کہ بہاول پور صرف بہاول پوریوں کا ہے۔ غالباً ان کا اصل محرک تھا جس کے تحت وہ ہندوستانی حکومت کے مقرر کردہ افسران کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔

برطانوی تصورات میں بہاول پور کی ریاست کا منظر نامہ آہستہ آہستہ کسی فرسودہ مشرقی دربار کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا جہاں ایک چالاک درباری اور اس کے پیروکار ایک کمزور حکمران کو عیش وعشرت اور اخلاقی انحطاط کی طرف دھکیل رہے تھے۔ افیون کی دھیمی مہک اور زہر آلود شربت کا پیالہ جیسے حکمران کی عقل کو ماؤف کر رہے ہوں تا کہ وہ درباری اصل اختیار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ نہ تو یہ منظر اور نہ ہی ایک بدحال اور مقروض ریاست میں بغاوت کو ہوا دینے کی خبریں مولوی یا اس کے خاندان کو برطانوی حکومت کی نظروں میں قابلِ قبول بنا سکیں خصوصاً اُس زمانے میں جب پنجاب میں خلافت تحریک کے ساتھ ہندو قوم پرستی بھی سر اٹھا رہی تھی۔ مولوی کے گروہ کی طرف سے طاقت

اور اختیار کے وحشیانہ استعمال کی خبروں نے برطانوی موقف کے لیے کچھ ہمدردی ضرور پیدا کی، زیادہ نواب کے لیے، جسے ایک ظالم اور بے لگام ریاستی انتظامیہ کا شکار سمجھا جانے لگا۔ اکتوبر 1925 تک یعنی صادق محمد کی تخت نشینی کے اٹھارہ ماہ بعد پنجاب کے گورنر سر ولیم میلکم ہیلی نے شملہ میں سیاسی سیکرٹری کو رپورٹ دی کہ بہاول پور کے وزیرِ مالیات اور پبلک ورکس، والٹر کینیو ے اور دیگر صوبائی اہلکار مستعفی ہو گئے ہیں۔ کینیو ے نے رپورٹ کیا: "ریاست اب تقریباً بے لگام ہو چکی ہے۔" دیگر افسران جیسے کرنل آئسکف، ڈویژنل انجینئر اور مس براؤن جو خاص طور پر زنانہ کے لیے تعینات کی گئی تھیں، نے بھی اسی نوعیت کی اطلاعات دیں۔ انھوں نے شکایت کی کہ ایک پارسی طوائف جو کراچی سے منگوائی گئی تھی کو آئسکف سے سو روپے ماہانہ زیادہ دیا جا رہا تھا" جو اُن کی خوشنودی کے لیے کافی نہ تھا۔" ہیلی نے لکھا کہ ریاست کا بدکردار دماغ یعنی مولوی، نواب کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے چکا ہے اور چیف منسٹر نواب مولا بخش اُس کا فرمانبردار آلہ کار بن چکا ہے۔ مولوی ایسے کسی بھی شخص کو برداشت نہ کرتا جو اُس کی اطاعت پر آمادہ نہ ہو اور اُس کا اعلان شدہ مقصد تھا کہ ریاست کو تمام غیر ضروری اور خاص طور پر برطانوی مقرر کردہ افسران سے پاک کیا جائے۔ کینیو ے نے لکھا کہ نواب نے ان سے ملاقات سے انکار کر دیا حالانکہ پہلے ان کے تعلقات 'نہایت دوستانہ' تھے اور سرکاری امور بغیر کسی مشورے کے نمٹائے جا رہے تھے۔ 'کالونائزیشن ایکٹ' کا مسودہ، جو ستلج ویلی کی نہری زمینوں کی الاٹمنٹ سے متعلق تھا، مولوی کے پاس رُکا ہوا تھا اور اُس پر دستخط نہیں کیے گئے تھے۔ مزید یہ کہ نہری منصوبوں میں جبری مشقت کے استعمال پر بھی تحفظات تھے جو پنجاب سے ممکنہ آبادکاروں کو روکنے کے لیے کافی تھا — وہ بھی ایک ایسی ریاست میں جہاں پہلے ہی جبر و استبداد کی فضا قائم تھی۔

لیفٹیننٹ کرنل ہنری سینٹ جون جو گورنر پنجاب کے ایجنٹ تھے، نے کینیو ے کی شکایات کو تسلیم تو کیا مگر وہ اُنھیں ریونیو منسٹر کے 'کچھ حد تک متعصب نقطۂ نظر' اور 'نرم مزاجی' کے ساتھ جوڑ کر کم اہمیت دیتے تھے۔ انھوں نے بہاول پور سے آنے والی درجنوں تشویشناک رپورٹوں کو پڑھتے ہوئے نسبتاً متوازن رائے قائم کی۔ وہ نواب کی اس یقین دہانی سے مطمئن نہ ہوئے کہ نہری مشقت فاقہ کشی کے دور کی امدادی تدبیر ہے نہ کہ جبری صفائی جیسی پرانی روایت اور انھوں نے نواب کی جانب سے جبری مشقت

کے خلاف جاری کردہ فرمان کو 'محض دکھاوا' قرار دیا۔ البتہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ نواب ہندوستانی حکومت سے اچھے تعلقات قائم رکھنا چاہتا ہے۔ ایک ملاقات میں، صادق محمد نے سینٹ جون کو یقین دلایا کہ مولوی کے اثرات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ سینٹ جون نے طویل المیعاد بہتری کی امید پر ایک مثبت رائے قائم کی کہ نواب کی ہمدردی جیت کر مولوی کے اثر کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ نوجوان حکمران آہستہ آہستہ اپنے اختیارات منوانے کی کوشش کر رہا ہے اور ریاستی اہلکار حکومتی افسروں کے خلاف سازشیں کرنے لگے ہیں۔ اپنی رپورٹ کے آخر میں انھوں نے لکھا": میں یہ تاثر نہیں دینا چاہتا کہ بہاول پور میں سب کچھ ٹھیک ہے۔ اس کے برعکس، وہاں کے حالات فکر اور بے چینی کا باعث ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ نواب کو اُن رجعت پسند عناصر سے علیحدہ کیا جانا ضروری ہے جن پر وہ اس وقت انحصار کرتا ہے۔"

1926 کے آغاز میں سینٹ جون نے بہاول پور میں" کچھ بہتر ماحول" کی اطلاع دی، اگر چہ نہ تو کالونائزیشن آگے بڑھی نہ زمین کے خریداروں میں کوئی دلچسپی دکھائی دی۔ اسی دوران، کراچی سے لائی گئی ایک یوریشین عورت کے بارے میں افواہیں گردش کرنے لگیں کہ وہ نواب پر گہرا اثر ڈال رہی ہے۔ سینٹ جون نے لکھا کہ جنسی عیش وعشرت "مسلمان حکمرانوں کی عام کمزوری" ہے اور نواب کو اس طرح کی زیادتیوں سے متعلق پہلے ہی خبردار کیا جا چکا تھا۔ صورتحال اُس وقت مزید سنگین ہوئی جب سکندر حیات خان جو بعد ازاں کے بی ای اور پنجاب کے گورنر بنے ("نائٹ کمانڈر آف دی آرڈر آف دی برٹش ایمپائر "یعنی کے بی ای)۔ جسے یہ اعزاز ملے اسے سر کہلوانے کا حق حاصل ہے اس لیے انھیں سر سکندر حیات بھی کہتے ہیں) صرف چند ماہ کی سروس کے بعد، 1928 میں انتہائی گستاخی اور مسلسل بے ادبی کی بنیاد پر نواب کے حکم سے برطرف کر دیے گئے۔ سکندر خان چھتیس سالہ نوجوان تھے جنھیں نہ تو سرکاری ملازمت کا تجربہ تھا اور نہ ہی ضلعی انتظامیہ کی عملی سوجھ بوجھ تاہم وہ پنجاب کے ایک "نہایت مشہور زمیندار خاندان" سے تعلق رکھتے تھے اور " کاروباری میدان میں کامیاب تجربہ " رکھتے تھے۔ انھیں سر ولیم میلکم ہیلی نے دوراندیشی سے سراہا کہ ": یہ وہ شخص ہے جو مستقبل میں پنجاب حکومت کے وزیر کے طور پر تصور کیا جا سکتا ہے اور جو پنجاب کے عوام کے لیے

بہاول پور میں استحکام اور کاروباری طرزِ حکمرانی کی ضمانت بن سکتا ہے۔ صادق محمد مسلسل اس بات پر زور دیتے رہے کہ مولوی اور اس کے بیٹے شمس الدین اور ضیاء الدین ریاست کے بہترین مفاد کے خواہاں ہیں لیکن حکومت کو دیگر ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ نواب درحقیقت ان سے اور ان کے ریاست پر قبضے کی قوت سے 'انتہائی خوفزدہ' ہے۔ ادھر یہ شکایات بھی بڑھتی جارہی تھیں کہ سرکاری امور میں رخنے ڈالے جارہے ہیں یا اُنہیں مؤخر کیا جارہا ہے اور نواب کو مولوی کے اثر سے الگ تھلگ رکھنے کی کوششیں تیز تر ہو چکی تھیں۔ ریاستی محکمے بدانتظامی، نااہلی اور بدعنوانی کا شکار ہو چکے تھے۔ خصوصاً ضیاالدین جو پولیس کے عملی نگران تھے، میٹرک کا امتحان بھی پاس نہ کر سکے تھے اور اُنہیں کسی بھی قسم کی پیشہ ورانہ تربیت حاصل نہ تھی۔ پولیس کے نام نہاد سربراہ، مسٹر ایٹکنسن جنھیں بظاہر نواب کی منظوری سے مقرر کیا گیا تھا دراصل ایک پرانے 'معاون پولیس افسر' تھے جو اب ڈیرہ دون میں ایک 'چمڑا محفوظ کرنے کے کاروبار' (taxidermy) میں مشغول تھے اور زیادہ تر وقت وہیں گزارتے تھے۔ یہ بات ناقابلِ فہم رہی کہ مولوی یا اس کے بیٹے ایسے شخص کو کہاں سے تلاش کر لائے۔ پولیس کا ادارہ 'وحشیانہ بنیادوں' پر چلایا جارہا تھا، جہاں 'رَیک اینڈ پنین' (یہ ایک اذیت کا آلہ Torture Device) ہوتا تھا جیسے اذیت ناک حربے استعمال کیے جارہے تھے تاکہ ملزموں سے اعترافات زبردستی کرائے جائیں چاہے وہ قصوروار ہوں یا بے گناہ۔

سکندر خان کو 7 ستمبر 1928 کو نواب صادق خان نے برطرف کر دیا جس سے بہاول پور کے عوام اور حکومتِ ہند دونوں میں بے چینی بڑھ گئی۔ 15 نومبر تک وائسرائے براہِ راست ان واقعات میں مداخلت کرنے لگے اور نواب پر دباؤ بڑھتا گیا۔ اُسے مجبوری کے تحت ٹیکسیڈرمی (حنوط کرنا) کے ماہر کو بھی برطرف کرنا پڑا جس نے جواباً سکندر حیات خان پر خورد برد اور برطانویوں کے لیے جاسوسی کے الزامات لگائے۔ اگرچہ یہ الزامات کسی حد تک حقیقت پر مبنی ہو سکتے تھے مگر ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسٹر ایٹکنسن کو بھی زبردستی برطرف کر کے مستقل طور پر اس کے 'جانوروں کے کھال کے کاروبار' میں بھیج دیا گیا۔ صادق محمد خان نے مولوی کے دفاع میں وائسرائے کو ایک خط لکھا جس میں کہا گیا کہ مولوی نے ریاستی خدمات کا آغاز بطور اتالیق کیا اور طویل عرصے کی وفادارانہ خدمت کے بعد

1923ء میں وزیر داخلہ بنا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عہدہ خاص طور پر مولوی کے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔ نواب نے ذکر کیا کہ مولوی نے اکیس برس بغیر کسی رخصت کے خدمت انجام دی اور اب وہ اپنے سابق اُستاد کو ایک سال کی چھٹی اور دفتر سے سبکدوشی دے رہا ہے تا کہ اُس کے وقار کو ٹھیس نہ پہنچے اور کسی قسم کی غلط فہمی کا ازالہ ہو سکے تاہم حکومت نے اس خط کو محض ٹال مٹول سمجھا۔ اس کے بعد پنجاب حکومت کے ایجنٹ نے چارلس واٹسن (سیاسی سیکرٹری) کو لکھا کہ وائسرائے کے مشاہدے کے لیے بہاول پور کی صورتحال ایک اسکینڈل ہے۔"13 دسمبر 1928 کو حکومتِ ہند کی جانب سے یہ واضح کیا گیا کہ مولوی کو ریاست سے نکلنا ہوگا اور اس حکم کو 'حتمی اور نا قابلِ واپسی' قرار دیا گیا۔ تین دن بعد نواب کی طرف سے خط موصول ہوا جس میں درج تھا: "وزیر داخلہ سے متعلق حکومت کے احکامات پر عملدرآمد ہو چکا ہے۔" اس کے ساتھ ہی ایک نئی روایت قائم ہوئی کہ آئندہ نواب کی اچھائی یا برائی کے فیصلے اُس کی اپنی مرضی سے منسوب کیے جائیں گے نہ کہ کسی اور کے ذریعے۔ مگر کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔

صادق محمد نے بار ہا حکومتِ ہند سے یہ دریافت کیا کہ آخر مولوی کو بغیر کسی قانونی الزام کے کیوں نکالا گیا۔ وہ 'نہیں' میں جواب کو بھی قبول نہ کرتے چاہے وہ اس انداز میں دیا جاتا کہ "بہاول پور کی انتظامیہ کی نیک نامی کی بحالی اس وقت کی بدنامی سے مشروط ہے جو سابق وزیر داخلہ کے وجود سے جڑی ہے۔" چارلس واٹسن کو لکھے گئے ایک خط میں نواب نے اپنی خواہش دہرانا شروع کی کہ مولوی، جو اس وقت 'اپنے بچوں اور گھر سے دور در بدر کی زندگی گزار رہا تھا'، واپس آ جائے۔ اس نے لکھا کہ ریاست میں اس کی اپنی ساکھ بھی متاثر ہو رہی ہے کیوں کہ عوام یہ محسوس کرتے ہیں کہ جب "میرا اُستاد عام جلاوطن کا سا انجام جھیل رہا ہے" تو نواب کی پوزیشن بھی غیر محفوظ ہے۔ اس نے شکوہ کیا کہ برطانوی راج کے دشمنوں کو حالیہ عرصے میں 'مصالحانہ رویہ' دیا گیا ہے، جب کہ میں ایک وفادار دوست اور اپنے دکھوں کے بوجھ تلے دب گیا ہوں۔ واٹسن اور وائسرائے لارڈ اِروِن دونوں اس معاملے میں سخت مؤقف پر قائم رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک 'آبپاشی کا منصوبہ' اتنی کامیابی حاصل نہ کر لے کہ مولوی کی واپسی بھی اسے متاثر نہ کر سکے اس وقت تک مولوی کی واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مولوی کے خاندان اور صادق محمد، دونوں ہی نے سلطنت برطانیہ کی ہدایات کو صرف زبانی طور پر

تسلیم کیا۔ وہ اصل میں ایسے طریقے ڈھونڈتے رہے جن سے کھلم کھلا بغاوت کے بغیر، حکومتِ ہند کے احکامات کو بآسانی نظرانداز کیا جاسکے۔ نواب نے مولوی کو سرکاری طور پر ایک سال کی چھٹی دینے کے بجائے تین ماہ کی چھٹی دے کر اس کی عزت اور اپنی خودداری بچانے کی کوشش کی۔ دسمبر 1929 کے آخر میں جب مولوی کی بہاول پور واپسی حکومت کے علم میں آئی تو نواب نے فوری طور پر یہ قانون لاگو کیا کہ ریاستی افسران چھٹی بڑھانے سے پہلے ایک دن کے لیے ریاست واپس آئیں لیکن اس سب سے کوئی خاص فرق نہ پڑا کیوں کہ شمس الدین نے بطور نجی سیکرٹری اپنی خاندانی گرفت برقرار رکھی تھی اور وہ غیر اعلانیہ وزیر داخلہ بن چکا تھا۔

مولوی کبھی دور نہیں تھا۔ اُس نے گرمیوں میں سمر ریزورٹ سولن میں قیام کیا جو شملہ میں نواب کی رہائش کے قریب ہی تھا۔ سردیوں میں وہ دہلی چلا گیا جہاں صادق محمد بھی مقیم رہا، تمام شاہی آداب سے ہٹ کر۔ چارلس واٹسن کو لکھے گئے ایک خط میں اُس وقت کے بہاول پور کے ریونیو وزیر جیمز فٹز پیٹرک نے لکھا کہ نواب کی ڈیرہ نواب صاحب میں خانگی امور سے دوری کے کچھ 'تلافی کے حامل فوائد' (compensatory advantages) ضرور تھے۔ دوسری طرف مولوی خاندان نے ریاست میں اپنے اثر ورسوخ کو برقرار رکھنے کے لیے کامیاب حکمتِ عملی اختیار کی جس پر نئے مقرر ہونے والے وزیر اعلیٰ، خان بہادر نبی بخش محمد حسین نے باقاعدہ شکایت کی۔ فٹز پیٹرک نے تجویز دی کہ شمس الدین کو وزارتِ خارجہ کی طرف منتقل کرنا مفید ہوگا تاکہ مولویوں کا 'نقصان دہ اور حاوی اثر' نواب پر فاصلہ بڑھنے سے کم ہو سکے۔ ساتھ ہی اس نے مشورہ دیا کہ پورے خاندان کو بہاول پور سے ہی ہٹا دینا بہتر ہوگا۔

جب مولوی کے بیٹوں نے اپنے والد کی بحالی کے لیے مہم تیز کی اور ایسے ہر شخص کو بدنام کرنے کی کوشش کی جو ایمانداری سے بطور وزیر اعلیٰ خدمات انجام دینا چاہتا تھا تو حکومت کا رویہ سخت ہوتا گیا۔ جنوری کے وسط میں، واٹسن نے نواب کو لکھا کہ مولوی کی ریٹائرمنٹ کو گزٹ میں شائع کیا جائے اور ریاستی معاملات سے اُس کی مکمل علیحدگی کو واضح کیا جائے۔ واٹسن کا کہنا تھا کہ شمس الدین کو ہرگز وزیر خارجہ نہیں بننے دیا جانا چاہیے البتہ ضیاالدین کو بطور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس رکھا جاسکتا

ہے’جہاں وہ کم سے کم نقصان دے‘۔ واٹسن کو اُمید تھی کہ یہ چھوٹا سا سمجھوتہ نواب کے لیے قابلِ قبول ہوگا مگر مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا۔صادق محمد نے جواباً شمس الدین کے لیے سیکرٹری خزانہ کی نامزدگی کی تجویز دی اور پھر اُسے وزیرِتعلیم کی حیثیت سے کابینہ میں شامل کرنے کی درخواست بھی کی۔آخرکار، 7 فروری 1930 کو اُسے ’محض ایک دفتری پوسٹ‘ یعنی سیکرٹری خزانہ کے طور پر نوٹیفائی کر دیا گیا۔ اسی وقت جب مولوی کی پنشن اور ستلج قرضے کے بدلے دی گئی نہری زمین کے معاملات بھی زیرِ بحث تھے۔حکومتِ ہند کو باقاعدہ آرڈر جاری کرنے میں مزید چھ ماہ لگے۔5 جون 1930 کے غیر معمولی صادق الاخبار بہاول پور میں اعلان کیا گیا کہ مولوی اور شمس الدین کے ساتھ نواب کا تعلق ختم کر دیا گیا ہے،اور "ریاستی معاملات یا نواب عالی جاہ کی ذات سے اُن کے تعلق کا دعویٰ جھوٹا پروپیگنڈا ہے جسے روکنے کی ضرورت ہے۔" اس اچانک پسپائی پر حکومتِ ہند حیران رہ گئی۔فٹز پیٹرک نے رپورٹ کیا": میرا خیال ہے کہ نواب عالی جاہ نے اپنے وعدے پر قائم رہ کر غیر معمولی عزم کا مظاہرہ کیا" اور اس فیصلے نے ریاست میں ’عام خوشی‘ کی لہر دوڑا دی۔مولوی کو اُس کی خدمات کا مالی صلہ مل گیا البتہ وہ زمین جو اُسے دی گئی تھی وہ بیچنے یا قریبی رشتہ داروں یا اتحادیوں کو عطا کرنے کے لیے مخصوص رہی۔یہ ماننا مشکل ہے کہ مولوی خاندان،سرکاری نقطۂ نظر سے ہٹ کر،ان برسوں کے دوران نواب سے کسی نہ کسی درجے میں قریب نہ رہا ہو یہاں تک کہ اکتوبر 1937 میں حکومتِ ہند کو نبی بخش وزیرِ اعلیٰ بہاول پور کی طرف سے نواب صادق محمد کی جانب سے ایک غیر معمولی درخواست موصول ہوئی جس میں مولوی غلام حسین کو ریاست واپس آنے کی اجازت مانگی گئی تھی۔یہ درخواست مولوی کی مدح سرائی پر مبنی تھی جس میں کہا گیا تھا:

’’مولوی غلام حسین صاحب نہایت معقول انسان تھے جو قابلِ ستائش نظریات سے متاثر تھے اور تاجِ برطانیہ سے وفاداری میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔بدقسمتی سے اُن کی سادگی اور خوش نیتی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ عیار لوگ جو اُن کے دوست بن کر سامنے آئے اُنہیں غلط مشورے دیتے رہے اور بحران در بحران پیدا کرتے گئے جن کا ذمہ دار مولوی ہرگز نہیں تھا۔‘‘ یہ حیران کن بیان، جو مولوی کی متنازعہ تاریخ کے تناظر میں خاصا غیر متوقع تھا غالباً مختلف زمینداروں کے کہنے پر دیا گیا تھا

جو مولوی کی بحالی یا کم از کم اُس کی واپسی کے خواہاں تھے۔اس بیان کی بنیاداس وقت دی جانے والی اُن سیاسی رعایتوں پر تھی جن کے تحت کئی سیاسی قیدیوں کو رہا کیا گیا اور اُن کی جائیدادیں برٹش انڈیا میں واپس کی گئیں۔ جہاں تک نواب کی سات سال پرانی گزٹ کردہ سرکاری پوزیشن واپس لینے کی دانشمندی پر برطانوی شک وشبہ کا تعلق تھا تو وہ شک اب وقتی سیاسی ضروریات کی روشنی میں نرم پڑ گیا تھا۔اگرچہ وہ مولوی کے بارے میں موجود بھاری بھرکم خط وکتابت کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے جو ممکنہ طور پر اب بھی بہاول پور کے سرکاری ریکارڈ میں بالائی سطح پر موجود تھی تاہم اُس وقت ایک تازہ مسئلہ درپیش تھا: نہری ترقیاتی منصوبے کے نگران انجینئروں میں مداخلت۔ یہ مسئلہ ایسا تھا جس پر تمام فریقوں کو راضی کرنے کے لیے کوئی سمجھوتہ تلاش کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔نواب اس خیال میں جکڑا ہوا تھا جو اسے مولوی سے وراثت میں ملا تھا کہ ریاست کی تمام ملازمتیں صرف ریاستی (ریاست کے وفادار) افراد کو دی جائیں، باہر سے آنے والوں کو نہیں۔ اگرچہ حقیقت یہ تھی کہ ایسے قابل انجینئر ریاست میں موجود ہی نہ تھے۔ وزیرداخلہ اور محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر کو ملازمتوں سے متعلق اس شورش کا نمایاں چہرہ سمجھا جاتا تھا اور اُن کی برطرفی ہی مولوی کی واپسی کی قیمت بن گئی۔ایک بار پھر برطانویوں کے لیے باعثِ حیرت یہ بات رہی کہ نواب صادق محمد نے اس شرط کو فوراً تسلیم کر لیا اور بغیر کسی مزید مطالبے یا شرط کے اس معاملے کو نمٹا دیا۔اگر وقت کے ساتھ مولوی اور اس کے خاندان کا اثر نواب صادق محمد پر کم ہوتا گیا یا یہ اثر صرف حکومتِ ہند کی نگاہ سے اوجھل رہا تو یہ کہنا درست ہوگا کہ وہی پرانا اور وفادار خادم (مولوی غلام حسین) تھا جس نے آخرکار ستلج ویلی قرض کے خاتمے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا جیسا کہ اگلے باب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔مولوی کی تمام خامیوں کے باوجود چاہے وہ برطانوی راج کے متزلزل خادموں نے بڑھا چڑھا کر پیش کی ہوں یا حقیقت پر مبنی ہوں مولوی خاندان کی بہاول پور کے عباسی نوابوں کے ساتھ مسلسل اہمیت کا ثبوت اس وقت دیا گیا جب شمس الدین کی بڑی بیٹی شمسی بیگم کی شادی آخری نواب کے بڑے بیٹے اور وارث صاحبزادہ محمد عباس سے ہوئی۔ یوں مولوی غلام حسین کی نسل عباسی خاندان میں دورُخی طور پر جاری رہی۔ بہاول اور عنیزہ، صلاح الدین اور منیبہ عباسی کے بچوں کی شکل میں جو مولوی کی اولاد کے ساتھ ساتھ عباسی خاندان کے پدری اور مادری لحاظ سے پڑپوتے اور پڑپوتیاں ہیں۔

(5)

اختیار کا استعمال(The Exercise of Power)

نواب صادق محمد خان پنجم کی محفوظ شدہ زندگی ایک غیر معمولی طور پر قسط وار اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے — بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا مگر ان انسانی ادوار سے کہیں بڑھ کر، یہ ایک ایسی زندگی تھی جو ڈرامائی تبدیلی کے دہانے پر گزری۔ وہ 1911 کے دربار میں ایک بہادر بچہ تھا؛ پھر ایک ایسا لڑکا جو حالات کے ہاتھوں جلاوطنی میں پورلاک جا پہنچا، خاندان اور مانوس ماحول سے دُور۔ نوجوانی ایچی سن کالج میں گزری پھر بہاول پور واپسی ہوئی جہاں وہ روایت اور ایک قابض استحصالی طاقت کی مسلط کردہ جدیدیت کے درمیان پھنس کر رہ گیا۔

جوانی میں وہ حکمران بنا مگر مسلسل نگرانی میں رہا۔ اس کے اختیارات اُس طاقت نے اپنے مفاد میں محدود کر دیے اور اس کی طرزِ زندگی کو جانچا گیا، تنقید کی گئی۔ وہ بظاہر اُس طاقت سے وفادار رہا، اس کے اہلکاروں کی پرتعیش انداز میں میزبانی کرتا رہا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اُسے نئے فیصلے کرنا پڑے، نئی وفاداریاں متعین کرنی پڑیں اور اُنہیں کشادہ دلی سے پیش کرنا پڑا تا کہ ایک اور بیرونی طاقت اپنا مفاد حاصل کر سکے اور پھر اُس وفاداری و سخاوت کے بدلے کیے گئے وعدوں سے مُکر جائے۔ اس کے بعد آیا ریاست، مرتبے اور اقتدار کا دائمی زوال، پھر ریٹائرمنٹ اور ایک غیر ملک میں نیم جلاوطنی جو زندگی کے اختتام تک جاری رہی۔

صادق محمد کی زندگی ایک مسلمان شہزادے کی حیثیت سے چند بدنام زمانہ اسکینڈلز تک محدود نہ تھی اگر چہ ان کا ذکر سب سے پہلے انڈیا آفس کے ریکارڈز میں نمودار ہوتا ہے۔ وہ عرب ممالک کے ساتھ، خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے دوران غیر رسمی سفارتی رابطے میں رہا اور 1941ء میں عراق اور ایران کا کامیاب دورہ کیا۔ اُس وقت عراق میں برطانوی سفیر نے دربارِ بہاول پور کی جنگی

کوششوں میں مدد کا ذکر کیا کہ وہ 'اس تاثر کو زائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہندوستان برطانوی سامراج کے سخت جبر تلے سسک رہا ہے۔انھوں نے عراق کے اہم مزارات پر یہ بھی کہا کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے اور بغداد کے بااثر سیاست دانوں کے سامنے یہ مؤقف بھی رکھا کہ اسلام کو برطانوی دوستی کا دامن تھامے رکھنا چاہیے۔کم اطمینان بخش پہلو یہ تھا کہ عراق کے جنوبی حصے میں واقع ایک تاریخی اور اہم شہر عمارہ کے "سابسان سنار" سے پچاس چاندی اور تیس سونے کے سگریٹ کیس منگوائے گئے جنھیں منگنی یا شادی کے تحفے کے طور پر دیا جانا تھا۔اس کے بعد عباسی خلفاء بغداد سے نسب کے لیے معروف شیخ صلاح بہایان کے رشتہ داروں سے اس بنیاد پر بات چیت کی گئی کہ صادق محمد کا سلسلہ نسب عباسی خلفاء بغداد سے ملتا ہے۔حکومت نے ایسے رشتوں کو زیادہ پسند کیا اور کہا کہ یہ عراق اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان ایک اہم ربط قائم کر سکتے ہیں۔

1943ء میں ہندوستانی فوج کے سپہ سالار سر کلاڈ آچنلک نے دریافت کیا کہ آیا ان کے عراق، ایران اور سعودی عرب کے دوسرے دورے کی تجویز میں کوئی حقیقی فائدہ موجود ہے۔یہ خیال کیا گیا کہ وہ ابن سعود، بادشاہ سعودی عرب کو متاثر کرنے کے قابل نہیں۔اس کے برعکس بیکانیر کا مہاراجہ جو اگرچہ ہندو تھا مگر اس میں وہ 'وقار موجود تھا' جو یہ رکاوٹ عبور کرنے کے لیے درکار تھا کہ بدو اور آفندی آسانی سے باہم نہیں گھلتے، یعنی سعودی عرب کے قبائلی مزاج والے "بدو" اور شہری، تعلیم یافتہ، شاہانہ آداب واطوار رکھنے والے "آفندی" قسم کے افراد ایک دوسرے سے آسانی سے میل نہیں کھاتے۔صادق محمد کو یہ مشورہ نہیں دیا گیا کہ وہ ابن سعود کو امریکا سے دوستانہ تعلقات کم کرنے کا مشورہ دیں اگرچہ انھیں دوبارہ عراق، ایران یا شام بھیجا جا سکتا تھا جہاں وہ نقصان تو نہیں دے گا، شاید کچھ فائدہ پہنچا دے۔بالآخر، اس منصوبے کو عرب میں خوراک اور نقل وحمل کے مسائل کے بہانے مؤخر کر دیا گیا۔خاص طور پر اس وقت جب بنگال کے قحط کے دوران بہاول پور میں خوراک کی فراہمی ایک سنجیدہ مسئلہ بنی ہوئی تھی۔نواب نے لکھا کہ وہ پہلے ہی عراق، شام اور سعودی عرب کی 'اشرافیہ' کو مالی امداد دے رہے تھے جو ہندوستانی حکومت کے لیے کوئی قابل قدر بات نہ تھی۔صادق محمد نے بارہا اپنے تعلقات کو اجاگر کیا تا کہ عرب حکمرانوں کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کا رشتہ ظاہر کر سکے خصوصاً

عراق اور مصر کے بادشاہوں کے ساتھ۔ اول الذکر شریفان مکہ کی ہاشمی نسل سے تھے اور ثانی الذکر عثمانی ترکوں کی اولاد۔ 1938ء میں انھوں نے اپنے بڑے بیٹے اور شاہ فاروق کی بہن کے درمیان رشتہ طے کرنے کی تجویز دی جس پر پنجاب کے سیاسی محکمے میں خطوط کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا کہ کیا معاملات اس نازک مسئلے میں آگے بڑھے ہیں؟' جواب ملا کہ غالباً نہیں، کیوں کہ یہ رشتہ طے نہ پایا اور اس کے بعد اس بارے میں کوئی ریکارڈ نہیں۔ 1944ء میں چاہے اتفاق ہو یا منصوبہ بندی، ان کے دوسرے بیٹے صاحبزادہ رشید عباسی کو قاہرہ میں انڈین آرمی لائژن مشن میں میجر جنرل ایف۔ ڈبلیو۔ برچ کا اے ڈی سی مقرر کیا گیا۔ ان کے لیے ایک شادی کی تجویز، جو کہ ہندوستانی سیاسی محکمے کے پٹھان رکن کی نیم سکاٹش پوتی سے تھی، ناکام ہوئی کیوں کہ بہاول پور کے دربار سے منسلک خواتین کے بارے میں منفی تاثر اور معمولی جہیز کی پیشکش کو مسئلہ بنایا گیا۔ آخرکار، وہ شہزادہ جو بعد ازاں پاکستان فارن سروس میں شامل ہوا اور تیونس میں سفیر رہا، لندن کے کیکسن ہال میں ایک انگریز خاتون کیتھرین اسکاٹ سے شادی کر بیٹھا جسے کئی آن لائن ذرائع میں 'ریل کے مزدور کی بیٹی' لکھا گیا ہے۔

صادق محمد خان مذہبی طور پر نہایت سخت گیر اور روایت پسند مسلمان تھے، علما اور مدرسین سے مسلسل مناظرے کرتے اور مساجد و تعلیمی ادارے قائم کرتے لیکن ان کی سخت گیری فرقہ وارانہ تعصب تک نہ پہنچی۔ جب 1935ء میں ہندو اخبارات اور مقامی سرگرم کارکنوں کے ذریعے گائے کے ذبیحے کے خلاف تحریک چلی تو اس کے ردِعمل میں مسلمانوں نے ہندو نائیوں اور صفائی کرنے والوں کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا جس سے حالات پرتشدد ہونے لگے۔ نواب نے ایک فرمان جاری کیا کہ جو کوئی شکایت رکھتا ہے وہ تین دن کے اندر ان سے ملاقات کرے بصورت دیگر شر پسندوں کو گرفتار کیا جائے گا۔ انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ سنگین نوعیت کا کوئی خطرہ نہیں اور درست پیش گوئی کی کہ پولیس اس صورتِ حال کو بغیر فوجی مداخلت کے سنبھال لے گی۔ تقسیم کے وقت، انھوں نے اپنی ریاست کے تمام باشندوں کو، بلاتمیز مذہب، ساتھ رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔

1931ء میں وہ آغا خان کی پیروی کرتے ہوئے علی گڑھ یونیورسٹی کو عطیہ دینا چاہتے تھے جو اسلامی علم کا عظیم مرکز تھا۔ اس عطیہ کو وائسرائے لارڈ ارون کے نام سے منسوب کرنا مقصود تھا لیکن

لارڈ ارون نے اس بنیاد پر یہ تجویز مسترد کر دی کہ 'آپ عالی جناب کی مالی حالت کچھ دگرگوں ہے'۔ معلوم ہوا کہ رقم پہلے ہی علی گڑھ سے وعدہ شدہ تھی، چار سالوں میں اقساط کی صورت میں لیکن ابتدائی معاہدے کے اٹھارہ ماہ بعد بھی یونیورسٹی کو کچھ نہ ملا۔ صادق محمد پہلی بار حج پر بطور تین سالہ بچہ گئے تھے جب ان کے والد کا انتقال ہوا۔ 1931ء اور 1935ء میں وہ کم از کم دو بار مزید گئے، ایک بار اپنے خرچ پر چار سو افراد کو ساتھ لے کر اور 'غسلِ کعبہ' جیسے مذہبی امور میں حصہ لیا جہاں ابن سعود اور افغانستان کے سابق امیر امان اللہ خان بھی شریک تھے۔ اس سفر کے اخراجات یقیناً برطانوی افسروں کے لیے پریشانی کا باعث بنے ہوں گے۔ 1933ء میں وہ حج پر جانا چاہتے تھے لیکن انھیں اجازت نہ ملی کیوں کہ برطانیہ چاہتا تھا کہ وہ شہزادوں کی کونسل میں شرکت کریں اور بتایا گیا کہ جدہ میں ان کے استقبال کے لیے مناسب انتظامات ممکن نہیں۔ اسی موقع پر، پٹیالہ کے مہاراجہ، جو انگلستان جانا چاہتے تھے، پر بھی سفر پر پابندی لگا دی گئی۔ برطانوی حکام نواب کے عشرت پسند طرزِ زندگی پر تحفظات کا شکار تھے لیکن سینٹ جان کی جانب سے جو 'کاہلی اور بے عملی' کا الزام لگایا گیا، وہ ایک غیر منصفانہ رائے تھی۔ ان کی حقیقی صلاحیتوں کو کبھی پوری طرح پرکھا نہیں گیا لیکن وہ اپنے مفادات کے حصول میں سرگرم رہے۔ اگرچہ یہ کوششیں مسٹر بولسٹر جیسے عیسائی مردانہ اخلاق کے حامل افسران کو متاثر نہ کر سکیں۔ وہ ایک پرامن راہ پر گامزن تھے۔ ان کی طرف سے جاری کردہ ایک اعلامیہ نے 1930-32ء کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں کے گرد 'انتشار کے طوفان' کی مذمت کی اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ تعاون کریں۔ وہ ہر کیمپ میں ایک قدم رکھنے کی کوشش کرتے اور اپنے مذہب و سلطنت کے وفادار کے طور پر درست راہ اپنانے کی کوشش کرتے۔ ڈیرہ نواب صاحب میں ہونے والی پُرخلوص شکار کی محفلوں اور ممتاز سیاستدانوں و سفارتکاروں کے ساتھ تصاویر، جن میں ایک کے بعد دوسرا وائسرائے، لمبا تڑنگا لنلتھ گو اور لارڈ ویول کی مشہور مونچھیں واضح طور پر نظر آتی ہیں، ۔ یہ ملاقاتیں صرف شکار ہی نہیں بلکہ وسیع تر معاملات پر گفتگو کی نشان دہی کرتی ہیں۔ "نواب کے عشرت پسند طرزِ زندگی پر برطانوی تحفظات درست ثابت ہوئے، لیکن سینٹ جان کی جانب سے جو 'کاہلی' کا الزام لگایا گیا، وہ ایک غیر منصفانہ رائے تھی۔"

نواب کی فوج، مشینوں اور موٹروں سے دلچسپی شاید انگریزوں کے لیے زیادہ قابلِ قبول ہوتی اگر اسے 1937 میں وِکرز کارڈن ٹریکٹروں کی خریداری کے معاملے میں نمود و نمائش اور فضول خرچی کا بہانہ نہ سمجھا جاتا جنھیں نواب ہر صورت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک جنونی ٹکٹ جمع کرنے والے (Philatelist) تھے اور یہ شوق اُن کے پوتے صلاح الدین کو بھی ورثے میں ملا۔ صادق محمد خان کی ٹکٹوں کی کل تعداد ان کی وفات کے وقت دُنیا بھر میں تیسری بڑی تھی — پہلے نمبر پر بادشاہ جارج پنجم تھے (جن کی ڈاک ٹکٹوں سے وابستگی کا اکثر مذاق اُڑایا جاتا تھا) اور دوسرے نمبر پر پوپ کا مجموعہ۔ بہاول پور میں ڈاک کا نظام "مداخلت" یعنی پہلی ریجنسی کے دور میں قائم کیا گیا تھا۔ اسے 1870 میں انگریز سلطنتی ڈاک نے "افادیت" کی بنیاد پر اپنے کنٹرول میں لے لیا اور یہ نظام 15 اگست 1947 تک انگریزوں کے زیرِ انتظام چلتا رہا۔ ہندوستان کی وہ تمام ریاستیں جو اپنی الگ ڈاک خدمات کی حامل تھیں، ان کے جاری کردہ ڈاک ٹکٹ صرف اندرونِ ریاست ہی قابلِ استعمال ہوتے تھے مگر "ڈاک ٹکٹوں کے شوقین" (philatelist) کے طور پر صادق محمد خان نے مسلسل کوشش کی کہ بہاول پور کی ڈاک خدمت بحال ہو اور جولائی 1933 میں انھوں نے برطانیہ اور بہاول پور کے درمیان اتحاد کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ایک یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ اُن کا خواب مکمل طور پر آزادی کے مختصر دور تک ہی پورا ہو سکا جب ریاست مکمل طور پر پاکستان میں ضم نہیں ہوئی تھی لیکن ایک معاہدے کے تحت 1 جنوری 1945 سے بہاول پور کے سرکاری ڈاک ٹکٹ ریاست کے اندر سرکاری خط و کتابت کے لیے قابلِ قبول قرار دے دیے گئے۔ اس سے قبل بھی نواب کے ڈاک کے خواب کو جزوی طور پر پورا کرنے کے لیے اور اہم مواقع کی یادگار کے طور پر کچھ ٹکٹ جاری کیے گئے تھے۔ ان میں ایک رنگین اور نایاب ٹکٹ بھی شامل تھا جو جارج پنجم کی سلور جوبلی کی مناسبت سے جاری کیا گیا تھا۔ بہاول پور کے ٹکٹ آج بھی خرید و فروخت میں شامل ہیں؛ کم قیمت والے ٹکٹ آسانی سے انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں مگر 1947 سے 1954 تک کے وہ ٹکٹ جو اُس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب آزادی کے بعد ریاست کا دارالحکومت "بغداد الجدید" کہلایا، بے حد قیمتی اور نایاب ہیں۔ یہ برصغیر کے سب سے عمدہ ڈیزائن شدہ ٹکٹ سمجھے جاتے تھے۔ ریاست کے اندر استعمال ہونے والے تمام ٹکٹ

نواب کو واپس کیے جانے کا حکم جاری ہوا تھا جو زیادہ اُمید پر مبنی معلوم ہوتا ہے بجائے کسی حقیقت پسندانہ توقع کے۔ محض 5 فیصد واپسی ریکارڈ پر ہے جو کہ حیرت انگیز حد تک بہتر شرح مانی جا سکتی ہے۔ ٹکٹ جمع کرنا اور ڈاک خدمات دنیا کی نظر میں بے ضرر مشغلے ہیں مگر بدقسمتی سے نواب صادق محمد خان کو عورتوں سے بھی محبت تھی ورنہ انھیں "جمع" بھی کرتے تھے۔ جہاں تک غیر ملکی خواتین کا تعلق ہے، اُن کا انتخاب اکثر ناکام رہا سوائے آخری بیوی اولیویا کے جو ڈچ تھیں اور صلاح الدین انھیں محبت سے یاد کرتے ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے بعد صرف چند ماہ زندہ رہیں۔ باقی عورتیں زیادہ تر سارہ اسکِنر کی دو نسل قبل کی مثال ہی کی مانند موقع پرست تھیں اور اپنے "حقوق" کے لیے برطانوی حکام سے رجوع کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی تھیں۔ اس حوالے سے حکومتِ ہند (GOI) نے تمام فریقین پر برابر ناراضی کا اظہار کیا اور افسران نے وہی تکبر اور سرد مہری کا رویہ اپنایا جیسا ماضی میں مسز اسکِنر کے ساتھ برتا گیا تھا۔ ریکارڈ پر ریکارڈ موجود ہیں جو نواب کی فضول خرچیوں، خواتین اور اُن کے مبینہ یا مبالغہ آمیز بُرے رویے کی تفصیل سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ وہ سنسنی خیز مواد ہے جو عام طور پر زرد صحافت کا حصہ ہوتا ہے مگر یہاں خشک سرکاری نثر میں درج ہے اور بہاول پور پر چڑھے قرض کا حوالہ ہمیشہ اُس کے حکمران کے خلاف بدگمانی اور خاص ناراضی کا جواز بنتا رہا۔ نواب صادق محمد خان کی بعض مشتبہ بیویوں کے مبینہ بچوں کا ذکر وقتاً فوقتاً سرکاری ریکارڈ میں ملتا ہے۔ یہ سب اس بات پر منحصر ہے کہ کون سا ریکارڈ کتنا مستند ہے۔ اُن کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق، اُن کے دس بیٹے اور دس بیٹیاں تھیں۔ اُس دور کے ایک کثیر الازواج شہزادے کے لیے یہ کوئی غیر معمولی عدد نہیں تھا؛ مثال کے طور پر، پٹیالہ کے مہاراجا بھوپندر سنگھ کے باون (52) بچے تھے۔ اسی طرح جیسے داؤد پوتروں کے اصلی "پردادا" نے آپسی لڑائی جھگڑوں کی ایسی بنیاد رکھی تھی جو نسلوں تک جاری رہی، ویسے ہی نواب صادق محمد خان عباسی نے بھی اپنی اولاد کے لیے خاندانی تنازعات کا ورثہ چھوڑا۔ بہاول پور کے ورثے اور خزانے کو ریاست کے عوام اور آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ رکھنے کی سیاسی جدوجہد خاندانی جھگڑوں سے مزید پیچیدہ ہو گئی ہے۔ عدم اعتماد، بدعنوانی اور ناجائز تصرف کے ماحول میں خاندانی افراد کو یہ موقع ملا کہ وہ حکومتی رجحانات سے میل کھاتی ذاتی حیثیت و اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنے

والد یا دادا کی میراث سے اپنے جائز حصے سے کہیں زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کریں یا چھین لیں۔ اس سارے عمل کے نتیجے میں ریاست کے زیادہ تر وسائل پاکستان میں ایک بالا دست قوت یعنی فوج کے قبضے میں چلے گئے۔

1921 میں، نواب کی شادی اپنی عباسی کزن جمیلہ بیگم صاحبہ سے ہوئی — یہی وہ تقریب تھی جس کی شکایت بولسٹر نے بھی کی تھی۔ برطانوی دستاویزات میں دیگر خواتین پر شکوہ شکایت کے باوجود، ایک یا دو خاص طور پر نواب اور حکام دونوں کے لیے باعثِ الجھن بنیں۔ صلاح الدین عباسی نے نہ تو کبھی "لنڈا سیس" کا نام سنا، نہ ہی اُن بچوں کا جو اُس نے مبینہ طور پر 1927 کی شادی (جو خود اُس نے 1930 کی بتائی) سے لے کر اپنی 1933 میں وفات تک پیدا کیے۔ تاہم، شادی کی جو بھی نوعیت تھی، برطانوی وزیراعظم بہاول پور سر رچرڈ کرافٹن جیسے حکام نے اسے حقیقت کے طور پر قبول کیا جیسا کہ لنڈا کے بھائی ایچ ایل سیس کی جانب سے نواب کو بھیجا گیا ایک دھمکی آمیز خط اس دعوے کی "قابلِ یقین" شہادت کے طور پر پیش کیا گیا۔ لیفٹیننٹ سیس نے اپنے سابق بہنوئی (نواب) سے ایک لاکھ روپے کا تقاضا کیا بصورت دیگر "تاج برطانیہ" سے رجوع یا قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی۔ اس موقع پر، جب یہ معاملہ سیاسی مشیر فرانسس وائیلی کے علم میں آیا تو برطانوی تاج کی نمائندگی کرنے والے افسر نے نواب کی حمایت میں مؤقف اپنایا۔ کرافٹن کی رپورٹ کے مطابق، سیس، اُس کی بہن کی شادی، اور ان کے چار بیٹے جنھیں بہاول پور میں اُن کے سوتیلے بھائیوں کے ساتھ تعلیم دی جا رہی تھی، سب کچھ درج تھا۔ سیس 1910 میں پیدا ہوا تھا اور اپنی بہن کی شادی کے بعد نواب کے خرچ پر تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اُس نے ڈیون کے "ڈارٹنگٹن ہال"، مسوری کے "سینٹ جارجز کالج" اور لندن کے "کالج آف اسٹیٹ مینجمنٹ" میں تعلیم حاصل کی اور ان تمام مرحلوں میں اسے مالی تعاون فراہم کیا گیا۔ ابتدا میں وہ سول انجینئر بننے کے لیے تربیت لے رہا تھا مگر جلد ہی ارادہ بدل لیا۔ اُس نے پڑھائی میں لاپروائی برتی، بُری عادات میں پڑ گیا اور نواب نے پہلے ہی خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ تعلیم مکمل کر کے بھارت میں ملازمت کرے۔ نواب نے خوشی کا اظہار کیا کہ سیس نے "رائل نیول والنٹیئر ریزرو" (RNVR) میں کمیشن حاصل کیا مگر اُسے مزید مالی مدد یا خط و کتابت بند کرنے کا

مشورہ دیا کیوں کہ اُس نے نواب کی توقعات پر پورا نا اُترنے کے باوجود اُس سے خطیر رقوم حاصل کی تھیں۔"RNVR" کے سرکاری ریکارڈ 1945 کے ریکارڈ میں اُس کا نام موجود نہیں۔

اپنی وفات سے قبل، لنڈا جو اس وقت خود کو "مسز وائی آئی عباسی" کہتی تھی، نے مارچ 1933 میں وائسرائے لارڈ وِلنگڈن کو خط لکھا جس میں دعویٰ کیا کہ اسے 1930 میں محض سترہ سال کی عمر میں نواب سے شادی کے لیے دھوکہ دیا گیا۔ اُس نے لکھا کہ اُس نے دولت کے لیے نہیں بلکہ محبت کی بنیاد پر شادی کی تھی اس شرط پر کہ اُسے پردے میں نہیں رکھا جائے گا اور نواب کی پہلی دو بیویوں سے اس کا تعلق منقطع ہے مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ درحقیقت تین اور بیویاں موجود تھیں۔ لنڈا نے وائسرائے کو بتایا کہ نواب اُسے "بیبز (babes)" کہہ کر بلاتے تھے اور اُس کا مہر بھی ادا نہیں کیا گیا البتہ ایک "سنگھار میز" بمعہ تمام "اینیمل ساز و سامان" دیا گیا۔ اب اُس پر یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ وہ پونا میں علاج کے دوران "جوکیوں اور اس قبیل کے افراد" سے تعلقات میں ملوث رہی۔ بہاول پور میں کی گئی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ماضی کے ممکنہ تعلقات کے علاوہ لنڈا حال ہی میں ایک جرمن شخص سے وابستہ ہو چکی تھی جس کے بعد نواب نے اُسے طلاق دے دی، زیورات اور تین ماہ کی عدت کا خرچ رکھنے دیا لیکن مہر ادا نہ کیا۔ اب اُس کی طرف سے بظاہر بلیک میلنگ کی کوشش کی جا رہی تھی اور وائسرائے نے مداخلت سے انکار کر دیا تاہم اُس کا خاندان اب بھی نواب پر اپنے حقوق جتا تا رہا۔ 1935 میں، لنڈا کی بہن گلیڈ لیس بشپ نے بہاول پور دربار سے لنڈا کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کی نقل حاصل کرنے کے لیے برطانوی حکومت سے مدد طلب کی۔ اُس نے درخواست دی کہ اس کی بھانجیاں تھیریسا اور میری، جو اس وقت شملہ کے ایک کانونٹ اسکول میں زیرِ تعلیم تھیں اور اس کے بھانجے، شہزادے مبارک اور داؤد کی مناسب دیکھ بھال کی جائے۔ بطور ثبوت اُس نے اپنی، لنڈا، ایک اور بہن آئیرین، دو بچوں، نواب اور ڈاکٹر پریرا کی مشترکہ تصاویر پیش کیں۔ اس "غیر محتاط" خط پر کوئی کارروائی ریکارڈ میں موجود نہیں جو پنجاب میں برطانوی حکومت کے نمائندے کو بھیجنے کے لیے نشان زد تھا۔ ممکن ہے کوئی عملی اقدام نہ کیا گیا ہو۔ لنڈا اور اُس کے خاندان کی بتائی ہوئی تاریخوں میں تضاد اور بچوں کی تعداد، جنس اور پیدائش کے وقت کے حوالے سے مختلف بیانات یقیناً شک کی گھنٹی بنے ہوں

گے۔ لیفٹیننٹ سیس جو بظاہر اپنی بہن کی شادی سے سب سے زیادہ فائدے میں رہا غالباً "سونے کے انڈے دینے والی مرغی" کی کہاوت بھول گیا تھا۔

نواب صادق محمد خان کے اخراجات پر اپنی تجوریاں بھرنے کی کوشش صرف سیس خاندان تک محدود نہ تھی۔ ایڈون ہال، جو خود کو سیلویا گوینڈولین اوبرائن (جسے "جائے" کہا جاتا تھا) نے نواب کو بلیک میل کرنے کی سازش کی جس کی منصوبہ بندی خود جائے کی نانی نے کی تھی۔ پنجاب کے برطانوی ریزیڈنٹ کے مطابق، وہ عورت "انتہائی لالچی فطرت" کی حامل تھی۔ ایڈون ہال کو بھی ایک مشکوک کردار قرار دیا گیا۔ ایک شرابی، جو پولیس فورس سے نکالا جا چکا تھا اور جسے اس پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ اس کی بیوی کو مالی فائدے کے لیے استعمال کیا جائے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ جائے دراصل نواب کی سوتیلی بیٹی تھی۔ اُس کی والدہ کو بنگلور سے ایک انگریز نے ہندوستانی بیوی کی تلاش میں بھیجے گئے نواب کے کارندے نے منتخب کیا تھا۔ جائے، اُس وقت ایک بچی تھی جسے نواب نے شملہ کے ایک کانونٹ اسکول میں تعلیم دلوائی۔ وہیں سے صرف پندرہ برس کی عمر میں اُس نے ایڈون ہال سے شادی کر لی بغیر اس کے کہ اپنے سرپرست کو اطلاع دیتی۔ شادی کے بعد جب اُس نے مالی امداد طلب کی تو نواب نے نہ صرف اُسے بہاول پور آنے سے منع کر دیا بلکہ اُسے انگلستان بھیجنے کی کوشش کی مگر اس منصوبے میں اُس کی نانی نے رکاوٹ ڈالی۔ ایک موقع پر یہ شبہ بھی ابھرا کہ شاید نواب نے خود جائے کو بہکایا ہو لیکن برطانوی ریزیڈنٹ کو اس میں کوئی کیس دکھائی نہ دیا۔ اُس نے دہلی لکھا: "اعلیٰ حضرت کی سماجی اور ازدواجی معاملات میں ذوق کچھ مختلف اور منفرد ہے"۔ ایسی شرمناک چھوٹی چھوٹی کہانیاں نواب صادق محمد خان کی شہرت کے لیے نقصان دہ بن گئیں۔ انگریز حکام اُن کے ہر قدم کا تجزیہ کرتے اور وہ کوئی کام ان کی مداخلت یا منظوری کے بغیر نہ کر سکتے تھے اور وہ منظوری بھی اکثر مزید شرائط کے ساتھ مشروط ہوتی۔

ستلج قرضہ بہاول پور دربار اور نواب کے سروں پر ہمہ وقت چھائے ایک سائے کی مانند تھا۔ یہ بوجھ کبھی کم نہ ہوا۔ دربار کی جانب سے ذاتی قرض لینے کی کوشش جیسے کہ ابتدا میں گوالیار سے، برطانوی حکومت نے یہ کہہ کر روک دی کہ حکومت ہند بین الریاستی قرضوں کی ضمانت نہیں دیتی۔

گوالیار نواب کی ساکھ سے بخوبی واقف تھا اس لیے وہ سخت شرائط پر تیار تھا۔ بالآخر بہاونگر ریاست سے قرض کا معاہدہ ہوا، وہ ریاست جو اس نوعیت کے مالی لین دین میں ماہر تھی۔ اس قرض کے عوض خانپور۔ چاچڑاں ریلوے کی آمدنی اور محصولات کو بطور ضمانت گروی رکھوایا گیا اور نواب کے اخراجات پر مزید قدغنیں لگانے کا ایک نیا بہانہ مل گیا۔

بہاول پور حکومت کی طرف سے نواب کے اختیارات کو محدود کرنے کی درخواستیں جیسے کہ وزراء کی تقرری یا ریاستی بجٹ کی منظوری یہ کہہ کر رد کر دی گئیں کہ "ایسے اقدام سے شدید شرمندگی پیدا ہو سکتی ہے" اور یہ کہ "حضور والا کی مستقل اور ناقابلِ اصلاح فضول خرچی کے پیش نظر کسی تبدیلی پر غور کے لیے وقت ابھی موزوں نہیں"۔ ریاستی بجٹ کی منظوری کے لیے پنجاب کے ریزیڈنٹ کی منظوری درکار رہتی، ستلج قرض کی واپسی کو یقینی بنانے کے نام پر۔ اس بات کو ہمیشہ "قبل از وقت" کہہ کر مؤخر کیا جاتا رہا اور وقت کے ساتھ ساتھ ہر وہ شکایت جو نواب کے خلاف کی جاتی، اُس کے گرد انگریزوں کی گرفت کو مزید سخت کر دیتی۔ انگریز افسروں کا رویہ کبھی ہمدرد باپ جیسا ہوتا، کبھی تحقیر آمیز، اور اکثر طنز سے لبریز۔ 1925 میں بہاول پور کے ایک درباری نے نواب کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں انھیں تیسری افغان جنگ کے تمغے دلانے کی کوشش کی جس کے وہ حقدار نہیں تھے۔ اس حرکت کے اثرات بعد میں محسوس کیے گئے جب دوسری جنگ عظیم میں نواب کے بیٹوں کو ملنے والے تمغوں اور اعزازات کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اسی سال، لیفٹیننٹ کرنل گورلی (21۔ انڈیا ہارس) نے شکایت کی کہ نواب نے ڈیرہ نواب صاحب میں اُن کی خاطر تواضع نہیں کی کیوں کہ وہ اس وقت شکار پر تھے۔ ممکن ہے اس وقت کسی قریبی مشیر نے نواب کو انگریز افسر سے بے رخی برتنے کا مشورہ دیا ہو۔ نواب کی فوج سے محبت، جو اُن کی زندگی بھر کا جذبہ تھی، اُسے بھی محض ایک مشغلہ سمجھا گیا۔ ایسا کھیل جو کسی امیر شخص کی تفریح ہو۔ مالی مسائل کی بنا پر 1930 میں انھیں لیگ آف نیشنز (جنیوا) کا نمائندہ بننے سے روک دیا گیا حالانکہ پنجاب حکومت کے افسران نے اس نامزدگی کی سفارش کی تھی تاکہ "ہماری طرف سے کیے گئے سخت اقدامات کے بعد حکومت کی عنایت کا اشارہ دیا جا سکے۔"

1935 میں، جماعت علی شاہ جیسے ایک انتہا پسند مذہبی رہنما کا بہاول پور میں داخلہ ممنوع

قرار دیا گیا کیوں کہ وہ عوام میں انگریزوں کے خلاف جذبات بھڑکانا چاہتے تھے مگر سوال اُٹھا کہ اُنہیں بلایا ہی کیوں گیا؟ الزام پھر مولوی غلام حسین پر آیا لیکن نواب کے مذہبی خیالات ایک بار پھر زیرِ سوال آئے۔ یوں وقت کے ساتھ ساتھ بعض چھوٹی بڑی باتوں نے نواب صاحب کی ساکھ کو متاثر کیا۔ یہ بھی رپورٹ ہوا کہ بہاول پور کے وزیرِاعظم کا بیٹا لندن میں خود کو "شہزادہ" کہتا پھرتا تھا اور شاہی طرز کی عیش وعشرت میں قرضے چڑھا رہا تھا۔ 1940 میں، کراچی کے کلفٹن ساحل پر ایک "واقعہ" پیش آیا۔ نواب کے ملازم اللہ ڈیوایا، جو بعد میں صلاح الدین عباسی کے بچپن میں خاص شخصیت بنے، نے ایک سادہ لباس میں ملبوس مخبر کو پیٹ ڈالا جو نواب پر نظر رکھ رہا تھا جب کہ نواب ایک یورپی معشوقہ کے ہمراہ ساحل پر گمنامی کی حالت میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ اس واقعے کے کئی ورژن ہیں مگر زیادہ نکتہ چینی اس بات پر ہوئی کہ نواب نے حکومت کی اجازت کے بغیر کراچی کے مضافات میں ایک مکان خرید لیا۔ صلاح الدین ایک اور واقعہ سناتے ہیں کہ وفادار خادم اللہ ڈیوایا نے ایک برطانوی سیاسی ایجنٹ کو بہاول پور میں ڈرا کر بھگا دیا جب وہ مسلسل دو شاموں تک اُس ایجنٹ پر اُس کے گھر کے احاطے میں گولیاں چلاتا رہا تا آنکہ وہ افسر تبادلے کی درخواست پر مجبور ہو گیا۔

1945 میں نواب صادق محمد خان نے اپنے خاندان خصوصاً چھوٹے بچوں کی فلاح کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کرنے کی تجویز پیش کی جس کی مثال حیدر آباد کے معظم جاہ ٹرسٹ سے لی گئی تھی۔ اس ٹرسٹ کے لیے ابتدائی سرمایہ لاہور میں واقع "بہاول پور ہاؤس" کی فروخت سے حاصل ہونا تھا مگر جلد ہی خط وکتابت میں سوال اُٹھا کہ کیا یہ جائیداد واقعی نواب کی ملکیت ہے کیوں کہ یہ پہلے ہی ستلج قرض کی پیشگی ادائیگی کے طور پر حکومت کے زیرِ قبضہ تھی۔ اسی طرح ٹرسٹ کے لیے زمین اور جاگیروں کے حقِ ملکیت پر بھی اعتراضات آئے۔ یہ تمام ریکارڈ بالآخر ہندوستان میں آخری برطانوی سیاسی سیکریٹری، سر لینسلٹ سیسل لیپل گرفن کی میز پر پہنچا اور بہاول پور سے متعلق معاملات، جو ابتدائی دور کی برطانوی "غیر مداخلت" کی پالیسی سے جُڑے تھے، ایک اٹھارہویں صدی کے سے نام والے افسر کے ہاتھوں اختتام کو پہنچے۔

آخر کار، قائداعظم محمد علی جناح نے نواب صادق محمد خان کی گردن سے ستلج ویلی پراجیکٹ

کا پھندا کھولا۔ آزادی سے کچھ ہی عرصہ قبل نواب کی والدہ جو اُن کی نابالغی کے دوران پسِ پردہ اثر ورسوخ رکھتی تھیں، نے اپنے قابلِ اعتماد ساتھی مولوی غلام حسین کو حیدرآباد روانہ کیا تا کہ وہاں کے نظام سے اپنے زیورات کو بطور ضمانت پیش کر کے قرض حاصل کیا جائے مگر افسانوی دولت کے باوجود کنجوس مشہور نظام برطانیہ کو ناراض کرنے کے موڈ میں نہ تھے اور مولوی غلام حسین صاحب خالی ہاتھ واپس آ رہے تھے جب بمبئی کے ایک ریلوے اسٹیشن پر اتفاقاً اُن کی ملاقات جناح سے ہوئی جو پلیٹ فارم پر ٹرین کے چلنے کے انتظار میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ جناح نے مولوی غلام حسین کو اپنے ڈبے میں مدعو کیا جہاں ساری داستان سنی۔ بعد ازاں، جناح کے بمبئی کے چیمبر میں ملاقات ہوئی اور ایک ایسا سادہ حل سامنے آیا کہ آج اُس پر افسوس ہی ہوتا ہے۔

جناح نے دریافت کیا کہ خانپور چاچڑاں ریلوے کے لیے زمین کی خریداری میں برطانوی حکومت کی جانب سے بہاول پور کو مکمل ادائیگی کبھی ہوئی ہی نہیں تھی۔ سود سمیت وہ رقم ممکنہ طور پر ستلج قرض کی بقیہ رقم سے زیادہ تھی، صلاح الدین کے مطابق 12 کروڑ کے بدلے صرف 8 کروڑ کی واجب الادا رقم۔ یوں برسوں سے لٹکا ہوا بوجھ محض اُس وقت اترا، جب بہاول پور کے پاس وہ دولت آ چکی تھی جس سے قرض کی مکمل ادائیگی ممکن تھی۔ یہ بوجھ نواب کے پورے دورِ حکومت میں اُن کے سروں پر تلوار کی مانند لٹکا رہا تھا اور توقع تھی کہ 1986 تک بھی اس کی ادائیگی مکمل نہ ہوگی۔

(6)

پاکستان(PAKISTAN)

(پاکستان سے الحاق وانضمام اورلندن میں آخری نواب کے آخری دن)

آج ستر برس بعد، برصغیر کی تقسیم کے دوران ہونے والی ہلاکت خیز خونریزی نہ صرف ایک نئے ملک کی اذیت ناک تخلیق کا عمل دکھائی دیتی ہے بلکہ ہندوستان کی ہزاروں سالہ تاریخ کو جھٹک دینے کا عمل بھی محسوس ہوتی ہے۔ یہ طویل داستان پاکستان اوراس کے عوام کی یادداشت کا اتنا ہی حصہ ہونی چاہیے تھی جتنا کہ بھارت اوراس کے شہریوں کے لیے تاہم بھارت میں آزادی محض ایک اورحملہ آور سلطنت کے خاتمے کا مرحلہ تھی جوخودبھی وقت کے دھارے میں معدوم ہوجاتی تھی۔ ایک طویل تر داستان کی ایک اورقسط۔ پاکستان میں، تاریخ گویا تقسیم کے ساتھ ختم ہوگئی — پاکستان زندہ باد۔ ادھر آخری سلطنت کے ملازمین عارضی طور پر دونوں ملکوں کے الگ الگ معاملات میں مصروف ہوگئے جب نئے ملک کے وزیرخزانہ نے 15 اگست 1947 کوکراچی میں اپنے نئے دفتر میں قدم رکھا تو وہاں صرف ایک میز کے سوا کچھ نہ تھا۔خزانہ تقریباً خالی تھا۔اگر چہ پاکستان کو دہلی میں موجودنقد ذخائر کا 18.75 فیصد،یعنی 750 ملین روپے، دواقساط میں ملنا تھا مگراس وقت ملک پر تقریباً 400 ملین روپے کا فوری قرض تھااوراس کے پاس فوج کی چار ماہ کی تنخواہیں دینے کے لیے بھی رقم نہ تھی۔ گورنر جنرل محمد علی جناح نے حیدرآباد کے نظام سے 200 ملین روپے کا قرض حاصل کیا جس کی دستاویزی شہادت موجود ہے۔ ان کی بہاول پور کے دولت مندنواب سے قریبی دوستی نے مزید 7 کروڑ روپے فراہم کیے جوعملی طور پرایک تحفے کی حیثیت رکھتے تھے، قائدِاعظم کے لیے بھی اورنوتشکیل شدہ مسلم قوم کے لیے بھی۔سرکاری محکموں کی ایک ماہ کی تنخواہیں بھی بہاول پورنے دی تھیں۔ پنڈریل مون کی بہاول پور ریاست کی مالی حالت سے متعلق تشویش کو مدنظر رکھتے ہوئے غالب امکان ہے کہ یہ رقم

نواب کی ذاتی دولت سے ادا کی گئی تھی یا اس خزانے سے جو ماضی میں برطانوی حکام کی شدید دلچسپی کا مرکز رہا تھا جہاں ریاستی اور شاہی خزانے باہم ملتے تھے۔ آزادی کے اس مختصر دور میں بہاول پور ایک ایسا تحفہ تھا جو دیتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ وہ تحفہ ختم ہو گیا۔ اگر جناح کی نظر میں نوابوں کی اہمیت زیادہ تھی تو بھی یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ نئی دنیا میں، اگست 1947 کے بعد، ان کی نیم خود مختار ریاستیں طویل مدت تک پاکستان میں قائم رہ سکتیں تھیں خصوصاً جب جناح ستمبر 1948 میں وفات پا گئے۔

ریاستوں اور سرحدی علاقوں کی وزارت (SAFRON) جولائی 1948 میں خود جناح کے تحت قائم کی گئی۔ کئی تجربہ کار ہندوستانی اور برطانوی افسران جو پاکستان میں موجود تھے پاکستان کی نوابی ریاستوں میں گورنر یا کمشنر مقرر کیے گئے۔ یعقوب خان بنگش نے اپنی کتاب "نوابی ریاست کا قضیہ" یا "A Princely Affair" میں ریاستوں کے انضمام کے عمل کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ ریاستوں میں وزرائے اعظم کی تقرری ہمیشہ حکمرانوں اور سیاسی محکمے کے درمیان تنازعے کا باعث رہی ہے۔ ہمیں علم ہے کہ برطانوی حکام آخر میں بہاول پور کے تقرر ناموں میں نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ اس میں مداخلت بھی کرتے تھے تاکہ اپنے مالی مفادات کو محفوظ رکھ سکیں۔ پاکستانی حکومت بھی ہر ریاست پر کنٹرول چاہتی تھی۔ بہاول پور کے معاملے میں جہاں ریاستی فوج خاصی مضبوط تھی، اسے حکومتی کنٹرول میں لانے کی ایک اضافی مجبوری تھی۔ اس کے علاوہ بہاول پور کے پاس مرکز کے لیے اور بھی قیمتی وسائل موجود تھے۔ جب ریاست مکمل طور پر پاکستان میں ضم ہو گئی تب تک اس کی دولت بھرپور طریقے سے خرچ ہو رہی تھی۔ تعلیم اور صحت کی سہولیات مفت تھیں، لاہور کی جامعات میں نشستیں مختص تھیں اور بیرونِ ملک وظائف ریاستی خزانے یا خود نواب کے ذریعے دیے جاتے تھے۔ ملک بھر میں سب سے زیادہ شرحِ خواندگی بہاول پور میں تھی جو آج کے پاکستان سے بھی بلند تھی اور ریاستی بیوروکریسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ تھی۔ جس طرح صادق محمد خان نے ایک وفادار افسر کو کپورتھلہ میں تلاش کیا تھا اسی طرح وہ بہاول پور سے باہر بھی باصلاحیت افراد پر نظر رکھتے اور ان کی خدمات کے لیے اعلیٰ تنخواہیں دینے کے قابل تھے۔ 1954 کے بعد مغربی پاکستان کے محکمہ مال اور انہار کی ذمہ داریاں بیشتر بہاول پوری بیوروکریٹس کے پاس تھیں۔

اکتوبر 1948 میں نواب بہاول پور نے " سپلیمنٹری انسٹرومنٹ آف اکسیشن " یعنی الحاق کی ضمنی دستاویز پر دستخط کیے۔ سال کے اختتام تک بہاول پور کی انتظامیہ میں تبدیلیاں شروع ہو چکی تھیں۔ پنڈریل مون نے اپنا آخری سرکاری عہدہ لینے کے لیے ہندوستان کے ضلع ہماچل پردیش کا رخ کیا جب کہ وزیرِ اعظم گورمانی نے پاکستان کی وفاقی حکومت میں وزیر بے محکمہ کے طور پر شمولیت اختیار کی۔ 1949 میں گُرمانی نے " کراچی معاہدہ " پر دستخط کیے جس کے ذریعے پہلی پاک۔ بھارت جنگ کے بعد جنگ بندی اور کشمیر کے متنازعہ علاقوں کے درمیان لائن آف کنٹرول قائم ہوئی۔ لیفٹیننٹ کرنل اے ایس بی شاہ، جو SAFRON کے مستقل سیکریٹری تھے اس بات سے آگاہ تھے کہ نواب بہاول پور اپنے لیے ایک انگریز وزیرِ اعظم چاہتے تھے۔ اس سے برطانوی دور کی صورت حال بحال ہوتی۔ انگریز وزیرِ اعظم اور ہندوستانی وزیرِ خزانہ تاہم اب پاکستانی حکومت اپنی مرضی کے افسر کی تقرری کی پوزیشن میں تھی۔ چناں چہ نارتھ ویسٹ فرنٹیئر صوبے (NWFP) کے سابق چیف سیکریٹری کرنل جان، جو بعد میں سرجان ڈرنگ کہلائے، کو یہ منصب دیا گیا۔ حکومت نے اپنی گرفت اس وقت مزید مضبوط کی جب کرنل شاہ نے نواب کو مطلع کیا کہ بہاول پور کی فوج کا کنٹرول اور کمانڈ اب ایک سرکاری مقرر کردہ افسر کے حوالے کرنا ہوگا جو بریگیڈیئر مارڈن کی جگہ لے گا۔ مارڈن جواب جنرل مارڈن بن چکے تھے، کو نواب نے املاک کا نگرانِ اعلیٰ مقرر کیا۔ جب شاہ نے فوجی اخراجات کے لیے سالانہ 1 کروڑ روپے (10 ملین) اور فوری طور پر اپ گریڈنگ اور تربیت کی مد میں ایک کروڑ روپے اور مانگے تو نواب نے یہ مطالبہ کیا کہ بہاول پور کی نصف فوج کو بطور ذاتی محافظ ان کے تحت رہنے دیا جائے۔ شاہ نے اس مطالبے کو مسترد کر دیا اور دلیل دی کہ ایسی فوج تربیت، کارکردگی اور وسائل کے اعتبار سے پاکستانی فوج کے مقابلے میں کمتر ہوگی۔ بنگش بالکل درست کہتے ہیں کہ یہ اقدامات حکومتِ پاکستان کی جانب سے "Paramountcy" اعلیٰ بالادستی کے اصول کو ایک نئے اور طاقتور انداز میں بحال کرنے کی کوشش تھی۔ ریاستوں کی افواج کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں لے کر اور پوری ریاست کو پاکستان میں مکمل طور پر ضم کرنے کے عمل کی ابتدا۔ شاہ کو بخوبی علم تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ آزادی اور مکمل انضمام کے درمیان جو وقفہ تھا وہ بہاول پور کے عوام اور اس کے

حکمران خاندان کے لیے پاکستان کی تاریخ میں صرف دوسطروں کا خلا رہ گیا۔ گذشتہ ستر برسوں کے دوران یہ سارا عمل مکمل ہوا۔ کرنل ڈرِنگ کو بہاول پور میں وزیرِاعظم اور پاکستان حکومت کے سیاسی ایجنٹ کی حیثیت سے ایک مشکل وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بنگش لکھتے ہیں کہ "متعدد غلط فہمیاں" پیدا ہوئیں اور شاہ کا حوالہ دیتے ہیں جو انھوں نے وزیرِاعظم لیاقت علی خان کو ایک تار میں دیا": میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ مجھے ایک ہی دوپہر میں سب کچھ مکمل کرنے پر کیوں اتنا مُصر تھا اور جب اُس نے دیکھا کہ میں اپنا کام اپنے طریقے سے کرنا چاہتا ہوں تو اُس نے خود ہی معاملہ طے کر کے مجھے ایک امر واقعہ (fait accompli) کے طور پر پیش کیا اور کیوں اس نے حکمران کو دورے پر بھیج دیا اور خود کراچی چلا گیا۔" شاہ، ڈرِنگ کے پاکستان کے ساتھ غیر تسلی بخش رویے کو برطانوی سامراج کی چھپی ہوئی سوچ سے منسوب کرتے تھے": بدقسمتی سے وہ ابھی تک اس حقیقت کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کر پایا کہ برطانوی راج ختم ہو چکا ہے اور یہ کہ ہم اپنا کام اپنے طریقے سے کرنا چاہتے ہیں۔" لیفٹیننٹ کرنل آرتھر جان ڈرِنگ کا خاندان 1830 سے ہندوستان میں مقیم تھا۔ یہ ان خاندانوں میں سے ایک تھا جو برصغیر میں نوآبادیاتی نظمِ حکومت کی ریڑھ کی ہڈی تصور کیے جاتے تھے؛ ان کے دادا فوج کے چیف پے ماسٹر تھے۔ جان اور ان کی بیوی ڈیبورہ، چارلس ایلن کی کتاب Plain Tales of the Raj میں نمایاں ہوئے اور کہا جاتا ہے کہ وہ Indian Summers نامی ٹی وی سیریز میں رالف ویلن کے کردار کے ماڈل بھی تھے جو جان ڈرِنگ کو حقیقت سے کچھ زیادہ ہی رنگین بنا کر پیش کرتا ہے۔ تاہم، ان کی مختصر یادداشت، جو India Office Records میں محفوظ ہے، ان کے متحرک اور دلچسپ کیریئر کی غماز ہے۔ وہ ریڈ شرٹ یا خدائی خدمت گار تحریک کے عروج پر پشاور کے کمشنر تھے اور بعد ازاں چارسدہ میں اسسٹنٹ کمشنر مقرر کیے گئے جب ان کے پیش رو پر تین بار قاتلانہ حملے ہوئے۔ وہ دو سال وائسرائے لارڈ ولنگڈن کے پرائیویٹ سیکریٹری بھی رہے۔ اس دوران ان کی ملاقات گاندھی، جناح اور کرپس مشن کے دیگر افراد سے ہوئی۔ انھیں شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلیوں سے خصوصی انسیت تھی۔ چیف سیکریٹری NWFP کی حیثیت سے وہ نہرو کے 1946ء میں وزیرستان، خیبر اور مالاکنڈ کے دورے سے خاصے متاثر نہیں تھے کیوں کہ اس وقت فرقہ

وارانہ کشیدگی یا کمیونل کشیدگی عروج پر تھی اور یہ دورہ کانگریس کے لیے سودمند نہ تھا۔

ڈرِنگ نے تقسیم کے اذیت ناک دنوں میں پشاور میں خدمات انجام دیں اور کہا": پاکستان نے دولت برآمد کی اور غربت درآمد کی۔" چند ماہ بعد انھیں بہاول پور کا وزیرِ اعظم مقرر کیا گیا تا کہ ریاست کو جمہوری نظام میں تبدیل کیا جا سکے جہاں اپنے وزراء اور اسمبلی ہو۔ شروع میں انھیں نواب کا رویہ خاصا "ناخوشگوار" محسوس ہوا جو اپنے اختیارات کے ختم ہونے پر ناراض تھے مگر جلد ہی وہ بدل گئے اور اس تبدیلی کو ناگزیر تسلیم کر لیا اگر چہ وہ پرانے نظام سے وفاداری کا اظہار کرتے اور سیاسی قائدین اور ان کی جماعتوں سے بیزاری دکھاتے تھے"۔ ڈرِنگ نے یہ بھی نوٹ کیا کہ نواب کے اپنے ڈاک کے ٹکٹ حتیٰ کہ ہوائی میل والے ایک مشہور برطانوی کمپنی De La Rue سے چھپوائے گئے تھے اور ان کا تاثر یہی تھا کہ "عام طور پر تمام شہزادے لاڈلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں"۔ ابتدائی تحفظات کے باوجود بحیثیت واحد سفید فام سول افسر انھیں بہاول پور میں ایک ایسی ریاست ملی جو بظاہر پرانے نظام کی حامل تھی لیکن مالی لحاظ سے خوشحال تھی کیوں کہ اس کی زمینیں پنجند بیراج، جہلم، اور ستلج کالونائزیشن اسکیم کی نہروں سے سیراب ہوتی تھیں۔ ریاست کا شعبہ تعمیرات خاصا فعال اور باکمال تھا۔ انھوں نے پنجند سے ایک ضمنی نہر نکالی جس سے جنوبی بہاول پور کی زمین سیراب ہوئی اور رحیم یار خان کو صنعتی مرکز بنانے میں مدد ملی۔ کپاس اور شوگر ملیں قائم ہوئیں اور Pakistan lever نے سبزیوں کے تیل کی مصنوعات کی بڑی فیکٹری لگائی۔ ڈرِنگ کے مطابق": پاکستانی حکومت نے فوراً مرکزی خزانے میں ایک بھاری رقم کے سالانہ عطیے کا مطالبہ کر دیا۔" شاہ کا اندازہ ڈرِنگ کی وفاداریوں کے حوالے سے کچھ حد تک درست تھا۔ آج بھی بہاول پور کا ڈرِنگ اسٹیڈیم ان کے نام پر ہے۔ صلاح الدین عباسی کے مطابق، سر جان کا دل شاید نواب اور ریاست سے زیادہ جُڑا ہوا تھا بجائے اس کے کہ وہ پاکستان کی نئی حکومت سے وفادار ہوتے، ان کی وفاداری کا مرکز شاید وہ پرانا برطانوی باپ جیسا نظام تھا جو ان کے خون اور تجربے کا حصہ تھا۔ شاہ کی پوری کوشش تھی کہ "بہاول پور کے عوام کو مزید تاخیر کے بغیر حکومتِ پاکستان کے پیچھے کھڑا کیا جائے" اور نواب کو محض آئینی کردار تک محدود کر دیا جائے۔ 1949 کا Government of

Bahawalpur Act،نومبر 1948 سے جاری اصلاحات کی ضابطہ بندی تھی جس کا نواب نے اپنی سلور جوبلی کے موقع پر 8مارچ1949 کو بغدادالجدید میں واقع گلزارمحل میں اعلان کیا. اس موقع پر وزیرِ اعظم لیاقت علی خان اور ان کی بیگم بھی موجود تھیں۔ اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا : ریاستی مجلس (State Majlis) جون1949 میں قائم ہوئی۔اس میں 16 منتخب اور 9 نامزدارکان شامل تھے۔ مجلس کوزراعت، جنگلات وغیرہ جیسے منتقل شدہ موضوعات پرقانون سازی کامکمل اختیار حاصل تھا۔وہ محصولات، آبپاشی، پولیس وغیرہ جیسے محفوظ موضوعات پربھی قانون سازی کرسکتی تھی لیکن اس کے تمام فیصلے بہاول پور کے وزیرِ اعظم کی منظوری اورتوثیق سے مشروط تھے۔ 50-1949 کے دوران مجلس نے درج ذیل بل منظور کیے:

1- شریعت اپلیکیشن بل -2-1950انسدادِ بدعنوانی۔ 3- 1950 منتقل شدہ موضوعات پرقانون کی توثیق کا بل 4-انکم ٹیکس (ترمیمی) بل1950

بہاول پورکو پاکستان کی دستورساز اسمبلی میں ایک نشست دی گئی جس کے لیےمولوی فضل حسین (سابق چیف جج) کونامزدکیا گیا۔کرنل اے جے ڈرنگ کو1949 کے Government of Bahawalpur Act کےتحت وزیرِ اعظم مقرر کیا گیا۔ان کی تقرری نواب اور حکومتِ پاکستان کی مشاورت سے ہوئی جیسا کہ ریاست کے نئے آئین میں درج تھا۔نواب کواب بھی مجلس تحلیل کرنے اوروزیرِ اعظم مقررکرنے کا اختیار حاصل تھامگر یہ تقرری پاکستان کی منظوری سے مشروط تھی۔ وزیرِ اعظم کواختیار حاصل تھا کہ وہ مجلس کونظرانداز کرتے ہوئے ریاستی مفاد یا سلامتی کے نام پر قانون بنا سکے۔ درحقیقت مجلس پہلے کی طرح بے اختیار مشیروں کی جماعت بن کر رہ گئی، بس اب نواب خودبھی بےاختیار ہوچکے تھے۔اصل اختیار پاکستان حکومت کے نامزدکردہ وزیرِ اعظم کے پاس تھا۔ باقی سب دکھاوا تھا جوجلد ہی چھن جانا تھا۔مئی1949 میں بہاول پور میں ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ کوشاندار کامیابی ملی، 16 میں سے 15 نشستیں جیتیں۔ یہ عوامی مطالبات کے درکھولنے والالمحہ تھا جومکمل منتخب اسمبلی اورعوامی وزراء کے مطالبے پر منتج ہوااور وفاقی حکومت کومزید اصلاحات نافذ کرنے کا موقع فراہم ہوا۔نواب کوسربراہ ریاست کی حیثیت سے برقرار رکھتے ہوئے معاہدے کی

چارشقوں نے درج ذیل پابندیاں عائد کی گئیں۔

1-وہ ذاتی استعمال کے لیے ریاستی خزانے سے محدود رقم نکال سکتے تھے؛انھیں اپنی جائیداد کی تفصیل حکومت کوفراہم کرنی تھی؛2- شاہی خاندان کواعزازات برقرار رکھنے کی اجازت تھی بشرطیکہ جانشینی کاعمل ریاست کے روایتی اصولوں اورقوانین کے مطابق ہو۔29 اپریل 1951 کو صادق محمد خان اور پاکستان کے گورنر جنرل سرخواجہ ناظم الدین نے ایک معاہدے پر دستخط کیے۔الحاق کی دوسری ضمنی دستاویز یا (Second Supplementary Instrument of Accession) جس کے تحت بہاول پور کو دیگر صوبوں کے مساوی حیثیت حاصل ہوئی۔ دفاعی بجٹ کی بجائے اب مرکزی ٹیکسوں کی خالص آمدنی بہاول پور کو دی گئی اور محفوظ موضوعات کی نگرانی اورانتظام حکومتِ پاکستان نے سنبھال لیا۔ مارچ 1952 میں حکومت بہاول پور عبوری آئین یا Interim Constitution Act (Government of Bahawalpur) کے تحت بہاول پور کو پاکستان کی وفاقی اکائی صوبہ کا درجہ ملا جسے 49 رکنی قانون ساز اسمبلی پانچ سال کے لیے عالمگیر حقِ رائے دہی کی بنیاد پر چلاتی۔اس مرحلے پر نواب کواسمبلی تحلیل کرنے اور قانون سازی پر ویٹو کا اختیار باقی تھا۔ نیز نواب کے خلاف عدالت میں کوئی مقدمہ دائر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ 3 مارچ 1952 کو الحاق کی تیسری ضمنی دستاویز (Third Supplementary Instrument of Accession) پر دستخط کے بعد،نواب کے تمام اختیارات ماسوائے ان جذبات اورروایات کے جورعایا کے دلوں میں ان سے جُڑے تھے ختم ہو گئے۔نواب نے اتفاق کیا کہ ": میرے مشورے سے پاکستان کے گورنر جنرل کے ساتھ مشاورت کے بعد ایک تجربہ کار افسر مقرر کیا جائے گا جو مجھے اپنے اختیارات کے استعمال اور ریاست کی آئینی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مشورہ دے گا۔" اس کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے کہ اگر نواب اپنی کابینہ کے وزراء یا اپنے مذکورہ مشیر کے دیے گئے مشورے سے اختلاف کریں گے تو وہ اس معاملے میں حکومت پاکستان سے مشورہ طلب کریں گے اوراس کے مطابق اس مشورے کوقبول کریں گے۔ جان ڈرنگ نے 1952ء میں بہاول پور کے وزیرِاعظم کے عہدے سے سبکدوشی اختیار کی۔ان کے بعد

مختصر مدت کے لیے مخدوم زادہ حسن محمود کو عبوری وزیرِ اعظم مقرر کیا گیا اور پھر 1953ء سے 1955ء تک اے۔ آر۔ خان وزیرِ اعلیٰ اور نواب کے مشیر کے طور پر کام کرتے رہے۔ 1952ء کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ نے انچاس میں سے پینتیس نشستیں جیتیں؛ اسلامی جماعتوں حزبِ اختلاف اور جماعتِ اسلامی نے بالترتیب گیارہ اور دو نشستیں حاصل کیں جب کہ ایک نشست آزاد امیدوار کو ملی۔ 1952ء میں پاکستان کے اندر بہاول پور کی صوبائی حیثیت کی توثیق، صلاح الدین عباسی کی سیاسی زندگی کا بنیادی ستون رہی ہے۔ 1955ء میں جب "ون یونٹ" کا قیام عمل میں آیا اور بہاول پور مغربی پاکستان میں ضم ہوا تو اسے صوبے کی حیثیت سے شامل کیا گیا اور نواب کو یقین دہانی کروائی گئی کہ اگر یا جب "ون یونٹ" تحلیل ہوا تو بہاول پور کو وفاقی پاکستان میں ایک علیحدہ صوبہ کی حیثیت بحال کر دیا جائے گا۔ آزادی کے بعد بہاول پور کی فلاحی ریاست کے فروغ کا جو عمل شروع ہوا تھا، وہ رکا نہیں بلکہ نواب تعلیم، صحت، مواصلات اور سماجی بہبود کے نئے منصوبوں کے سرپرست یا علامتی رہنما کے طور پر سامنے آتے رہے جنھیں مرکزی حکومت کی طرف سے گرانٹس کی صورت میں امداد حاصل ہوتی تھی۔ انھوں نے بہاول پور میں صادق پبلک اسکول کی تعمیر کے لیے دو ہزار ایکڑ زمین اور فنڈز دیے۔ اس اسکول کا سنگِ بنیاد 4 مارچ 1953 کو نواب نے خود رکھا اور اسکول 18 جنوری 1954 کو، ایک سال سے بھی کم عرصے میں شروع ہو گیا۔ صادق نامہ کے مطابق ": بہاول پور ریاست میں آئینی نظام پوری آب و تاب کے ساتھ کھل کر سامنے آ چکا تھا۔"

زیادہ حقیقت پسندی کے ساتھ کہا جائے تو نئی جمہوری اقدار اور ایک منظّم عدالتی نظام، تعلیم، عبادت گاہوں، صنعت و تجارت اور معاشی بحالی کے میدان میں نئی سرگرمیوں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ جامع مسجد جس کے ساتھ شاپنگ سینٹر اور دفاتر بنائے گئے، کپڑے اور آٹے کی ملیں، ڈیری فارم، پھلوں کے باغات، صابن اور گھی کی فیکٹریاں نیز دیہی صنعتوں اور دستکاریوں کی بحالی کے منصوبے۔ اگرچہ تقسیم، ہجرت اور آبادیوں کی نقل مکانی کے مسائل موجود تھے مگر یہ سارا عمل ابتدا ہی سے شاندار نظم و نسق کے تحت انجام پایا اور نئے آباد کار ریاست میں بخوبی ضم ہو گئے۔ پاکستان اُس وقت تک بہاول پور کے بغیر نہیں چل سکتا تھا جب تک کہ وہ وقت نہ آ پہنچا جب ریاست کی دولت کو

پنجاب بالا دست کے حق میں اس قدر لوٹ لیا گیا کہ لاہور سے ملتان تک موٹر ویز تو بن گئیں مگر اب انھیں بہاول پور جیسے "پسماندہ" سابقہ صوبے تک لے جانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ (یہ غالباً مصنفہ سے خاص طور پر لکھوایا گیا جملہ لگتا ہے۔ مترجم)

اکتوبر 1951ء میں لیاقت علی خان کے قتل کے بعد، خواجہ ناظم الدین نے وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا اور اپریل 1953 میں محمد علی بوگرہ ان کے جانشین بنے۔ بوگرہ بھی ناظم الدین کی طرح بنگالی تھے اور ایک ایسے ملک کو چلانے کی کوشش کر رہے تھے جو دو بازوؤں پر مشتمل تھا، مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان کی ریاستوں اور صوبوں کا مجموعہ۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان 1600 کلومیٹر کا بھارتی علاقہ حائل تھا جو دشمن تصور کیا جاتا تھا اور ان دونوں میں تقریباً ہر پہلو سے اختلاف تھا، سوا مذہب کے۔ مشرقی پاکستان اپنی معاشی پسماندگی کا ذمہ دار مغربی پاکستان میں قائم دور دراز کی مرکزی حکومت کو ٹھہراتا تھا اور وہاں خودمختاری کی تحریک زور پکڑتی گئی۔ 1954ء کے قانون ساز انتخابات میں مشرقی بنگال میں متحدہ محاذ (UnitedFront) نے مسلم لیگ کے خلاف قوم پرست اور بائیں بازو کی جماعتوں کے اتحاد کی شکل میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ اس انتخابی شکست کے بعد مرکز میں اقتدار کی کشمکش پیدا ہوئی اور گورنر جنرل نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی۔ اس سیاسی بحران کے نتیجے میں وزیر اعظم بوگرہ نے نومبر 1954ء میں "ون یونٹ پالیسی" کا اعلان کیا، جس میں کہا گیا:

> "نہ کوئی بنگالی ہوگا، نہ پنجابی، نہ سندھی، نہ پٹھان، نہ بلوچ، نہ
> بہاول پوری، نہ خیر پوری اور ان گروہوں کے خاتمے سے پاکستان
> کی وحدت مزید مضبوط ہوگی۔"

ملک کے دونوں بازو (مشرقی و مغربی پاکستان) ایک دوسرے سے خودمختاری کے اصول پر الگ الگ ہوتے ہوئے اجتماعی طور پر ایک وحدت کے طور پر کام کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے بشرطیکہ ایک دوسرے پر بوجھ نہ بنیں۔ ڈان کے 2011ء کے شمارے میں شائع شدہ ایک "یادگاری مضمون" کے مطابق": سیاسی وحدت کے پیشِ نظر ضروری ہو گیا تھا کہ ان دونوں ریاستوں کا انضمام ہو جائے جس پر آخری نواب نے رضامندی ظاہر کی۔ 17" دسمبر 1954 کو نواب بہاول پور نے "بہاول پور انضمامی معاہدہ" پر دستخط کیے": بہاول پور ریاست اور پاکستان کے ڈومینین دونوں کے مفاد میں یہ ضروری ہے کہ بہاول پور کی سرزمین پاکستان کے ڈومینین کو تفویض کی

جائے اور اسے مغربی پاکستان کہلانے والی مجوزہ اکائی میں ضم کیا جائے۔ اس دن سے، پاکستان کی حکومت اس ریاست اور اس کی سرزمین کے نظم ونسق کے لیے تمام اختیارات، اقتدار اور دائرہ اختیار استعمال کرے گی اور جس ادارے کے ذریعے وہ چاہے اسے نافذ کرے گی۔ یہ معاہدہ اب تک کے تمام "انسٹرومنٹس آف اکسیشن" اور گورنر جنرل پاکستان ونواب بہاول پور کے مابین ہونے والے تمام معاہدوں کو منسوخ کرتا ہے۔" یوں بہاول پور ریاست ایک انتظامی ڈویژن بن گئی جس میں تین اضلاع شامل تھے: بہاول پور، بہاولنگر، اور رحیم یار خان۔ نواب کو سالانہ 32 لاکھ روپے (32,00,000) کی پنشن دی گئی۔ وہ زیادہ عمر رسیدہ نہیں تھے مگر قریب نصف صدی پہلے انھوں نے تخت وتاج کی تلخ وراثت سنبھالی تھی۔ ان کی زندگی کی آخری جھلکیاں ایک پرعزم بچے کی صورت میں سامنے آئیں جو برٹش راج کے ایک عظیم الشان دربار میں سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا—اب وہ سب قصہ پارینہ ہو چکا تھا۔ اپنے الوداعی پیغام میں نواب نے بہاول پور کے عوام سے کہا:

> " آپ اور میرے خاندان کے درمیان جو تعلقات کئی سو سالوں سے چلے آرہے تھے، اب ختم ہونے جا رہے ہیں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے گذشتہ پچاس برسوں میں مجھے محبت، خلوص، تعاون اور وفاداری دی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ پاکستان کے لیے وفادار رہیں گے۔ میری زندگی کے آخری لمحے تک میں آپ کی ترقی اور بہبود میں دلچسپی لیتا رہوں گا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، آپ کا خیال رکھے اور آپ کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔"

صادق محمد خان نے اگرچہ کچھ وقت بہاول پور میں گزارنا جاری رکھا مگر ان کی زندگی ایک امیر، ریٹائرڈ اور عمومی طور پر گوشہ نشین انگریز نواب کی سی بن گئی جو سسیکس اور لندن میں بسر کرتے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے محمد عباس عباسی نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف اور صدرِ پاکستان جنرل ایوب خان کی درخواست پر سیاست میں قدم رکھا۔ یہ شمولیت بنیادی جمہوریتوں کے پیچیدہ نظام کے ذریعے ہوئی جو ایوب خان نے 1960 میں قومی اسمبلی کے انتخابات اور 1965 میں محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف اپنی دوبارہ کامیاب صدارتی انتخابی مہم کے لیے متعارف کروایا تھا جس پر دھاندلی اور قتل

کے الزامات بھی لگے۔ عباس عباسی ہمیشہ بلا مقابلہ منتخب ہوتے رہے۔ ان کے والد کا خیال تھا کہ مقامی مخالف کے خلاف لڑنے کی بجائے یہ طریقہ نسبتاً زیادہ باوقار ہے۔ پاکستان کے وسیع تر علاقوں میں قبائلی سردار حسبِ سابق حکومت اور ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ 2006ء میں بلوچستان میں نواب اکبر بگٹی اسی جنگ میں، ایک پہاڑی غار میں سرکاری گولہ باری کی زد میں آ کر انتقال کر گئے۔ وہ بلوچستان کو مزید خودمختاری دلانے کے لیے برسرِ پیکار تھے۔ بہاول پور کے حالیہ خاندانی اور ریاستی تنازعات اب زیادہ تر جدید جمہوری اور عدالتی میدانوں میں لڑے جا رہے ہیں، ایک ایسی ریاست میں جو بظاہر مہذب اور جدید ہے۔

1930ء اور 1940ء کی دہائیوں میں لندن میں صادق محمد خان کی پرتعیش زندگی Savoy ہوٹل کے سوئٹ، درباریوں اور خدام کے لیے الگ رہائش اور 1937ء کی پرتعیش خریداری اب ماضی کا قصہ بن چکی تھی۔ وہ شاید Quaglino's میں دوپہر کے کھانے یا Bond Street کے Asprey اور Garrard جو کہ شاہی جیولرز تھے جاتے ہوں گے۔ Regent Street کے ان بورڈ رومز کی دیواروں پر اب بھی بہاول پور کے زیورات کے خاکے آویزاں تھے لیکن صادق محمد خان اب عمر رسیدہ اور بیمار ہو چکے تھے۔ ان کی شاہانہ زندگی کھوکھلی ہو چکی تھی اور وہ نسبتاً مالی طور پر کمزور ہو گئے تھے۔ وہ ذیابیطس کے مریض تھے اور برطانوی اشرافیہ، سماجی تقریبات، کھیلوں اور ملکیتی دعوؤں کی دنیا سے کٹ کر تنہائی کی زندگی گزار رہے تھے۔ کچھ پرانی عادتیں بہرحال ختم نہ ہو سکیں۔ ان کے پوتے کو یاد ہے کہ وہ اب بھی Moyses Stevens شاہی پھول فروش سے باقاعدگی سے پھول منگواتے اور بکنگھم پیلس میں ملکہ کو کارڈ بھجواتے تھے جیسے ماضی میں نواب کے انگلستان آمد پر روایت تھی۔ وہ نہ شکاری تھے نہ پولو کھیلتے تھے، برخلاف اپنے بیٹے کے لیکن وہ ماضی میں بکنگھم پیلس کے باقاعدہ مہمان رہ چکے تھے۔ اب وہ ویسٹ منسٹر میں ایک غیر نمایاں فلیٹ یا سسیکس میں اپنی بیوی، لیڈی اولیویا (Lady O) کے ساتھ مقیم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ صادق محمد خان نے لیڈی او کی پہلی شادی سے بیٹی کو خاصی قیمتی زیورات وراثت میں دیے۔

انھوں نے انگلینڈ میں ان لوگوں کے ساتھ بھی ویسی ہی وفاداریاں قائم رکھیں جیسے بہاول

پور میں جنرل مارڈن یا پینڈرل مون کے تحت اپنی رعایا سے رکھتے تھے۔ صلاح الدین عباسی کو الفریڈ سمنز یاد ہیں جو ان کے مشیر اور ہمہ کار کارندے لگتے تھے اور ان کے بھائی مسٹر سمنز بھی، جو ان کے دادا کے درزی تھے اور بہاول پور آئے تھے۔ ایک انگریز ڈرائیور مسٹر اسمتھ ان کی بیوی کے لیے موجود تھا نیز خانساماں مسٹر اور مسز ہر بنڈ بھی۔ ان کے کئی ملازمین، خصوصاً آئرش ملازمہ مس گریفن، جو ان کی دادی کی خادمہ رہ چکی تھیں، بڑی محبت سے یاد کی جاتی ہیں۔ وہ لندن میں نواب کی دیکھ بھال کرتی رہیں اور نوے سال کی عمر تک ان کے لیے سودا سلف لایا کرتی تھیں۔ صادق محمد خان عباسی کا انتقال 24 مئی 1966 کو لندن میں ہوا۔ ان کی میت پاکستان واپس لائی گئی اور صحرائے چولستان میں دراوڑ کے مقام پر توپ گاڑی میں لے جا کر دفن کی گئی۔

ان کی زندگی کے آخری برسوں کی یادیں شیلا کووے (SheilaCovey) جو سسیکس میں ان کے سابقہ ہیڈ مالی کی بیٹی تھیں، نے 2009ء میں Parish Graffham News میں کچھ یوں رقم کیں:

"امیر بہاول پور نے 1930ء کی دہائی میں انگلینڈ کو اپنی سالانہ چھٹیاں گزارنے کے لیے آنا شروع کیا۔ انھوں نے فرنام (Farnham Surrey) کے مضافات میں ایک خوب صورت گھر خریدا۔ 1939 سے 1945 کی جنگ کے دوران وہ ملک سے باہر نہیں جا سکے لہٰذا انھوں نے اپنا گھر حکومت کے حوالے کر دیا تاکہ اسے بچوں کی نرسری (شاید جنگ زدگان کے لیے) بنایا جا سکے۔ انھوں نے جنگ زدہ علاقوں میں موبائل کینٹین بھی فراہم کی۔ جنگ کے خاتمے پر ان کا گھر انھیں واپس ملا اور وہ ہر سال چھٹیوں کے لیے انگلینڈ آتے رہے۔ 1948ء میں جب Selham House فروخت کے لیے آیا تو انھوں نے فرنام کا گھر بیچ کر سیلہام منتقل ہو گئے۔ میرے والد ولیم ٹلبری (William Tilbury) کو انھوں نے ہیڈ مالی اور منیجر مقرر کیا اور وہ ان کے ساتھ سیلہام منتقل ہو گئے۔ میرے والد کے لیے اس نے 35 برس کام کیا، اور وہ ہمہ وقت 'آن کال' رہتے تھے۔ سیلہام میں نواب نے ایک مستقل خانساماں، خادمہ اور بٹلر رکھا ہوا تھا اور جب وہ قیام پذیر ہوتے تو مقامی افراد کو بھی ملازم رکھتے۔ ان کے ڈرائیور کا قیام لندن میں ہوتا اور نواب ہفتے میں 2 سے 3 دن

لندن میں گزارتے۔ انگریز عملہ پورے گھر کا انتظام سنبھالتا۔

بہاول پور سے ان کے ذاتی ملازمین ہر سال لائے جاتے اور ان کے لیے علیحدہ رہائش ہوتی۔ نواب، نوکروں کے کوارٹر سے گزرتے وقت توقع رکھتے کہ سب کہیں: " گڈ آفٹر نون، یور ہائینس"! مگر انگریز خدام اکثر انھیں پہچان نہیں پاتے تھے۔ وہ ایک زندہ دل شخصیت کے مالک تھے جنھیں نایاب پرندوں اور جانوروں سے گہرا شغف تھا۔ سیلہام ہاؤس میں ان کے پاس ایک میکاؤ طوطا، طوطے، فاختائیں، مختلف نسلوں کے خرگوش، بٹیر، کتے، بلیاں، گائیں، اور خوب صورت گھوڑے تھے، جن پر وہ اپنی جائیداد اور قریبی جنگلات میں سوار ہوتے۔

اگرچہ گھر کی تزئین نہایت خوب صورت تھی، نواب چاہتے تھے کہ جانور آزاد پھریں، انھیں کسی نقصان سے پریشانی نہ ہوتی۔ ایک خاکستری طوطا تو انسانی آواز کی نقل کرتا، "لیفٹ، رائٹ، لیفٹ، رائٹ، ووہ"! کہتا، اور 'مسٹر ٹلبری' بھی پکارا کرتا۔ وہ عورتوں کی آواز، ٹیلیفون کی گھنٹی، اور ریڈیو کی آوازوں کی بھی نقل کرتا۔ نواب نے دودھ کے لیے گائیں خریدیں مگر بیگم صاحبہ وزن بڑھنے سے نالاں ہوئیں تو گائیں فروخت کر دی گئیں۔ باغ میں نواب کو چمکدار رنگ پسند تھے۔ میرے والد ہزاروں پودوں کی قلمیں تیار کرتے۔ وہ بیج بھی خود جمع کرتے (سوائے میٹھی مٹر کے)۔ ان کے پاس باغبانی کا عملہ تھا اور ہیڈ مالی مسٹر الف سارجنٹ سیلہام میں مقیم تھے۔ نواب کو گاڑیوں کا شوق تھا، ہمیشہ چاندی اور سیاہ رنگ کی گاڑیاں رکھتے جن میں ایک رولز رائس تھی۔ 'مسز ہائینس' (بیگم صاحبہ) کے پاس نیلا جیگوار ہوتا۔ نواب بہاول پور کو ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا شوق تھا، ان کے پاس ایک نایاب ذخیرہ تھا۔ انھیں کھلونوں کی ریل گاڑیوں کا بھی شوق تھا اور انھوں نے مختلف ملکوں کی منی ٹرینوں کا شاندار مجموعہ ترتیب دیا تھا۔

نواب ایک نہایت فیاض انسان تھے۔ ایک موقع پر وہ "دی تھری مولز" کے قریب سڑک پر بچوں کو کرکٹ کھیلتے دیکھ کر واپس آئے تو فوراً اپنے لندن کے وکیل، مسٹر سمنڈز، کو فون کیا اور ان سے کہا کہ بچوں کے لیے مکمل اور بہتر کرکٹ کا سامان بھجوایا جائے۔ انھوں نے کئی سالوں تک مقامی بچوں کے لیے "ایمپائر ہال" میں ہر سال ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ ان تقریبات میں اعلیٰ درجے کے

فنکار اور کیٹررز آتے اور تمام بچوں کو خوب صورت تحائف دیے جاتے۔ یہ تحائف سب کے سب لندن سے بھیجے جاتے تھے۔ یہ پارٹیاں 1940ء کی آخری دہائی میں شروع ہوئیں اور 1960ء کی دہائی تک جاری رہیں۔ وہ نہایت شائستہ اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ جب بھی پاکستان واپسی کا وقت آتا، وہ ہمیشہ میرے والد (عباس خاں عباسی) سے مصافحہ کرتے اور انھیں ایک ایسا تحفہ دیتے جس پر ان کا ذاتی نشان (مونوگرام) ہوتا تھا۔ انھوں نے 1954 تک سیلہام میں تعطیلات گزارنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر انھیں معلوم ہوا کہ ان کا فرنام والا مکان دوبارہ فروخت کے لیے دستیاب ہے تو انھوں نے فوراً اسے خرید لیا اور واپس وہاں منتقل ہو گئے، اور سیلہام ہاؤس کو فروخت کے لیے لگا دیا۔ بدقسمتی سے سیلہام ہاؤس فروخت نہ ہو سکا چناں چہ انھیں مشورہ دیا گیا کہ دونوں جائیدادیں بازار میں برائے فروخت پیش کریں۔ فرنام والا مکان جلد فروخت ہو گیا اس لیے وہ دوبارہ سیلہام واپس آ گئے۔ وہ ہر سال وہاں آتے رہے یہاں تک کہ 1960ء کی دہائی کے وسط میں ان کا انتقال ہو گیا۔

جون 1966 میں، بریگیڈیئر محمد عباس خان عباسی کو باقاعدہ طور پر صدرِ اسلامی جمہوریہ پاکستان، جنرل ایوب خان نے امیرِ بہاول پور تسلیم کیا۔ انھیں 16,00,000 (سولہ لاکھ) روپے سالانہ 'پرائیوی پرس (وظیفہ) دیا گیا جو ٹیکس سے مستثنیٰ تھا تاکہ وہ اور ان کا خاندان اپنی تمام ذاتی ضروریات مثلاً: ملازمین کی تنخواہیں، ذاتی محافظ، دورے، مہمان نوازی، رہائش کی دیکھ بھال، شادی بیاہ اور دیگر خاندانی تقاریب کو پورا کر سکیں، بشرطیکہ وہ": بطور پاکستانی شہری اپنی ذمہ داریاں دیانت داری سے ادا کرتے رہیں۔"

☆☆☆☆☆

بہاول پور کی حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان طے پانے والے تمام معاہدے

(1833 تا 1843)

معاہدہ نمبر 1

عہد نامہ جو معزز ایسٹ انڈیا کمپنی اور نواب بہاول خان، حکمران ریاست بہاول پور کے مابین 2 فروری 1833ء کو طے پایا:

خدا کے فضل سے، معزز ایسٹ انڈیا کمپنی اور ریاست بہاول پور کے درمیان دوستانہ تعلق جو جناب مسٹر الفنسٹون کے 09-1808ء میں کابل کے سفر کے موقع پر قائم ہوا، اب تک بلاتعطل قائم رہا ہے اور اب جب کہ کیپٹن سی۔ ایم۔ ویڈ، سیاسی ایجنٹ لدھیانہ، معزز لارڈ ڈبلیو۔ بینٹنک، G.C.B., G.C.H., گورنر جنرل برٹش انڈیا کی جانب سے بہاول پور پہنچے ہیں تاکہ ان دوستانہ روابط کو مزید مضبوط کیا جا سکے اور دریاؤں سندھ وستلج کی تجارت کے لیے راہیں کھولی جا سکیں جو کہ خدا کو پسند اور گرد ونواح کی ریاستوں کی ترقی کے لیے مفید ہے، تو ذیل میں درج دفعات ایک باقاعدہ معاہدے کی صورت میں مرتب ہوئیں:

یہ معاہدہ معزز ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ایک طرف اور نواب رکن الدولہ، حافظ الملک مخلص الدولہ محمد بہاول خان عباسی، نصرت جنگ بہادر، رئیسِ داؤد پوترہ کی جانب سے دوسری طرف، دونوں ریاستوں کے باہمی دوستانہ تعلقات کے قیام، دریائی تجارت کے آغاز اور اس سے متعلقہ انتظامات کو ضابطہ میں لانے کے لیے طے پایا۔

دفعہ I۔معزز ایسٹ انڈیا کمپنی اورنواب محمد بہاول خان، اُن کے وارثین و جانشینوں کے درمیان ابدی دوستی اوراتحاد قائم رہے گا۔

دفعہ II۔ معزز ایسٹ انڈیا کمپنی اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ وہ ریاست بہاول پور کی وراثتی یا دیگر املاک میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گی۔

دفعہ III۔ریاست کے داخلی انتظامات اور اپنی رعایا پر نواب کی حاکمیت میں کوئی دخل اندازی نہیں کی جائے گی اورنواب پہلے کی طرح مکمل خودمختار رہیں گے۔

دفعہ IV۔جوافسر برٹش حکومت کی طرف سے ریاست بہاول پور میں تعینات ہوگا وہ بھی نواب کی حکومت میں دخل اندازی سے باز رہے گا اور دونوں حکومتوں کے دوستانہ تعلقات کا احترام کرے گا۔

دفعہ V۔معزز ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے دریائے سندھ وستلج اور ریاست بہاول پور کی سڑکوں کو ہندوستان کے تاجروں کے لیے استعمال کی اجازت طلب کی گئی جسے نواب نے منظور کرتے ہوئے یہ شرط رکھی کہ متعلقہ اشخاص کے پاس پاسپورٹ ہونا ضروری ہے۔

دفعہ VI۔حکومتِ بہاول پور اس بات کی پابند ہوگی کہ برطانوی حکومت کے ساتھ مشاورت سے مناسب اور معتدل محصولات مقرر کرے گی اور فریقین کی رضامندی کے بغیر ان میں کسی قسم کا اضافہ یا کمی نہیں کی جائے گی۔

دفعہ VII۔مقررہ محصولات کی تفصیلات عوامی اطلاع کے لیے شائع کی جائیں گی، اور کسٹم آفیسرز و محصول اکٹھا کرنے والے کوسختی سے ہدایت کی جائے گی کہ محصولات وصول کرنے کے بعد سامانِ تجارت کوکسی بہانے یا حکم کے انتظار میں نہ روکا جائے۔

دفعہ VIII۔ جومحصولاتی جدول مقرر ہوگا وہ صرف اسی مخصوص دریائی گزرگاہ پر لاگو ہوگا اور کسی دوسرے زمینی یا دریائی راستے پر نافذ نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ IX۔ جوتاجر اس راستے کو استعمال کریں وہ نواب کی اتھارٹی کا احترام کریں گے اور ملک کے مذہبی وتمدنی اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔

دفعہ X۔نواب کو حاصل ہونے والی محصولات نواب کے مقرر کردہ افسروں کے ذریعہ جمع کی جائیں گی۔

دفعہ XI۔سامان کی جانچ اور محصول کی وصولی کے لیے حکومت بہاول پور کے افسران صرف مٹھن کوٹ اور ہر یکیے سامنے تعینات کیے جائیں گے اور انہی مقامات پر کشتیوں کی تلاشی یا روک کی اجازت (permissible) ہوگی۔

دفعہ XII۔اگر کشتی والے از خود کسی مقام پر سامان اتاریں یا لادیں تو اس پر مقامی محصول لاگو ہوگا۔

دفعہ XIII۔مٹھن کوٹ پر تعینات افسر سامان کی تفتیش کر کے مقررہ محصول لے گا اور پاسپورٹ جاری کرے گا۔ ہرّ یکے پر دوسرا افسر اس پاسپورٹ کا موازنہ کرے گا اور زائد سامان پر محصول وصول کرے گا، باقی مال بغیر رکاوٹ گزرے گا۔

دفعہ XIV۔یہی اصول ہر یکے سے سندھ آنے والی کشتیوں پر بھی لاگو ہوں گے۔

دفعہ XV۔تجارتی راستے پر نواب کے افسر تاجروں کو مکمل تحفظ فراہم کریں گے، اور رات کے وقت کسی مقام پر ٹھہرنے پر تاجروں کو متعلقہ تھانیدار کو اپنا پاسپورٹ دکھا کر تحفظ لینا ہوگا۔

دفعہ XVI۔اس معاہدے کی تمام دفعات خواہ داخلی معاملات سے ہوں یا تجارت سے، باہمی طور پر نافذ العمل رہیں گی اور دونوں ریاستوں کے درمیان مستقل دوستی کی ضمانت ہوں گی۔

مقام: بہاول پور تاریخ: 22 فروری 1833

(دستخط) Bentinck C.H. منظور شدہ: 13 ستمبر 1833، گورنر جنرل ان کونسل کی جانب سے

معاہدہ نمبر 2

ایسٹ انڈیا کمپنی اور حکومت بہاول پور کے درمیان تکمیلی معاہدے کی دفعات

جہاں تک 22 فروری 1833 کے معاہدے کی دفعہ VI کا تعلق ہے، اس میں طے پایا تھا

کہ دونوں حکومتیں مشترکہ مشورے سے ایک معتدل نرخوں پر محصول نافذ کریں گی جو دریاؤں سندھ اور ستلج کے ذریعہ گزرنے والے سامان پر لاگو ہوں گے لیکن موجودہ حالات میں چوں کہ ان علاقوں کو محصولاتی امور کا تجربہ کم ہے لہٰذا یہ فیصلہ ہوا کہ "قیمت یا مقدار" پر مبنی محصول کے بجائے اب "چنگی" (Auctrai) نافذ کی جائے گی۔

دفعہ I۔ ہر کشتی پر خواہ اس کا سائز یا وزن کچھ بھی ہو، جو سمندر اور روپوڑ کے درمیان دریاؤں میں سامان لے کر چلے، ایک یکساں چنگی 570 روپے ہوگی۔ یہ رقم مختلف ریاستوں میں ان کے دریائی حدود کے مطابق تقسیم کی جائے گی۔

دفعہ II۔ اس میں سے حکومتِ بہاول پور کا حصہ 106 روپے 2.1/2 آنے ہوگا جو مٹھن کوٹ پر، سمندر سے روپوڑ جانے والی کشتیوں پر (اور ہرّ یکے پٹّن کے قریب) روپوڑ سے سمندر آنے والی کشتیوں پر وصول کیا جائے گا۔ کسی اور جگہ یہ محصول وصول نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ III۔ چنگی کی وصولی کے عمل کو مؤثر بنانے اور ممکنہ اختلافات کے حل کے لیے، برطانوی حکومت ایک افسر کو مٹھن کوٹ اور ایک مقامی ایجنٹ کو ہرّ یکے پٹّن پر تعینات کرے گی جو لدھیانہ کے برٹش ایجنٹ کے ماتحت ہوں گے۔ دیگر ریاستیں بھی اپنے ایجنٹ مقرر کریں گی۔

دفعہ IV۔ برطانوی افسر جو مٹھن کوٹ پر تعینات ہوگا تجارت میں مداخلت نہیں کرے گا اور سابقہ معاہدے کی دفعہ IV کے مطابق بہاول پور حکومت کے داخلی امور میں بھی دخل نہیں دے گا۔

دفعہ V۔ کسی تاجر کی جانب سے جھوٹے الزامات سے بچنے کے لیے، ان سے پاسپورٹ کے حصول کے وقت اپنے سامان کی باقاعدہ رسید پیش کرنے کی شرط ہوگی۔

دفعہ VI۔ 22 فروری 1833 کے معاہدے کی دفعہ VI، VII، XI، XIII اور XIV منسوخ کر دی گئی ہیں اور ان کی جگہ موجودہ دفعات نافذ العمل ہوں گی۔

(اصل نقل اور ترجمہ) دستخط (C.M Wade) سیاسی ایجنٹ) دستخط (C.W Bentinck)

منظوری: 5 مارچ 1835، گورنر جنرل ان کونسل

معاہدہ نمبر 3

دریاؤں سندھ و ستلج میں چلنے والی کشتیوں پر ریاست بہاول پور میں وصول کی جانے والی چنگیوں کی تفصیلی فہرست

معاہدہ 27 شعبان 1250 ہجری / 29 دسمبر 1834ء کے مطابق حکومت بہاول پور کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ درج ذیل مقامات پر ہر کشتی پر 106 روپے 12 آنے 3 پائی کی چنگی وصول کرے لیکن چوں کہ بعض کشتیاں مکمل حدود سے نہیں گزرتیں بلکہ راستے میں رکتی یا واپسی کرتی ہیں اس لیے چنگی کی رقم درج ذیل مقامات کی نسبت سے وصول کی جائے گی:

1۔محصول کی شرح (مخصوص راستوں کے لیے)

(الف) کشتیوں پر محصول۔ مشرقی سرحد سے مختلف مقامات تک اور واپسی پر:

راستہ محصول (روپے۔ آنے۔ پائی)

مشرقی سرحد سے خیر پو اور واپسی پر 53-6-1½

مشرقی سرحد سے بہاول پور اور واپسی پر 66-1-8

مشرقی سرحد سے چاچڑاں اور واپسی پر 93-6-8½

شمال مشرقی سرحد سے جنوب مغربی سرحد تک اور واپسی پر 106-12-3

(ب) کشتیوں پر محصول۔ جنوب مشرقی سرحد سے مختلف مقامات تک اور واپسی پر:

راستہ محصول (روپے۔ آنے۔ پائی)

جنوب مشرقی سرحد سے چاچڑاں اور واپسی پر 13-5-6

جنوب مغربی سرحد سے بہاول پور اور واپسی پر 40-6

جنوب مغربی سرحد سے خیر پور اور واپسی پر 53-6-1½

جنوب مغربی سرحد سے شمال مشرقی سرحد اور واپسی پر 3-12-106

(ج) کشتیوں پر محصول - پنجاب کے دریاؤں سے سندھ و ستلج کے راستے: راستہ اور (محصول روپے - آنے - پائی)

1- بکری گھاٹ (Bakri Ferry) سے جنوب مغربی سرحد، بہاول پور اور غیر ملکی علاقے تک یا واپسی پر 0-1-1-6 2- بکری گھاٹ سے شمال مشرقی سرحد اور غیر ملکی علاقے تک یا واپسی پر 2½-1-80

2۔ دیگر شرائط:

(1) خالی کشتیوں پر کوئی محصول عائد نہیں ہوگا۔

(2) جہاں کہیں بھی تاجر بہاول پور کے علاقے میں سامان خریدیں یا فروخت کریں، انھیں وہاں کی مقررہ مقامی کسٹم ڈیوٹی ادا کرنی ہوگی۔

(منظوری اور دستخط)

(دستخط شدہ (ایف۔ میکسن) گورنر جنرل آف انڈیا کی منظوری 12 کتوبر 1833

معاہدہ نمبر 4

ستلج اور سندھ دریا پر تجارتی کشتیوں کے لیے مجوزہ نرخ

نواب بہاول خان کے اپنے تاجروں اور رعایا کو مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے ریاست بہاول پور کی حدود سے گزرنے کے لیے ادا کی جانے والی چنگی

دفعہ I۔ گندم، لکڑی اور چونا، لاہور کی حدود کی طرح مفت ہوں گے۔

دفعہ II۔ مندرجہ بالا تین اشیاء کے علاوہ، تمام اقسام کی تجارت پر محصول لاگو ہوگا جو

کشتیوں کے تین سائزوں کے مطابق ہوگا۔

دفعہ III۔ جو کشتی 250 من سامان سے زائد لے جانے کے قابل نہ ہو اور روجھان یا کوٹ مٹھن سے روانہ ہو کر پہاڑوں کے سامنے والے علاقوں، روپوڑ، لدھیانہ وغیرہ کی طرف جائے یا روپوڑ، لدھیانہ سے روجھان یا کوٹ مٹھن کی طرف:.10 روپے

اگر کشتی کا وزن 250 من سے زیادہ ہو مگر 500 من سے کم:20 روپے

اگر کشتی 500 من سے زیادہ ہو:,,40 روپے

دفعہ IV۔ تمام کشتیوں پر بڑے حروف میں نمبر 1، 2، 3 لکھا جائے تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ کشتی کس درجے میں شمار ہوتی ہے۔

تاریخ:5 اگست 1840، مطابق 5 جمادی الثانی 1256 ہجری (درست ترجمہ) (دستخط) Clerk,George) ایڈ جوٹنٹ گورنر جنرل

منظور شدہ از گورنر جنرل آف انڈیا، کونسل میں، مورخہ 31 اگست 1840

معاہدہ نمبر۔5

معاہدہ بابت محصولات برآمد و درآمد اشیاء پر

ریاست بہاول پور سے گزرنے والی تجارت پر محصولات کے نفاذ کا معاہدہ

(نواب بہاول پور کی رعایا اور تجارتی ادارے مستثنیٰ ہیں) مندرجہ ذیل دفعات پر برطانوی اور بہاول پور حکومت کے درمیان اتفاق رائے ہوا:

اول۔ وہ کشتیاں جو ریاست بہاول پور سے گزرتے ہوئے اوپر یا نیچے دریا میں سامان لے جا رہی ہوں، ان پر محصول صرف موجودہ مقررہ نرخ کا آدھا ہوگا۔ دوم۔ جو سامان خشکی کے راستے

گزرے، اس پر مندرجہ ذیل کے علاوہ کوئی اور محصول لاگو نہ ہوگا:

دوم۔ایک بیل گاڑی پر لدی ہوئی مال برداری .2 روپے، ایک اونٹ پر لدی ہوئی مال برداری: 1روپیہ، ایک خچر، گھوڑے، بیل یا گدھے پر لدی ہوئی مال برداری: 8روپے

سوم۔کوئی بھی تاجر جو "پاسپورٹ" یا "روانہ" رکھتا ہو، جیسا کہ معاہدے کے ساتھ منسلک نمونہ میں درج ہے، اُسے راستے میں بغیر کسی تنگی یا تلاش کے بخیر و عافیت گزرنے کی اجازت ہوگی۔

چہارم۔اگر کوئی تاجر راستے میں کسی مقام پر مال خریدے یا بیچے تو اُسے اس مقام پر مقامی معمول کے مطابق محصول ادا کرنا ہوگا۔

پنجم — چوں کہ بہاول پور سے سرسا تک راستے میں کہیں بھی پختہ کنویں یا مسافر سرائیں موجود نہیں لہٰذا حکومت بہاول پور اس امر کی پابند ہوگی کہ وہ اپنی حدود میں ہر مرحلے پر پختہ کنویں اور مسافر سرائیں قائم کرے اور سڑک کی بھی مرمت با قاعدہ کرتی رہے تا کہ مسافروں کو سہولت میسر ہو۔

ششم۔معاہدہ دونوں حکومتوں کے درمیان قائم دوستی کے تحت تیار کیا گیا ہے تا کہ تاجر اطمینان و اعتماد کے ساتھ تجارت میں مشغول رہیں۔تاریخ: 15 شعبان 1259 ہجری، مطابق 11 ستمبر 1843 (دستخط) .C.N.R" Hamilton کلکتہ گزٹ" میں شائع شدہ، گورنر جنرل آف انڈیا کی کونسل کے حکم پر، مورخہ 28 اکتوبر 1843

☆☆☆☆☆

حکومت پاکستان اور ریاست بہاول پور کے درمیان الحاق سے انضمام تک اور اس کے بعد جانشینی اور وظیفے کے اجرا کے معاہدے اور صدارتی احکام

(5 اکتوبر 1947 تا 4 جون 1966)

1- ریاست بہاول پور کا معاہدہ الحاق

چوں کہ قانون آزادی ہند 1947 کے تحت، پندرہ اگست 1947 سے ایک آزاد مملکت جس کا نام پاکستان ہوگا، قائم کی گئی ہے اور یہ کہ قانون حکومت ہند 1935، جس میں گورنر جنرل کی جانب سے مقرر کردہ حذف، اضافے، تطبیقات اور ترامیم کے ساتھ، پاکستان کے دائرہ اختیار میں نافذ العمل ہوگا؛

اور چوں کہ قانون حکومت ہند 1935، جیسا کہ گورنر جنرل کی جانب سے وضع کردہ ترامیم کے ساتھ نافذ ہے، یہ اجازت دیتا ہے کہ کوئی ریاستِ ہند الحاق کے معاہدے کے ذریعے پاکستان کے وفاق سے الحاق کر سکتی ہے لہٰذا:

میں، صادق محمد خان عباسی، امیرِ ریاست بہاول پور، اپنی ریاست میں اپنی خودمختاری کے اختیار سے یہ معاہدہ الحاق مکمل طور پر اپنی مرضی و ارادہ سے طے کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ:

1۔ میں اس معاہدے کے ذریعے ریاست بہاول پور کو پاکستان کے وفاق میں شامل کرتا ہوں۔ اس ارادے کے ساتھ کہ پاکستان کا گورنر جنرل، وفاقی مقنّنہ، وفاقی عدالت اور وفاق کے مقاصد کے لیے قائم کردہ کوئی بھی وفاقی مقتدرہ اس معاہدے کی شرائط کے تابع، صرف وفاق کے مقاصد کے لیے، ریاست بہاول پور جسے آئندہ اس دستاویز میں "یہ ریاست" کہا جائے گا، سے

متعلق وہ تمام اختیارات استعمال کریں گے جو انھیں قانون حکومت ہند 1935 جیسا کہ 15 اگست 1947ء کو پاکستان میں نافذ تھا، کے تحت حاصل ہوں گے۔

2۔ میں اس بات کی ذمہ داری لیتا ہوں کہ مذکورہ قانون (یعنی قانون حکومت ہند 1935) جتنا وہ اس ریاست پر اس معاہدے کے تحت لاگو ہوتا ہے، اس پر پوری طرح عملدرآمد یقینی بنایا جائے گا۔

3۔ میں اس معاہدے کے ساتھ منسلک شیڈول میں بیان کردہ امور کو تسلیم کرتا ہوں جن پر پاکستان کی وفاقی مقنّنہ کو اس ریاست کے لیے قوانین سازی کا اختیار حاصل ہوگا۔

4۔ میں اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ میرا الحاق پاکستان کے وفاق سے اس ضمانت کے ساتھ ہے کہ اگر گورنر جنرل اور اس ریاست کے حکمران کے درمیان کوئی معاہدہ طے پاتا ہے جس کے تحت وفاقی قانون کے نفاذ کے ضمن میں بعض انتظامی اختیارات اس ریاست کے حکمران کو تفویض کیے جائیں گے تو ایسا معاہدہ اس الحاقی معاہدے کا حصہ تصور ہوگا اور اسی حیثیت سے نافذ العمل ہوگا۔

5۔ اس معاہدے کی کسی بھی شق کے تحت پاکستان کی وفاقی مقنّنہ کو اختیار حاصل نہ ہوگا کہ وہ اس ریاست میں کسی اراضی کے جبری حصول کا قانون بنائے تاہم میں یہ عہد کرتا ہوں کہ اگر پاکستان کی وفاقی حکومت کسی ایسے وفاقی قانون کے نفاذ کے لیے جو اس ریاست پر لاگو ہو، اراضی کے حصول کو ضروری سمجھے تو میں ان کے مطالبے پر وہ اراضی ان کی لاگت پر حاصل کروں گا، یا اگر وہ اراضی میری ذاتی ملکیت ہوگی تو میں اسے متفقہ شرائط پر یا کسی ثالث کے ذریعے مقرر کردہ شرائط پر جو چیف جسٹس آف پاکستان مقرر کرے گا، منتقل کردوں گا۔

6۔ اس معاہدہ الحاق کی شرائط کو قانون حکومت ہند 1935 یا قانون آزادی ہند 1947 میں کسی ترمیم کے ذریعے تبدیل نہیں کیا جا سکے گا جب تک کہ میں بذریعہ ایک اضافی معاہدہ ایسی ترمیم کو تسلیم نہ کرلوں۔

7۔ اس معاہدے میں کچھ بھی ایسا نہیں ہوگا جو مجھے مستقبل کے کسی آئین پاکستان کو تسلیم کرنے کا پابند کرے اور نہ ہی ایسا کوئی امر ہوگا جو مجھے مستقبل میں پاکستان کی حکومت کے ساتھ کسی

نئے آئینی معاہدے کرنے کے اختیار سے روک سکے۔

8۔اس معاہدے میں کچھ بھی ایسا نہیں ہوگا جو میری اس ریاست میں خودمختاری کوختم کرے اور نہ ہی اس کے تحت میرے بطور حکمران موجودہ اختیارات،حقوق اور قانونی حیثیت یا اس وقت نافذ کسی قانون کی درستگی متاثر ہوگی جب تک کہ یہ معاہدہ اس کی صراحت نہ کرے۔

9۔میں اعلان کرتا ہوں کہ یہ معاہدہ میں ریاست کی جانب سے انجام دے رہا ہوں،اور اس معاہدے میں جہاں کہیں بھی میری ذات یا ریاست کے حکمران کا ذکر ہے، وہ میرے ورثا اور جانشینوں پر بھی لاگو ہوگا۔

دستخط کے ساتھ یہ معاہدہ 3 اکتوبر 1947ء کومکمل کیا گیا۔(دستخط شدہ) صادق محمد عباسی امیرِ ریاست بہاول پور۔

میں اس معاہدہ الحاق کوتسلیم کرتا ہوں

(دستخط شدہ) محمد علی جناح گورنر جنرل، پاکستان 5 اکتوبر 1947

شیڈول

وہ امور جن پر وفاقی مملکت (Dominion) کی قانون ساز اسمبلی کو اس ریاست (ریاست بہاول پور) کے لیے قانون سازی کا اختیار حاصل ہوگا:

الف۔دفاع (Defence)۔1-وفاق کی بحری، بری اور فضائی افواج اور ایسی کوئی بھی مسلح افواج جو وفاق نے قائم کی ہوں یا برقرار رکھی ہوں بشمول ایسی مسلح افواج جو کسی وفاقی ریاست نے قائم کی ہوں یا برقرار رکھی ہوں اور وہ وفاق کی افواج سے منسلک ہوں یا ان کے ساتھ کارروائیوں میں شریک ہوں ۔ 2۔بحری، بری اور فضائی افواج کے اثاثہ جات اور چھاؤنیوں کا انتظام سوائے ان چھاؤنیوں کے جو وفاقی ریاست کی ملکیت میں ہوں۔3۔۔وفاقی ریاست کی افواج کے استعمال کے

لیے اسلحہ، بارود اور دھماکہ خیز مواد کی فراہمی۔4۔ وفاقی ریاست کی جانب سے پاکستان سے باہر اسلحہ، بارود اور دھماکہ خیز مواد کی برآمد۔

ب۔خارجہ امور(External Affairs)

1۔خارجہ امور: دیگر ممالک سے کیے گئے معاہدات اور سمجھوتوں پر عمل درآمد؛ حوالگی بشمول ان مجرموں اور ملزموں کی حوالگی جو پاکستان سے باہر شاہِ معظم کے زیرِ تسلط علاقوں میں موجود ہوں۔

2۔ پاکستان میں داخلہ: پاکستان سے ترکِ وطن اور اخراج نیز ان افراد کی پاکستان میں نقل وحرکت کی تنظیم جو برٹش سبجیکٹ نہ ہوں یا پاکستان میں مستقل مقیم نہ ہوں یا کسی وفاقی ریاست کے شہری نہ ہوں اور پاکستان سے باہر مقامات کی زیارات۔

3۔وفاقی ریاست میں ایسے افراد کی شہریت کا قانون جو پاکستان کے شہری نہ ہوں۔

ج۔مواصلات(Communications)

1۔ ڈاک اور تار برقی خدمات (Posts and Telegraph) بشمول ٹرنک ٹیلیفون، وائرلیس، نشریات اور وفاقی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والی دیگر مواصلاتی اقسام۔

2۔ وفاقی ریلویز؛ بڑی اور چھوٹی ریلوے کے نظم ونسق سے متعلقہ امور، جیسے سلامتی، کرایوں اور نرخوں کی بالائی وزیریں حدیں، اسٹیشن اور خدمات کے آخری چارجز، ٹریفک کی تبادلہ کاری اور مال ومسافر برداری کے سلسلے میں ریلوے انتظامیہ کی ذمہ داری؛ چھوٹی ریلوے کی حدتک صرف سلامتی اور مال ومسافر برداری کی ذمہ داری سے متعلقہ قواعد۔

3۔ بحری جہاز رانی اور کشتیاں، بشمول مدو جزر والے پانیوں پر جہاز رانی اور بحری امور (Admiralty) عدالت کا دائرہ اختیار

4۔ بندرگاہی قرنطینہ (Quarantine Port)

5۔ بڑی بندرگاہیں؛ یعنی ایسی بندرگاہوں کا اعلان، ان کی حد بندی اور ان میں بندرگاہی حکام کی تشکیل و اختیارات۔

6۔ ہوائی جہاز اور فضائی جہاز رانی، ہوائی اڈوں کی فراہمی، فضائی نقل وحرکت اور ہوائی اڈوں کا تنظیمی ڈھانچہ و ضابطہ۔

7۔ لائٹ ہاؤسز، بشمول روشنی کے جہاز، بیکن اور جہاز رانی اور ہوائی نقل وحمل کی سلامتی کے دیگر انتظامات۔

8۔ سمندر یا فضا کے ذریعے مسافروں اور مال کی نقل وحمل۔

د۔ ضمنی امور (Ancillary)

1۔ مذکورہ بالا تمام امور سے متعلق قوانین کی خلاف ورزیوں پر سزا کا تعین۔

2۔ مذکورہ بالا امور کے سلسلے میں تحقیقات اور اعداد وشمار کی تیاری۔

3۔ عدالتوں کا دائرہ اختیار اور اختیارات مذکورہ بالا امور کے سلسلے میں لیکن کسی وفاقی ریاست کے حکمران کی رضامندی کے بغیر ایسی عدالتوں کو اختیارات تفویض نہیں کیے جا سکتے جو اس ریاست میں یا اس سے متعلقہ طور پر عمومی طور پر دائرہ اختیار نہ رکھتی ہوں۔

2-یادداشتِ ملاقات

جو مورخہ 23 فروری 1952ء کو عزت مآب الحاج نواب سر صادق محمد خان عباسی، امیر ریاست بہاول پور اور معزز مشتاق احمد گورمانی وزیر داخلہ وامورِ ریاست وسرحدات حکومت پاکستان کے درمیان ہوئی۔ معزز وزیر نے عزت مآب امیر کو بتایا کہ یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ ریاست بہاول پور کی افواج کو پاکستان آرمی میں ضم کر دیا جائے تا کہ ان کے تنخواہوں کے نظام، سروس شرائط اور عمومی

معیار کو پاکستان آرمی کے مطابق ہم آہنگ کیا جا سکے۔ عزت مآب نے اس تجویز سے اصولی طور پر اتفاق کیا بشرطیکہ درج ذیل امور کو تسلیم کیا جائے:

1۔ ان کی ذاتی باڈی گارڈ فورس کو بدستور ریاست بہاول پور کی فوج تصور کیا جائے اور اس کے بارے میں تمام موجودہ انتظامات برقرار رکھے جائیں نیز امیر کو ایک اضافی گرانٹ دی جائے تاکہ وہ اپنی باڈی گارڈ کی تنخواہیں بڑھا سکیں کیوں کہ بصورت دیگر عملے میں بے چینی پیدا ہو سکتی ہے۔

2۔ ریاست بہاول پور کی افواج کے یونٹس اپنے موجودہ نام اور امیر کی جانب سے دیے گئے جھنڈے ورنگ برقرار رکھیں اور امیر بدستور ان کے کرنل انچیف (Colonel-in-Chief) رہیں۔

3۔ ریاست بہاول پور میں تعینات پاکستان کی افواج کے یونٹس تقریباتی مواقع پر گارڈ آف آنر فراہم کریں اور امیر کو ریاست کے حکمران کی حیثیت سے وہی عزت، احترام اور اعزاز دیں جو فی الحال دیا جا رہا ہے۔

4۔ ریاست کو ان افواج کے اخراجات کے لیے سالانہ مالی امداد دینے کی ذمہ داری سے بری الذمہ قرار دیا جائے اور ریاست اور وفاقی حکومت کے درمیان مالی معاملات اسی اصول کے تحت ہوں جیسے گورنر صوبے اور وفاق کے درمیان ہوتے ہیں۔

معزز وزیر نے عزت مآب کے تمام نکات سے اصولی اتفاق کیا اور وعدہ کیا کہ وہ مالی امور کا مزید جائزہ لے کر معاہدے کا ایک حتمی مسودہ تیار کروا کر دستخط کے لیے عزت مآب کو بھیجیں گے۔

3-ریاست بہاول پور کا ضمنی معاہدہ الحاق

چوں کہ میں نے اپنی اس اعلان شدہ پالیسی کے تحت یہ عزم کیا ہے کہ میں اپنی ریاست کے انتظام و انصرام میں اپنے عوام کی بڑھتی ہوئی شرکت کو ممکن بناؤں گا اور خود اختیاری اداروں کی تدریجی ترقی کے ذریعے اپنی ریاست میں ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کو، پاکستان کے ایک وفاقی یونٹ کے طور پر، تدریجی طور پر یقینی بناؤں گا؛

اور چوں کہ میں نے قانون حکومتِ بہاول پور1952ء کی صورت میں اپنی ریاست کے لیے ایک عارضی آئین نافذ کر دیا ہے جو کہ ایک وزارت کے قیام کی شق رکھتا ہے جو منتخب عوامی نمائندوں پر مشتمل ریاستی اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہوگی؛

لہٰذا، میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی ریاست پر اپنے اختیارات اور اقتدار کا استعمال مذکورہ عارضی آئین کی دفعات کے مطابق انجام دوں گا؛

مزید برآں، میں نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ ایک تجربہ کار افسر کو میری جانب سے، گورنر جنرل پاکستان سے مشاورت کے بعد، میرا مشیر مقرر کیا جائے گا جو میری حیثیت بطور آئینی حکمران، میرے اختیارات واقتدار کے استعمال اور ان امور کی انجام دہی میں میری مدد ورہنمائی کرے گا جن پر پاکستان کی وفاقی مقنّنہ کو میری ریاست کے لیے قانون سازی کا اختیار حاصل ہے اور جن پر انتظامی اختیار گورنر جنرل پاکستان کو حاصل ہے تا کہ اس ریاست میں پاکستان کے آئین اور قوانین، جو اس پر لاگو ہیں یا وقتاً فوقتاً لاگو ہوں گے، پر پوری طرح عملدرآمد یقینی بنایا جا سکے اور گورنر جنرل پاکستان کی طرف سے وقتاً فوقتاً جاری کردہ ہدایات پر حسبِ منشا عمل کیا جا سکے۔

اگر میرے وزراء (کابینہ) یا میرے مذکورہ مشیر کی طرف سے دی گئی رائے میں اختلاف ہو تو میں اس معاملے پر پاکستان کی حکومت (محکمہ ریاستی امور) سے مشورہ طلب کروں گا اور ان کی دی گئی رائے کو قبول کروں گا۔

یہ معاہدہ یکم مارچ1952ء کو میری جانب سے دستخط کے ساتھ نافذ کیا گیا۔

(دستخط شدہ) صادق محمد خان امیرِ ریاست بہاول پور

میں اس ضمنی معاہدہ الحاق کو تسلیم کرتا ہوں۔

(دستخط شدہ) غلام محمد گورنر جنرل، پاکستان بتاریخ 3مارچ1952

4- عزت مآب امیرِ بہاول پور کے ساتھ خصوصی شاہی وظیفہ، ذاتی جائیداد، حقوق اور مراعات سے متعلق معاہدہ

یہ معاہدہ 11 اپریل 1952ء کو گورنر جنرل پاکستان اور عزت مآب امیرِ ریاست بہاول پور کے درمیان طے پایا۔

چوں کہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ پاکستان کی مجلسِ نمائندگان کی جانب سے منظور کردہ آئین پاکستان ریاست بہاول پور پر بھی اسی طرح نافذ العمل ہوگا جیسے پاکستان کے دیگر حصوں پر ہوتا ہے اور چوں کہ یہ مناسب اور موزوں سمجھا گیا کہ امیرِ بہاول پور کے حقوق، مراعات، اعزازات، وراثتی جانشینی اور شاہی وظیفہ (Privy Purse) کا تعین حکومتِ پاکستان اور امیر کے مابین باقاعدہ معاہدے کے ذریعے کیا جائے لہٰذا، فریقین مندرجہ ذیل شرائط پر متفق ہوئے:

آرٹیکل اول:

1۔ عزت مآب امیر بہاول پور ہر سال ریاست بہاول پور کی آمدنی سے بطور شاہی وظیفہ (Privy purse) زیادہ سے زیادہ 29 لاکھ 50 ہزار روپے (29,50,000/-) حاصل کرنے کے حقدار ہوں گے جو ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنٰی ہوں گے جیسا کہ اس معاہدے سے منسلک شیڈول میں درج ہے۔

2۔ یہ رقم امیر اور ان کے خاندان کے تمام اخراجات کے لیے مختص ہے جن میں ذاتی عملہ، باڈی گارڈ، سفر، مہمان نوازی، رہائش گاہوں کی دیکھ بھال، شادی بیاہ اور دیگر رسومات شامل ہیں۔

3۔ یہ رقم سال کے آغاز میں، ہر سہ ماہی کے لیے پیشگی، چار مساوی اقساط میں ادا کی جائے گی۔

4۔ اس رقم کی ادائیگی، جیسا کہ اس معاہدے میں بیان کی گئی ہے، حکومت پاکستان کی طرف سے ضمانت شدہ ہے۔

آرٹیکل دوم:

1۔عزت مآب امیر کو مکمل ملکیت، استعمال اور تصرف کا حق حاصل ہوگا ان تمام جواہرات، زیورات، سونے چاندی کے زیورات، حصص، بانڈز، اور دیگر ذاتی منقولہ اور غیر منقولہ جائیدادوں پر جو اس معاہدے کی تاریخ پر ان کی ذاتی ملکیت ہیں اور ریاستی جائیداد نہیں ہیں۔

2۔امیر کو لازم ہوگا کہ اس معاہدے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر حکومت پاکستان کو اپنی تمام منقولہ وغیر منقولہ ذاتی جائیداد کی فہرستیں فراہم کریں۔

3۔اگر کسی خاص جائیداد کی نوعیت پر اختلاف ہو کہ وہ ذاتی ملکیت ہے یا ریاستی تو اس تنازع کا فیصلہ گورنر جنرل پاکستان کریں گے اور ان کا فیصلہ حتمی اور تمام فریقین پر لازم ہوگا۔

آرٹیکل سوم:

امیر اور ان کے خاندان کے افراد وہ تمام ذاتی مراعات، اعزازات اور القابات کے حقدار ہوں گے جو وہ اس معاہدے کی تاریخ سے قبل ریاست کے اندر یا باہر استعمال کرتے رہے ہیں۔

آرٹیکل چہارم:

حکومت پاکستان اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ ریاست بہاول پور کے قانون اور رواج کے مطابق گدی کی جانشینی اور امیر کے ذاتی حقوق، مراعات، اعزازات اور القابات قائم رہیں گے۔

اس معاہدے کی توثیق میں، گورنر جنرل پاکستان اور عزت مآب امیرِ بہاول پور نے مورخہ 11 اپریل 1952ء کو اپنے دستخط ثبت کیے۔

(دستخط شدہ) غلام محمد گورنر جنرل، پاکستان

(دستخط شدہ) صادق محمد خان پنجم عباسی امیرِ ریاست بہاول پور

5- حکومت پاکستان اورعزت مآب امیر ریاست بہاول پور کے درمیان معاہدہ

چوں کہ حکومتِ پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ ریاست بہاول پور کی افواج کو پاکستان کی فوج میں ضم کر دیا جائے اور آئندہ یہ افواج پاکستان آرمی کا حصہ سمجھی جائیں لہٰذا فریقین کے درمیان درج ذیل امور پر باقاعدہ معاہدہ طے پایا:

1۔حکومتِ پاکستان یکم اپریل 1952ء سے مؤثر، اس سالانہ امدادی رقم سے دستبردار ہو جائے گی جو ریاست بہاول پور کی طرف سے بہاول پور اسٹیٹ فورسز کے اخراجات کے لیے حکومتِ پاکستان کو ادا کی جاتی تھی جیسا کہ 29 اپریل 1951ء کے دوسرے ضمنی معاہدہ الحاق کی شق نمبر 7 میں بیان کیا گیا تھا۔

2۔ وہ تمام محصولات (Taxes) جنھیں وفاق نے ریاست بہاول پور میں نافذ کیا اور وصول کیا، بشمول سیلز ٹیکس، ان کی تقسیم وفاق اور ریاست کے مابین ویسے ہی کی جائے گی جیسے وفاق اور پاکستان کے دیگر صوبوں کے مابین کی جاتی ہے اور اس ضمن میں ریسمین رپورٹ کی سفارشات کو بنیاد بنایا جائے گا۔ چناں چہ اس امر کے تحت 1 اکتوبر 1948ء اور 29 اپریل 1951ء کے ضمنی معاہدہ الحاق کی متعلقہ دفعات کو ترمیم شدہ تصور کیا جائے گا۔

3۔ ریاست بہاول پور کی افواج کو پاکستان آرمی میں ضم کر دیا جائے گا اور وہ پاکستان آرمی کا حصہ ہوں گی تاہم عزت مآب امیر بہاول پور کی ذاتی باڈی گارڈ فورس بدستور ریاست بہاول پور کی فوج سمجھی جائے گی اور اس کی تعداد و تنظیم، مالی، انتظامی اور عملی معاملات میں موجودہ حیثیت کے مطابق برقرار رہے گی۔

4۔ بہاول پور اسٹیٹ فورسز کے موجودہ یونٹس کے نام برقرار رہیں گے اور وہ انہی ناموں کے ساتھ کام کریں گے۔

5۔عزت مآب امیر بہاول پور ان یونٹس کے بدستور کرنل انچیف (Colonel-in-

(Chief) ہوں گے۔

6۔ امیرِ بہاول پور کو ریاست کی آمدنی سے سالانہ 2,50,000 روپے اضافی دیے جائیں گے جو موجودہ 5,00,000 روپے سالانہ گرانٹ کے علاوہ ہوں گے تا کہ وہ اپنی باڈی گارڈ کے اہلکاروں کی تنخواہیں بڑھا سکیں۔

7۔ ریاست میں تعینات پاکستان کی مسلح افواج کے یونٹس عزت مآب امیر بہاول پور کو پورا اعزاز اور احترام دیں گے اور ان کی درخواست پر ریاست کے اندر خصوصی تقاریب کے موقع پر گارڈ آف آنز بھی فراہم کریں گے۔

اس معاہدے کی تصدیق میں:

کرنل عبدالرحیم خان، سیکریٹری برائے وزارت ریاستی و سرحدی امور، حکومت پاکستان کی جانب سے اختیار و اجازت کے تحت دستخط کرتے ہیں؛ اور

عزت مآب لیفٹیننٹ جنرل الحاج صادق محمد خان پنجم عباسی، امیر ریاست بہاول پور، اپنی اور اپنے ورثاء و جانشینوں کی جانب سے دستخط کرتے ہیں۔

(دستخط شدہ) عبدالرحیم خان سیکریٹری، حکومت پاکستان

(دستخط شدہ) صادق محمد خان پنجم عباسی امیر ریاست بہاول پور بتاریخ: 24 اپریل 1952

6- معاہدہ ادغامِ ریاست بہاول پور

گورنر جنرل پاکستان اور عزت مآب امیرِ ریاست بہاول پور کے درمیان مورخہ 17 دسمبر 1954ء کو طے پایا:

چوں کہ ریاست بہاول پور اور مملکت پاکستان دونوں کے بہترین مفاد میں یہ امر ضروری سمجھا گیا ہے کہ ریاست بہاول پور کے علاقے مملکت پاکستان کے سپرد کیے جائیں اور انھیں مجوزہ یونٹ "مغربی پاکستان" میں ضم کر دیا جائے؛

لہٰذا، فریقین مندرجہ ذیل شرائط پر متفق ہوئے ہیں:

آرٹیکل اول: عزت مآب امیر بہاول پور بذریعہ اس معاہدہ اپنی خودمختاری اور تمام حقوق، اختیارات اور اقتدار بطور حکمرانِ ریاست بہاول پور، بشمول تمام علاقہ جات مملکت پاکستان کی حکومت کے سپرد کرتے ہیں اور ریاست اور اس کے علاقوں کی حکمرانی کے تمام اختیارات، دائرہ اختیار اور اقتدار اس تاریخ سے جو گورنر جنرل پاکستان مقرر کرے گا، حکومت پاکستان کے سپرد ہوں گے۔ مذکورہ تاریخ سے حکومت پاکستان ان علاقوں پر حسبِ صوابدید، جس طریقے یا ایجنسی کے ذریعے چاہے، مکمل اختیارات کے ساتھ حکمرانی کرے گی۔

آرٹیکل دوم: عزت مآب امیر بہاول پور ہر سال 32 لاکھ روپے بطور خصوصی شاہی وظیفہ (Privy Purse) حکومت پاکستان سے وصول کرنے کے حقدار ہوں گے اور یہ رقم کسی بھی قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگی۔

1۔ یہ رقم امیر بہاول پور اور ان کے خاندان کے تمام اخراجات جیسے کہ ذاتی عملہ، باڈی گارڈ، سفر، مہمان داری، رہائش گاہوں کا خرچ، شادی بیاہ اور دیگر خانگی رسوم کے لیے مختص ہوگی۔

2۔ یہ رقم سال کے چاروں سہ ماہیوں کے آغاز پر مساوی اقساط میں پیشگی ادا کی جائے گی۔

3۔ اس رقم کی ادائیگی کی ضمانت حکومت پاکستان فراہم کرتی ہے۔

آرٹیکل سوم: عزت مآب امیر کو تمام ذاتی جواہرات، زیورات، سونے چاندی کے زیورات، حصص، بانڈز، اور دیگر منقولہ و غیر منقولہ جائیداد (جو ریاستی ملکیت نہ ہو) کی مکمل ملکیت، استعمال اور تصرف کا حق حاصل ہوگا جیسا کہ اس معاہدے کی تاریخ پر ان کی ملکیت میں ہے۔ اگر کسی جائیداد کی نوعیت کے بارے میں تنازع پیدا ہو کہ وہ ذاتی ملکیت ہے یا ریاستی تو اس کا فیصلہ گورنر جنرل پاکستان کریں گے اور ان کا فیصلہ حتمی و لازمی ہوگا۔

آرٹیکل چہارم: عزت مآب امیر، عزت مآب بیگم اور ان کے بچے تمام ذاتی اعزازات، رتبے اور القابات کے حقدار ہوں گے جو وہ اس معاہدے سے قبل ریاست کے اندر یا باہر استعمال کرتے رہے ہیں۔

آرٹیکل پنجم: حکومت پاکستان اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ ریاست بہاول پور کے

روایتی قانون ورواج کے مطابق امیر بہاول پور کی ذاتی مراعات، اعزازات، اور القابات (جیسا کہ آرٹیکل دوم تا چہارم میں بیان ہوئے ہیں) وراثت کے طور پر ان کے جانشینوں کو منتقل ہوں گے۔

آرٹیکل ششم: یہ معاہدہ تمام سابقہ الحاقی دستاویزات اور حکومت پاکستان وامیر بہاول پور کے مابین سابقہ معاہدات کو کالعدم قرار دیتا ہے۔

اس معاہدہ کی توثیق میں: گورنر جنرل پاکستان اور عزت مآب امیر ریاست بہاول پور نے مورخہ 17 دسمبر 1954ء کو اپنے دستخط ثبت کیے۔ (دستخط شدہ) غلام محمد گورنر جنرل، پاکستان

(دستخط شدہ) صادق محمد خان پنجم عباسی امیر ریاست بہاول پور

7۔معاہدہ درمیان حکومت ومحمد عباس خان عباسی

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر اور بریگیڈیئر عزت مآب محمد عباس خان عباسی کے درمیان جو مورخہ 4 جون 1966ء کو طے پایا:

چوں کہ بریگیڈیئر عزت مآب محمد عباس خان عباسی (جنھیں آئندہ اس معاہدے میں "امیر" کہا جائے گا) نے ریاست بہاول پور کے قانون ورواج کے مطابق امیرِ بہاول پور کی حیثیت سے جانشینی اختیار کی ہے؛ اور چوں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر (جنھیں آئندہ اس معاہدے میں "صدر" کہا جائے گا) نے مذکورہ جانشینی کو تسلیم فرمایا ہے اور چوں کہ صدر کی جانب سے اس جانشینی کو تسلیم کیے جانے کے بعد، امیر کو وہی خصوصی شاہی وظیفہ (Privy Purse) اور وہی ذاتی اعزازات، رتبے اور القابات حاصل ہوں گے جو صدر اور امیر کے درمیان طے پائے گئے ہیں لہٰذ فریقین کے مابین مندرجہ ذیل شرائط پر باقاعدہ معاہدہ کیا گیا:

(1) امیر کو حکومت پاکستان کی جانب سے بطور شاہی وظیفہ (Privy Purse) سالانہ 16 لاکھ روپے دیے جائیں گے، جو ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

I - یہ رقم امیر بہاول پور اور ان کے خاندان کے تمام اخراجات کے لیے مقرر ہے جن میں

ذاتی عملہ، باڈی گارڈ، اسفار، مہمان داری، رہائش گاہوں کا خرچ، شادی بیاہ اور دیگر خانگی رسوم و روایات شامل ہیں۔

II ۔ یہ رقم سال کے چاروں سہ ماہیوں کے آغاز میں، مساوی اقساط میں پیشگی ادا کی جائے گی۔

(2) امیر، اپنے والد کی طرف سے حاصل کردہ تمام ذاتی مراعات، اعزازات اور القابات کے حقدار ہوں گے خواہ وہ ریاست بہاول پور کے اندر ہوں یا اس سے باہر۔

(3) امیر کی شاہی وظیفہ اور ذاتی اعزازات، مراعات اور القابات کی دعویداری اس وقت پاکستان میں نافذ قوانین کے تابع ہوگی اور اس شرط کے ساتھ ہوگی کہ امیر:

الف۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان سے کامل وفاداری رکھیں گے۔ ب۔ بطور شہری اپنے آئینی و قانونی فرائض کو دیانتداری اور خلوص سے ادا کریں گے۔ ج۔ پاکستان کی سلامتی، یکجہتی اور استحکام کے مفاد میں وفاداری سے عمل کریں گے۔

(4) حکومت پاکستان ریاست بہاول پور کے قانون و رواج کے مطابق جانشینی کی ضمانت دیتی ہے۔

اس معاہدے کی توثیق میں، صدرِ پاکستان اور امیرِ بہاول پور نے بالا بیان کردہ تاریخ اور سال میں اپنے دستخط ثبت کیے۔ (دستخط شدہ) صدرِ پاکستان (دستخط شدہ) امیرِ بہاول پور

بتاریخ: 4 جون 1966

جیسا کہ میرے معزز والد، مرحوم امیر ریاست بہاول پور، کی وصیت مؤرخہ 20 مارچ 1958ء میں درج ہے، میں اس امر کا اقرار کرتا ہوں کہ بیگم او لیوئین جمیلہ عباسی (بیوہ) کو ان کی وفات یا دوبارہ نکاح تک ہر سال 1,00,000 روپے) ایک لاکھ روپے ادا کیے جائیں گے۔

(دستخط شدہ) امیرِ بہاول پور

شیڈول

عزت مآب امیر بہاول پور کا شاہی وظیفہ :(Privy Purse)

1۔شاہی وظیفہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 20,00,000 روپے سالانہ

2۔سول لسٹ ریزرو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 2,00,000 روپے سالانہ

3۔باڈی گارڈ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 7,50,000 روپے سالانہ

کل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ **29,50,000** روپے سالانہ

(دستخط شدہ) عبدالرحیم خان

☆☆☆☆☆

8۔ تمام نوابوں کے وظائف والقابات کی تنسیخ

1973 کے آئین کی منظوری اور نفاذ سے قبل ذوالفقار علی بھٹو نے بحیثیت صدر پاکستان اور سول چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹو، ملک کی باگ ڈور سنبھالی۔انہوں نے جاگیرداری کے خاتمے کی علامت اور عوامی جمہوریہ پاکستان'' کی مساواتی پالیسی کو اجاگر کرنے کے لیے 1972 کا صدارتی حکم نامہ نمبر 15 جاری کیا جس کا عنوان یہ تھا۔'' پاکستان میں شامل سابق ریاستوں کے حکمرانوں کے استحقاق وخطابات ووظائف کے خاتمے کا حکم'' جو یکم جنوری 1971 سے نافذ العمل ہوا اور 24 مارچ 1972 کو حکومت پاکستان کے غیر معمولی گزٹ میں شائع ہوا۔اس کے بنیادی نکات مندرجہ ذیل تھے۔

1۔تمام Privy Purses ختم کر دیے گئے۔(یعنی وہ وظیفے اور مالی گرانٹس جو ریاستی حکمرانوں کو پاکستان میں انضمام کے بعد دیے جا رہے تھے)

2۔ تمام اعزازات، خطابات اور مراعات منسوخ کر دی گئیں۔(مثلاً نواب،سر، ہز ہائی نس،مہاراج،خانِ اعظم وغیرہ کے القاب)

3۔تمام خصوصی مراعات (پروٹوکول، استحقاق، سرکاری گاڑیاں، پرچم، گارڈ آف آنر

وغیرہ) واپس لے لیے گئے۔

4۔اس کا بہاول پور سمیت تمام سابق ریاستوں کے حکمرانوں پر اطلاق ہوگا۔

اس حکم کے نتیجے میں: نواب صادق محمد خان پنجم (جو اُس وقت برطانیہ میں مقیم تھے) اور ان کے خاندان کے افراد جو قانونی حیثیت میں ''سابق ریاستی حکمران'' کہلانے لگے تھے ان کے تمام القاب اور مالی گرانٹس منسوخ کر دی گئیں۔ (Extraordinary Gazette of Pakistan Part I Dated March 24,1972)۔ایک دکیل دوست نے بتایا کہ بعد میں یہ رعایات بحال کر دی گئی تھیں۔حکومت پاکستان نے ذاتی وظیفے کی رعایت تین نسلوں تک دی تھی یعنی نواب کے پوتے ''نواب'' صلاح الدین تک۔انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جتنا وظیفہ نواب کو ملتا تھا اس کا آدھا بیٹے کے لیے اور اس سے آدھا پوتے کے لیے منظور کیا تھا، اگر آخری نواب کا وظیفہ مبلغ چھتیس لاکھ تھا تو ان کے بیٹے کو اٹھارہ لاکھ اور پوتے کو نو لاکھ سالانہ طے ہوا تھا مگر سیفران محکمہ نے افراط زر کی روشنی میں کئی بار وظیفے میں اضافے کی پارلیمنٹ سے منظوری لی۔از مترجم)

خاندان کا نقصان عظیم

The Dynasty Spoils

تحریر و تحقیق۔عمر فاروق فیچر رائیٹر ماہنامہ ہیرالڈ کراچی

شائع شدہ سالنامہ 2012

بہاول پور کے آخری نواب صادق محمد خان عباسی کے 1966 میں انتقال کے بعد پاکستان آرمی نے ان کے محلات میں سے پانچ محل لیز پر حاصل کر لیے جن کے نام یہ ہیں: دربار محل، نور محل، گلزار محل، نشاط محل اور فرحت محل۔ان میں سے غالباً دو محلات کے اندر اس علاقے میں تعینات آرمی کے مختلف دستوں کے ہیڈ کوارٹرز قائم کیے گئے۔محلات کی بحالی کے دوران حکومت اور آرمی نے عباسی خاندان سے ابتدائی طور پر مشاورت کی مگر مشاورت کا یہ عمل اس لیے پروان نہ چڑھ سکا کیوں کہ عباسی خاندان آپس میں نہ ختم ہونے والے جائیداد کے جھگڑوں میں الجھا ہوا تھا اور اب بھی ایک سو سے زائد عباسی ورثا جائیداد کی تقسیم کے اختلافات کا شکار اور عدالتی لڑائیاں لڑنے میں مصروف ہیں۔اگرچہ حکومت عباسی خاندان کو آخری نواب کی جائیداد کے جائز وارث تسلیم کرتی ہے لیکن اس ضمن میں عباسیوں اور آرمی میں مکمل اتفاق نہیں ہے۔نواب کے ایک پوتے عمر عباسی کہتے ہیں ہمیں بتایا گیا تھا کہ آرمی دفاعی مقاصد کے لیے کنٹونمنٹ کی حدود میں کوئی بھی جائیداد حاصل کرنے کا قانونی اختیار رکھتی ہے اور ہم اسکیسی عدالت میں چیلنج نہیں کر سکتے۔انھوں نے یہ وضاحت اس وقت کی جب ان سے پوچھا گیا کہ آرمی نے کس طرح عباسی فرمانروا کی تعمیر کردہ تاریخی یادگاروں میں سے چند ایک کا کنٹرول حاصل کر لیا۔انھوں نے مزید کہا کہ ان کے خاندان کے قبضے میں موجود بہت سی

املاک میں فوج کو دلچسپی ہے مگر اب عباسی خاندان کے ورثا ایسی کسی کوشش کی حوصلہ افزائی نہیں کریں گے۔ اس قسم کے اختلافات اور نزاع کے باعث ان یادگاروں کی بحالی کا کام ممکنہ رفتار سے جاری نہ رہ سکا بلکہ علاقے کے ان عظیم آثار قدیمہ تک پبلک کی آسان رسائی ممکن نہ رہی۔ 1990 میں آرمی نے صحرائے چولستان میں واقع اٹھارویں صدی کی یادگار قلعہ دراوڑ کی بحالی کی پیشکش کی لیکن عباسی خاندان نے اس پیشکش کی پذیرائی نہ کی۔ عمر عباسی نے یہ بھی بتایا کہ اب عباسی خاندان اس بات پر متفق ہے کہ وہ بحالی کے مقصد کے لیے قلعہ دراوڑ اور صادق گڑھ پیلس آرمی کے حوالے نہیں کرے گا۔ ان کا یہ خیال ہے کہ اس طرح ایک تو یادگاریں عوام کی رسائی سے دور ہو جائیں گی اور دوسرے عباسی خاندان کا ان یادگاروں سے متعلق انتظامی کردار ختم ہو جائے گا۔ ان کا موقف ہے کہ آرمی اپنے زیر انتظام محلات کی معلومات تک ہماری رسائی نہیں ہونے دیتی حالانکہ یہ ہماری قانونی وراثت ہیں۔ آرمی افسران ان یادگاروں کے حوالے سے عباسی خاندان کے کردار کو وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بہاول پور کنٹونمنٹ کے داخلی گیٹ کے قریب واقع نور محل میں متعین ایک آرمی گائیڈ نے بتایا کہ آخری نواب کی وفات کے بعد عباسی خاندان کے افراد گروہ در گروہ نور محل آتے اور نور محل کے فرنیچر اور فانوسوں کی چھینا جھپٹی میں لگے رہتے جس سے نور محل کے فرش کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ ابھی نور محل کے اطالوی ٹائلز سے بنے فرش کو ہونے والے نقصانات کے تین جگہوں پر نشانات واضح ہیں۔ ایک آرمی گائیڈ نے یہ بھی بتایا کہ یہاں کے ہنر پاروں کو عباسیوں کے دنگا فساد نے بہت نقصان پہنچایا۔ اس کشمکش میں ایک فانوس گر کر ٹوٹ گیا۔ 1872 میں تعمیر ہونے والے نور محل کو آرمی نے 1971 میں لیز پر حاصل کیا، بعد میں 1997 کے دوران آرمی نے اسے 119 ملین روپے کی ادائیگی کے بعد خرید لیا۔ 1971 میں آرمی نے 7.7 ملین روپے کی لاگت سے اس کی بحالی کا کام کرایا۔ اگرچہ یہ آرمی کے دفاتر کے طور پر استعمال ہو رہا ہے مگر 2001 میں اس میں آفیسرز کلب متعارف کرایا گیا۔ بڑے ہال میں موجود فرنیچر خاصہ بے جوڑ محسوس ہوتا ہے، عباسیوں سے بچ رہنے والے چند ایک اصلی شہہ پارے بھی نظر آ جاتے ہیں۔ بڑے ہال کے گرد برآمدوں کو پکچر گیلریوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے جہاں شاہی خاندان کی تصاویر موجود ہیں، باقی ماندہ محل کو کلب کے طور پر استعمال کیا جاتا

ہے۔ اس کے سبزہ زار کو دعوتی اور شادی لانز کے طور پر استعمال کرنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ اگر چہ عباسی آرمی کے زیر کنٹرول تاریخی اثاثوں تک مشکل رسائی کے شاکی ہیں لیکن چند ایک اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ آرمی نے ان عمارتوں کی حفاظت کے لیے غیر معمولی کاوشیں کی ہیں۔ مثلاً دربار محل کو لے لیں، پہلے پہل آرمی نے اس کے برآمدوں میں پختہ کمرے بنا لیے لیکن بعد میں انھیں ختم کر کے ملتان سے ماہر کاریگروں کے ذریعے اس کے برآمدوں کو اصل شکل میں بحال کیا۔ آج کل دربار محل میں جنرل آفیسر کمانڈنگ (جی او سی) کے دفاتر قائم ہیں۔

آرمی اور عباسی خاندان کے درمیان رابطے کے فقدان کے پیش نظر عباسیوں نے نجی کاروباری لوگوں اور حکومت سے تاریخی آثار کی دیکھ بھال اور بحالی کے لیے التجا کی۔ اگر چہ اس قسم کی کاوشوں میں مسائل بھی بہت درپیش تھے خصوصاً خاندان کے اندر سے اٹھنے والے اختلافات زیادہ تھے مثلاً جب بہاول پور ریاست پاکستان کا حصہ بنی تو حکومت نے بہاول پور سے چند کلومیٹر فاصلے پر ڈیرہ نواب شہر کے اندر واقعہ 1882 میں بننے والے صادق گڑھ پیلس کو خاندان کی مشترکہ ملکیت ڈکلیئر کیا تب سے عباسی خاندان کو یادگاروں کی بحالی، مرمت اور حفاظت کے لیے بہت سے تجاویز موصول ہوئیں۔ ان میں آغا خان فاؤنڈیشن اور میریٹ ہوٹل کے مالک صدرالدین ہاشوانی کی تجاویز غیر معمولی تھیں، وہ صادق گڑھ پیلس کو فائیو سٹار ہوٹل میں تبدیل کرنے کے متعلق تھیں مگر خاندانی تنازعوں کے باعث ہونے والے عدم اتفاق کے باعث پیلس کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بہت سے نوادرات چوری ہو گئے جس میں سے اکثر بیرون ملک بیچ دیے گئے۔ اب یہ محل بہت خستہ حالی کا شکار ہے۔ دیواروں پر لگی تصاویر و پینٹنگ غائب ہو چکی ہیں اور فرش پر مٹی کی دبیز تہہ جم چکی ہے۔

عباسی خاندان کا ایک خادم جو ہیرالڈ کے فیچر رائٹر عمر فاروق کے ہمراہ تھا، نے بتایا کہ اس محل میں 360 کمرے تھے اور متعدد فوارے تھے جو اب خراب ہو چکے ہیں۔ عمر عباسی نے یہ بھی بتایا کہ عباسی خاندان نے ایک نجی تنظیم سے محل کی شراکتی ملکیت کی تجویز پر غور کیا ہے۔ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی کی طرز پر ایک اسلامی تحقیقی ادارہ کا قیام ہے مگر ان تجاویز پر متفق ہونا ابھی

باقی ہے۔ خاندان کے کچھ ارکان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ صادق گڑھ پیلس کو وراثتی قانون کے مطابق تقسیم ہونا چاہیے۔ دیگر یادگاری اثاثوں کی بحالی کے لیے وفاقی اور صوبائی حکومتوں سے مذاکرات بھی ناکام ہو چکے ہیں مثلاً اکتوبر 2010 میں محکمہ آثار قدیمہ پنجاب نے قلعہ دراوڑ کی بحالی کا ایک تفصیلی منصوبہ حکومت پنجاب کو پیش کیا تھا۔

ایک سب انجینئر محمد سجاد کا کہنا ہے کہ محکمہ آثار قدیمہ نے تجویز پیش کی تھی کہ قلعہ دراوڑ کی بیرونی دیواروں پر پختہ اینٹوں کی چنائی سے انھیں مضبوط بنایا جائے، اس منصوبے پر لاگت کا تخمینہ 380 ملین تھا جب کہ قلعہ دراوڑ کی مکمل بحالی کے لیے مزید گرانٹ کی ضرورت ہوگی۔ محکمہ نے یہ بھی سفارش کی تھی کہ اس کی ممکنہ بحالی سے قبل مقامی ماہرین کے ذریعے بطور پیشگی اقدام فیزیبلٹی رپورٹ تیار کرالی جائے مگر عباسی خاندان قلعہ دراوڑ کا انتظام شیئر کرنے یا ترک کرنے پر تیار نہیں جس کے باعث حکومت بھی کسی پیشرفت سے کترا رہی ہے۔ عمر عباسی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قلعہ دو سے تین سال کے اندر مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے گا اس لیے انھوں نے سینئر وزیر پنجاب ذوالفقار کھوسہ سے کہا ہے کہ وہ حکومت کو قائل کریں کہ وہ صورتحال کی سنگینی کے پیش نظر کوئی اقدام اٹھائے مگر اس ملاقات کو بھی کئی ماہ ہو چکے ہیں اور حکومت پنجاب نے ابھی تک کسی قسم کے فنڈز مختص نہیں کیے اور قلعہ اینٹ در اینٹ گر رہا ہے، ٹوٹ رہا ہے اگرچہ یہ عمل آہستگی سے جاری ہے مگر اس کا گرنا یقینی ہو چکا ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے کالج آف آرٹس اور ڈیزائن کے پرنسپل ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصر یہ دلیل دیتے ہیں کہ صوبائی حکومت کو اس علاقے کی اثری باقیات کی تاریخ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ 2009 میں اہل بہاول پور کی طرف سے پنجاب حکومت کے ادارہ برائے زبان وثقافت (پلاک) لاہور کے تحت بہاول پور شہر میں یہاں کی اثری باقیات کا جائزہ لینے کا دفتر کھولنے کی تجویز دی گئی مگر اس پر کبھی غور تک نہیں کیا گیا۔

☆☆☆☆☆

سنگین خطرہ Grave Danger

تحریر و تحقیق۔سلمان رشید محقق، ماہر اثری باقیات، ترقی پسند مؤرخ

شائع شدہ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی سالنامہ 2012

تاریخ دانوں کے ایک گروہ کا ماننا ہے کہ اوچ وہ شہر ہے جو اسکندر کے مؤرخ اریان کے مطابق چناب اور سندھ کے سنگم پر تعمیر کیا گیا تھا۔ فاتح کو توقع تھی کہ یہ جگہ ترقی کر کے ایک عالمی شہرت یافتہ شہر بن جائے گی۔ قرون وسطیٰ میں اوچ کو اسکالانداپا اس جیسے کئی متغیر ناموں سے جانا جاتا تھا جو سب ایلیگز ینڈریا کے مشتقات مانے جاتے ہیں جس کی وجہ سے مؤرخین اسے مقدونیہ کے فاتح کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ تاہم، کچھ لوگ اس تعلق سے انکار کرتے ہیں اور شہر کو کہیں اور تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چاہے جو بھی کہیں، گیارھویں صدی کے دوران اوچ یا (اوچا) یعنی بلند۔ اس کے بلند ٹیلے پر واقع ہونے کی وجہ سے یقیناً عالمی شہرت کا حامل تھا۔ ممتاز ماہرِ آثارِ قدیمہ ڈاکٹر سیف الرحمان ڈار نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ وسطی ایشیا سے افغان پہاڑیوں) (سطح مرتفع) کے ذریعے مرکزی سڑک پر واقع ہونے کی وجہ سے، اوچ سفر کرنے والوں کے لیے ایک مصروف راستے کے مرکز کے طور پر کام کرتا تھا جو یا تو راجستھانی شہروں کی طرف جا رہے تھے یا ملتان اور دہلی جانے والے تھے۔ چوراہے یا مرکزی جگہ پر واقع ہونے کی وجہ سے، یہ شہر آہستہ آہستہ سیاسی، مذہبی اور علمی مرکز بن گیا اور تمام مذاہب خصوصاً مذہب اسلام کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔ تیرہویں صدی کے اوائل میں ایک اسلامی مذہبی خاندان جو وسطی ایشیا سے تعلق کا داعی تھا، اوچ میں آباد ہو گیا۔ دوسرے لوگ بھی اس کے پیچھے آئے اور اوچ ایک مذہبی تعلیم کا بہت بڑا مرکز بن گیا اور آج کا یہ چھوٹا شہر حقیقتاً تیرہویں سے پندرھویں صدی تک کے مقبروں اور قبروں سے بھرا پڑا ہے لیکن اوچ کے لیے

سب کچھ آسان نہیں تھا، اس نے مشکلات کا بھی سامنا کیا۔ اس نے اپنے حصے کے دکھ بھی اٹھائے ہیں۔ گیارھویں صدی کے اوائل میں یہ غزنویوں کے حملوں کا مرکز بنا جنھوں نے کرامتی فرقے کو بیخ کنی کے لیے تلاش کیا جو کہ ان کے نزدیک بدعتی تھے۔ دوسو سال بعد چنگیز خاں معزول شدہ جلال الدین خوارزم جو چنگیز خان سے بچ کر بھاگ رہا تھا کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچا اور اس نے 1221 میں اس اسلامی مرکز کو لوٹ لیا اور تباہ و برباد کیا۔

کامل خان ممتاز، معروف معمار اور معمارانہ تاریخ دان اوچ کو سلاطین کے دور کے معمارانہ (architectural) انداز کی سب سے اہم اور نمائندہ دستاویز قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اوچ کی گنبد والی عمارتیں اس ابتدائی دور کی نمائندہ ہیں جب گنبد کی مضبوطی کو مکمل طور پر سمجھا نہیں گیا تھا اور اسے لکڑیوں سے مضبوط کرنے کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ اس سے بڑھ کر یہاں متنوع انداز کی عمارات کا ایک مجموعہ موجود ہے جس میں گنبد والی، شہتیری اور چپٹی چھت اور لکڑی یا اینٹوں کی بنی ہوئی عمارتیں شامل ہیں۔ ممتاز کے مطابق ہمارے علاقے میں قرون وسطیٰ کے اواخر یا اس کے بعد کی معمارانہ ترقی اور معیار کو سمجھنے کے لیے اوچ شریف سب سے اہم تاریخی دستاویز ہے۔ بازاروں کی ہلچل سے باہر ایک کم اونچی جگہ پر تین مقبرے ہیں۔ دراصل ان کے آثار نیلی ٹائلوں سے سجے ہوئے ہیں۔ سب سے قدیم بہاول حلیم کا مقبرہ، چودھویں صدی کے وسط میں تعمیر کیا گیا تھا، اس کے بعد بی بی جیوندی کا مقبرہ 1494ء میں مکمل ہوا اور نوریہ کی ایک چھوٹی سی عمارت چودہویں صدی کے وسط کے قریب۔ نوریہ کو ایک عظیم معمار سمجھا جاتا ہے جب کہ دیگر دونوں مذہبی شخصیات تھیں جو اوچ کے اہم خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔

1855 میں چناب نے جو اس وقت شہر کے قریب بہہ رہا تھا (آج 10 کلومیٹر مغرب میں) اس ٹیلے کے نیچے کٹاؤ کیا جس پر تین گنبد والی عمارتیں واقع تھیں اور ہر عمارت کا ایک نصف حصہ مکمل طور پر کٹ کر الگ ہو گیا اور پھر وہ پچھلے ڈیڑھ سو سال سے اپنی تقریباً برباد حالت میں کھڑی رہیں۔ فوٹوگرافروں کی نظر میں اپنی منفرد تصویری خصوصیت کی وجہ سے مشہور ہوئیں لیکن آثار قدیمہ کے تحفظ کے ماہرین کی طرف سے مکمل طور پر نظر انداز کر دی گئیں۔ 1997 میں، نیویارک کے عالمی

یادگاری فنڈ (ورلڈ مونیومنٹ فنڈ) سے اوچ کی عمارتوں کے تحفظ کے لیے مالی امداد فراہم کی گئی۔ اب، فنڈ ہر سال ایک ورلڈ مونیومنٹ واچ فہرست تیار کرتا ہے جس میں ایک سو سب سے زیادہ خطرے میں پڑی تاریخی عمارتوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلی فہرست میں اوچ کی ان تین عمارتوں کے گروپ کو اس کے سرورق پر شامل کیا گیا جس سے ان کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔ اس فنڈنگ نے ماہر تعمیرات (Architect) یاسمین چیمہ کو اوچ شہر کا تفصیلی مقامی جغرافیائی خصوصیات پر مبنی (ٹوپوگرافیکل) نقشہ تیار کرنے کی سہولت دی۔ اس کے علاوہ، خطرے سے دوچار عمارتوں کی تفصیلی دستاویز بھی تیار کی گئی۔ یہ آج ایک بہت ہی اعلیٰ معیار کے ریکارڈ کے طور پر دستیاب ہے۔ تدفین کی جگہ کی حفاظتی دیواروں کو مضبوط کیا گیا اور ایک بار پھر بیکار اور کمزور لکڑیوں کی جگہ بہاول حلیم کے مقبرے کی محرابوں کی مضبوطی کے لیے ایک مکمل عمل کیا گیا۔ اسی طرح، مائی جیوندی کے ڈھانچے کی سطح سے اوپر کچھ مضبوطی کی گئی۔ اس کے بعد فنڈز ختم ہو گئے اور کام رک گیا۔ مائی جیوندی کے مقبرے میں نصب مضبوط مچان (اسکیفولڈنگ) یہ ظاہر کرتی ہے کہ کچھ بہت ہی حوصلہ افزا مرمت و بحالی کے کام کا منصوبہ بنایا گیا تھا جو شروع ہی نہیں ہو سکا۔ اس تحریر کے دوران تحقیق کرتے وقت چوں کہ یاسمین چیمہ دستیاب نہیں تھیں لہٰذا یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اصل کیا منصوبہ تھا۔ گذشتہ چھ سال سے یہ کام ٹھپ پڑا ہے۔ تدفین کی جگہ کی حفاظتی دیواروں کی مضبوطی وقت پر ہوئی۔ اگر یہ کام نا کیا جاتا تو 2010-11 کے دوران ہونے والی متواتر بارشوں نے تینوں نازک عمارتوں کو شدید نقصان پہنچایا ہوتا لیکن اگر جلد ہی مزید تحفظ کا کام نہ کیا گیا تو اوچ کی سب سے اہم اور دلکش یادگاریں سنگین خطرے سے دوچار رہیں گی اور خدشہ ہے کہ ایک بہت اہم معمارانہ دستاویز (Architectural Document) ضائع نا ہو جائے۔

☆☆☆☆☆

حکایات بہاول پور

(10)

وہ ایک بڑا زمیندار اور کاروباری آدمی ہے۔ حال ہی میں اس نے اپنے گاؤں میں ایک عالیشان کوٹھی تعمیر کروائی ہے جس پر دو لاکھ سے زائد لاگت آئی۔ یہ بات مجھے ہمیشہ حیران کرتی رہی کہ اتنے چھوٹے سے گاؤں میں، جہاں آبادی چند سو نفوس پر مشتمل ہے، وہ ایسا شاندار محل کیوں تعمیر کروا رہا ہے؟ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نے بجلی اور پانی کے لیے بھی الگ سے اپنے پلانٹ اور واٹر ورکس قائم کیے کیوں کہ بیت الخلاء میں تازہ ترین فلش سسٹم لگایا گیا ہے۔ جب میں نے اس سے ملاقات کی تو میں اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا اور پوچھ بیٹھا": جناب! آپ نے اتنے مہنگے مکان پر ایک دور دراز گاؤں میں کیوں خرچ کیا؟ آپ تو کاروباری بھی ہیں۔ یہ رقم کراچی یا دارالحکومت میں لگاتے تو ہر ماہ معقول آمدنی حاصل ہوتی۔ "بوڑھے دانا نے مسکرا کر جواب دیا": تمھاری دلیل ٹھیک ہے، لیکن میری اپنی سوچ ہے۔ میں چاہتا تو کراچی میں بھی ایک کوٹھی بنا سکتا تھا لیکن وہ بھی ان سیکڑوں کوٹھیوں میں ایک اور کوٹھی ہوتی۔ میں شہروں کی دھواں زدہ فضا، ہجوم، خودغرضی اور دکھاوے سے دور یہاں اپنی مرضی کا پرسکون ماحول بنانا چاہتا تھا۔"

بقیدحیات خزانے

Surviving Treasures

تحریروتحقیق۔عمرفاروق فیچررائیٹرماہنامہ ہیرالڈکراچی شائع شدہ سالنامہ 2012

شہر اُوچ صدیوں سے اپنے آثار قدیمہ کی جگہوں اور مذہبی زیارت گاہوں کے لیے سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یہ علاقہ دہائیوں سے علمی دلچسپی کا حامل بھی ہے۔ یہاں بزرگوں کے مقابر اور قبروں پر چھ کناروں والے ستاروں اور کنول کے پھولوں کی کندہ کاری جنوبی پنجاب کے دانش وروں کے درمیان ایک مباحثہ کا موضوع بنی رہی ہے۔ بہت سے لوگوں کا ماننا ہے کہ یہ خطاطی یہاں ایک یہودی تجارتی برادری کے موجود ہونے اور برصغیر میں ہندو فلسفوں یا ابتدائی اسلامی صوفیانہ روایات کے اثرات کو ظاہر کرتی ہے۔ کچھ مقامات اُوچ کے ماضی کی عظمت کی عکاسی کرتے ہیں۔ جب مرمت کے منصوبوں کی بات آتی ہے تو کچھ قبریں ریاستی حکام کی غفلت کا شکار ہیں۔ 15ویں صدی کی یہ قبریں جن میں بی بی جیوندی، جو ایک نیک عورت کے طور پر جانی جاتی ہیں اور بہاول حلیم جو اوچ میں ایک مقامی مدرسے کے مذہبی اسکالر اور استاد تھے آسودہ خاک ہیں، ریاستی غفلت کی مثالیں ہیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے کالج آف آرٹ اینڈ ڈیزائن کے پرنسپل ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصر کہتے ہیں": اوچ ماضی میں اسلامی تعلیمات کا سب سے اہم مرکز تھا لیکن پنجاب حکومت آثارِ قدیمہ کی جگہوں کی دستاویز بندی کے لیے بھی وسائل مختص کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، "۔ دیگر علاقائی شاعروں کی طرح، انھوں نے بی بی جیوندی کو اپنی شاعری میں استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے، جس میں اوچ شریف کے تاریخی مقامات کی خستہ حالی کو بیان کیا گیا ہے۔

بی بی جیوندی جو سید جلال الدین بخاری سرخ پوش کی بیٹی ؟ تھیں) جو اوچ کے سب سے

محترم مذہبی شخصیات میں سے ایک ہیں (اپنی پارسائی کے لیے مشہور تھیں)۔ان کی قبر جو اوچ شہر کے بخاری علاقے میں واقع ہے خراسان کے حاکم دلشاد نے 1494 میں اس پر مقبرہ تعمیر کرایا۔ یہ مقبرہ 1817 میں سیلاب سے جزوی طور پر تباہ ہو گیا۔ 90-1988 میں وفاقی آثارِ قدیمہ کے محکمے نے اس کی مرمت کی تھی تا کہ اس کی باقی دیواروں کے نچلے حصے کو مضبوط بنایا جا سکے تا کہ یہ گر نہ جائے لیکن مقامی ماہرین کا کہنا ہے کہ آثارِ قدیمہ کے محکمے نے قبر کی تعمیر میں استعمال ہونے والی اصل چھوٹی ٹوٹی ہوئی اینٹوں کی جگہ بڑی اور آج کے دور کی اینٹیں لگا دیں جو عام طور پر پنجاب کے گھروں کی تعمیر میں استعمال ہوتی ہیں۔ مقبرہ کی کوئی چھت نہیں ہے اور اس کی صرف دو دیواریں کھڑی ہیں۔ لاہور میں قائم ایک غیر سرکاری تنظیم نے ان کو گرنے سے بچانے کے لیے غیر ملکی فنڈنگ سے دیواروں کے ساتھ اسٹیل کا فریم لگا دیا۔ مقبرے کا باقی بچا ہوا بیرونی حصہ ابھی بھی خوب صورت نیلی موزیک ٹائلوں سے مزین ہے جب کہ اندرونی حصہ صرف کھنڈرات کی مانند نظر آتا ہے۔ صوبائی آثارِ قدیمہ کے محکمے کے ساتھ کام کرنے والے ایک افسر کا کہنا ہے "اکثر مرمت کا کام یہ یقینی بنانے کے لیے کیا جاتا ہے کہ اصل ڈھانچہ کھڑا رہے نہ کہ اس کی ماضی کی عظمت کو واپس لایا جائے۔"

اس کے برعکس، سید جلال الدین بخاری سرخ پوش کا مقبرہ جو علاقے میں اسلام کے پھیلاؤ کا سبب سمجھا جاتا ہے، جو بی بی جیوندی کی آخری آرام گاہ سے صرف چند قدم دور ہے، بہترین حالت میں ہے جو حکام کی نظر میں مقبرے کی اہمیت کا غماز ہے۔ لیکن بی بی جیوندی اور بہاول حلیم کی قبروں کی طرح، شہر کے کچھ دیگر مقامات کی حالت بھی قابلِ افسوس ہے۔ ابوحنیفہ کے چودھویں صدی کے مقبرے کی حالت اب یہ ہے کہ اس کی چھت نہیں ہے اور اس کی دیواریں گر رہی ہیں۔ جو لکڑی کا کام کبھی اس کی سجاوٹ کا حصہ تھا وہ اب مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے اور پنجاب آثارِ قدیمہ کے محکمے کے حکام کا کہنا ہے کہ اس کی مرمت کے لیے فنڈز درکار ہیں جو فی الحال دستیاب نہیں ہیں۔ آثارِ قدیمہ کے حوالہ جات سے پتہ چلتا ہے کہ ابنِ بطوطہ نے اُوچ میں ابوحنیفہ سے ملاقات کی تھی اور بعد میں ان کا اپنے مشہور سفرنامے "الرحلہ" میں ذکر کیا۔ یہ مقبرہ جس کی مذہبی اہمیت کم دکھائی دیتی ہے شاید ہی زائرین کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ تین طرف سے تجاوزات سے گھرا ہوا ہے اور مقبرے کے

سامنے ایک گھر یا پلاٹ حال ہی میں ضلعی عدالت کے حکم پر خالی کرایا گیا ہے مگر بلدیہ اب اس خالی پلاٹ میں کچرا پھینکتی ہے۔ مقبرے کے پچھواڑے میں موجود گھر کے رہائشیوں نے اسے عدالت کے حکم کے باوجود خالی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اگر چہ تصور میں کوئی بھی مرمت کا کام خوش آئند ہے مگر عملی طور پر یہ تب ہی مناسب ہوتا ہے جب اس پر اچھی طرح سے سوچ بچار یا غور و فکر کیا گیا ہو اور ایسا اقدام کیا جائے جس سے یہ مقام مزید نقصان سے بچا رہے۔ یہی کچھ 1433 میں بنائے گئے راجن قتال کے مقبرے کے ساتھ ہوا۔ 2010 میں امریکی فنڈنگ سے مرمت کی گئی۔ اس کے مستطیل نما ڈھانچے اور بیرونی منظر کو جیومیٹرک پیٹرن والی چمکدار ٹائلوں سے سجایا گیا اور اس کی چپٹی چھت کو لکڑی کے ستونوں اور بریکٹوں سے سہارا دیا گیا۔ حالیہ وقت میں یہ ایک جدید گھر کے اندرونی کمرے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ مقامی افسر جو پنجاب آثارِ قدیمہ کے محکمے میں کام کر رہے ہیں، اس طرح کی غلط مرمت کی وجوہات بتاتے ہیں۔ وہ معیاری آپریٹنگ طریقوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کو مرمت شروع کرنے سے پہلے اس جگہ کا سروے کرنا چاہیے۔ "خراب حالت میں موجود مقام کا جائزہ لینے کے بعد، اور ماہر اپنی تشخیص کے ساتھ اس کے تحفظ کے نوٹس لکھتا ہے، درکار ساز و سامان کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے اور جگہ کے آثارِ قدیمہ کی تفصیلات کا سروے کرتا ہے لیکن راجن قتال کے مقبرے کے معاملے میں، کوئی تحفظ کا جائزہ تیار نہیں کیا گیا، وہ کہتے ہیں۔ دراصل وفاقی اور صوبائی آثارِ قدیمہ کے محکموں نے اوچ میں جگہوں پر کام کرنے سے پہلے تحفظ کے نوٹس تیار کرنے کے عمل کو کافی عرصہ پہلے ترک کر دیا ہے۔ حکام نے ہیرالڈ کو بتایا کہ شہر کے مقبروں پر کی جانے والی بیشتر مرمتیں سول انجینئرز کے مشوروں پر کی گئی ہیں نہ کہ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کی نگرانی میں۔ اس کے نتیجے میں، پنجاب آثارِ قدیمہ کے محکمے کا اُوچ میں تحفظ کا کام بظاہر بے ترتیب منصوبہ بندی کا شکار ہے۔ محکمہ کے ساتھ کام کرنے والے ایک انجینئر کے مطابق، کچھ جگہوں پر ڈھانچوں کو مضبوط کرنے کے لیے ملتان میں خصوصی طور پر چھوٹی اینٹوں کا استعمال کیا گیا ہے جب کہ دوسری جگہوں پر بڑی اینٹوں کا استعمال کیا گیا ہے تا کہ راستوں اور دیواروں کو سہارا مل سکے۔

ایسے انجینئرَ جوان جگہوں پر کام کر رہے ہیں، کہتے ہیں کہ مقامی لوگوں نے ڈھانچے میں بڑی اینٹیں ڈال دیں حالانکہ یہ ایک قابلِ سزا جرم ہے کہ اس طرح کی تبدیلیاں مقبرے کی ساخت یا سجاوٹ میں کی جائیں جو محفوظ مقامات پر ہوں۔ "جب بھی مقامی لوگ دیکھتے ہیں کہ کوئی حصہ گرتا ہے، وہ باہر سے اس پر اینٹوں کا کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں،" محمد سجاد، جو اوچ میں مرمت کے منصوبوں کے سربراہ ہیں، کہتے ہیں کہ اس طرح کی مرمت اکثر پائیدار نہیں ہوتی۔

مقبرہ موسیٰ پاک شہید جو سولہویں صدی کے ایک بزرگ اور جنوبی پنجاب میں محترم شخصیت ہیں، اوچ کے گیلانی حصے میں واقع ہے جہاں انھیں دفن کیا گیا تھا بعد میں ان کی لاش ملتان منتقل کر دی گئی تھی۔ مقامی انجینئرَز کا کہنا ہے کہ 1988 میں وفاقی آثارِ قدیمہ کے محکمے نے جو جدید اینٹیں استعمال کی تھیں وہ بوسیدہ ہونے سے بچانے کے لیے کافی اچھی نہیں تھیں۔ اوچ میں مقبروں کے نگران عبدالروَف یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔" گزشتہ برس اسلام آباد سے آئے ہوئے انجینئرَوں نے اس مقام کا دورہ کیا اور بتایا کہ یہ مقبرہ دو سال کے اندر منہدم ہو سکتا ہے۔ پنجاب حکومت کے سول انجینئرَ ممتاز الحق نے "ہیرالڈ" کو بتایا کہ اس مقبرے کی مزید بحالی کے لیے تین ملین روپے کی درخواست صوبائی حکومت کو بھیج دی گئی ہے۔ پنجاب آثارِ قدیمہ کے محکمے کا کہنا ہے کہ راجن قتال کے مقبرے کے سوا، اوچ کے تمام مقامات اٹھارہویں آئینی ترمیم سے پہلے وفاقی حکومت کے زیر انتظام تھے اس لیے وہ اُوچ میں مرمت کے عمل میں کی جانے والی کسی بھی غلطی سے خود کو بری الذمہ سمجھتے ہیں اس دوران جب مقامی باشندوں نے اپنے ورثے کے تحفظ میں شامل ہونے کی کوشش کی تو وفاقی حکام نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

ڈاکٹر نصر اللہ خاں ناصر جو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے کالج آف آرٹ اینڈ ڈیزائن کے پرنسپل ہیں، اوچ شہر میں ایک ہیریٹیج اسٹریٹ بنانیکی تجویز کا حوالہ دیتے ہیں۔ "یہ سڑک شہر کے سولہ مقبروں کو جوڑتی جنھیں ان کی اصل حالت میں بحال کیا جانا تھا،"۔ اس تجویز کو سننے والوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔

☆☆☆☆☆

چولستان: ایک بے آباد صحرا اور چنن پیر کے گاؤں میں

تحریر خصوصی فیچر: علیزہ کوہاری

شائع شدہ: ماہنامہ ہیرالڈ چولستان سپیشل اپریل 2015

https://herald.dawn.com/special/cholistan/

حصہ اول

چولستان: ایک بے آباد صحرا

ساٹھ لاکھ ایکڑ سے کہیں زیادہ وسیع وعریض صحرا، ریت کے ہر مربع کلومیٹر میں صرف نو آدمی — لیکن اُس صبح چولستان ایک چھوٹے سے قصبے کی طرح لگ رہا تھا۔ دراوڑ قلعے کے کھنڈرات کے قریب آباد بستیوں سے لے کر کئی میل دور نہروں سے گھرے کھیتوں تک، ہر شخص صحرا میں ہونے والی شادی کا ذکر ایسے کر رہا تھا جیسے کوئی نزدیکی ہمسایہ ہو۔ ''وہ جو عورتیں وہاں رہتی ہیں، بہت زیادہ میک اپ کرتی ہیں،'' حفیظہ نے ناک چڑھا کر اور آواز دھیمی کر کے کہا جیسے وہ واقعی برابر والے گھر میں ہوں۔ وہ بھی صحرا میں ہی رہتی تھی لیکن اس کا اپنا گھر دراوڑ قلعہ کے قریب اور ایک سڑک کے ساتھ تھا جس کی وجہ سے وہ خود کو صحرا کے اندر بسنے والے خانہ بدوشوں سے الگ سمجھتی تھی جہاں پکی سڑک ختم ہو کر صحرا کی سفید سطح، یعنی ''ڈاہر'' میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ''اور کتنے چمکیلے کپڑے!'' تھوڑا اور آگے، اس زمین پر جہاں تھوڑے سے پانی کی آبپاشی اور کھاد و کیمیکل کے امتزاج نے زمین کو قابلِ کاشت بنایا تھا، رشیدہ کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے بتایا کہ یہ شادی اُس کے رشتہ داروں میں تھی؛ اس کے زیادہ تر رشتہ دار گہرے صحرا میں رہتے تھے۔ کئی سال پہلے، اس کے سسر کو یہاں زمین کا ایک ٹکڑا

الاٹ ہوا تھا، اس کی کاشت کے لیے اب وہ یہاں اپنے چند بیٹوں، اپنی بیٹی اور اس نواسی کے ساتھ رہتی تھی جو آٹھ سال کی سنجیدہ آنکھوں والی بچی تھی۔ کچھ ہفتے قبل، یہ نواسی بھی ایک پیچیدہ نظام ''وٹہ سٹہ کے تحت تقریباً بیاہی جا رہی تھی جسے آخری لمحے ٹال دیا گیا تھا۔ ''اس کے ہاتھوں پر مہندی بھی لگ گئی تھی،'' رشیدہ نے سنجیدگی سے کہا اور بچی کو اپنے قریب کر لیا۔

صحرا میں شادی والی دلہن بھی عمر میں صرف کچھ بڑی تھی۔ لوگ کہتے ہیں بارہ سال کی۔ وہ زیورات سے لدی ہوئی ایک چارپائی کے بیچ پریشان بیٹھی تھی جب کہ خوش باش خواتین رشتہ دار اس کے اردگرد موجود تھیں۔ کھلے میدان میں، دولہا، جو دلہن سے بڑا لیکن پھر بھی نوجوان تھا، وہ بھی اتنا ہی بوجھل دکھائی دیتا تھا۔ اس کے گلے میں پڑا ہوا ہار تقریباً پورے جسم کو ڈھانپ رہا تھا اور اچھے شگون کے لیے اس نے دھات کی ایک چھڑی پکڑ رکھی تھی۔ اس کے آس پاس مہمان کھانے کے بڑے دیگچوں کے قریب جمع تھے یا شامیانوں کے نیچے آرام کر رہے تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ صحرا کی اس شادی کے انتظامات ایک پروفیشنل کیٹرر کر رہا تھا۔ بعد میں، قریبی قصبے سے ایک گلوکار اپنی اسکوٹر پر کھڑکھڑاتا پہنچے گا، وہ تہوار جیسی پیلی قمیض میں مکمل سیاہ بالوں اور چمکتے سفید دانتوں کے ساتھ ایک معمولی سی مشہور شخصیت کے غرور کے ساتھ ہوگا لیکن ابھی دلہن کی جھونپڑی کے باہر عورتیں گیت گا رہی تھیں: ایسے گیت جو نسل در نسل منتقل ہوئے اور نئے گیت جو ریڈیو پر مقبول تھے۔ ان کے صحرائی لہجے میں اردو کی بول چال اور عام بول چال کے الفاظ ملے ہوئے تھے:

تم شہر میں رہتے ہو، میں روہی کی باسی ہوں،
مجھے بتاؤ بھلا ہمارا میل کیسے ہوگا؟
تم محل جیسے بنگلوں میں ہو،
ہمارے پاس کچے جھونپڑے ہیں،
تم ٹھنڈے پانی کے کولر سے پیتے ہو،
ہمارے پاس ادھ بھرے مٹکے ہیں،
تم جیپوں اور گاڑیوں میں سفر کرتے ہو،

ہم اونٹوں پر بیٹھتے ہیں،
تم پھل کھاتے ہو، ہم مشروم پر گزارا کرتے ہیں،
پھر بتاؤ بھلا ہمارا میل کیسے ہوگا؟
(سرائیکی متن از شاعر۔مترجم)
(میکوں ایہوتاں ڈسا کیویں جوڑ ایہہ ٹھاہسی
تیڈی شاہر دی رہائش میں ہاں روہی داواسی
تیڈیاں محل تے ماڑیاں ساڈیاں جھوپڑتے جھگیاں
تیڈے کولر ٹھڈے پانڑی ساڈیاں گیڑیاں تے گھگیاں
تیڈیاں جیپاں تے کاراں ساڈی اُٹھاں دی سواری
تیڈے کیلے پھل فروٹ ساڈی کھمبیاں تے گزاری)

یہ ایک ناکام عاشق کا بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا نوحہ ہے — تکنیکی طور پر غم کا گیت — لیکن عورتیں اسے افسردگی سے نہیں گا رہیں۔ وہ اسے فتح مندانہ طور پر گاتی ہیں، ہاتھوں کو گھماتے ہوئے، اس گیت کو فتح مندی کے جشن میں بدل دیتی ہیں۔ صحرا کے لوگ شہری زندگی کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ ان کے اردگرد، کیٹرر کے لگائے ہوئے شامیانوں سے آگے، کرسیوں سے بھری ہوئی ٹریکٹر ٹرالی سے آگے، صحرا لامحدود حد تک پھیلا ہوا ہے: ہوا میں ریت، زمین پر ریت، چھوٹے بگولے جو افق تک گھومتے چلے جاتے ہیں۔ یہ پورا وسیع صحرا ان کا ہے، کاغذ پر نہ سہی تو خیال میں: جب ان کا ''ٹوبہ'' پانی سے خشک ہو جائے گا تو یہ اپنے جانوروں کو لے کر وہاں جائیں گے جہاں پانی انھیں لے جائے گا۔ ان کے آباؤاجداد یہی کرتے آئے ہیں، سینکڑوں برس سے۔ اور پھر بھی حکومت کی جانب سے صحرا کو مزید آباد کرنے کے لیے اراضی کی نئی تقسیم کی تیاری جاری ہے، ساڑھے بارہ ایکڑ کے مربعوں میں زمین تقسیم کی جا رہی ہے، دو لاکھ آبادی والے اس صحرا سے چون ہزار سے زائد درخواستیں موصول ہو چکی ہیں۔ ہر پُر شدہ فارم درحقیقت ایک مختلف زندگی کی خواہش ہے۔ پورے صحرا میں، حفیظہ کے گھر سے لے کر رشیدہ کے رشتہ داروں تک اور بجنوٹ کی اُن آبادیوں تک جو اتنی اندر ہیں کہ 1971 میں

بھارتی فوج نے ان پر قبضہ جمالیا تھا، ہر چولستانی خاندان کی ایک ہی خواہش ہے: زمین کا ایک ٹکڑا جسے وہ اپنا کہہ سکیں۔ شاہنامہ کے فارسی رزمیہ میں اپنے ہم نام کی طرح، رستم عباسی کا تعلق بھی بادشاہوں سے ہے۔ وہ اسی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جس سے بہاول پور کے نواب ہیں جو خود کو آٹھویں صدی میں بغداد کے عباسی خاندان کی اولاد بتاتے ہیں۔ بعض مؤرخ اس نسب پر شک کا اظہار کرتے ہیں اگرچہ عباسی اسے فخر کے نشان کی طرح ظاہر کرتے ہیں۔ ہمیں جو بات یقینی طور پر معلوم ہے وہ یہ کہ اٹھارہویں صدی کے ابتدائی برسوں میں سندھ پر حکمرانی کرنے والے جنگجو سرداروں نے آپس میں لڑنا شروع کیا اور ایک گروہ داؤد پوتروں کا قبیلہ، شمال کی طرف منتقل ہوا اور ستلج، چناب اور سندھ کے دریائی سلسلے کے ذرا نیچے آباد ہو گیا۔ مشرق میں جیسلمیر کے حکمران سے ٹکراؤ کے بعد، انھوں نے اس کے صحرا کے قلعے، دراوڑ پر قبضہ کر لیا۔ اسی سے ریاست بہاول پور کی ابتدا ہوئی۔ "نہیں نہیں! لیکن میں اُس طرح کا عباسی نہیں ہوں،" رستم تھوڑی شرمندگی سے جلدی سے وضاحت کرتا ہے۔ قبیلہ ایک بات ہے لیکن بادشاہوں کو ماتحتوں کے ساتھ نہیں ملانا چاہیے۔ رات ہے، گہری رات، رستم زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہے، ریت کے اندر چھپی ہوئی بے جان جڑوں کو کھرچ رہا ہے۔ اس کے موبائل فون پر ایک گانا تیز آواز سے بج رہا ہے: ایک عورت کی آواز، غالباً ریشماں کی، ہوا کو چیرتی اور شور پیدا کرتی ہے۔ رستم بڑے فخر سے اعلان کرتا ہے کہ یہاں سے تین سو کلومیٹر مشرق اور تین سو کلومیٹر مغرب تک ساری زمین نواب کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس میں مبالغہ ہے: زیادہ تر زمین وفاقی حکومت کو وراثت میں ملی تھی جب یہ نوابی ریاست 1947 میں پاکستان میں شامل ہوئی اور پھر 1954 میں ون یونٹ میں ضم ہو گئی لیکن قابلِ ذکر حد تک اراضی اب بھی سابق شاہی خاندان اور ان کے متعدد وسیع رشتہ داروں کی ملکیت ہے اور رستم کا نسبتاً بے رونق سا کام اسی ذاتی جائیداد پر دراوڑ اور اس کے اردگرد نظر رکھنا ہے پھر بھی، کبھی کبھار وہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی ناول کے صفحوں سے سیدھا نکل آیا ہو — شاید کوئی ناقابلِ اعتبار راوی یا کوئی خیالی ساضمنی کردار جس کی اپنی کوئی الگ سی ثانوی کہانی ہو۔ وہ کھردری، بے ربط آوازوں میں بولتا ہے اور اکثر نادانستہ طور پر مزاحیہ لگتا ہے۔ اُس کا خواب ہے کہ قلعے کی زمین کے نیچے سے سونا نکالے اور سیاہ بچھوؤں کو پھانس کر اُن کے زہر کو دواساز کمپنیوں کو بیچ کر

دولت کمالے۔ وہ فخر سے ایک جوڑی بچھو دکھاتا ہے جو وہ پہلے ہی پکڑ چکا ہے — چھوٹے، کیچڑ جیسے، بھورے رنگ کے، جو ایک دھات کی بالٹی میں خطرناک انداز میں رینگ رہے ہیں۔ اور پھر اپنے برابر میں موجود ایک لمبی، نالے جیسے گڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک کہانی سناتا ہے — بظاہر معمولی سی، اگر سیاق وسباق نہ ہو، لیکن صحرا کی ویرانی میں ایک عجیب سا غیر حقیقی رنگ لیے ہوئے۔ "یہ کبھی نہر ہوا کرتی تھی،" وہ کہتا ہے۔ "کبھی یہاں پانی بہتا تھا، جو گندم، کپاس اور گنے کے کھیتوں کو سیراب کرتا تھا۔" وہ بتاتا ہے کہ چولستان کے کچھ لوگوں کا ایک وفد نواب کے حضور پیش ہوا اور ایک عجیب سی درخواست کی۔ "یہ پانی بند کر دیں،" انھوں نے منت کی، "ہمارے جانور مر رہے ہیں۔" اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ گڑھا واقعی کسی پرانی نہر کا سا منظر پیش کرتا ہے — اب ترک شدہ، بالکل سوکھا جیسے کبھی پانی کا نام ونشان ہی نہ ہو۔ ڈھیلی اینٹوں پر ماند پڑتا چاند مدھم روشنی ڈال رہا ہے؛ دراڑوں میں جھاڑ جھکاڑ اگ آئی ہے۔ رستم یہ کہانی بڑے اہتمام سے سناتا ہے — نواب کی فیاضی کو اجاگر کرنے کے لیے تاکہ موجودہ حکومتوں کی بے حسی اس کے دل کے کشادہ پن کے مقابل واضح ہو جائے۔ وہ بتاتا ہے کہ نواب نے کاشتکاری کو روک دیا تاکہ علاقے کے خانہ بدوش، جو صرف مویشی پالتے تھے، اپنے جانور چَرا سکیں۔ بہاول پور کے نوابوں نے اپنی ایسی ہی شبیہ کو شعوری طور پر پروان چڑھایا تھا، ریاست کا نشان ایک "پیلیکن" (پانی پر رہنے والا پرندہ) تھا جو اپنی جان کی قیمت پر اپنے بچوں کو اپنا خون پلا دیتا ہے اور اسی وجہ سے ایثار وقربانی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن رستم کی کہانی ایک اور زاویے سے بھی نہایت معنی خیز ہے: یہ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ زمین، خواہ وہ صحرا ہی کیوں نہ ہو، جو بظاہر ناقابلِ تغیر لگتا ہے — وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے۔۔ چولستان شاید کسی بھی اور صحرا کے مقابلے میں اس خیال سے زیادہ متاثر ہے۔ خانہ بدوش ایسے گیت گاتے ہیں جن میں پانی کی تمنا ہوتی ہے۔، یہ گیت اس بات کے گواہ ہیں کہ یہاں کبھی پانی تھا۔ ایک صحرا کے گیت میں، ایک دریا ''پتن منارہ'' کے مقام پر دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے، جہاں ایک قدیم بدھ خانقاہ تھی، اب محض پتھروں کی کمزور سی عمارت ہے — یہ گمشدہ دریا ''ہاکڑہ'' ہے، رگ وید میں مقدس ''سرسوتی'' ہندو مت کا تیسرا عظیم دریا جس کے متعلق اب محققین متفق ہیں کہ یہ محض ایک فرضی داستان نہیں۔ ایک اور

گیت میں، بیاس اور ستلج دریا پہاڑوں سے "دو آزاد گھوڑیوں" یا "دو گایوں کی طرح" اُترتے ہیں جو آپس میں کھیل رہی ہوں — اب یہ دونوں دریا پاکستان میں صرف نام کی حد تک بہتے ہیں کیوں کہ سندھ طاس معاہدے کے تحت انھیں بھارت کو دے دیا گیا ہے۔ ایک اور گیت میں شاعر دریا سے منت سماجت کر رہا ہے کہ وہ اپنا زور کم کرے تا کہ وہ اسے پار کر سکے۔ ''صرف تب جب تم میرے لیے ایک نظم لکھو گے،'' دریا شرارت سے جواب دیتا ہے۔ ''تا کہ دنیا مجھے یاد رکھے جب میں نہ رہوں۔''

امریکا کے مغربی صحراؤں، ریگستانی وسعتوں، اور قدرتی مناظر کے پُر جوش مصنف اور مؤرخ ایڈورڈ ایبی (1989–1927) نے لکھا تھا، ''صحرا سے محبت کرنے کے لیے آپ کو ہرے رنگ سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔'' لیکن یہ خاص مقام کبھی سرسبز اور آباد تھا۔ ہاکڑہ ندی کی خشک گزرگاہ پر ایک علاقہ ''گنویری والا'' کہلاتا ہے، ایک غیر کھدی ہوئی آثارِ قدیمہ کی جگہ، تقریباً 80 ہیکٹر پر پھیلی ہوئی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ موہنجوداڑو اور ہڑپہ جتنا ہی قدیم ہے، شاید اس دور کے بڑے شہروں میں سے ایک تھا۔ آج یہ محض ویران زمین دکھائی دیتی ہے؛ مقامی لوگ کہتے ہیں یہاں سے ایک سڑک گزرتی ہے اس لیے صحرا کے کنارے ترک شدہ نہر کی کہانی خاص معنی رکھتی ہے — ایک استعارہ، شاعرانہ علامت یاد اور خواہش کا امتزاج۔ یہ کہنا کہ پانی زندگی کے لیے لازمی ہے، ایک عام سی بات ہے جو چولستانی ''ڈاہر'' سے بھی زیادہ ہموار ہے لیکن کیا یہ پھر بھی دلچسپ نہیں کہ صحرا وہ واحد زمینی منظر (landscape) ہے جو اُس شے کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے جس کی اس میں کمی ہے؟ مانا کہ پانی کی قلت ہی صحرا کی زندگی کو کنٹرول کرتی ہے: اسی لیے چولستانی لوگ جو کھاتے ہیں، جیسے کپڑے پہنتے ہیں اور عام طور پر جیسے زندگی گزارتے ہیں وہ پانی کی قلت کے باعث ہی ہے۔ اس کے باوجود جب آپ جسمانی طور پر صحرا میں موجود ہوتے ہیں تو فوراً پانی کا خیال آپ کو نہیں پکڑتا۔ اس کے بجائے آپ حیران ہوتے ہیں زمین کی بے انتہا مقدار پر۔ کوئی اسفالٹ کی حدود نہیں، کوئی کنکریٹ کی عمارتیں نہیں، کوئی بجلی کے کھمبے اور تاریں نہیں۔ ایک بھی سیدھی زاویے والی سطح نہیں، جیسا کہ ایڈورڈ ایبے کہے گا — بس جنگلی لہریلی زمین۔ یہ کشادگی کا احساس آپ کو چکرا سکتا ہے۔ ایک پلک جھپکیں اور منظر جیسے سراب کی طرح غائب ہو جائے گا۔ دیگر مناظر کے برعکس صحرا کا کوئی جسمانی یا مقصدی نقطہ

اختتام نہیں لگتا: پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں، سمندروں کے ساحل ہیں اور دریاؤں کے مخالف کنارے ہیں لیکن صحرا بس موجود ہے، اپنی کشادگی میں پُراَسرار اور بظاہر مقصد کے فقدان میں مشکوک یعنی "جو بظاہر بے مقصد نظر آتا ہے، اسی وجہ سے مشتبہ محسوس ہوتا ہے''۔ شاید اسی نا قابلِ فہم خاصیت کی وجہ سے بہت سے لوگ دیگر مناظر کو ترجیح دیتے ہیں، پہاڑوں کی عظمت، بڑے شہروں کا شور شرابہ، یہاں تک کہ میدانوں کی سنجیدہ فطرت۔ صحرا کو عام سیاحوں کی زیادہ پرواہ نہیں؛ یہ سج سنور کر خود کو دکھاتا نہیں۔ تو پھر آپ کیا کریں گے اگر صحرا میں گم ہو جائیں اور زمین کا احساس نہ کر پائیں؟ وہ لوگ جو گاڑیوں پر سفر کرتے ہیں — شکاری، امدادی کارکن، جنگلی حیات کے افسران اور سرکاری سب انجینئر — اپنے ٹائروں کے نشانوں سے ریت پر علامات بناتے ہیں، پیچیدہ لکیریں اور دائرے جو اُن کے راستوں کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ہوا والے دن ان نشانات کا حال روٹی کے ٹکڑوں کے نشانوں جیسا غیر یقینی ہوتا ہے۔ ایک گمشدہ چولستانی اپنا پگڑا اتار کر کسی درخت یا ٹیلے پر اپنے قد سے بلند رکھ دیتا ہے جو صحرا میں مصیبت کی ایک معروف علامت ہے۔ اگر رات ہو تو وہ ستاروں کے ذریعے راستہ تلاش کرے گا البتہ اب چوں کہ ایک موبائل کمپنی پورے علاقے میں نیٹ ورک فراہم کرتی ہے، یہ گمشدہ چولستانی شاید فون کے ذریعے مدد طلب کرے گا جو یقینی طور پر کم رومانوی لیکن بہت زیادہ مؤثر طریقہ ہے۔ میرے لیے، جو ایک مختلف معنوں میں گم ہو چکا تھا، میں نے نقشہ دیکھا۔ اس سے معمولی سی مدد ملی: چولستان پنجاب کے جنوب مشرقی کونے میں زرد رنگ کے دھندلے نشان کی صورت میں نظر آتا ہے، اقتدار کے مراکز سے بہت دُور، شاید ہی کسی کے تصور کو جگا سکتا ہے، ماسوائے اُن کے جو خلا کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ دراوڑ کے آگے شاید ہی کوئی پختہ سڑک موجود ہو، نہ ہی کوئی تہذیب کے نقشے والی علامت۔ تھر صحرا کے برعکس یہاں کوئی مناسب قصبہ نہیں — بجنوٹ، جو چولستان کی سب سے بڑی بستی ہے، ایک قطار میں بنے ہوئے گھاس پھوس کے جھونپڑوں (گوپوں) زیرِ زمین کنوؤں اور تالہ لگی ہوئی سفید مسجد پر مشتمل ہے۔ چناں چہ میں نے اس خلا پر اپنے ذاتی نشانات لگانے شروع کیے۔ میں نے گنویری والا کی سائٹ کو نشان زد کیا، چولستان کی 400 قدیم سائٹوں میں سے ایک جس کی شناخت ماہرِ آثارِ قدیمہ رفیق مغل نے کی پھر غیر یقینی طور پر پرانے ہاکڑہ کے دریا کی گزرگاہ کو کھینچا جسے

اکثر کم گہرے اور زیادہ گہرے چولستان کے مابین عملی حد سمجھا جاتا ہے۔ میں نے صحرا میں بکھرے ہوئے ٹوٹتے قلعوں کی قطاروں کو بھی نشان زد کیا اور 5,000 ایکڑ کے نئے چمکتے سولر پارک کو بھی جو قومی گرڈ میں سو میگا واٹ کا اضافہ کرے گا۔ صحرا کے کنارے پر لال سوہانرا نیشنل پارک کا خاکہ بنایا جو صحرا اور جنگل کی زندگی کا ایک دلچسپ امتزاج ہے۔ یہ تبصرے والا نقشہ بہت حد تک ایک بیرونی آدمی کے نقطہ نظر پر مبنی تھا، مجھے احساس ہوا کہ اس میں وہاں رہنے والوں پر معمولی سی ہی توجہ دی گئی ہے۔ جس سے ایک اور سوچ پیدا ہوئی: جب دوسرے لوگ صحرا کو دیکھتے ہیں تو وہ کیا دیکھتے ہیں؟

مجھے گذشتہ برس تھر سے نکلنے والی شدید میڈیا رپورٹس یاد آئیں جنھوں نے بلاشبہ مشکل صحرا کی زندگی کو بالکل جہنم جیسا بنا کر پیش کیا یہاں تک کہ عارف حسن جیسے ماہرین نے دلیل دی کہ مسائل کی جڑیں زیادہ گہری ہیں جو ناقص جدیدیت کا لازمی نتیجہ ہے۔ مجھے خواجہ غلام فرید یاد آئے جو انیسویں صدی کے آخر میں صحرا میں گھومتے تھے اور اس کی ویرانی میں انسانی روح کا استعارہ دیکھتے تھے۔ وہ وجد میں لکھتے تھے: میں پہاڑوں اور صحراؤں میں اس طرح گھومتا ہوں جیسے رقص کرتے ہوئے قدموں سے متحرک ٹیلے۔ ایک اور حالیہ نظم یاد آئی جس میں چولستان آنے والے سیاحوں پر تنقید تھی کہ وہ یہاں کے لوگوں کو محض دلکش منظر کے طور پر پیش کرتے ہیں:

ہمارے تالاب کیسے خشک ہوئے، ہمارے مال مویشی کیسے تباہ ہوئے،
لیکن تم یہاں ہماری تصویریں لینے آتے ہو، ہم پر فیچر لکھتے ہو،
کہتے ہو ''روہی جنت ہے''، ہمیں سرکس کی طرح پیش کرتے ہو۔

میں نے دوبارہ نقشہ دیکھا۔ سیاست دان کیا دیکھے گا؟ تھر صحرا کے برعکس، چولستان انتظامی طور پر تین اضلاع میں پھیلا ہے: بہاولنگر، بہاول پور اور رحیم یار خان۔ کوئی ایک مکمل انتخابی حلقہ صحرا پر مشتمل نہیں۔ مقامی لوگ افسوس کرتے ہیں کہ کوئی چولستانی آج تک کونسلر سے بڑا عہدہ حاصل نہیں کر سکا۔ فوجی شخص ہندوستانی سرحد پر غور کرے گا۔ زمین کی آبادکاری کا افسر اسے بنجر مگر قابلِ تقسیم زمین کے طور پر دیکھے گا۔ میں نے آخری بار چولستان کا نقشہ دیکھا۔ اچانک یہ زرد دھندلا نشان زندہ محسوس ہوا۔

بوڑھے اللہ بخش کے پاس ایک ہزار اونٹ ہیں۔ تکنیکی اعتبار سے یہ بات اسے بہت امیر

آدمی بتاتی ہے۔آخرکار،قربانی کے لیے عام اونٹ کی قیمت 60 ہزار سے 2 لاکھ روپے تک ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے جانور علاقے میں گوشت یا طاقت کے لحاظ سے بہترین نہ بھی ہوں اور ان کی اوسط قیمت صرف ایک لاکھ روپے ہی ہو تب بھی یہ بہت زیادہ رقم بنتی ہے۔درست حساب لگائیں تو یہ دس کروڑ روپے بنتے ہیں۔اُس دوپہر اللہ بخش اپنی نیم پختہ بستی ''ناگراکھوں'' میں اپنی ڈھیلی ڈھالی دھوتی،کڑک پگڑی اور شکن زدہ پیشانی کے ساتھ بیٹھا ہے۔اُس کے ساتھ والی چارپائی پر ایک جوان آدمی بیٹھا ہے،اسی علاقے کا باشندہ جو اب ٹوبے اور شہر کے درمیان وقت تقسیم کرتا ہے۔ایک نسل کے فرق نے کتنا بڑا بدلاؤ پیدا کیا ہے: نوجوان نے فیتے والے سینڈل اور ہلکی جامنی پگڑی پہن رکھی ہے؛ اُس کی کلائی پر گھڑی،ہاتھ میں موبائل فون اور ناک پر مٹی میں اَٹے دھوپ کے چشمے ہیں۔میں دوبارہ اللہ بخش کی طرف دیکھتی ہوں،اُس کے ہاتھ میں پکڑی چھڑی اور پاؤں میں نوکیلے کُھسوں کو دیکھتی ہوں۔میرے ذہن میں لفظ ''غریب'' آتا ہے۔اس لفظ کا اصل مطلب ''بے پیسہ'' نہیں ہے، اگرچہ آج کل ہم اسے عموماً اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں لیکن اصل میں یہ ''اجنبی،غیر،جدا'' کے معنی رکھتا ہے۔یہ بوڑھے شخص کے لیے موزوں لگتا ہے جو میرے سامنے ہے۔اُس کی پیشانی پر پڑی شکنوں کی دو وجوہات ہیں۔سردیاں قریب آ رہی ہیں اور گھاس پھونس کم ہوتی جا رہی ہے۔بارشیں تیزی سے غیر یقینی ہو چکی ہیں۔ایک زمانہ تھا جب محکمہ جنگلات ہیلی کاپٹروں کے ذریعے بیج بکھیرتا تھا؛ بارش کے بعد وہ اُگتے اور چراگاہوں میں اضافہ ہو جاتا لیکن اب یہ عمل ترک کر دیا گیا ہے۔بلکہ اِس سال ایک نئی پریشانی بھی آن پڑی ہے: چولستان ڈیولپمنٹ اتھارٹی (CDA) جو صحرا میں بنیادی انتظامی ادارہ ہے،نے علاقے کے 1800 سرکاری طور پر تسلیم شدہ ٹوبوں میں سے 1100 کی صفائی اور توسیع شروع کر دی لیکن غیر ارادی طور پر پانی اور چراگاہ کے تناسب میں خلل پیدا کر دیا لہٰذا اگرچہ ناگراکھوں کے ٹوبے میں پانی چمک رہا ہے مگر گھاس پھونس غائب ہو چکی ہے۔اللہ بخش کے جانور گھاس کی تلاش میں دور دور بھٹک رہے ہیں،جتنا زیادہ سفر کرتے ہیں اتنے ہی کمزور ہوتے جاتے ہیں اور نتیجتاً ان کے دودھ کی پیداوار بھی کم ہو جاتی ہے۔تو کیا اب ہجرت کا وقت آ گیا ہے،اتنا سارا پانی چھوڑ کر؟ ایک خانہ بدوش کے لیے یہ ایک ظالمانہ فیصلہ ہے۔''اب مویشیوں میں کچھ نہیں بچا،''

ایک ہزار اونٹوں والا آدمی افسوس سے کہتا ہے۔ ''پھر کیا ہوگا؟'' میں پوچھتی ہوں۔ ''رقبہ!'' وہ معنی خیز انداز میں جواب دیتا ہے۔ زمین کا ایک ٹکڑا۔ اُس کے پاس بیٹھا ہوا شخص زور زور سے سر ہلاتا ہے۔ دراصل اللہ بخش کے پاس پہلے ہی زمین ہے۔ اس کے خاندان کو 1970ء کی دہائی میں ناگرا کھوں سے کئی میل دور ساڑھے بارہ ایکڑ زمین الاٹ ہوئی تھی لیکن اب سالہا سال اور نسل در نسل تقسیم کے بعد ہر فرد کا حصہ محض چند مرلوں یا چند سو گز تک محدود ہو چکا ہے۔ وہ اس زمین کو خود کاشت نہیں کرتا بلکہ اس نے اسے ٹھیکے پر دے رکھا ہے پھر بھی وہ تھوڑی مزید زمین کے خلاف نہیں۔ زیادہ تر چولستانیوں کی طرح اسے یقین ہے کہ یہی خوشحالی کا راستہ ہے اگرچہ اسے واضح طور پر معلوم نہیں کہ وہ اس زمین کا کرے گا کیا۔ میں پوچھتی ہوں، ''کیا تم خود کاشت کرو گے؟'' اللہ بخش کندھے اُچکاتا ہے۔ الاٹ ہونے والی زمین کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی: ہوسکتا ہے زمین ناہموار ہو، شاید وہ کافی زرخیز نہ ہو یا اس میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ہو۔ زیادہ تر لوگوں کو زمین قابلِ کاشت بنانے کے لیے اپنے وسائل خرچ کرنا پڑتے ہیں یہاں تک کہ چند جانور فروخت بھی کرنے پڑتے ہیں۔ ایک شخص نے اعتراف کیا کہ اس کے پاس زمین ہموار کرنے کے لیے پیسے نہیں تھے اس لیے اُس نے سابق یونین کونسل ناظم سے مدد مانگی۔ سیاست دان راضی تو ہوا لیکن ایک شرط پر۔ آئندہ آٹھ سالوں کی فصل کی ساری آمدنی اسے دینی ہوگی۔ لیکن اللہ بخش کو اس بات کی زیادہ فکر نہیں۔ کم از کم، وہ دلیل دیتا ہے، جب وہ سردیوں میں آباد علاقوں میں ہجرت کرے گا تو جانور رکھنے کی جگہ تو ہوگی۔ اس وقت وہ ہمیشہ پریشان رہتا ہے: اس کی گائیں اور اونٹ جب کبھی دوسروں کی زمینوں میں گھس جاتے ہیں تو زمیندار کے ملازم ہوا میں گولیاں چلاتے ہیں۔ کبھی کبھار براہ راست بھی چلا دیتے ہیں۔

1959 میں جب "مزید خوراک اگاؤ منصوبے" (Grow More Food Scheme) کا آغاز ہوا تب سے اب تک چولستان میں زمینوں کی الاٹمنٹ کے کئی مراحل مکمل ہو چکے ہیں۔ اب تک 2,68,748 ایکڑ صحرا کو باقاعدہ طور پر چکوں میں تقسیم کر کے 20,605 افراد کو عطا کیا جا چکا ہے۔ کچھ اسکیمیں صرف چولستانیوں کے لیے مخصوص تھیں جب کہ بعض دیگر میں یہ تخصیص نہیں تھی۔ ملک بھر میں ترقیاتی منصوبوں سے متاثر ہونے والے افراد کو بھی یہاں زمین دی گئی:

بلوچستان میں پٹ فیڈر کینال کی تعمیر سے متاثرہ 481 افراد، اوکاڑہ میں فوجی چھاؤنی سے متاثرہ 357 افراد، مظفرگڑھ کینال سے متاثرہ 164 افراد اور لال سہانرا نیشنل پارک سے بے دخل کیے گئے 132 افراد کو بھی یہاں زمین دی گئی۔ یہاں تک کہ تربیلا ڈیم کے متاثرین کے چند خاندانوں کو بھی یہاں آباد کیا گیا۔ کارگل جنگ میں شہید ہونے والے 133 فوجیوں کے خاندانوں کو بھی اسی صحرا کی زمینوں سے نوازا گیا۔ جاری اسکیم کے تحت سات سے آٹھ ہزار، ساڑھے بارہ ایکڑ کے رقبے فراہم کیے جائیں گے اور حکام اصرار کرتے ہیں کہ یہ صرف چولستانیوں کے لیے مختص ہوں گے۔ اس عمل میں سخت چھان بین کی جاتی ہے۔ درخواست گزار کو 1980 کی دہائی سے مویشیوں کے ٹیکس (تیرنی) کی ادائیگی کی رسیدیں دینا ہوتی ہیں۔ ان کا نام 2008 کے انتخابی فہرستوں میں ہونا ضروری ہے۔ ان کے شناختی کارڈ پر مستقل پتہ چولستان درج ہونا چاہیے اور ان سب کی تصدیق ان کے گاؤں کے لمبردار سے درکار ہوتی ہے۔ حکام کہتے ہیں 54,115 درخواستوں میں سے صرف 20,000 سے 25,000 ہی جانچ کے معیار پر پوری اُترنے کی توقع ہے لیکن اس کے باوجود کرپشن عام ہے۔ جعلی شناخت ایک معمول ہے۔ اگر کسی کی بیوروکریسی میں رسائی ہو تو جعلی دستاویزات تیار کر کے خود کو چولستانی ظاہر کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ مقامی لوگ شکایت کرتے ہیں کہ لمبردار کی مٹھی گرم کیے بغیر تصدیق ممکن نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بعض لمبرداروں نے بوریوں کے حساب سے رشوت وصول کی اگرچہ اس کی کوئی تصدیق ممکن نہیں۔ ادھر وہ لوگ جو خود کو محروم سمجھتے ہیں، اپنے اندراج کے لیے نت نئے حربے آزماتے ہیں۔ ایک مقامی رپورٹر نے بتایا کہ کچھ بے اولاد چولستانیوں نے اپنے اونٹوں کو انسانوں جیسے نام دیے اور انھیں اپنی اولاد ظاہر کر کے دستاویزات میں درج کروایا تاکہ وہ اپنی موجودہ زمین اُن "اولادوں" کے نام کر سکیں، خود کو بے زمین ظاہر کریں اور مزید زمین کی درخواست دے سکیں۔ اللہ بخش کو ایک اور مسئلہ درپیش ہے جو اس کی پیشانی پر بل کا سبب ہے۔ چولستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سی ڈی اے) اس کا شناختی کارڈ تجدید کرنے سے انکاری ہے۔ بظاہر اتھارٹی نے نادرا کو ہدایت دی ہے کہ وہ نئی زمین الاٹمنٹ اسکیم کے اعلان کے بعد شناختی کارڈ جاری کرنا روک دے۔ حکام اسے دھوکہ دہی سے بچاؤ کی ایک اضافی احتیاطی تدبیر قرار دیتے ہیں لیکن اللہ بخش کا مؤقف ہے کہ اس سے تجدید

پر پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ بہاول پور میں سی ڈی اے کے ہیڈ آفس کے متعدد دوروں میں اسے بدسلوکی کا سامنا کرنا پڑا۔ "یہ ہمیں اس لیے ذلیل کرتے ہیں کہ ہم چولستانی ہیں،" وہ غصے سے کہتا ہے۔ یہ ایک عام الزام ہے جو اس ادارے پر لگایا جاتا ہے، خاص طور پر اس کے ڈھانچے کے سبب؛ اتھارٹی کا سربراہ وزیرِاعلیٰ پنجاب ہوتا ہے، یہ بورڈ آف ریونیو پنجاب کے ماتحت ہے اور آج تک اس کے نظم و نسق میں کسی بھی چولستانی کو شامل نہیں کیا گیا۔ اس کے شدید ناقدین اسے جدید نو آبادیاتی طرزِ حکمرانی قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ اللہ بخش اپنے نئے پلاٹ کی منصوبہ بندی کر رہا ہے مگر وہ پھر بھی محتاط ہے۔ چولستان کے اندر اور باہر، ایک پُرانا شک وشبہ اب بھی موجود ہے کہ اتھارٹی آج بھی اس پرانی اور وسیع روایت کو جاری رکھے ہوئے ہے جو اس سے پہلے بھی چلی آ رہی تھی یعنی زمین کو منظّم انداز سے باہر والوں میں بانٹنے کا عمل۔

حصہ دوم

چنن پیر کے گاؤں میں

ایک دفعہ کا ذکر ہے، تیرھویں صدی میں کسی وقت، اوچ شریف کا سرخ چوغے میں ملبوس ایک درویش ایک ہندو حکمران، راجا سادھارن کی صحرائی سلطنت میں پہنچا۔ اُس نے راجا کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی لیکن اسے بےعزت کر کے نکال دیا گیا۔ لیکن اُس ریاست کی ملکہ بےاولاد اور فکرمند تھی۔ اُس نے اس بزرگ کی کرامات کا سنا تھا اور وہ خفیہ طور پر اُس کے پاس گئی اور دعا کے لیے التجا کی۔ بزرگ نے اُسے یقین دلایا: ''تمھارے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔ وہ مسلمان ہوگا۔'' یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بادشاہ اُس وقت خوش نہیں ہوا جب اس کا بیٹا کلمہ پڑھتا ہوا پیدا ہوا۔ چناں چہ اُس نے اُسے صندل کی لکڑی کے صندوق (جسے مقامی زبان میں ''چنن'' کہتے ہیں) میں بند کر کے صحرا کی گہرائیوں میں بھیج دیا۔ لیکن یہ بچہ مقدر کا دھنی تھا؛ فطرت نے اسے زندہ رکھنے کی منصوبہ بندی تیار کر رکھی تھی۔ ایک روایت کے مطابق گدھا اُسے روزانہ خوراک اور پانی فراہم کرتا تھا جب کہ دوسری روایت کے مطابق ایک ہرنی اس کی پرورش کرتی تھی۔ جلد ہی لوگ بھی اس کے گرد جمع ہونے لگے

تا کہ اس کے فیض سے فائدہ اٹھائیں اور اس سے دعائیں لیں۔ آٹھ سو سال گزر گئے اور وہ اب بھی آ رہے ہیں۔ خاص طور پر اس جمعرات کو وہ ہزاروں کی تعداد میں آئیں گے۔ اس وقت ہماری تیز رفتار گاڑی کی ونڈ اسکرین سے پروفیسر عصمت اللہ شاہ ایک پُر جوش بچے کی طرح جھانک رہے ہیں ''دیکھو! اس ٹرالی میں سب کتنے سجے ہوئے ہیں۔ وہ گندم کے بورے اور وہ بکریاں! کسی کی منّت پوری ہو گئی۔ واہ، یہ تو اونٹوں پر آ رہے ہیں، بالکل پرانے زمانے کی طرح۔'' ہم صحرا کے اس بزرگ کی زیارت کرنے جا رہے ہیں: ہمارے ساتھ بہاول پور کے قدیم ترین کالج میں سرائیکی زبان کے اُستاد عصمت اللہ شاہ، دو شاعر — ایک بہاول پور سے (ملک جہانگیر مخلص) اور ایک خاتون ڈیرہ غازی خان سے اور میں شامل ہیں۔ بہار کے شروع میں سات ہفتوں تک ہر جمعرات کو چنن پیر کے آس پاس کا علاقہ جاگ اٹھتا ہے؛ عقیدت مندرات بھر جشن مناتے ہیں اور صبح غائب ہو جاتے ہیں۔ آج سات جمعراتوں میں سے پانچویں جمعرات ہے جو اتنی مقبول ہے کہ پورے ضلع بہاول پور میں سرکاری تعطیل ہوتی ہے۔ نتیجتاً یزمان کے بازار سے ہوتے ہوئے اور کھیتوں کے بیچ گزرتے ہوئے مزار کی طرف جانے والی سڑک ٹریفک سے بھر چکی ہے: ٹریکٹر ٹرالیاں، موٹر سائیکلیں، منی وینز، اونٹ، گائیں، بیل اور گدھا گاڑیاں تک نظر آتے ہیں۔ شاہ صاحب کافی عرصے بعد چنن پیر جا رہے ہیں۔ ایک عرصہ پہلے اُن کے والدین نے یہاں حاضری دی تھی۔ وہ اس بزرگ سے اُس کی پیدائش کے لیے دعا کرنے آئے تھے۔ برسوں بعد وہ ننھے عصمت اللہ کو ساتھ لے کر واپس آئے، گندم اور آٹے کے تھیلے اور ایک بھیڑ ساتھ لائے۔ تب یہ سفر مختلف تھا۔ سجے ہوئے اونٹوں کی قطاریں کچے راستوں پر چلتی تھیں اور گھنٹیوں کی مسلسل جھنکار ہوتی تھی نہ کہ گاڑیوں کا شور۔ جدیدیت نے اس ثقافت کو ماند کر دیا ہے، وہ افسوس سے کہتے ہیں۔ ''یہ سب کبھی صحرا تھا۔'' واقعی، مغل دور میں سوائے اُوچ شریف کے یہ بہاول پور اتنا ویران تھا کہ شاہی مال گزاری کی دستاویزات اسے محض ''بیرون پنجند'' (پنجند سے باہر کا علاقہ) لکھ کر نظر انداز کرتیں۔ یہ اس کی واحد شناخت تھی۔ جب عباسیوں نے اپنی ریاست قائم کی تو اُنہوں نے وسیع نہری نظام بنایا۔ 1871ء کی ایک برطانوی انجینئر کی رپورٹ کے مطابق، مختلف حجم کی لمبائی، چوڑائی اور گہرائی کی 45 نہریں ستلج، چناب اور سندھ دریاؤں سے نکالی گئی

تھیں جو مجموعی طور پر 2,176 کلومیٹر طویل تھیں؛ کاشتکاروں کے مزید 4,800 کلومیٹر لمبے کھالے ان سے جڑتے تھے۔ محقق رچرڈ بارنیٹ کے مطابق، 1835ء میں بھی خانپور کے مقام پر ایک برطانوی لیفٹیننٹ نے دیکھا کہ وہاں چاول کے کھیت افق تک پھیلے ہوئے تھے، ''کئی میلوں تک صرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا تھا،'' اس نے حیرت سے لکھا۔ لیکن سب سے زیادہ تبدیلی لانے والا منصوبہ ابھی آنا تھا۔ 1920ء کی دہائی میں ستلج ویلی پروجیکٹ کے تحت تین بیراج بنائے گئے جو آج تک فعال ہیں؛ انھوں نے پانی کی مستقل فراہمی یقینی بنائی۔ اسی وجہ سے چنن پیر کا مزار، جو کبھی صحرا میں اتنا گہرا تھا کہ بادشاہ سمجھتا تھا کوئی وہاں ہمیشہ کے لیے گم ہو جائے گا، اب صحرا کے کنارے پر ہے، اس کے ایک طرف سبزہ ہے جو صحرا کے اندر مسلسل بڑھ رہا ہے۔ عصمت اللہ شاہ اپنی نشست پر مڑ کر پیچھے دیکھتے ہیں۔ ''جانتے ہو، یہ علاقہ تقریباً مکمل طور پر پنجابی ہے لیکن میلے میں ہر شخص سرائیکی ہوگا۔ سوائے چند شرارتی لڑکوں کے جو شاید صرف تماشا دیکھنے اور ہنسنے آئیں۔ تم خود دیکھ لینا۔'' ہم ''چکوک'' کے دیہی علاقوں سے گزر رہے ہیں جو زیادہ تر اُن آبادکاروں کے لیے بنائے گئے تھے جو عباسی ریاست میں نہری نظام کی توسیع کے باعث زمین کاشت کرنے آئے تھے۔ سب سے پہلے سکھ اور بشنوئی ہندو 1860ء کی دہائی میں آئے، پھر مشرقی اور وسطی پنجاب سے مسلمان آئے۔ یہاں آبادکاروں کی صحیح تعداد متنازعہ ہے لیکن ان کی موجودگی بہاول پور کی سیاست کا اہم جزو رہی ہے۔

بہاول پور ڈویژن جو ماضی کی ریاستِ بہاول پور سے معمولی سا مختلف ہے، آج کل تقریباً برابر تقسیم ہے پنجابی بولنے والوں 45.82 (فیصد) اور سرائیکی بولنے والوں 46.59 (فیصد) کے درمیان۔ اردو بولنے والے تقریباً چار فیصد ہیں۔ (2023 کی مردم شماری کے مطابق بہاول پور ڈویژن میں سرائیکی، پنجابی، اردو اور دیگر زبانیں بولنے والی آبادی کا تناسب بالترتیب 49.1، 42.6 ، 3.85 اور 4.45 فیصد ہے۔ مترجم) ایسی صورتحال میں "چک" (chak) جو سرائیکی "مَوضع" کا مترادف ہے تھوڑے سے فرق کے ساتھ، بہت سے سرائیکی قوم پرستوں کے لیے تاریخی ناانصافیوں کی علامت بن گیا ہے۔ ایک شاعر نے اپنی شاعری میں لفظ "چک" کے دوہرے معنی (کاٹنے) کو استعمال کرتے ہوئے مقامی آبادی کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کو اجاگر کیا ہے۔ اسی شاعر

جاوید اسلم نے اپنی ایک اور نظم میں لکھا": میں تر ساں، میڈی دھرتی ترسے، ترسی روہی جائے، میکوں آکھ نہ پنج دریائی"" (میں پیاسا ہوں، میری زمین پیاسی ہے، روہی (چولستان) پیاسی ہے، مجھے پانچ دریاؤں کی سرزمین کا باسی نہ کہو۔") جاوید اسلم کی شاعری کو پُر اسرار بنانے والی حقیقت یہ ہے کہ اس کے والدین اردو بولنے والے تھے۔

سرائیکی زبان پڑھانے کے علاوہ، عصمت اللہ شاہ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے پر بھی کام کر رہے ہیں جو سرائیکی دوہڑے (دومصرعوں کی صنف) کے ارتقاء کا جائزہ ہے۔ اُن کے دل میں خواجہ غلام فرید کے لیے اتنی گہری عقیدت ہے کہ جب وہ ان کے بارے میں بات کرتے ہیں تو اُن کے گال محبت سے سُرخ ہو جاتے ہیں۔ ایک پُر جوش قوم پرست کے طور پر، اُن کے سیاسی نظریات اُس کے چہرے سے نمایاں ہوتے ہیں۔ قوم پرستی کی سیاست کی علامت انھوں نے صبح سے عملی طور پر اپنے گلے میں پہن رکھی ہے۔ ایک اجرک اُن کے کندھوں پر شان سے پڑی ہے۔ "یہ سّجرک ہے،" وہ مجھے اس کے رنگ (ملتان کی نیلی ٹائل جیسے نیلے رنگ) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درست کرتے ہیں۔ " آپ جانتے ہیں، اجرک اصل میں اسی خطے (کروڑ شہر کے قریب) سے شروع ہوئی تھی پھر یہاں سے سندھ پہنچی۔ پچھلے سال ہمارے کچھ سرائیکی دانشوروں نے فیصلہ کیا کہ اسے واپس لے کر سّجرک کہا جائے۔" وہ توقف کرتے ہیں، پھر مزید کہتے: "لیکن یہ نام مقبول نہیں ہوا لہٰذا اب ہم اسے سرائیکی اجرک کہہ رہے ہیں۔ "اس سے پہلے، شاہ کے ایک ساتھی، تاریخ (History) کے استاد ڈاکٹر محمد طاہر، جنھوں نے ریاست بہاول پور کے انتظامی امور پر (پی ایچ ڈی کی) ایک ضخیم کتاب مرتب کی ہے، نے ایک قصہ سنایا تھا۔ برسوں پہلے، گجرات سے تعلق رکھنے والا ایک پڑھا لکھا آدمی، مولوی عبدالحق، ریاست کے وزیرِ خزانہ کے بچوں کو عربی اور فارسی پڑھاتا تھا۔ وزیر اُن کی قابلیت سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے انھیں اپنی وزارت میں ملازمت کی پیشکش کی۔ مولوی عبدالحق نے یہ پیشکش قبول کر لی اور بتدریج ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ عہدے تک پہنچے۔ تاریخ کے استاد نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا،" جب وہ فوت ہوئے تو ان کے بیٹے نے یہ عہدہ وراثت میں لے لیا۔" یہ بیٹا، اختر علی، جن کا اپنا بیٹا محمد خالد اختر بعد میں اردو کا مشہور افسانہ نگار بنا، ریاست میں نئی قابلِ کاشت زمین کی

الاٹمنٹ کے معاملات کا نگران تھا۔ مجھے تو یہ مہاجرین کی ایک شاندار کامیاب کہانی محسوس ہوئی، ایک آدمی کے حالات بدل دینے والی محنت کی داستان لیکن سرائیکی قوم پرستوں کے نزدیک یہ ایک بہت خطرناک رجحان کی ابتدا تھی: یعنی پنجابی آبادکاروں کی آمد۔ ایک قوم پرست نے الفاظ احتیاط سے منتخب کرتے ہوئے وضاحت کی کوشش کی: "زیادہ تر آبادکاروں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ابھی تک اپنی جائے پیدائش سے رابطے میں ہیں۔ وہ یہاں ضم نہیں ہوتے۔ وہ اپنی پرانی وفاداریاں برقرار رکھتے ہیں اور یہی تصادم کا باعث بنتا ہے۔" یہ احساس بہت سے لوگوں کا ہے۔ بہاول پور کے ایک سرائیکی بولنے والے وکیل نے، جو قوم پرست مقصد سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا، کہا کہ اُسے یہ بات تکلیف دیتی ہے جب نسلوں سے شہر میں رہنے والے آبادکار دعویٰ کرتے ہیں کہ انھیں سرائیکی کی ایک بات بھی سمجھ نہیں آتی۔ تاریخ کے استاد (شاہ کے ساتھی) نے بتایا کہ اس کے اپنے والد نے سرکاری ملازمت جونیئر کلرک کے طور پر شروع کی اور سینئر کلرک کے طور پر ریٹائر ہوئے جب کہ ان کے اردگرد بہتر رابطے رکھنے والے ساتھی ضلع کمشنر جیسے عہدوں تک پہنچ گئے۔ قوم پرست کہتے ہیں کہ آپ کا حسب نسب ہی آپ کے تعلقات اور ترقی کے مواقع طے کرتا ہے۔ ایک ایسے نسلی گروہ سے تعلق رکھنا فائدہ مند ہوتا ہے جو ملک کے اداروں، فوج، بیوروکریسی، وفاقی اور صوبائی سیاست — پر غالب رہا ہے (یا اردو بولنے والوں کی صورت میں کبھی غالب رہا تھا) لہٰذا جب ہماری گاڑی سڑک سے اُتر کر گائیوں، اونٹوں اور لوگوں کے ہجوم سے ہوتی ہوئی چنن پیر کے مزار کی طرف بڑھتی ہے اور پنجاب پولیس کا ایک غصیلہ (اور یقیناً پنجابی) افسر ہم پر چلاتا ہے تو شاید کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ شاہ اسے محض ایک بدمزاج آدمی نہیں بلکہ نسلی جبر کی علامت سمجھتے ہیں۔ شاید پولیس والا بھی شاہ کو کسی علامت کے طور پر دیکھتا ہے۔ شاہ شدید ناراضگی سے کہتے ہیں: "دیکھا وہ ہم سے کیسے بات کرتے ہیں"! لیکن چنن پیر کے دربار پر زیادہ دیر تک ناراض رہنا ممکن نہیں۔ عام طور پر فوراً نظر آنے والا مزار کا سبز گنبد، ریت پر پھیلا ہوا سینکڑوں خیموں سے گھرا ہے؛ آخر کار اصل میلہ شام کو شروع ہوتا ہے۔ مرد حلقے بنا کر جھوم رقص کرتے ہیں۔ میں اچانک شاہ کے لیے ہمدردی محسوس کرتی ہوں کیوں کہ بہت سے لوگوں نے اصلی اجرک پہنی ہوئی ہے — لگتا ہے "سجّرک" کے مقبول ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔

صحرا کے اس بزرگ کے پیروکار دُور دُور تک ہیں لیکن سب سے زیادہ چولستان میں۔ خانہ بدوش اپنے بہترین جانور لائے ہیں — تندرست گائیں، بکریاں اور اونٹ جن کی کھالوں پر خوب صورت نقش اور گردنوں پر نام کندہ ہیں: "بجلی"، "کبوتر"، "جھولے لعل"۔ اونٹوں میں "عبدالوحید" بھی ہے جو مجھے بے اولاد چولستانیوں کی یاد دلاتا ہے جو جانوروں کو اولاد ظاہر کرتے ہیں۔ جس گدھے نے صدیوں پہلے ننھے چنن پیر کو زندہ رکھا تھا وہ بھی یہاں دفن ہے؛ خانہ بدوش احترام سے اپنے گدھوں کو اس کی چھوٹی سی قبر کے پاس لے کر آتے ہیں۔ مزار پر بے تحاشا ہجوم ہے، زیادہ تر مرد، کبھی کبھار کوئی عورت تبرک تقسیم کرنے کے لیے راستہ بناتی ہے۔ مزار خیمے کی طرح مخروطی ہے۔ لوگ مزار کے اوپر چڑھ کر اس کی نوک کو چومنے اور آنکھیں لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مزار کی نگرانی کرنے والے سرکاری محکمے کے مصروف و پریشان اہلکاران لوگوں کو ڈانٹ کر ہٹا دیتے ہیں۔ صحن میں ایک پرانا درخت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چنن پیر کی ماں، جو کبھی اس سرزمین کی ملکہ تھی، اسی درخت کے نیچے دفن ہے۔ اس کی قبر پر سایہ فگن شاخیں رنگ برنگے دھاگوں سے لدی ہوئی ہیں؛ یہ ہزاروں عقیدت مندوں کی امیدوں اور خوابوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ایک شاخ پر کوکا کولا کی بوتل کا ریپر بھی بندھا ہوا ہے بالکل اسی اہتمام سے جیسے دوسرے دھاگے شاید کسی کے پاس دھاگا ختم ہو گیا ہوگا۔ بہت سے لوگ یہاں اولاد کی دعا مانگنے آتے ہیں جیسے کبھی ملکہ نے مانگی تھی۔ میں سوچتا ہوں، کیا اس روشن امیدوں والے درخت پر بندھے دھاگوں میں سے کوئی ایک بھی زمین کے پلاٹ کی خواہش کے لیے تو نہیں؟

چند روز قبل، ایک ناراض قوم پرست شکایت کر رہا تھا کہ مزار کے اردگرد صرف ایک ہی جگہ ہے جہاں غیر سرائیکی بولنے والے مل سکتے ہیں، وہ ہے بازار جو مزار سے متصل ہے۔ اُس نے افسوس سے کہا کہ آباد کار صرف اسے تجارت کا موقع سمجھتے ہیں۔ جب ہم بازار سے گزرتے ہیں جہاں چوڑیوں، پلاسٹک کی گڑیوں، اور جائے نمازوں کے سٹالز کا ایک پھیلا ہوا سلسلہ ہے۔ میں شاہ سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ اس بات کو درست مانتے ہیں؟۔ وہ سر ہلاتے ہیں پھر زمین پر پان کی پیک کے داغ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو بہت بڑا ہے کہ تقریباً جوہڑ لگتا ہے۔ اُن کے مطابق، سرائیکی لوگ شاذ و نادر ہی پان کھاتے ہیں۔ وہ تلخی سے کہتے ہیں ''باہر والا یہاں تک پہنچ چکا ہے۔''

تشخص یا شناخت کی سیاست ایک عجیب شے ہے۔ ستر کی دہائی کے دوران دو اہم پیش رفتیں ہوئیں۔ 1975 میں ملتان میں ایک ادبی کانفرنس منعقد ہوئی، ''پہلی آل پاکستان سرائیکی ادبی کانفرنس'' اور ایک زبان، جسے طویل عرصے تک پنجابی کی بولی سمجھا جاتا رہا، جسے نوآبادیاتی افسران نے وچ، ملتانی، جٹکی، جنوبی لہندا اور مغربی پنجابی کے ناموں سے یاد کیا، اسے باقاعدہ معیار بنایا گیا اور ایک باقاعدہ نام دیا گیا۔ اس زبان کو طویل عرصے تک پنجابی میں شامل کیے جانے کی کئی وجوہات بیان کی جاتی ہیں جیسا کہ شاعر و محقق محترمہ نخبہ لنگاہ کا کہنا ہے، شاید اس لیے کہ جس خطے کو سرائیکی قوم پرست وسیب کہتے ہیں اس کا بڑا حصہ رنجیت سنگھ کے زیرِ اثر رہا یا شاید اس لیے کہ پنجابی اور سرائیکی علاقوں کے درمیان کوئی قدرتی رکاوٹیں، جیسے کہ پہاڑ، موجود نہ تھیں یا شاید اس لیے کہ جب انگریزوں نے اپنی درجہ بندی کی تو انھوں نے اس زبان کی لوک روایت اور زبانی ثقافت کو نظر انداز کیا جو کہ اس کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

کسی کو یقین سے معلوم نہیں کہ "سرائیکی" کا لفظ کہاں سے آیا یا سب نے اسے یکا یک کیوں قبول کر لیا اگرچہ اکثر لوگ اسے سندھی لفظ "سِرو" سے جوڑتے ہیں، جس کا مطلب ہے "شمال"۔ بہرحال، یہ ایک حیران کن کامیابی تھی، لاکھوں لوگ جو ایک وسیع علاقے میں بکھرے ہوئے تھے، انھیں ایک مشترک شناختی نشان اور ایک نئی شعوری بیداری دے دی گئی۔ یقیناً کچھ لوگ اسے معمولی فرقوں کی خود پرستی کی ایک اور مثال سمجھتے تھے — یعنی یہ خیال کہ وہ برادریاں جو ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتی ہیں، ہمیشہ اختلاف اور تمسخر کا شکار ہوتی ہیں۔

ہم تو مٹی کے غریب سپوت ہیں
ہماری ہستی محبت کی پوجا کے سوا کچھ نہیں
ہمارے دیس میں کبھی ہاکڑہ بہتا تھا
ہماری شخصیتیں ستلج کی وسعت کی مانند تھیں
ہمارا اُوچ اور ملتان کبھی خوشحال تھے
ہماری خوشیاں اور مسرتیں کیا تھیں!

ہمارا قلعہ دراوڑ کبھی بیدار تھا
اور ہمارا پتن مینارہ کبھی آباد بستیوں سے بھرا ہوا تھا
اب ہماری تقدیر ماند پڑ چکی ہے
تو پھر تم ان بچھڑ جانے والے لوگوں کے وجود کے بارے میں کیا
پوچھتے ہو؟
ہم روہی کے آخری آثار ہیں
تم ہماری خوشیوں اور مسرتوں کا کیا پوچھتے ہو؟
(مندرجہ بالا کلام سرائیکی شاعر ملک جہانگیر مخلص کے مندرجہ
ذیل اصل کلام کا اردو ترجمہ ہے)
(اساں مٹی واس نمانے ہیں
ساڈیاں ریتاں پیت پرستیاں ہن
ساڈی بھوئیں تے ہاکڑہ واہندا ہا
ساڈیاں ستلج سانویں ہستیاں ہن
ساڈا کوٹ ڈیراور جاگدا ہا
ساڈیاں پتن منارے وستیاں ہن
ساڈا اوچ ملتان مُسیندا ہا
کیاں موجاں ہن کیا مستیاں ہن
ہن مسیے مستک پڑھ ساڈے
رُل گئی دیاں ذاتاں کیا پچھدیں
اساں چھیکڑی ساہ ہیں روہی دے
ساڈیاں عید براتاں کیا پچھدیں)

میرے بہاول پور کے قیام کے دوران، ایک سرائیکی بولنے والے اردو کے استاد نے دعویٰ کیا کہ دراصل پنجابی ہی کسی اور زبان کی بولی ہے۔ان کا مؤقف تھا کہ زبان کی بنیاد تین اقسام کی

تراکیب پر ہوتی ہے: اسم، فعل اور حرف، اسم تو مستعار لیے جا سکتے ہیں لیکن فعل ایک زبان کی تقدیس اور اصلیت کو محفوظ رکھتے ہیں۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ پنجابی میں کوئی ایسا فعل نہیں جو اردو سے الگ ہو، اس لیے یہ " محض ایک عوامی زبان ہے"۔ "ونجیج"، انھوں نے اچانک کہا، ایک خالص سرائیکی لفظ کی مثال دیتے ہوئے۔ "تم اسے بول بھی نہیں سکو گے۔" "ونجیج،" میں نے دہرایا۔ وہ تڑپ گئے۔ میں نے دوبارہ کوشش کی؛ انھوں نے سر ہلا دیا۔ میں نے ہار مان کر ان سے پوچھا کہ اس لفظ کا مطلب کیا ہے۔ " کھو جانا، ضائع ہو جانا" انھوں نے جواب دیا اور ایک اور تحریک بھی چالیس سال پہلے بہاول پور میں اٹھ رہی تھی بلکہ اس سے بھی پہلے۔ پاکستان میں ون یونٹ سکیم کے خاتمے پر بہاول پور کو پنجاب کا حصہ بنا دیا گیا حالانکہ یہ پہلے ایک الگ وفاقی اکائی کے طور پر موجود تھا اور اب اس کے رہائشی اس حیثیت کی بحالی پر اصرار کرتے تھے بلکہ ان کا دعویٰ تھا کہ ریاستِ پاکستان نے اس کا وعدہ کیا تھا۔ یہ بحالی تحریک محض لسانی شناخت پر مبنی نہیں تھی، اس میں ہر نسل کے لوگ، آبادکار اور مہاجر شامل تھے۔ ان کی شناخت ایک مشترکہ سیاسی تاریخ سے اخذ ہوتی تھی، وہ خود کو "ریاستی" کہتے تھے اگرچہ بعض اوقات یہ اصطلاح صرف "مقامی" آبادی کے لیے استعمال ہوتی ہے اور ایک فوری احساسِ زیاں سے۔ آخرکار بہاول پور بھی صحرا کی مانند، اپنے ماضی کا آسیب زدہ ہے۔ ایک خود مختار اور خوشحال ریاست نے دیکھا کہ اقتدار کا مرکز دور لاہور اور اسلام آباد منتقل ہو گیا۔ اس کے عظیم الشان محلات اب فوجی دفاتر بن چکے ہیں۔ آج بھی، ہر ریاستی دو باتیں ضرور یاد کرتا ہے: کہ نواب نے تحریکِ آزادی کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اس ریاست کا دروازہ پاکستان کی طرف کھلتا ہے" اور یہ کہ جب پاکستان بنا تو اس کے ملازمین کی تنخواہیں نواب کے خزانے سے ادا کی گئیں۔ جناح کی رولز رائس بھی بہاول پور سے آئی تھی۔

اگرچہ سرائیکی یا بہاول پور صوبے کی بازگشت وقتاً فوقتاً سنائی دیتی ہے، خاص طور پر انتخابات سے پہلے اور اگرچہ پاکستان کے غیر متوازن وفاقی نظام کو دیکھتے ہوئے نئے صوبوں کے حق میں مضبوط دلائل موجود ہیں، ان دونوں تحریکوں نے کبھی کبھار تشویشناک رجعتی رجحانات بھی ظاہر کیے ہیں۔ 1970 کی دہائی کے دوران بہاول پور سے منتخب ہونے والے ایک رکنِ پارلیمنٹ نے یہ

موَقف اختیار کیا کہ بہاول پور کو دوبارہ صوبائی درجہ دیا جائے تا کہ یہ خطہ اپنی سابقہ 'سماجی اور مذہبی پاکیز گی' کو دوبارہ حاصل کر سکے۔ انھوں نے کہا": بہاول پور کے ون یونٹ میں انضمام سے پہلے، یہاں نہ بے پردہ عورتیں تھیں نہ مخلوط تعلیم۔ اسلامی روایات کے مطابق ہر جمعہ تعطیل ہوا کرتی، رمضان کا مہینہ ادب سے گزارا جاتا، شراب کی فروخت پر پابندی تھی اور عیسائیت کی تبلیغ ممنوع تھی۔ ریاست کی حدود میں نہ کوئی چرچ تھا نہ مشنری اسکول۔ تمام دیوانی اور فوجداری مقدمات شریعت کے مطابق فیصل ہوتے تھے لیکن انضمام کے بعد یہ سب مذہبی اوصاف مٹ گئے۔ جہاں تک قوم پرست پاکستان سرائیکی پارٹی کا تعلق ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ " قیامِ پاکستان کے بعد سرائیکی علاقے میں کی گئی تمام زمینوں کی الاٹمنٹ کالعدم قرار دی جائے گی۔ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے مطابق یہ زمینیں صرف قدیم باشندوں یا مقامی لوگوں کو دی جا سکتی ہیں اور پاکستان سرائیکی پارٹی تمام جعلی اور غیر قانونی الاٹمنٹ کو منسوخ کر کے یہ زمینیں صرف مقامی افراد کو دے گی۔ "اس قسم کی قوم پرستانہ زبان کا مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھی اسے استعمال کر سکتا ہے۔ ایک صحافی نے بہاول پور میں ایک تنازعے کی روداد سنائی جس کا تعلق فرقہ واریت سے تھا لیکن وہ شخص شیعہ نہیں تھا۔ اس بار کوئی بینر نہیں لگا۔ بہاول پور کی مرکزی لائبریری کے مطالعہ ہال میں، میں خواجہ غلام فرید کی تصویر کو دیکھتی ہوں۔ مجھے وہ کچھ سنجیدہ اور سخت مزاج محسوس ہوتے ہیں گویا کوئی ان کے خیالات میں مخل ہو تو خوش نہ ہوں گے۔ بوجھل آنکھوں والے، موٹے ہونٹوں والے، وہ ذرا سا جھکے ہوئے انداز میں نیچے دیکھ رہے ہیں۔ اس مصنوعی رنگ والی تصویر میں ان کی ٹوپی اور کرتا نرم خاکی رنگ کے ہیں — جیسے صحرا کی مٹی کپڑے میں جذب ہو گئی ہو — لیکن ان کی داڑھی بالکل سفید ہے۔ ہونٹ کچھ زیادہ سرخ ہیں پھر بھی ان کے اندر ایک خاموش ٹھہراؤ ہے۔ جیسے صحرا۔ خواجہ غلام فرید ہر جگہ ہیں۔ بہاول پور کے ہر سرکاری دفتر میں ان کی تصویر آویزاں ہے۔ مرکزی بازار کا دروازہ انہی کے نام سے موسوم ہے۔ ان پر علمی تحقیق کی ایک مستقل شاخ قائم ہے: ''فریدیات''۔ رکشے اور ویگنیں ان کا پیغام لیے پھرتی ہیں": خواجہ دا اِک پیغام: پیار، امن و امان" اور ان کے لیے پیغامات": میں دیوانی خواجہ دی" وہ ایک مجرد معنوں میں بھی بہت نمایاں ہو چکے ہیں: سرائیکی قوم پرستی نے انھیں ایک علامتی مجاہد کے طور پر اپنا چہرہ بنا دیا ہے۔ ماضی کا ایک

نشان، جدوجہد کی ایک علامت۔ مانا کہ وہ نوآبادیات کے سخت مخالف تھے اور اپنے اشعار میں مزاحمت کے پیغام دیتے تھے": اپنیں ملک کُوں آپ وساتُوں، پُٹ انگریزی تھانے" لیکن میں سوچتی ہوں کہ اگر وہ آج کے بہاول پور کو دیکھتے تو کیا سوچتے؟ نوآبادیات اور تاریخی زیادتیاں، عدم مساوات اور جمی ہوئی اشرافیہ — کیا ان جنگوں کو اس طرح لڑا جاسکتا ہے کہ لوگوں کو نسلوں، برادریوں میں بانٹ کر، ان کی انفرادیت کو مٹادیا جائے؟ کسی جگہ سے وابستہ ہونے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ آخر سب مہاجر جابر تو نہیں ہوتے۔ بہت سے لوگ محض بہتر زندگی کی تلاش میں آتے ہیں، بہت سے خود حالات کے مارے ہوتے ہیں، جیسے مقامی لوگ اور جو باہر سے آتے ہیں، وہ ہمیشہ باہر کے نہیں رہتے۔ یہ بات خواجہ غلام فرید سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ وہ روہی میں پیدا نہیں ہوئے تھے مگر کیا کوئی خواجہ کو اُس کے صحرا سے جدا کرسکتا ہے؟ علی محمد چودھری بہاول پور شہر کے نواح میں ایک صاف ستھرے سے گھر میں رہتے ہیں جو زرعی کھیتوں کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ ان میں سے بیشتر کھیت ان کی ملکیت ہیں۔ یہ انھیں اپنے والد سے ورثے میں ملی جو 1960 کی دہائی میں پاکستان ہجرت کرنے والے اردو بولنے والے مہاجر تھے۔ ان کے گھر کے بالکل سامنے کی زمین خالی ہے۔ اکثر لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ وہاں کچھ کاشت کیوں نہیں کرتے — آخر کار یہ تو زرخیز ترین زمین ہے۔ "میں انھیں کہتا ہوں، کیوں کہ میں پاگل ہوں،" وہ ہنستے ہوئے کہتے ہیں۔ وہ اس زمین پر ایک اسکول بنانے کے لیے پیسے جمع کر رہے ہیں۔ ان کے گھر کے اندر جو کہ اردگرد کے لہلہاتے کھیتوں کے برعکس ہے، کتابوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں، ایک باقاعدہ کتب خانہ۔ چودھری پیشے کے لحاظ سے آبادکار ہو سکتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ماضی کے عاشق ہیں۔ خصوصاً اس زمین کے ماضی کے، جس پر وہ بستے ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی چند کتابیں ان کے قلمی نام "عین میم چودھری" کے تحت شائع ہوئی ہیں۔ اس وقت وہ سوئی وہار کی تاریخ پر مبنی ایک ضخیم کتاب پر کام کر رہے ہیں جسے وہ سختی سے محفوظ رکھتے ہیں — چوری اور سرقے کے خدشے کی وجہ سے جیسا کہ انھیں ماضی میں تجربہ ہو چکا ہے۔ اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر، چودھری افق پر ایک خاص مقام کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سوئی وہار ایک اینٹوں کے بھٹے کی چمنی کی مانند نظر آتا ہے جو درختوں کے درمیان سے جھانک رہا ہو لیکن دراصل وہ ایک بدھ مت سٹوپہ کے آثار

ہیں۔ کنشک دور میں یہاں ایک خانقاہ ہوا کرتی تھی لیکن اب کاشت کاری نے اس علمی مقام کے بڑے حصے کو نگل لیا ہے۔ چودھری بچپن سے اس مقام پر جایا کرتے تھے، ان بکھرے ہوئے برتنوں کے ٹکڑوں اور مٹی کے ٹیلے نے انھیں مسحور کیے رکھا۔ کبھی یہ سنا کہ اس میں خزانہ دفن ہے؛ کبھی یہ کہ اس علاقے پر ایک بانجھ مگر مہربان عورت حکومت کرتی تھی۔ وہ آج بھی وہاں جایا کرتے ہیں اکثر سیاحوں اور محققین کو رہنمائی فراہم کرتے ہوئے۔ اگرچہ ان کے بیان کردہ کچھ تاریخی واقعات جیسے کہ بعض قبریں صحابہ کرام کی بتانا، متنازع ہیں مگر ان کے خلوصِ دل سے اس سٹوپہ سے محبت میں کوئی شک نہیں۔ "میں پہلے افسانے لکھنا چاہتا تھا،" وہ کہتے ہیں، "لیکن اس سٹوپہ کو دوبارہ تخیل میں لانا کہیں بہتر ہے۔" سوئی وہاران کے پیچھے بلند ہے، ایک ٹیڑھی سی انگلی کی مانند جو تنبیہ کر رہی ہو، ماضی کی ایک یاددہانی کہ ہر چیز صحرا، کھیت، زبان اور اس سے جنم لینے والی سیاست عارضی ہے، تبدیلی و تغیر کے تابع!!

☆☆☆☆☆

حکایات بہاول پور

(11)

یہ واقعہ حال ہی میں رحیم یار خان میں پیش آیا، جو اب ریاست بہاول پور کا سب سے اہم صنعتی مرکز بن چکا ہے۔ عباسی ٹیکسٹائل مل کی طرف جانے والا راستہ پرانے شہر سے ایک نہر کی شاخ کے ساتھ ساتھ کچھ فاصلے تک چلتا ہے، پھر پانی کے کنارے کو چھوڑ کر ایک ریلوے انڈر برج کے نیچے سے بل کھاتا ہوا گزرتا ہے، جو بمشکل گاڑیوں، تانگوں، کاروں اور نچلی چھت والے ٹرکوں کے لیے ہی مناسب راستہ فراہم کرتا ہے۔ لیکن ایک 3 ٹن وزنی ٹرک کا ڈرائیور کچھ زیادہ ہی مہم جو ثابت ہوا۔ اس کا کھلا ٹرک بھاری فولادی شہتیروں سے لدا ہوا تھا، اس کے باوجود اس نے زمین دوز پل سے گزرنے کی ہمت کی۔ شہتیروں کی سطح پل کی فولادی چھت سے محض ایک انچ نیچے تھی۔ جیسے ہی ٹرک پل کے

نیچے بنے پختہ راستے پر چڑھا شہتیر چھت سے رگڑ کھانے لگے۔ ڈرائیور نے رفتار کم کرنے کی بجائے الٹا ایکسلریٹر پر مزید دباؤ ڈالا تا کہ کسی طرح گزر جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے تو ایک ہولناک رگڑنے اور چرچرانے کی آواز آئی اور پھر ٹرک بھاری فولادی بیموں سمیت پل کی فولادی چھت اور نیچے کے فرش کے درمیان پھنس گیا۔ اس تصادم کے باعث دونوں اطراف کی ٹریفک رک گئی کیوں کہ راستہ پہلے ہی ایک طرفہ ٹریفک کے لیے تنگ تھا۔ جتنا وہ اپنی گاڑی کو آگے دھکیلنے کی کوشش کرتا، اتنا ہی پھنس جاتا۔ آخر کار جب اسے یقین ہو گیا کہ اس نے اپنی حماقت سے بری طرح ٹرک کو پھنسوا لیا ہے تو وہ اپنی نشست سے اتر کر ہجوم کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگا۔ دریں اثنا دونوں جانب گاڑیوں اور تانگوں کی لمبی قطار لگ چکی تھی اور ان کے سوار چہرے پر غصہ لیے کھڑے تھے۔

کچھ لوگ مدد کو آئے اور پوری قوت لگا کر ٹرک کو دھکیلنے کی کوشش کی مگر وہ بالکل نہ ہلا۔ ہجوم میں کچھ تعلیم یافتہ لوگ، قریبی فیکٹریوں کے مکینک اور محکمہ تعمیرات عامہ کا ایک انجینئر بھی موجود تھا۔ سب اپنے اپنے طور پر کوئی تدبیر سوچنے لگے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایک ہی حل تھا کہ پل کی چھت کو اکھاڑا جائے مگر یہ ریلوے حکام کے بغیر ممکن نہ تھا اور اس سے ریل کی آمدورفت کئی گھنٹے معطل ہو جاتی۔ جب سب لوگ مایوس ہو چکے تو ایک دیہاتی شخص آیا، جس نے سب کو حیران کر دیا۔ اس نے حالات کا جائزہ لیا پھر خاموشی سے ٹرک کے سب سے قریب والے ٹائر کی والو پر ہاتھ رکھا اور والو دبا کر ہوا نکالنے لگا۔ ٹائر دھیرے دھیرے بیٹھنے لگا۔ اس نے یہی عمل باقی تین ٹائروں کے ساتھ بھی دہرایا۔ تین چار منٹ میں ٹرک کی چھت سے اوپر رکھی بیموں کا فاصلہ پل کی فولادی چھت سے کم ہو گیا اور ٹرک نکلنے کے قابل ہو گیا۔ اس کے بعد چند آدمیوں نے ٹرک کو دھکا دیا اور یوں تقریباً ایک گھنٹے سے رکی ہوئی ٹریفک بحال ہو گئی اور یہ سب ایک دیہاتی کی عقل مندی سے ممکن ہوا جس نے مکینکوں اور انجینئروں کی تمام مہارتوں کو مات دے دی۔

ریگ زار سے اٹھتی ایک سلطنت۔ بہاول پور کی داستان

تحریر۔سلمان رشید، سیاح، مئورخ اور ماہر آثار قدیمہ

سورس۔ مطبوعہ۔ڈیسٹینیشنز (Destinations) ای۔جرنل شمارہ16

Timeless Bahawalpur کے ٹائیٹل سے خصوصی شمارہ

دسویں صدی کے راجپوت شہزادے سے لے کر خلافتِ عباسیہ کے ان سادات تک جنھوں نے اس خطے میں ایک خوشحال ریاست کی بنیاد رکھی۔

کہا جاتا ہے کہ کبھی زمانہ قدیم میں دریائے جمنا میں ایک خوفناک اژدہا رہتا تھا۔ دیوی دیوتا اس سے ناخوش ہو گئے اور اسے حکم دیا کہ دریا چھوڑ کر سمندر کی جانب کوچ کرے۔ چوں کہ وہ صرف پانی کے ذریعے سفر کر سکتا تھا اس لیے دیوتاؤں نے جمنا کو حکم دیا کہ وہ جنوب کی طرف ایک ندی بہادے تا کہ اژدہا سمندر تک پہنچ سکے۔ یوں یہ نیا نالا، جو ہزاروں سال تک "ہاکڑہ" کے نام سے جانا گیا، اژدہے کی راہ بنا مگر وقت کی تخلیقی رفتار کسی شے کو سلامت نہیں رہنے دیتی، نہ دیوتاؤں کے بنائے گئے راستوں کو۔ وہ ہاکڑہ جو کبھی ایک زرخیز زمین کو سیراب کرتا تھا، خشک ہو گیا اور زمین صحرا بن گئی۔ آج صرف ریت کے ٹیلوں میں ایک خم دار گہری لکیر باقی ہے جو اس کھوئے ہوئے دریا کی یاد دلاتی ہے۔اسی صحرائی زمین میں راجپوت آج بھی دھرتی ماتا کی پوجا کرتے تھے۔اس روایت کی گونج آج بھی چنن پیر کے میلے میں سنائی دیتی ہے۔ یہیں چالاک راجپوت شہزادہ راول دیوراج نے ایک ریاست قائم کی۔ اسے سسرال سے گائے کی کھال دی گئی کہ جتنا علاقہ اس میں لپیٹ سکے، اس پر ریاست بنالے۔شہزادے نے کھال کو باریک پٹیوں میں کاٹ کر وسیع علاقہ گھیر لیا جس سے انکار ممکن نہ رہا۔اس جگہ اس نے کچی اینٹوں کا قلعہ تعمیر کیا جسے "ڈیرا راول دیوراج" کہا گیا۔ وقت کے ساتھ یہ

"ڈیرہ راول" سے بگڑ کر "دراوڑ" بن گیا اور اس سے منسوب داستانیں جنم لینے لگیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ سکندر اعظم نے یہاں خزانہ دفن کیا تھا۔ اس داستان نے شاہ حسن ارغون کو 1525ء میں سندھ سے دراوڑ پر حملہ کرنے پر اکسایا۔ مختصر محاصرے کے بعد اس نے قلعہ فتح کیا اور ایک بڑا خزانہ لے گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہاکڑہ دریا کبھی واقعی بہتا تھا اور اس نے ایک ایسی قدیم تہذیب کو جنم دیا تھا جو موئن جودڑو اور ہڑپہ کی ہم پلہ تھی۔ چار ہزار سال قبل جب ہاکڑہ خشک ہو گیا تو اس کے کنارے آباد شہر بھی ریت میں دفن ہو گئے۔ بدقسمتی سے ہاکڑہ کی تہذیب کو وہ توجہ نہ مل سکی جو سندھ کی تہذیب کو ملی۔ صدیوں کی خاموشی تب ٹوٹی جب سندھ کے امیر چنی خان کی اولاد میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ چنی خان نے مرنے سے پہلے اپنی حکومت کی علامت پگڑی بڑے بیٹے مہدی کو دی اور قرآن و تسبیح چھوٹے بیٹے داؤد کو تاکہ وہ روحانی رہنما بنے۔ بعد میں جب مہدی فوت ہوا تو داؤد نے حکومت چھیننے کی کوشش کی مگر ناکامی پر شمال کی جانب ہجرت کی اور نئی بنیاد رکھی۔ یہی داؤد پوترہ یا عباسی کہلائے جانے والے لوگ بہاول پور کے بانی بنے۔ ان میں سے سب سے پہلے نمایاں ہونے والے سردار صادق محمد خان اول تھے جنھوں نے راہزنوں کو ختم کیا، امن قائم کیا اور آج کے بہاول پور و رحیم یار خان میں قصبے بسائے۔

نادر شاہ نے ان کی قابلیت دیکھ کر انھیں بالائی سندھ کے اہم شہروں کا گورنر بنایا اور دراوڑ قلعہ بھی ان کے حوالے کیا — وہی قلعہ جو انھوں نے کچھ سال پہلے راجپوت شہزادے راول آکھی سنگھ سے چھینا تھا مگر نادر شاہ کے واپس جاتے ہی ان کے رشتے دار خدایار کلہوڑا نے ان پر حملہ کیا۔ صادق محمد خان شہید ہو گئے اور ان کے بیٹے بہاول خان اول کو پگڑی ملی۔ انھوں نے شکار پور و لاڑکانہ چھوڑ کر شمال کی سمت نئی راجدھانی بہاول پور قائم کی اور 1748 میں دریائے ستلج سے نہر نکال کر اس کے کنارے باغات لگوائے۔ 1808ء میں ماونٹ اسٹوارٹ الفنسٹن بہاول پور آیا تو شہر چار میل محیط میں گھرا ہوا تھا، آموں کے باغات اور تنگ گلیوں میں گھومتی مٹی سے چھتی ہوئی چھتوں والے بازاروں میں رونق تھی۔ یہاں کپڑا، ریشمی پٹکے اور لنگیاں تیار ہوتی تھیں۔ 1827 میں چارلس میسن بھی یہاں آیا۔ شہر کی زرخیزی اور کھجوروں سے لدے درخت اسے بہت بھائے۔ بہاول خان کی نہر "خاں واہ"

کو ناگنی کہا جاتا تھا، اس کی خم دار شکل کی وجہ سے۔ شہر نے ترقی کی منازل طے کیں۔ انیسویں صدی کے اختتام تک بہاول پور تجارت، کپاس، نیل، تیل، کھجور، آم، قالین اور چمڑے کی اشیا کا بڑا مرکز بن چکا تھا مگر 1866ء میں نواب بہاول خان چہارم کو زہر دے کر قتل کر دیا گیا۔ ان کے بیٹے صادق محمد خان چہارم کی عمر صرف پانچ برس تھی۔ ان کی والدہ نے سازشوں کا مقابلہ کیا۔ بالغ ہونے پر انھوں نے 1874ء میں نور محل تعمیر کروایا جو آج بھی بہاول پور کی شان ہے۔ قصرِ نور کا خرچ بارہ لاکھ روپے آیا مگر اس کی قربت میں واقع قبرستان کے باعث وہ یہاں نہیں رہے۔ محل کو دفتر اور مہمان خانہ بنا دیا۔ اپنی رہائش کے لیے انھوں نے احمد پور شرقیہ میں صادق گڑھ پیلس تعمیر کروایا، جس میں یورپی و ہندوستانی طرز کا امتزاج تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب نواب نے تین دارالحکومت رکھے: بہاول پور (سرکاری استقبال)، ڈیرہ نواب (ذاتی و ریاستی معاملات) اور دراوڑ (دستار بندی و تدفین)۔ 1899ء میں صادق محمد خان چہارم وفات پا گئے۔ ان کے صاحبزادے بہاول خان پنجم نے ان کی عماراتی روایت کو بڑھایا۔ دربار محل، مغل طرزِ تعمیر کا شاہکار، ان کے دور کا حاصل تھا مگر وہ بھی جلد دنیا سے رخصت ہوئے (1907) اور ایک بار پھر شیر خوار نواب صادق محمد خان پنجم کے لیے حکمرانی کا آغاز ہوا۔ اس عظیم المرتبت حکمران نے تعلیم پر توجہ دی۔ 1930ء کی دہائی میں بہاول پور لائبریری، اور 1950ء کی دہائی میں صادق پبلک اسکول کی بنیاد رکھی۔ صادق محمد خان (1924-1966) نے نہ صرف سعودی عرب کو مالی امداد دی بلکہ پاکستان بننے کے بعد بھی فراخدلی سے ملک کو سنوارنے میں کردار ادا کیا۔ لاہور کی پنجاب یونیورسٹی و کنگ ایڈورڈ کالج کو جائیدادیں عطیہ کیں۔ 1955 میں بہاول پور کو پنجاب میں ضم کر دیا گیا۔ 1966ء میں نواب وفات پا گئے۔ ان کے بعد ورثاء نے جائیدادوں کے لیے لڑائیاں کیں، صادق گڑھ پیلس کو لوٹا گیا اور کئی عمارات ویران ہو گئیں۔ آج صادق گڑھ پیلس اپنی عظمتِ رفتہ کا نوحہ ہے — بے رونق باغات، خالی کمروں اور اجڑی ہوئی زیبائش کے ساتھ۔ مگر وہ تین نواب، جنھوں نے ریت کو گلزار بنایا، تاریخ میں روشن رہیں گے۔

حکایات بہاول پور

(12)

یہ واقعہ حال ہی میں پیش آیا مگر میری یادوں کا دائمی حصہ بن گیا ہے۔ میں اپنے بھائی کے ہمراہ ایک سرکاری دفتر گیا جہاں اسے بل کی ادائیگی کا چیک لینا تھا۔ معمول کی تاخیر کی اطلاع ملی۔ بھائی نے اپنی مجبوری بیان کی اور میں نے بھی سفارش کی۔

اکاؤنٹنٹ کا دل موم ہوا۔ اس نے فائل نکالی، دستخط اور مہریں لگوا کر چیک دے دیا۔ خوش ہو کر بھائی نے شکرانے کے طور پر ایک دس روپے کا نوٹ آگے بڑھایا۔ لیکن اکاؤنٹنٹ نے غصے سے نوٹ واپس کر دیا اور کہا": آپ مجھے رشوت پیش کر کے غیر قانونی حرکت کر رہے ہیں۔ میں حکومت کا ملازم ہوں اور میری تنخواہ میری خدمت کا صلہ ہے۔" اس نے اپنی میز سے ایک نوٹ بک نکالی، جس میں تمام مسترد شدہ رشوتوں کی تفصیل درج تھی۔

اس نے نیا اندراج کیا: "روپے 10۔ "00 اور کالم کے نیچے کل رقم لکھی: " 9790۔ "00۔ روپے جب میں نے حیرت سے وجہ پوچھی تو اکاؤنٹنٹ نے کہا": یہ میری دیانت کا ریکارڈ ہے۔ اگر میں ان سالوں میں ملنے والی پیشکشیں قبول کر لیتا تو آج میرے اکاؤنٹ میں 9790 روپے اضافی ہوتے۔ یہ ان لوگوں کی طرف سے دی گئی رقوم کا اندراج ہے جن کی پیشکشیں میں نے ٹھکرا دیں۔"

چنن پیر! ایک مختلف نقطہ نظر

سلمان رشید۔ محقق و ماہر آثار قدیمہ

سورس:https://odysseuslahori.blogspot.com

17 August 2013

چمکتا ہوا نیا پک اپ ٹرک کالے تارکول سے بنی سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑتا چلا جا رہا تھا جس کے ایک جانب سرمئی اور متحرک ریت کے ٹیلے تھے اور دوسری طرف سبز و شاداب ترشادہ اور نارنجی باغات اور گندم کے لہلہاتے کھیت۔ میں یزمان (ضلع بہاول پور) سے چولستان کے صحرا میں چنن پیر کے سالانہ میلے کی طرف جا رہا تھا اور میرے ہم سفر بیسیوں کی تعداد میں ایسے عقیدت مند تھے جو فیصل آباد، رحیم یار خان اور کشمور جیسے دُور دراز شہروں سے آئے تھے۔ چوں کہ یہ فروری کا پہلا جمعہ تھا اس لیے یہ لوگ ابتدائی زائرین تھے کیوں کہ میلہ آئندہ چھ جمعوں تک جاری رہنا تھا اور مارچ کے وسط میں اختتام کو پہنچنا تھا۔ جتنا پیچھے کوئی یادداشت ساتھ دیتی ہے، چنن پیر کا یہ سالانہ عرس ہمیشہ چھ ہفتوں پر محیط رہا ہے۔

میں اس میلے کی کھوج میں نکلا تھا جسے میں پنجاب کا سب سے قدیم اور فطری میلہ تصور کرتا ہوں جب کہ میرے ہم سفر چنن پیر کے مزار کی جانب رواں دواں تھے — کچھ اس مرحوم بزرگ کی برکت کا شکریہ ادا کرنے کہ انھوں نے انھیں برسوں سے مانگی ہوئی نرینہ اولاد عطا کی اور کچھ وہ جن کی آرزو ابھی پوری نہ ہوئی تھی۔ یہ بچے جو منت سے ملے تھے، نہا دھو کر، نئے اور عمدہ کپڑے پہنے، تیل لگے بالوں اور چمکتے پلاسٹک کے جوتوں میں ملبوس تھے۔ ان کی آنکھوں کے گرد موٹے سرمے کی تہہ

انھیں کسی بی گریڈ ہارر فلم کے کردار جیسا بنا رہی تھی۔ کچھ بچوں نے تو سستے غازے سے گال بھی رنگ رکھے تھے۔ ایک شخص، جو بظاہر سخت گیر مُلّا معلوم ہوتا تھا، اپنی بے پردہ بیوی اور تین نہایت خوب صورت چھوٹی بچیوں کے ساتھ بلاشبہ اس مردہ ولی کو جھنجھوڑنے جا رہا تھا کہ اس نے اس کی دعا کے باوجود اسے تیسری بیٹی کیوں عطا کی۔ یقیناً اس شکوے کے بعد ایک بار پھر دلگیر مناجات ہوگی کہ اس بار بیٹا ہو حالانکہ کون جانے وہ بیٹا کیا کرے گا جو بیٹیاں نہیں کر سکتیں لیکن یہی مشرق کا چلن ہے کہ جس کے ہاں بیٹا نہیں، وہ خود کو ادھورا مانتا ہے۔ یہ سب کے سب خوش باش تھے اور اس بات کا اظہار کر رہے تھے کہ وہ اس عظیم میلے سے محروم کیسے رہ سکتے ہیں۔ وہ عاجزی سے بات کرتے کہ ان کا بزرگ اللہ کے کتنا قریب ہے اور اللہ تعالیٰ کیسے اس کی خواہشات کو تسلیم کرتا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ اس ملا اور اس کی بیوی کی اس معاملے میں کیا رائے ہوگی۔

سڑک کے مشرقی کنارے پر جہاں ہم گاڑی سے اترے، ریت کے ٹیلوں کے درمیان خیموں کی ایک قطار تھی جو عارضی بازار پر مشتمل تھی۔ یہاں کھانے پینے کی اشیاء اور رنگ برنگی جھلملاتی چیزیں فروخت ہو رہی تھیں۔ اس قطار کے آخری سرے پر تین چمکتے سفید گنبد ریت سے اُبھر رہے تھے۔ بازار کے ایک طرف جھولے اور دو عدد ''موت کے کنوئیں'' تھے۔ وہ بڑے لکڑی کے ڈرم جن کی اندرونی دیواروں پر کوئی بہادر شخص موٹر سائیکل چلاتا ہے، کششِ ثقل کو مات دیتے ہوئے۔ دوسری جانب وہ کھلا میدان تھا جہاں سینکڑوں خاندان جانوروں سے جُتی یا ان جُتی گاڑیوں یا ٹریکٹر ٹرالیوں کی آڑ میں دھوپ سے بچنے کے لیے خیمہ زن تھے۔ تقریباً سبھی آگ جلا کر ناشتہ تیار کر رہے تھے۔ تیز ہوا کے جھونکوں پر موسیقی کی آواز لہروں کی صورت گونج رہی تھی اور صبح کے آٹھ بجے ہی انسانوں کا ایک ہجوم خوش دلی سے بازار میں رواں دواں تھا۔ یہاں روزے کے دوران کھانے پر پابندی کے باوجود، کھانے کے اسٹال خوب چل رہے تھے۔ ہمارے شہروں کے منافقانہ مذہبی نگہبانوں کی نظروں سے دُور، یہاں عقیدہ ایک ذاتی معاملہ تھا۔ یہاں نیم قیمتی پتھروں اور نایاب خوشبوؤں کے بیوپاری تھے، عجیب وغریب دندان ساز پاؤڈروں اور معجونوں کے بیچنے والے جو آنتوں کے کیڑوں، بواسیر اور نامردی سمیت ہر بیماری کا علاج بتاتے تھے۔ ان کے درمیان ریچھوں اور بندروں کے ساتھ کرتب

دکھانے والے، سانپوں اور نیولوں کی لڑائی کروانے والے بھی موجود تھے۔ میلے کا سب سے نمایاں کردار وہ عامل تھا جو، اپنی تختی کے مطابق، بدنظر دور کر سکتا تھا یا جس عورت کی چاہت دل میں ہو اُسے پاؤں میں گرا ہوا غلام بنا سکتا تھا لیکن سب سے بڑا ہجوم کھینچنے والی چیز ان دو ''سرکسوں'' میں سے ایک تھی جہاں ایک نوجوان لڑکا اور ایک خواجہ سرا، جاذبِ نظر جسمانی خدوخال خصوصاً کشادہ سینے کی مالک اور 30و40 کی دہائی کی معروف مغربی اداکارہ مَے ویسٹ کو بھی شرما دینے والے لباس اور انداز میں، پنجابی لوک گیتوں کی دھن پر ایسی حرکات کر رہے تھے کہ ہمارے وہی اخلاقی نگہبان اگر دیکھتے تو صدمے سے جاں بحق ہو جاتے لیکن مرد حضرات، بوڑھے ہوں یا جوان، جو وہاں جمع کھڑے تھے، انسانی ذہن کی پیچیدگیوں کا بھرپور عکس پیش کر رہے تھے۔

سڑک بننے سے پہلے جب مزار تک صرف اونٹ یا پا پیادہ ہی پہنچا جا سکتا تھا، عقیدت مند جمعرات کو روانہ ہوتے اور کئی دن کا ریگستانی سفر طے کر کے وہاں پہنچتے۔ خواتین کیمپ یا خیمے کی دیکھ بھال کرتیں جب کہ مرد بھنگ جو کہ تہواروں کا روایتی مشروب تھا، سے سرشار ہو کر بازار میں بانھیں ڈالے گھومتے رہتے۔ بھنگ کی تیاری اور اس کا استعمال بالکل کھلے عام ہوتا تھا اور کسی کو اس پر اعتراض نہ ہوتا مگر 1980ء کی دہائی کے قریب زدہ مارشل لا نے جو منافقت کو جنم دیا، اس کے بعد بھنگ کا استعمال بھی شراب کی مانند چھپ کر کیا جانے لگا۔ اس کے باوجود مجھے یقین دلایا گیا کہ یہ اب بھی چھپ کر وافر مقدار میں دستیاب ہوتی ہے۔ بازار کے آخری سرے پر، سفید چونے سے لپی ہوئی مسجد کی جنوبی دیوار کے ساتھ، چنن پیر کا مشہور ریت کا ٹیلہ موجود تھا۔ اس پر کوئی گنبد نہیں کیوں کہ روایت ہے کہ خود بزرگ کی خواہش تھی کہ اس پر کوئی عمارت نہ بنے۔ یہی وہ ٹیلہ ہے کبھی سبز کلمہ کندہ چادر میں لپٹا ہوا اور کبھی بالکل ننگا جسے زائرین پیر کی آخری آرام گاہ مان کر سجدہ کرتے ہیں۔ روایت ہے کہ اس قبر پر بارہا گنبد تعمیر کرنے کی کوششیں ہوئیں مگر ہر بار وہ راتوں رات منہدم ہو جاتا۔ آخری بار یہ کوشش 1930ء کی دہائی میں نواب صادق محمد عباسی پنجم نے کی تھی مگر جب عمارت دوبارہ منہدم ہوئی تو سب کو بزرگ کی مرضی سمجھ آ گئی اور معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ (اب وہاں فائبر کی چھت موجود ہے)

اس ٹیلے کے ایک جانب ایک چھوٹا سا مینار ہے جس کے گنبد کے نیچے ایک طاق بنی ہے۔

اس طاق میں مٹی کی ایک پیالی رکھی گئی ہے جو سرسوں کے تیل سے بھری ہوتی ہے۔ یہ تیل شفا کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے جسے لوگ جلدی امراض یا زخموں پر لگاتے ہیں جیسے خارش زدہ بچہ، زخم دار عورت، ہاتھ پر گہرے کٹ والا بوڑھا یا سوجے ہوئے بازو والا نوجوان۔ سب کو تھوڑا تھوڑا تیل دیا جاتا ہے۔ جو شفا پاتے ہیں وہ لوٹ کر آتے ہیں اور بزرگ کی کرامت کا چرچا کرتے ہیں جو شفا نہیں پاتے، وہ اسے اللہ کی مرضی سمجھ کر صبر کرتے ہیں۔

1904ء کے ریاست بہاول پور کے گزٹ میں درج روایت کے مطابق قدیم زمانے میں ایک سید شیر شاہ اس علاقے میں آئے جو اس وقت راجہ سندھیلا کے زیر حکومت تھا۔ سید نے دریافت کیا کہ کیا یہاں کوئی مسلمان ہے؟ جواب نفی میں ملا۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ کیا کوئی حاملہ عورت ہے؟ معلوم ہوا کہ خود رانی اُمید سے ہے۔ روایت ہے کہ سید نے راجہ کو حکم دیا کہ بچے کی ولادت کے لیے مسلمان دایہ کا بندوبست کرے کیوں کہ وہ بچہ اسلام کا پیروکار ہوگا۔ جب بچہ پیدا ہوا تو راجہ کو خدشہ لاحق ہوا کہ وہ اپنے آبا وَاجداد کا مذہب چھوڑ کر نئے دین کو اختیار کرے گا اور یہ عمل اس پر عذاب نازل کرے گا۔ اس خوف سے اس نے بچے کو صحرا کے ٹیلوں میں چھوڑ دیا۔ کچھ عرصے بعد اطلاع ملی کہ ایک صندل کا پالنا آسمان سے اترا ہے اور بچہ کسی غیبی ہستی کے زیر سایہ پروان چڑھ رہا ہے۔ راجہ فوراً بچے کو لینے آیا مگر جیسے ہی وہ قریب پہنچا، پالنا بلند ہوگیا۔ بار ہا کوشش کے باوجود کامیابی نہ ملی۔ راجہ نے سمجھ لیا کہ دیوتا یہی چاہتے ہیں اور وہ واپس لوٹ گیا۔ جب وہ بچہ بڑا ہوا تو وہ اسی ٹیلے پر رہنے لگا جہاں صندل کا پالنا اترا تھا اور وہیں دفن ہوا۔ روایت یہ بھی ہے کہ اس بچے کے حسن و جمال کی ایسی چمک تھی کہ اسے "چنن" یعنی چاند کے نام سے یاد کیا جانے لگا — چوں کہ سرائیکی میں چاند کو چن کہا جاتا ہے۔

اچانک تمام شور شرابے کے بیچ بانسریوں کی چیخ اور ڈھول کی گونج بلند ہوئی۔ کوئی اسکاٹش سپاہی نہیں بلکہ ایک دھوتی پہنے گندمی رنگت کا شخص اپنے گروہ کی قیادت کر رہا تھا، ایسے لوگ جو منت پوری ہونے پر اپنے بیٹے کو دکھانے آئے تھے۔ مرد و زن سب ناچتے ہوئے آ رہے تھے جن کی قیادت ایک پسینے میں شرابور، مٹکتی ہوئی خواجہ سرا کر رہی تھی۔ کچھ بکرے یا بھیڑ گھسیٹ کر لا رہے تھے تاکہ بزرگ کے نام پر قربانی کی جائے۔ ایک نوجوان بھیڑ سے الگ ہو کر مزار کے قریب ایک پرانے پیلو

کے درخت سے ایک چھوٹی لکڑی کا پالنا باندھ رہا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ شرما کر بولا: ''میں بھی بیٹے کی دعا مانگنے آیا ہوں اگر پالنا چڑھاؤں گا تو مراد ضرور پوری ہوگی۔'' اب اس متبرک ٹیلے کو لوہے کی باڑ نے گھیر رکھا ہے، جس میں داخلے اور اخراج کے لیے دو راستے ہیں۔ میں ایک طرف کھڑا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ عقیدت مندوں کا ریلا باڑ کے اندر جانے کے لیے بے قرار ہے۔ اندر جا کر وہ سب سجدے میں گر جاتے، ماتھوں کو سبز چادر یا برہنہ ریت پر ٹکاتے اور اسی حالت میں رہتے جب تک اوقاف کے عملے کے افراد انھیں چھڑیوں سے ہٹا کر جگہ خالی کرواتے۔ باڑ سے باہر کھڑے کچھ لوگ چپ چاپ ٹیلے کو دیکھتے اور جب عقیدت حد سے بڑھتی تو بغیر انتظار کے، وہیں ریت میں جھک کر سجدہ کر دیتے۔ ایک شخص جس نے اپنے دو سالہ بیٹے کو کندھوں پر اٹھا رکھا تھا، باڑ کو تھامے کھڑا تھا کہ کب بھیڑ کم ہو اور وہ اندر جا سکے۔ تین بار کوشش کی مگر ہر بار پیچھے دھکیل دیا گیا۔ وہ ایک طرف ہو کر کچھ دیر کھڑا رہا اور پھر اچانک جھک کر، بیٹے کو کندھوں پر لیے، ریت میں ماتھا ٹیک دیا۔ بچہ اپنے چہرے کو ریت سے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہا مگر باپ بے خبر سجدے میں پڑا رہا یہاں تک کہ بچہ سسکنے لگا۔ تب وہ اٹھا اور بچے کے تیل آلود ماتھے سے نرمی سے ریت صاف کی۔ کچھ لوگ تسبیح کرتے ہوئے بیٹھے تھے جب کہ مالدار افراد مکھانے اور پیسے مزار پر پھینک رہے تھے۔ پیسے سیدھے اوقاف کے صندوق میں جاتے اور مکھانے، جواب شفا بخش قرار پاتے، زائرین میں بانٹے جاتے۔ لوگ سبز چادر کو چومتے یا ننگی ریت کو، بعض تو بس ہاتھ لگا کر آسمان کی طرف خوابیدہ نگاہوں سے دیکھتے۔ بچے بھی اپنے بڑوں کی نقل کرتے۔

عقیدت مندوں کے سجدوں اور محبت بھرے انداز کے برعکس، سرکاری اہلکاروں کے چہرے پر ذرّہ برابر بھی عقیدت کے آثار نہ تھے۔ وہ مزار کے ٹیلے پر اس انداز سے چل رہے تھے جیسے یہ صرف ایک معمولی ریت کا ڈھیر ہو۔ میں نے کئی بار ان تین اہلکاروں میں سب سے کم عمر، صاف ستھرے، شہری طرز کے نوجوان کی آنکھوں میں جھانک کر گفتگو کی کوشش کی مگر وہ بڑی مہارت سے نظریں چرا گیا۔ شاید وہ مجھے کسی خطرناک سائل یا سازشی خیال کر بیٹھا تھا۔ چنن پیر کے معتقدین کی ایک بڑی تعداد نہایت خوب صورت اور سجے ہوئے بیلوں اور گھوڑوں کو ساتھ لائی تھی۔ ان پر مہندی،

جامنی، سبز، زنگ آلود یا نیلا رنگ کر کے انھیں تہوار کی رونق بنایا گیا تھا۔ میں نے سمجھا کہ شاید ان بیلوں کو قربانی کے لیے لایا گیا ہے مگر جب ایک شخص سے پوچھا تو وہ قدرے ناگواری سے بولا (شاید میں نابلد لگ رہا تھا) 'یہ جانور بھی ہماری طرح سلام کہنے آئے ہیں۔'' جانوروں کا سجدہ کرنا، کھلے آسمان تلے مزار، چھ ہفتے جاری رہنے والا میلہ، ہندو راجا کے گھر پیدا ہونے والے ایک مسلم ولی کی کہانی اور وہ چھوٹا سا حوالہ جو ایک پرانی نایاب کتاب میں دفن تھا۔ یہ تمام باتیں اچانک ایک نقطے پر آ کر جُڑ گئیں۔

اب اس پرانی کتاب کا ذکر۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے نویں عشرے میں ایک نوجوان، جو یونان کے شہر "کِندوس" کے ایک طبیب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، طب کے فن میں اپنی مہارت کی بدولت مشہور ہوا۔ اس کا نام کتیشیاس تھا جو بقراط کا ہم عصر اور دور کا رشتہ دار تھا۔ 416 قبل مسیح میں وہ اپنے وطن سے نکل کر فارسی دربار میں پہنچا اور داریوش دوم کا شاہی معالج بن گیا۔ وہ گیارہ برس تک بادشاہ کی خدمت میں رہا اور بادشاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے اردشیر نے بھی اُسے اپنے دربار میں رکھا۔ طب کے پیشے سے ہٹ کر کتیشیاس نے تصنیف کا شوق بھی پورا کیا اور کئی تاریخی و جغرافیائی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک "انڈیکا" (Indika) ہے جو قدیم ہندوستان پر ایک مفصل بیان ہے۔ اگرچہ وہ خود کبھی ہندوستان نہیں آیا مگر دربار میں آنے والے تاجر، علما، سفیر اور دیگر مسافر اس کی معلومات کا ذریعہ تھے۔ مترجم جان مک کرنڈل کے بقول کتیشیاس ''عجائبات کا دلدادہ تھا مگر تنقیدی بصیرت سے محروم''، اس لیے اس کی کتاب کئی بعید از قیاس کہانیوں سے بھری ہوئی ہے، کچھ شاید جھوٹے قصہ گوؤں نے گھڑیں، کچھ وہ خود غلط سمجھے یا مبالغہ سے کام لیا۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ اس نے کچھ نہایت اہم اور درست معلومات بھی درج کیں۔ انہی میں سے ایک ذکر ایسے ''مقدس مقام'' کا ہے جو ''ویران علاقے کے بیچ واقع ہے اور جسے سورج اور چاند کے نام پر پوجا جاتا ہے''۔ کتیشیاس لکھتا ہے کہ یہ مقام ان پہاڑوں سے پندرہ دن کی مسافت پر ہے جہاں اونیکس اور سرڈونی قیمتی پتھر ملتے ہیں۔ یہاں ''ہر سال سورج پینتیس دن کے لیے اپنی تپش کم کر دیتا ہے تاکہ اس کے پجاری اپنی رسومات ادا کر سکیں اور دھوپ سے جھلسے کے بغیر واپس جا سکیں۔''

چنن پیر کا میلہ پینتالیس دن جب کہ سورج کے تہوار کی مدت پینتیس دن بتائی گئی ہے۔ زیادہ دلچسپ بات یہ کہ اس زمانے کا تعین بھی سورج کی ''ٹھنڈک'' سے ہوتا ہے یعنی موسمِ گرما سے پہلے کا معتدل وقت۔ مشہور مستشرق ویلتھائم نے اس ''ویران علاقے'' کو چولستان کے ریگزار میں واقع قرار دیا ہے جو ہمالیہ سے واقعاً پندرہ دن کی مسافت پر ہے۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ قدیم زمانے میں یہاں سورج کی پوجا کی جاتی تھی مگر اس سے بھی پہلے، سورج یا چاند نہیں بلکہ ایک اور طاقتور دیوی کی پرستش یہاں رائج تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ دھرتی ماں یا زرخیزی کی دیوی کا تصور دنیا کی بیشتر تہذیبوں میں موجود رہا ہے۔ موئن جودڑو اور مہر گڑھ جیسے قدیم مقامات پر بھی آٹھ ہزار سال قبل زرخیز سینے والی عورت کی مورتیاں ملتی ہیں جنھیں زرعی برکت کی دیوی مانا جاتا تھا۔ تب چولستان کی گمشدہ ندیاں اس سرزمین کو سیراب کرتی تھیں۔ دھرتی ماں ہر بہار میں خود کو نئی زندگی عطا کرتی اور اس کی پوجا کنارِ دریا ہوتی۔ شاید کوئی مٹی کا ٹیلہ ہوتا جسے اس دیوی کی علامت سمجھا جاتا۔

تقریباً چار ہزار سال قبل دریا سوکھ گئے، زمین بنجر ہوگئی، سرسبز کھیتوں کی جگہ خشک، کٹے پھٹے میدان اور صحرائی جھاڑ جھنکار نے لے لی۔ کنویں خشک ہو گئے اور صحرا کی ریت نے شہر دبانے شروع کر دیے۔ باسیوں نے اپنے گھر چھوڑ دیے اور کہیں اور جا بسے۔ وقت گزرتا گیا۔ قدیم بستیاں ریت تلے دب گئیں، سب کچھ فراموش ہو گیا مگر دھرتی ماں کی یاد لوگوں کے اجتماعی حافظے میں نقش رہی۔ ہر سال، عقیدت منداس مقام پر لوٹتے کہ شاید دیوی پھر سے زمین کو برکت دے۔ 1700 قبل مسیح کے آس پاس، مقامی باشندوں کی جگہ آریائی نسل کے لوگ آ گئے۔ انھیں بھی دھرتی ماں کا تصور بھایا۔ چناں چہ وہ بھی اپنے نئے دیوتاؤں کے ساتھ، اس مقدس ٹیلے پر ہر بہار میں آتے تا کہ ان کی عورتوں، مویشیوں اور کھیتوں کو برکت ملے مگر زمین بنجر ہی رہی، دیوی روٹھ چکی تھی۔ وقت گزرتا گیا، سورج اور چاند کی پوجا نے دھرتی ماں کی جگہ لے لی مگر بہار کی وہ قدیم رسم باقی رہی۔

زمانے نے مذہبی منظر نامہ بدلا۔ ویدک عقائد نے انڈس تہذیب کے دیوتاؤں کو پیچھے چھوڑا، بدھ مت آیا، پھر ویدک مذہب واپس لوٹا اور بالآخر اسلام کا عروج ہوا۔ پرانے دیوتا نئے بزرگ بن گئے۔ مگر دھرتی ماں اور سورج جیسے واضح ویدک نشانات کو اسلامی لبادہ پہنانا مشکل تھا۔ اس

لیے ایک ایسا نام چُنا گیا جس کی قبولیت آسان ہو۔ چاند جو اسلام میں بھی محترم ہے، ایک موزوں متبادل تھا۔ دھرتی ماں کو چاند جیسے چہرے والے مرد بزرگ "چنن پیر" میں ڈھال دیا گیا۔ راجہ سندھیلا اور اس کی ملکہ کے ذریعے ایک "مسلم ولی" کی ولادت کی کہانی نے اس تبدیلی کو مذہبی جواز دیا اور جو قدیم روایت تھی کہ اس دیوی کے مزار پر کبھی گنبد نہ بنایا جائے، اسے چنن پیر کی زبانی بیان کروا کر نئی معنویت دے دی گئی۔ پھر وقت نے افسانے کو تاریخ میں بدل دیا چناں چہ گنبد کے بار بار گرنے کی کہانی گھڑ لی گئی۔ اس ظاہری ملمع کاری کے نیچے، وہی قدیم رسم جاری ہے جو کٹیشیاس کے مطابق چھ ہفتوں تک سورج کے نرم موسم میں ادا کی جاتی تھی۔ آج بھی اعلیٰ نسل کے جانور بزرگ کو سلامی دینے آتے ہیں، نرینہ اولاد کی دعا کی جاتی ہے، اور دیوی اپنی قبولیت کے اشارے عطا کرتی ہے۔

جب میں چنن پیر کے ٹیلے پر یہ نیم مذہبی منظر دیکھ رہا تھا تو اس کی شدت نے مجھے مغلوب کر لیا۔ سجدے، ٹیلے کو عقیدت سے دیکھنا، ہاتھ سے چھونا، چہرے اور آنکھوں پر ملنا، مکھانوں کو شفا بخش ماننا اور بیٹے کے لیے دعا یہ سب ہزاروں سال کی پختہ عبادت کی میراث ہے۔ اس سب کے پس منظر میں وقت کی دھندلی راہوں میں دھرتی ماں کے قدیم عقیدے کے کئی پرت بکھرے ہوئے ہیں، جو نئے رنگوں میں ڈھلتے ڈھلتے یہاں تک آ پہنچے ہیں۔ جب باپ اپنے بیٹے کو کندھوں پر لیے سجدے میں گرتا ہے تو یہ عقیدہ اس بچے کی رگوں میں اتر جاتا ہے جیسے اس کے باپ کی رگوں میں اترا تھا اور اس سے پہلے اس کے باپ کے۔ زرخیزی کی دیوی کا یہ عقیدہ کبھی مٹنے والا نہیں۔

☆☆☆☆☆

وہ پلنگ جس نے سب کو چونکا دیا!

مصنف: اکشے چاون

اشاعت کی تاریخ: 16 اپریل 2017

ذریعہ: peepultree.world

1975 تک یہ راز برقرار رہا کہ یہ عجیب وغریب پلنگ آخر کس ''ہندوستانی شہزادے'' نے بنوایا، 1882ء میں پیرس کے مشہور فرانسیسی چاندی ساز ادارے "کرسٹوفل" کو ایک نامعلوم شخص کی جانب سے ایک پلنگ کا آرڈر موصول ہوا مگر اس پلنگ کی جو تفصیلات فراہم کی گئیں وہ اتنی حیران کن تھیں کہ کمپنی دنگ رہ گئی۔ آرڈر کی تفصیل کچھ یوں تھی: "گہرے رنگ کی لکڑی کا پلنگ، جس پر خالص چاندی کی پرت چڑھی ہو، بعض حصے سونے سے ملمع ہوں، اس پر شاہی نشان اور مونگرام بنے ہوں، اور چار مکمل انسانی قامت کی کانسی کی مجسمہ نما عورتیں نصب ہوں، جنھیں قدرتی رنگ سے پینٹ کیا گیا ہو، ان کے بال اصلی ہوں، آنکھیں اور بازو حرکت کر سکیں اور وہ ہاتھوں میں پنکھے اور چمر تھامے ہوئے ہوں۔"

(چمر یا چاؤر: لمبے بالوں والے جھاڑو نما پنکھے ہوتے ہیں جو گھوڑے کی دُم کے بالوں سے بنائے جاتے ہیں اور برصغیر کی شاہی روایات میں خاص طور پر نوابوں، راجاؤں یا بزرگانِ دین کے حضور جھلنے کے لیے استعمال ہوتے تھے)

چار برس کی محنت کے بعد یہ پلنگ تیار ہوا۔ اسے گہرے گلابی رنگ کی لکڑی روز ووڈ سے بنایا گیا اور اس پر 260 کلوگرام چاندی چڑھائی گئی۔ اس کے چاروں کونوں پر چار خواتین کے مجسمے نصب کیے گئے، جو فرانس، اسپین، اٹلی اور یونان کی نمائندگی کرتے تھے۔ ایک بٹن دبانے پر ایک

خاص مشینی نظام حرکت میں آتا جس سے یہ مجسمے آنکھ مارنے لگتے اور پنکھے جھلنے لگتے جب کہ پس منظر میں فرانسیسی موسیقار گونو کے مشہور اوپیرا فاؤسٹ کا تیس منٹ کا ٹکڑا بجتا رہتا۔

یہ آرڈر انتہائی راز داری سے دیا گیا اور اس کی ترسیل بھی کچھ نمائندوں کے ذریعے کرائی گئی چناں چہ طویل عرصے تک کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ پلنگ کس کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ صرف اتنا پتا چلا کہ یہ کسی ہندوستانی شہزادے کے لیے تھا۔ بالآخر 1975 میں اس پلنگ کا سراغ بہاول پور (پاکستان) میں لگا۔ بہاول پور دریائے سندھ کے کنارے واقع ایک وسیع و عریض ریاست تھی جو آج پاکستان کا حصہ ہے۔ اس پر عباسی خاندان کی حکومت تھی جو خلیفہ ہارون الرشید (809- 786) کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہی ہارون الرشید جو الف لیلہ کی کئی کہانیوں کا مرکزی کردار بھی ہے۔ 1882 میں، یہ پلنگ بہاول پور کے 20 سالہ نواب، محمد صادق محمد خان چہارم نے خفیہ طور پر تیار کروایا تھا۔

1966 میں بہاول پور کے آخری حکمران نواب کا انتقال ہوا تو اُس وقت کے وزیر اعظم پاکستان، ذوالفقار علی بھٹو نے صادق گڑھ محل میں موجود تمام شاہی سامان کا ریکارڈ مرتب کروانے کا حکم دیا۔ اس فہرست میں یہ چاندی کا پلنگ بھی شامل تھا جو محل کے "فرینچ بیڈروم" میں موجود تھا تاہم نواب کی وراثت کے جھگڑوں کے باعث محل اور اس کا تمام سامان سیل کر دیا گیا۔ بعد ازاں 1990 کی دہائی میں یہ پلنگ محل سے پراسرار طور پر غائب ہو گیا اور بالآخر فرانس میں کسی ذاتی ذخیرے یا نجی کلیکشن کا حصہ بن گیا۔ (اضافی نوٹ از مترجم: 2020 کے دوران بھارت سے چھپنے والی اینابیل لائڈ کی کتاب Bahawalpur - A Vanished Kingdom میں اس منفرد پلنگ کی تصویر بھی موجود ہے جو ممکنہ طور پر جناب صلاح الدین عباسی نے مہیا کی ہوگی۔ اس پلنگ کی ایک تصویر فیس بک پر (A Sirkar & Co. Jewellers) پر دیکھی جا سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

سلیمانکی ہیڈ ورکس — صحرا کو گلزار بنانے والا منصوبہ

تحریر۔سلمان رشید تاریخ اشاعت یکم اکتوبر 2015

سورس:odysseuslahori.blogspot.com

دریائے ستلج پاکستان میں ساہیوال سے تقریباً 80 کلومیٹر مشرق میں واقع گاؤں سلیمانکی کے مقام پر داخل ہوتا ہے۔اس مقام سے نیچے کا علاقہ جو آج سرسبز و شاداب اور زرخیز ہے، کبھی ایک بنجر ریگستان تھا۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں عباسی خاندان نے اس خطے کو صحرائی راجپوتوں سے چھین لیا۔ راجپوتوں نے یہاں کتنی نہریں کھدوائیں، اس کا کوئی مستند ریکارڈ موجود نہیں، مگر یہ بات طے شدہ ہے کہ عباسی حکمران آبی گزرگاہیں تعمیر کرنے کے ماہر تھے۔ انھوں نے اس نئی حاصل شدہ سرزمین میں کئی نہریں نکال کر ایک حصے کو سرسبز بنا دیا۔ فورڈواہ نہر سامنے اور صادقیہ مشرقی نہر پیچھے۔ یہ دونوں نہریں ستلج کے بائیں کنارے سے نکلتی ہیں۔ یہ دریا یہاں چناب اور جہلم کا پانی لاتا ہے جو راوی پر بنے بلوکی ہیڈ ورکس سے بلوکی۔ سلیمانکی رابطہ نہر کے ذریعے یہاں پہنچتا ہے۔ جب 1866ء میں پہلا برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ ریاست بہاول پور میں تعینات ہوا تو اس کے عملے نے ستلج کے کنارے بہاولنگر اور بہاول پور کے موجودہ اضلاع میں محض ایک دو نہیں بلکہ 26 بڑی نہریں دریافت کیں۔ اس کے علاوہ کئی چھوٹی نہریں اور دریا سے نکلنے والی درجنوں چھوٹی " کٹ" گزرگاہیں بھی موجود تھیں۔ یہ تمام نہریں سیلابی نوعیت کی تھیں جو ستلج کے پانی کی بلندی پر بہتی تھیں اور بیشتر بہتر حالت میں تھیں تاہم موجودہ نہری نظام کو بہتر بنانے پر کام کیا گیا۔ 1889ء میں صادقیہ مشرقی نہر کو جو سلیمانکی کے کچھ کلومیٹر اوپر سے نکلتی ہے، بہتر بنا کر 40 کلومیٹر تک توسیع دی گئی۔ 1898ء میں اس کا پچھلا سرا مزید 22 کلومیٹر تک بڑھایا گیا۔ 1870ء کی دہائی میں فورڈواہ نہر جو

ریاست بہاول پور کے پہلے پولیٹیکل ایجنٹ کے نام پر ہے، نکالی گئی۔ دونوں نہروں کے سیلابی ہیڈ سلیمانکی کے قریب بائیں کنارے پر واقع تھے۔

1854ء کی پرانی فائلوں کے مطابق، انگریز حکام نے "ستلج ویلی پروجیکٹ" کا ایک ابتدائی خاکہ تیار کیا تھا جس میں دریائے بیاس اور ستلج کے پانی سے لاہور۔فیروز پور لائن کے نیچے بہاول پور اور بیکانیر تک کا علاقہ سیراب کرنے کا منصوبہ تھا۔ اس منصوبے میں رحیم یار خان کے ریگستان کو بھی زرخیز بنانا شامل تھا۔ کسی نہ کسی وجہ سے یہ منصوبہ 1906ء تک معرضِ التوا میں رہا، جب ابتدائی سروے شروع ہوئے۔ 1919ء تک یہ منصوبہ اپنی مکمل شکل میں سامنے آیا اور مالی وسائل بھی میسر آئے۔ منصوبہ یہ تھا کہ ستلج پر فیروز پور سے پنجند تک چار بیراج تعمیر کیے جائیں: حسینی والا (فیروز پور)، سلیمانکی، اسلام اور پنجند۔ ان بیراجوں سے 12 نہریں نکالی جاتیں جو مجموعی طور پر 48,000 کیوسک پانی لے جاتیں۔ حسینی والا ہیڈ ورکس 1924ء میں مکمل ہوا۔ اسی وقت سلیمانکی کے مقام پر دوسرے بیراج کے مقام پر غور ہو رہا تھا۔ انگریز انجینئروں نے سلیمانکی سے 34 کلومیٹر نیچے مقام تجویز کیا مگر چوں کہ یہ علاقہ نواب صادق عباسی پنجم کا تھا اس لیے ان کی رائے کو اہمیت دی گئی۔ نواب چاہتے تھے کہ بیراج سلیمانکی سے 34 کلومیٹر اوپر بنایا جائے تاکہ ان کی ریاست کے شمالی علاقوں کو بھی مستقل نہری آبپاشی مل سکے۔ بالآخر سلیمانکی مقام پر اتفاقِ رائے ہوا۔ صرف پچاس برس پہلے اسی علاقے میں صادقیہ مشرقی اور فورڈواہ نہریں سیلابی نظام کے تحت بنائی گئی تھیں۔ اس مقام پر دریا کا پاٹ نسبتاً مستحکم اور 1.5 کلومیٹر چوڑا تھا۔ یہ اہم تھا کیوں کہ ستلج کو قدیم زمانے میں "ستادرُو" یعنی "سو دھاراؤں والا" کہا جاتا تھا — یعنی اس کے پانی کے بہاؤ کے کئی راستے تھے، جو وقت کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ 1893ء میں ستلج نے راستہ بدل لیا تھا اور صادقیہ نہر کا ہیڈ چھوڑ دیا جس کی وجہ سے نیا ہیڈ بنانا پڑا تھا۔ 1924ء میں کام شروع ہوا اور اپریل 1926ء میں بیراج مکمل ہوا۔ بائیں کنارے سے نکلنے والی صادقیہ مشرقی اور فورڈواہ نہروں نے فورٹ عباس سے حاصل پور تک، 160 کلومیٹر کے دائرے میں، بنجر زمین کو سیراب کر دیا۔ دائیں کنارے سے پاکپتن نہر جنوب مغرب کی طرف چلی جس نے وہاڑی اور بورے والا کے ببول کے جنگلات کو زرعی زمین میں بدل دیا۔ آج یہ

تینوں نہریں تقریباً 28 لاکھ ایکڑ رقبے کو سیراب کرتی ہیں۔

1940ء کی دہائی میں جب برصغیر کی تقسیم کی تیاریاں ہو رہی تھیں، تو انگلستان سے سرل ریڈکلف کو زمینی حقیقتوں سے ناآشنا ہو کر سرحد کھینچنے کا حکم دیا گیا۔ اس کی قلمی لکیر نے گاؤں، نہریں اور دریاؤں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ ستلج ویلی پروجیکٹ کے تناظر میں یہ تقسیم حیران کن ثابت ہوئی: حسینی والا ہیڈ ورکس بھارت میں چلا گیا اور سلیمانکی پاکستان میں آ گیا۔ اگرچہ ہیڈ ورکس ایک ملک میں گئے، ان کے ساتھ موجود حفاظتی پشتے دوسرے ملک میں چلے گئے۔ حسینی والا پر دائیں کنارے کی پشتیں پاکستان میں تھیں، اور سلیمانکی پر بائیں کنارے کی پشتیں بھارت میں۔ تقسیم کے ابتدائی سالوں میں پاکستانی و بھارتی آبپاشی حکام کو دوسری طرف مرمت کی اجازت لینا پڑتی تھی۔ 1960ء میں یہ مسئلہ زمینی تبادلے سے حل ہوا۔ بھارت نے سلیمانکی میں ایک علاقہ پاکستان کو دیا اور اس کے بدلے حسینی والا میں ویسا ہی علاقہ حاصل کیا۔ یوں آج دونوں ہیڈ ورکس بین الاقوامی سرحد کے قریب واقع ہیں گویا دونوں ممالک میں سب سے قریبی سرحدی بیراج۔ انڈس واٹر ٹریٹی 1960ء کے تحت دریاؤں کی تقسیم عمل میں آئی۔ راوی، ستلج اور بیاس بھارت کے حصے میں آئے اور بھارت کو مکمل اختیار دیا گیا کہ وہ ان کے پانی کا استعمال پاکستان کی پروا کیے بغیر کرے۔ چناں چہ ستلج تقریباً مر گیا اور صرف شدید سیلاب کی صورت میں بھارت پانی چھوڑتا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب صادقیہ، فورڈ واہ اور پاکپتن نہریں ختم ہونے کے قریب تھیں مگر معاملہ فہم دماغوں نے برطانوی دور کے اصول Pooling of Waters کو دوبارہ اپنایا۔ اگر چناب اور جہلم کا پانی راوی میں مل سکتا ہے تو وہی ستلج میں بھی ہو سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے راوی پر پہلے سے بلوکی ہیڈ ورکس موجود تھا جس سے بلوکی۔ سلیمانکی رابطہ نہر کھودی گئی اور یوں سلیمانکی کی نہریں زندہ رہیں۔ آج، پاکپتن، بہاولنگر، وہاڑی اور میلسی کی زرخیزی کا پورا انحصار انہی نہروں پر ہے۔ یہ دلچسپ خیال بھی ذہن میں آتا ہے کہ اگر نواب صادق عباسی اپنی بات منوا لیتے اور بیراج سلیمانکی کے بجائے لالوگدر میں بنایا جاتا — جو بھارت کے اندر ہے — تو تینوں نہروں کو جاری رکھنا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا۔

حکایات بہاول پور

(13)

وہ ایک نہایت بڑے زمیندار ہیں، روایت پسند اور سخت قدامت پسند۔ ستر برس سے زائد عمر اور تین بیویاں۔ ایک دن گپ شپ میں، میں نے پوچھ ہی لیا کہ "سر! تین بیویوں کے ساتھ گھر میں امن کیسے قائم رکھتے ہیں؟ کیا کبھی ان کے درمیان یا آپ کے ساتھ حسد یا جھگڑا نہیں ہوتا؟" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے، حقے کا کش لیا اور جواب دیا": انھوں نے کبھی آپس میں یا میرے ساتھ جھگڑا نہیں کیا اور اس کی وجہ ایک واقعہ ہے جسے میری پہلی بیوی نے دوسری اور دوسری نے تیسری بیوی تک پہنچایا۔ واقعہ یوں ہے: پچاس سال پہلے جب میں نے پہلی شادی کی، چند دن بعد میں اپنی بیوی کو اس کے والدین کے گاؤں لے جا رہا تھا میں گھوڑے پر سوار تھا اور بیوی ایک عمدہ اور قیمتی گھوڑی پر۔ تین چار میل کا سفر کیا تھا کہ گھوڑی بدک گئی اور مچلنے لگی۔ میں فوراً کود کر اترا، گھوڑی کی لگام سنبھالی، قابو پایا اور گھوڑی کے کان میں کہا: 'یہ پہلی دفعہ ہے۔' کچھ دور جا کر گھوڑی پھر بدکی۔ میں پھر اترا، قابو پایا اور اس کے کان میں کہا: 'یہ دوسری دفعہ ہے۔' تیسری مرتبہ جب گھوڑی نے بدکنے کی کوشش کی تو میں نے بیوی کو نیچے اتارا، گھوڑی کا زین اتارا اور ریوالور نکال کر گھوڑی کے سر میں چھ گولیاں مار دیں۔ گھوڑی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ میری بیوی نے غصے میں مجھے خوب سنائیں مگر میں خاموشی سے سنتا رہا۔ جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا: 'یہ پہلی دفعہ ہے اور انگوٹھے سے گھوڑی کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ بیوی سمجھ گئی اور پھر کبھی مجھ سے جھگڑا نہیں کیا۔ پچاس برس بیت گئے ہیں، میری کوئی بیوی مجھ سے یا آپس میں نہیں جھگڑی۔" پھر مسکرا کر کہا": لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔ آج کی بیویاں اور شوہر بدل چکے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ میری کہانی آج کے دور میں کارآمد ہو سکے۔"

صادق گڑھ محل، ڈیرہ نواب صاحب

''شان وشوکت اور تزئین وآرائش سے بھرپور جلال اور جذبات انگیز طرزِفن'' کا امتزاج

تحریر:سلمان رشید تاریخ اشاعت 22 فروری 2013

سورس:odysseuslahori.blogspot.com

جب نواب بہاول خان عباسی چہارم 1866ء میں وفات پا گئے تو ان کا بیٹا صادق صرف پانچ برس کا بچہ تھا۔اس نابالغ شہزادے کا زمانہ ایسا تھا کہ اس کی بیوہ والدہ کو درباری سازشوں اور دعوے داروں کی ریشہ دوانیوں کا تن تنہا سامنا کرنا پڑا۔اس کے باوجود،نواب صادق نے ایک معقول حد تک تعلیم حاصل کی۔اٹھارہویں سالگرہ پر اسے روایتی دستار پہنائی گئی اور ریاست بہاول پور کی حکمرانی کا اختیار سونپا گیا اور یوں وہ نواب صادق محمد خان چہارم کہلایا۔

نواب صادق محمد خان ایک نفیس ذوق رکھنے والے مہذب انسان تھے۔وہ محلوں کے عظیم معمار اور اطالوی طرزِ تعمیر کے شیدائی تھے۔انھوں نے کئی شاندار عمارات تعمیر کروائیں جو آج بھی ان کی دولت اور ذوقِ تعمیر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔اٹھارہویں صدی کے اختتام تک بہاول پور کے نواب ایک دولت مند ریاست پر حکمرانی کر رہے تھے۔وہ تین دارالحکومت رکھتے تھے:بہاول پور،دراوڑ اور احمد پور شرقیہ۔آخری مقام پر شاہی خاندان کا اصل مسکن ایک قلعہ میں تھا جو شہر کی ہنگامہ خیزی سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔اسی شہر کو نواب صادق محمد خان نے اپنی زندگی کی خوب صورت ترین عمارات میں سے ایک صادق گڑھ محل کا تحفہ دیا۔یہ محل 13 برس کی انتھک محنت کے بعد 1895ء میں مکمل ہوا مگر

قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔نواب صرف چار سال بعد، 1899ء میں محض 38 برس کی عمر میں وفات پا گئے ۔اگر نواب کو یہ گمان تھا کہ وہ مقامی اور اطالوی طرزِتعمیر کا حسین امتزاج بنا چکے ہیں تو سب اس سے متفق نہ تھے۔معروف نقاد جارج برڈووڈ جو مقامی طرزِتعمیر کے زبردست حامی تھے، نے اس محل کو "بے جان کلاسیکی طرز کا بدترین نمونہ" قرار دیا مگر تنقید اپنی جگہ، صادق گڑھ محل آج بھی اطالوی طرزِ تعمیر کی ایک شاندار مثال اور فنِ تعمیر کے طلبا کے لیے مطالعے کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

یہ محل مقامی اور اطالوی طرزِتعمیر کا حسین امتزاج ہے۔نواب کی دولت نے انھیں ایک اطالوی معمار کی خدمات حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا۔اگرچہ اطالوی ماہر نے باروک طرز میں محل کی تعمیر کی مگر اس کے ساتھ کام کرنے والے مقامی ہنرمندوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ مقامی طرز مکمل طور پر مغلوب نہ ہو چناں چہ ہمیں جھروکوں، مغلیہ محرابوں، گنبد نما میناروں کے ساتھ اطالوی جھروکوں، زینتی ستونوں اور باروک طرز کے گنبدوں کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

ریاست بہاول پور کے پاکستان میں انضمام کے بعد بھی یہ محل شاہی خاندان کے زیرِ استعمال رہا مگر آخری حکمران نواب صادق محمد عباسی پنجم کی 1966ء میں وفات کے بعد ان کے بیٹے عباس کو محض علامتی طور پر جانشین مقرر کیا گیا۔یہی وہ موڑ تھا جہاں سے صادق گڑھ محل کے زوال کی داستان شروع ہوئی۔1988ء میں عباس کی وفات کے بعد خاندانی تنازعات نے محل کو بندش تک پہنچا دیا مگر بندش نے بھی محل کو تباہی سے نہ بچایا۔

صادق گڑھ محل، جو کبھی بہاول پور کے شاہی خزانے کا امین تھا، آج لٹیروں کا شکار ہو چکا ہے۔جو بھی اس کے بلند و بالا دروازے کے پیچھے تک پہنچا اس نے لوٹ مار میں حصہ لیا۔وہ قیمتی کرسٹل فانوس جن میں سے بعض کا وزن کئی ٹن تھا، اب صرف یادیں ہیں۔ان کے مقام پر صرف لوہے کی زنجیریں اور پائپ باقی رہ گئے ہیں۔فرنیچر، تصویریں، ظروف، چاندی کے برتن، یہاں تک کہ غسل خانوں اور باورچی خانے کی تنصیبات بھی غائب ہو چکی ہیں۔

آج یہ محل، جو کبھی شاہی جاہ و جلال کی علامت تھا، خالی خول کی مانند کھڑا ہے۔اپنے گزرے ہوئے عظیم ماضی، تہذیب اور ایک ایسی ریاست کی یادگار جو اب فقط تاریخ کے اوراق میں زندہ ہے۔

قدیم شاہی قبرستان

تحریر۔عاصف محمود

اشاعت:27فروری2022۔لاہور:

سورس: (T.Magazine) https://tribune.com.pk/

بہاول پور کی تحصیل احمد پور شرقیہ میں عباسی نواب خاندان کا ایک قدیم شاہی قبرستان واقع ہے جہاں نواب خاندان کے سر براہوں کی قبریں ایک وسیع ہال میں بنائی گئی ہیں۔اس کے برعکس نوابوں کی بیویوں کے لیے الگ مزارات تعمیر کیے گئے ہیں۔غیر ملکی بیویوں کے مقبرے سفید سنگ مرمر سے بنے ہیں جب کہ مقامی اور عباسی خاندان سے تعلق رکھنے والی بیویوں کی قبریں علاقائی ثقافت کے مطابق دلکش نقش ونگار سے مزین ہیں جو انھیں دیگر قبروں سے ممتاز بناتی ہیں۔

بہاول پور کی تاریخ بہت طویل ہے مگر اس کا انجام دلخراش ہے۔بہاول پور ریاست کے بیشتر نواب قلعہ دراوڑ میں پیدا ہوئے جو اس شاہی قبرستان سے چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے اور بعد ازاں اسی قبرستان میں دفن ہوئے۔اس قبرستان میں تقریباً100 کے قریب چھوٹی بڑی قبریں موجود ہیں۔عباسی خاندان نے 1690ء(؟؟؟) سے لے کر 1955ء تک تقریباً دوسو پچاس سال تک ریاست بہاول پور پر حکمرانی کی۔یہ قبریں عباسی نواب خاندان کے عروج وزوال کی کہانی سناتی ہیں۔ ماہر آثار قدیمہ فضل خان کے مطابق یہ شاہی قبرستان، دراصل صدیوں پرانے ایک بڑے قبرستان کا حصہ ہے جہاں زیادہ تر قبریں چولستان کے دامن میں گم ہو چکی ہیں تاہم نوابوں کے قبرستان کو باقاعدہ باڑ لگا کر علیحدہ کیا گیا ہے۔کئی کلومیٹر دور سے ہی یہ مزارات اپنی موجودگی اور شاندار فن تعمیر کا بھر پور احساس دلاتے ہیں۔یہ نواب خاندان کا نجی قبرستان ہے، چناں چہ یہاں کسی عام فرد کو دفن

کرنے کی اجازت نہیں اور نہ ہی کسی کو اس میں داخل ہونے کی اجازت ہے۔قبرستان کے باہر ایک خاندان نواب بہاول محمد خان ثانی کے دور سے اس مزار کی دیکھ بھال پر مامور ہے، اور یہ خدمت نو پشتوں سے اس کے سپرد ہے۔ اس وقت بھی اسی خاندان کے سربراہ کے پاس قبرستان کی چابیاں موجود ہیں۔نواب خاندان کے سربراہوں کی قبروں کا کمرہ اوراس کی ذمہ داری نسل درنسل منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔

شاہی قبرستان کے داخلی دروازے پر ایک بڑا لکڑی کا دروازہ لگا ہوا ہے جو صرف نواب خاندان کے افراد یا خاص مہمانوں کے لیے کھولا جاتا ہے۔قبرستان کے اندر مختلف اقسام کی قبریں موجود ہیں۔بعض قبروں کے گنبد سرائیکی اور سندھی روایتی فنِ تعمیر کا شاہکار ہیں، جن پر نیلے رنگ کی کندہ کاری کی گئی ہے، جب کہ بعض قبریں خالص سفید سنگ مرمر سے بنی ہوئی ہیں۔افضل خان کے مطابق سفید سنگ مرمر سے بنے مقبرے نوابوں کی غیر ملکی بیویوں کے ہیں۔ یہ سفید پتھر خاص طور پر فرانس سے منگوایا گیا تھا جب کہ دیگر مقبرے مقامی فنِ تعمیر کے مطابق نقش ونگار سے مزین ہیں اوران کا تعلق نواب خاندان کے افراد اوران کی اہلِ خانہ سے ہے۔ان مزارات کے دروازے بند رہتے ہیں اور صرف نواب خاندان اور ان کی خواتین مہمانوں کے لیے کھولے جاتے ہیں۔ایک بڑے مستطیل ہال میں بہاول پور ریاست کے ان سابق حکمران نوابوں کے مزارات موجود ہیں جنھوں نے ریاست پر حکمرانی کی۔ان میں آخری قبر نواب صادق محمد خان خامس کی ہے جو ریاست بہاول پور کے آخری نواب تھے۔انھوں نے 1955ء میں ریاست کا پاکستان سے الحاق کیا یوں بہاول پور کی الگ ریاستی حیثیت ختم ہوگئی۔اس ہال میں ایک چھوٹا سا مقبرہ نواب رحیم یار خان کا بھی ہے جن کے نام پر ضلع رحیم یار خان کا نام رکھا گیا۔ ہر قبر پر متعلقہ نواب کا نام اور مختصر تاریخ درج ہے۔تمام قبریں سفید سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں۔قبروں کے سروں پر چھوٹے اور بڑے ستون بنے ہوئے ہیں۔ ماہرین کے مطابق ستونوں کا سائز اس نواب کی حکمرانی کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔اس احاطے میں مزید قبروں کی جگہ اب بھی موجود ہے۔ان قبروں کو سفید چادروں سے ڈھانپا گیا ہے اور یہ حصہ بھی بند رہتا ہے۔اس قبرستان کی ایک منفرد قبر وکٹوریہ نامی نواب صادق محمد خان خامس کی غیر ملکی اہلیہ کی ہے۔

پنجاب ٹورازم ڈیپارٹمنٹ کی سینئر ٹور افسر مصباح اسحاق کے مطابق نواب کی بیوی انگریز تھیں جنھوں نے شادی سے قبل اسلام قبول کیا اور ان کا نام "غلام فاطمہ" رکھا گیا، مگر لوگ آج بھی انھیں "وکٹوریہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کے نام پر بہاول پور میں ایک اسپتال بھی قائم ہے۔ مصباح اسحاق کے مطابق وکٹوریہ نواب صادق محمد خان سے بے حد محبت کرتی تھیں اور انھوں نے وصیت کی تھی کہ وفات کے بعد انہیں نواب صاحب کے قدموں میں دفن کیا جائے۔ چناں چہ ان کی وفات کے بعد ان کا مقبرہ نواب صادق محمد خان کے قدموں میں بنایا گیا اور اس پر ایک چھوٹا سا مزار قائم کیا گیا۔ یہ مقبرہ ہال کے پیچھے، نواب صادق محمد خان کے قدموں کے سامنے موجود ہے۔ یہ نواب صاحب سے ایک غیر ملکی بیوی کی محبت کی انوکھی مثال ہے تاہم بعض مورخین وکٹوریہ بیگم کے نام سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کے مطابق یہ مقبرہ "لنڈا فلورنس" کا ہے جو نواب صادق محمد خان کی بیوی تھیں۔ وہ حیدر آباد دکن کے ایک برطانوی اسسٹنٹ انجینئر کی بیٹی تھیں۔ نواب صادق محمد خان نے انھیں 1927ء میں بمبئی میں دیکھا، پسند کیا اور شادی کر لی۔ بیگم لنڈا فلورنس نے شادی کے بعد چھ سال زندگی گزاری، اس دوران ان کے ہاں چار بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد انھیں اس شاہی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ شاہی قبرستان کے ایک صحن میں چند عام طرز کی قبریں بھی تعمیر کی گئی ہیں۔ یہاں کچھ ایسی پکی قبریں بھی موجود ہیں جن پر کوئی نام درج نہیں، صرف نمبر ز لکھے گئے ہیں۔ قبرستان کے خادمین کا کہنا ہے کہ انھیں علم نہیں کہ ان قبروں میں کون دفن ہے لیکن چوں کہ یہ قبرستان نواب خاندان کا ہے، اس لیے اندازہ یہی ہے کہ یہ قبریں بھی نواب خاندان سے تعلق رکھنے والوں کی ہیں۔ جب کہ شاہی قبرستان کی دیوار کے باہر ایک قدیم مزار بھی موجود ہے، جس کے بارے میں مقامی لوگوں کو کوئی خاص معلومات حاصل نہیں۔ لاہور سے شاہی قبرستان دیکھنے آئی خاتون نبیلہ کھوکھر اس قبرستان کو دیکھ کر حیران اور افسردہ ہو گئیں۔ انھوں نے کہا کہ چاہے کوئی نواب ہو یا عام انسان، سب کو ایک دن اس دنیا سے جانا ہے۔ نواب خاندان کی خواتین کی قبروں پر تبصرہ کرتے ہوئے نبیلہ نے کہا کہ صاف ظاہر ہے کہ نواب اپنے بیویوں کی عزت اور توقیر کرتے تھے اسی لیے ان کے لیے باقاعدہ مقبرے بنوائے جب کہ اپنے لیے عام قبریں بنوائیں۔ ایک اور سیاح خالد محمود کا کہنا تھا کہ یہ

شاہی قبرستان واقعی فن تعمیر کا شاہکار ہے۔آج ان کے شاندار مقبرے تو موجود ہیں مگر ان میں دفن تمام لوگ خاک کا حصہ بن چکے ہیں۔ یہ ہم سب کے لیے سبق ہے کہ ہمیں بھی ایک دن یہ دنیا چھوڑنی ہے اور ہماری شان و شوکت بھی یہیں ختم ہو جائے گی۔ ہمارے نیک اعمال ہی ہمیں بخشوائیں گے۔ نوابوں کی قبروں والے کمرے کے باہر ایک آیت نہایت واضح انداز میں درج ہے، جس کا مفہوم ہے: "ہر چیز فنا ہو جائے گی.

(نوٹ از مترجم: یہاں اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ اگر داؤد پوترے عباسیوں کا عرصہ حکمرانی کو صادق محمد خان اول سے شروع کیا جائے تو کل 12 نوابوں نے ریاست بہاول پور پر حکمرانی کی، دو نوابوں نے اصل ناموں جب کہ پانچ نے بہاول خاں اور دیگر پانچ نے صادق محمد خاں کے عرفی نام اختیار کئے۔امیر صادق محمد خاں اول ایک لڑائی میں 1747 میں فوت ہوئے تو شکار پور میں دفن ہوئے اور وہاں سٹیوارٹ گنج میں ان کا مقبرہ آج بھی موجود ہے۔ بہاول خاں اول اور مبارک خاں کی تدفین ملوک شاہ قبرستان میں نوابوں کے لیے مختص حصے میں کی گئی۔ایک مستند حوالے کے مطابق 37 سال حکمران رہنے والے امیر بہاول خاں دوم جنہوں نے اپنی ریاست کو باقاعدہ ریاست بہاول پور کا نام دیا 1809 فوت ہوئے تو دراوڑ کے شاہی قبرستان میں دفن ہونے والے وہ پہلے نواب تھے۔ان کے بعد آنے والے جن آٹھ نوابوں کو شاہی قبرستان میں دفن ہونا نصیب ہوا، ان کے باالترتیب نام یہ ہیں۔امیر صادق محمد خاں ثانی، امیر بہاول خاں سوم، امیر صادق محمد خاں سوم، امیر فتح خاں، امیر بہاول خاں چہارم، امیر صادق محمد خاں چہارم، امیر بہاول خاں پنجم، امیر صادق محمد خاں پنجم آخری حکمران نواب کا 24 مئی 1966 کو انتقال ہوا تو عباس خاں عباسی کو ایک صدارتی حکم کی رو سے وارث نواب کے طور پر مع وظیفہ نوٹی فائی کیا گیا۔14 مارچ 1988 کو ان کی وفات ہوئی تو ان کی تدفین شاہی قبرستان میں کی گئی۔ان کے بعد صلاح الدین عباسی کو وارث نواب قرار دیا گیا مگر وظیفے یا پریوی پرس اور خطابات والقابات تو بھٹو حکومت نے تمام نوابوں کے ختم کر دیے تھے۔کافی سال پہلے جب میں ایک وفد کے ساتھ یہ شاہی قبرستان دیکھنے گیا تو ہمیں دکھایا اور بتایا گیا کہ مرحوم نوابوں کے ہال میں ایک لائن میں تدفین کے لیے صرف ایک جگہ باقی ہے)

روہی کی داستان

تحریر: محمد حسن معراج

جنوری17 اور27فروری2014 Dawn.com

1853 کی 16 اپریل، ہندوستان کی تاریخ کا ایک یادگار دن ہے۔ یہ دن عام تعطیل کا دن تھا۔ سہ پہر ساڑھے تین بجے جب 21 توپوں کی سلامی گونجی، تو پہلا ریل انجن، جس میں بمبئی کے گورنر کی اہلیہ لیڈی فاک لینڈ اور 400 خصوصی مہمان سوار تھے، بمبئی سے تھانہ کی جانب روانہ ہوا۔ جس لمحے یہ انجن پٹری پر دوڑا، فاصلوں، رشتوں اور جذبات کے مفاہیم ہی بدل گئے۔ اباسین ایکسپریس، خیبر میل اور کلکتہ میل محض ٹرینوں کے نام نہیں رہے بلکہ دلوں اور روحوں کے سفر بن گئے۔ اب اگرچہ ہم ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جہاں ریل گاڑیاں جلی ہوئی یا بیکار کھڑی ہیں لیکن میرے ذہن میں ٹرین کے سفر سے جڑی کچھ خوشگوار یادیں اب بھی زندہ ہیں۔ یہ یادیں دراصل وہ مکالمے ہیں جو میں نے سفر کے دوران کھڑکی کے پاس بیٹھ کر یا دروازے پر کھڑے ہوکر، خود سے کیے۔ کلاؤڈ اور وائی فائی کے دور میں، امید ہے یہ سادہ سی باتیں آپ کو پسند آئیں گی۔

بہاول پور کے بعد ٹرین، سمہ سٹہ کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ یہ صدیوں پرانا ریلوے اسٹیشن بھی بیشتر اچھی چیزوں کی طرح، جولائی 2011ء سے بند پڑا ہے۔ اس خاموش جنکشن سے گزرتے ہوئے ریل اپنی مخصوص سیٹی بجاتی ہے جو روہی کے ویرانے میں گونجتی ہے اور اس کی بازگشت دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ نوابانِ بہاول پور نے احمد پور شرقیہ کے قریب ایک اور شہر، ڈیرا نواب صاحب آباد کر کے دوراندیشی کا ثبوت دیا۔ عباسی ذوقِ جمال کے حامل تھے جنھوں نے پنجاب کے اس حصے کو خوب صورت شہروں اور شاہانہ محلات سے آراستہ کیا۔ انہی محلات میں سے ایک صادق گڑھ پیلس بھی ہے۔ ریاستی دارالحکومت بہاول پور کی ہلچل سے دور یہ رہائش گاہ ایک مسجد اور ایک سینما سے مزین تھی۔

اسے شاہی ساز وسامان کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا اور یہ ایک کیمپ آفس کا کام بھی دیتی تھی۔ سو سال سے زیادہ پرانا یہ محل، ننانوے کمروں پر مشتمل ہے، یعنی سو سے ایک کم — گویا نوابوں نے کمال میں بھی ایک کمی کا سبق نور محل سے سیکھا تھا۔ یہ محل صرف شاہی خاندانوں کی رہائش گاہ نہ تھا بلکہ یہاں ایران کے شہنشاہ، وزرائے اعظم، وائسرائے اور فیلڈ مارشلز کی یادیں بھی محفوظ رہیں مگر 1947ء کا سال نوابی ریاستوں کے جاہ وجلال کو بہا لے گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ احمد پور شرقیہ نے ایک نیا رنگ اختیار کیا لیکن صادق گڑھ اپنے ماضی ہی میں ساکن رہا۔ جب ریاستی عظمت رخصت ہوئی تو نوابوں کے بڑے خاندان کی داستان بھی زبان زدِ عام ہونے لگی۔ وراثت کے جھگڑے اس تیزی سے بڑھے کہ ریاستی املاک پیچھے رہ گئیں۔ بالآخر ایک دن محل کے باسی بھی وہاں سے کوچ کر گئے۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ جو محل کل بہاول پور پر حاکم تھا آج خود عدالتی مقدمات میں مقید ہے۔ یہ وسیع وعریض عمارت اب ایک عظیم مگر ویران نشانی ہے۔ اس کی منہدم دیواریں اور اُجڑی ہوئی کیاریاں ایک افسوسناک منظر پیش کرتی ہیں۔ جھاڑ فانوس تو اب نہیں رہے لیکن ان کے خالی کنڈوں پر شاہانہ عظمت کی مہراب بھی واضح دکھائی دیتی ہے۔ وہ شطرنجی فرش جو کبھی چمکتا تھا، اب مدھم پڑ چکا ہے۔ کمروں میں کھڑکیاں ٹوٹ چکی ہیں، اور ہوائیں بے روک وٹوک آتی اور جاتی ہیں۔ بار بار اٹھنے والے گرد آلود طوفان اس شہر کو ڈھانپتے اور کھولتے رہتے ہیں جیسے یادیں ایک اور سوتی ہوئی شہزادی کی کہانی سناتی ہوں۔ یہ سوتا ہوا محل ایک جاگتے ہوئے شہر کے پہلو میں ہے جیسے لیاقت پور، فیروزہ اور خانپور کٹورہ جیسے قصبے ایک ساکت صحرا کی قربت میں سانس لیتے ہوں۔ ایک طرف ٹھنڈی ریت آنکھوں میں اترتی ہے تو دوسری طرف سبزہ دل کو راحت دیتا ہے۔ سرسوں کے کھیت صحرا کو چھوتے ہیں اور ٹبّے سبزہ زار کو چھو کر اسے صحرا میں بدل دیتے ہیں۔ ان کے بیچ ایک خاموش معاہدہ بہتا ہے — ایک چھوٹی سی نہر کی صورت میں، جو پرسکون انداز میں چلتی ہے۔ یہیں سے روہی کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ "روہی" کا اصل نام "چولستان" ہے جو ترکی زبان کے لفظ "چول" سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے: ریت۔ یہ ریت کا سمندر کچھ چمکتے جزائر پر مشتمل ہے، جنھیں مقامی زبان میں "ٹبّے" کہا جاتا ہے۔ ایک سیّاح کی تقدیر کی مانند یہ ٹبّے اپنی جگہ بدلتے رہتے ہیں لیکن اپنے مزاج میں کبھی تبدیلی نہیں لاتے۔ اگر

بارش ہو جائے تو زمین سخت ہو جاتی ہے اور سبز ہونے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں سفید پڑ جاتی ہے۔ خشک ہوتے پانی کے تالاب بھی کہیں کہیں دکھائی دے سکتے ہیں بشرطیکہ قریب ہی وہ زیرِ زمین پانی کے ٹینک نہ ہوں جو عرب شیوخ نے بنوائے تھے۔ اس طلسماتی تبدیلی کو ایک اور پراَسرار نام دیا گیا ہے — ''ڈاہر''۔ چولستان کے خانہ بدوشوں کی اجنبی اور عجیب زندگی کا تجربہ دراصل ایک بے لگام جذبے سے جڑی آوارہ روی کا حصار ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو سواری کے کسی بندھن میں نہیں بندھتا بلکہ خود ہی راستہ طے کرتا ہے۔ جب کوئی اجنبی اس دنیا میں داخل ہوتا ہے تو ایک پراسرار سی خاموشی اسے گھیر لیتی ہے لیکن ریت کے ذرات مسلسل مقامی باشندوں کے کانوں میں بقا کے بھید سرگوشی کرتے رہتے ہیں، انھیں صبر کا درس دیتے ہوئے کہ بارش کا انتظار ابھی باقی ہے۔ اے سی کوچ کی کھڑکی سے لے کر "ڈاہر" کی جادوئی دنیا تک، یہ سب کچھ جیسے کسی طلسماتی اوپیرا کی طرح ہے سنسنی، سرشاری اور وحشی پن کا حسین امتزاج۔ مرکزی سڑک سے نکلتے ہوئے راستے ایک عجیب منظر بکھیرتے ہیں۔ طویل قیام کی تھکن سے بوجھل مقامی لوگ اپنے مویشیوں کو قطار میں لیے، انھیں صحرا کی سمت ہانک دیتے ہیں۔ یہ مویشی نہ صرف بغیر چرواہے کے چرتے ہیں بلکہ ایک خاص حد تک پہنچ کر خود بخود واپس بھی لوٹ آتے ہیں، بنا کسی اشارے یا روک ٹوک کے۔ کون جانے، ان کے ہاتھوں میں کون سی وہ نادیدہ رسی ہے جسے وہ تھامے رکھتے ہیں؟ نہ وہ بھٹکتے ہیں نہ ہی گم ہوتے ہیں۔ گویا وہ نماز کی جماعت کی طرح کسی الہامی ترتیب میں چرتے ہیں، بدن پر صرف اپنے مالک کی نشانی لیے۔ عام چرواہے، عام مالک اور زمیندار جواب کب کے انا یا کمتری کے احساس کو چھوڑ چکے ہیں، چراگاہوں کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ انھی جگہوں پر وہ میٹھے پانی کے کنویں کھودتے ہیں۔ ایسے ہی ایک چرواہے اشرف ہیں جنھوں نے 58 خشک مون سون دیکھے اور جن کے پاس کبھی تین ہزار مویشی ہوا کرتے تھے۔ انھیں عشاء کی نماز کی رکعتیں تو یاد نہ تھیں لیکن ہر راہگیر کو روک کر پانی ضرور پیش کرتے تھے۔

ان کے دادا کو زیرِ زمین میٹھے پانی کے مقام کا اندازہ لگانے کا فن آتا تھا، کچھ دھاتوں کے علم کی بدولت اور کچھ سادہ فہمی سے۔ ان کے وجدان پر اعتماد کرتے ہوئے چھ افراد پر مشتمل ایک جماعت چھ دن تک ایک کنواں کھودتی رہی۔ ان میں سب سے تجربہ کار زمین کھودتا، سب سے ماہر چونا

لگا تا اور باقی چار مٹی اکٹھا کر کے قریب میں برابر پھیلا دیتے۔ ہر دس ہاتھ گہرائی پر وہ سوراخ کو آدھے ہاتھ تک پھیلا دیتے اور جب پانی کو چھوتے تو وہی سوراخ رفتہ رفتہ کنویں کی شکل اختیار کر لیتا۔ اشرف کو یاد نہیں کہ چونے کو سیمنٹ کی طرح اثر انگیز بنانے کے لیے وہ کیا طریقہ اپناتے تھے۔

جب بارش چولستان کو چھوڑ دیتی ہے تو ڈاہر پیاسے ہونٹوں کی مانند خشک ہو جاتے ہیں۔ ٹبّے بانجھ پن کی علامت بن جاتے ہیں اور ہر سانس کے ساتھ صحرائی وسعت دل میں اترتی ہے۔ سارا صحرا عرفات کے میدان کی یاد دلاتا ہے جہاں ایک پُر ہیبت خاموشی چھائی ہو اور جیسے قیامت کے دن کی سی سکونت ہو۔ جہاں تہاں بکھری ان جانوروں کی ہڈیاں جو پانی کی تلاش میں مر گئے اور کبھی کبھار اگ آنے والی جھاڑیاں اس دُعا کی مانند لگتی ہیں جو آسمان کی جانب بلند ہوئی مگر واپس لوٹا دی گئی۔ جوں جوں شام اترتی ہے، دور کہیں چھوٹے قافلوں کے سائے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ان کے قافلے ریت کے ٹبّوں میں اترتے اور نکلتے ہیں جیسے سسی اور سہتی کی وہ بد دعا دہرا رہے ہوں جو انھوں نے کسی اونٹوں کے بیوپاری کو دی تھی۔ صحرا کی مقدس خامشی اور اس کی متبرک ہوائیں جن حساس روحوں کو چھوتی ہیں وہیں ایک الہامی کیفیت جنم لیتی ہے مگر اس ویران صحرا کو صرف نغموں کے سہارے شہروں کی چہل پہل میں ڈھال دینا۔ یہ فقط ریشماں کا ہی کمال تھا۔

جب ہماری جیپ فرید کی روہی کے ٹبوں میں گم ہوگئی، سورج بھی زمین کے دامن میں چھپتا چلا گیا۔ صبح سویرے سولہ کھوئی سے شروع ہونے والا یہ سفر گِنگلاں والے ٹوبے پر ایک مختصر توقف کے بعد، آخر کار کوری والا ڈاہر پر آ کر ختم ہوا۔ میری طرح، صحرائی چڑیوں کا ایک جوڑا بھی اس ڈاہر کے اکلوتے درخت پر رات گزارنے آ پہنچا۔ ریگستان کی زندگی اپنے اصول خود بناتی ہے اور ان میں ڈھل جانا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہاں کے باسیوں کے دل کی وسعت اور ان کی سادہ پسندی کی تمنا اب تک ہمارے شہری تمدن کے تصنع سے محفوظ ہے۔ اونٹ کے نمکین گوشت اور کھاری پانی پر پلنے والے سخت جان چرواہے اور شوخ رنگ لباس پہنے سانولی عورتیں اپنی مقامی بولی میں ایسی دھن کے ساتھ بات کرتی ہیں جسے صرف یہی صحرا سمجھتا ہے۔ صدیوں پہلے، جب انسانی خواہشات کی فہرست دھوپ تلے اور زمین پر جینے سے آگے بڑھ کر غاروں اور عمارتوں تک پہنچی، تب ان خانہ بدوشوں کو "گھر" کے

تصور نے مسحور کیا۔مگر مسئلہ گھر کی چار دیواری کا نہیں، بلکہ ان آوارہ گردوں کی فطری بیقراری کا تھا۔وہ اپنی زمین سے محبت کرتے تھے مگر کبھی اس سے وابستہ ہونا نہیں چاہتے تھے۔زمین انھیں چھوڑنے نہیں دیتی تھی اور وہ زمین پر کوئی مستقل ٹھکانہ بنانا نہیں چاہتے تھے چناں چہ ایک عارضی گھر وجود میں آیا۔ جھاڑیوں کو گول دائرے میں لگا کر دیواریں بنائی گئیں اور گھاس پھونس کو بُن کر چادر کی صورت چھت بنائی گئی جو ایک ستون پر ٹکی ہوتی تھی۔ یہ ایک کمرے کا گھر " گوپا" کہلاتا ہے اور اپنی محدود ساخت کے باوجود یہ اپنی جگہ ایک مکمل دنیا ہے۔اندر کی اشیاء جیسے دیواروں سے لٹکے کپڑے، کونوں میں ترتیب سے رکھی راشن کی پوٹلیاں اور زمین میں نیم دفن مٹی کے پانی والے گھڑے، سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کوئی ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے۔لیکن فضا میں تنہائی کی ایک اداس خوشبو باقی رہتی ہے۔ایسے جھونپڑوں کے یہ جھرمٹ، ان راہیوں کی فطرت کے عین مطابق ہیں۔

چولستان کے زیادہ تر آبی ذخائر پہلی بارش سے بھر جاتے ہیں۔یہی ابتدائی مون سون، مقامی لوگوں کو کئی ہفتے سہارا دیتے ہیں یہاں تک کہ پانی ختم ہو جائے۔پھر باسی ان گوپوں کو پیچھے چھوڑ کر کسی اور ذخیرے کی جانب کوچ کرتے ہیں اور ان یادوں بھرے خیموں کو تشنہ آنکھوں سے پیچھے رہ جانے دیتے ہیں لیکن پانی کی کمی کے باوجود وہ کبھی یہ نہیں بھولتے کہ ایک پانی سے بھرا گھڑا دفن کر جائیں شاید کسی پیاسے مسافر کے لیے، جو راہ بھٹک جائے۔دھوپ میں مسلسل سفر سے تھکے ہوئے قافلے جب کہیں ایک گوپا کی جھلک دیکھتے ہیں تو وہ کسی معجزے سے کم نہیں لگتی اور جو چیز انسانی فطرت کی معراج ہے وہ یہ ہے کہ ان پیاسے قافلوں کے لب سوکھے ہوتے ہیں، جسم نڈھال مگر پھر بھی وہ ایثار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔وہ جھونپڑی میں داخل ہوتے ہیں، پانی کا گھڑا دیکھتے ہیں اور اسے پیے بغیر، کسی اور کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔یہی وہ راز ہے جو ان گوپوں کو ہمیشہ پانی سے لبریز رکھتا ہے۔انہی ریت کے ٹبوں کے بیچ، نواں کوٹ کا نخلستان واقع ہے چار صحرائی شاہراہوں کے سنگم پر۔ایک راستہ بجنوٹ کی طرف جاتا ہے، دوسرا شہر کی سمت، اور باقی دو مقامی ٹبوں اور ڈاہروں کے گرد چکر لگاتے ہیں نواں کوٹ کے ایک جانب صدیوں پرانا مغلیہ قلعہ واقع ہے۔دریا کے کنارے قائم یہ قلعہ اُن قلعوں کی کڑی تھا جو خان گڑھ، اسلام گڑھ اور خیر گڑھ میں بنائے گئے تھے۔وقت کے ساتھ ساتھ اس

قلعے کی محرابیں، فصیلوں پر سجے ہاتھی دروازے، سرنگیں اور مغلیہ شان وشوکت زمیں بوس ہوگئیں مگر اس کی حد بندیاں، مینار اور کہانیاں آج بھی باقی ہیں جو ماضی کی داستان سناتی ہیں۔ دوسری جانب وہ مسجد کھڑی ہے جس کی دیکھ بھال اُن شکاریوں کے ذمے ہے جو تلور کا شکار کرتے ہیں۔ ریت کے ان شاہراہوں کے سنگم پر ایک تالاب کے گرد واقع یہ نخلستان — نواں کوٹ — زمان ومکان کی ظاہری حدود سے ماورا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ قلعے اور مسجد کے درمیان موجود یہی پانی کا تالاب، روہی کے مویشیوں، رینجرز کے سپاہیوں، مقامی باشندوں اور اُن پودوں کی پیاس بجھاتا ہے جو چولستان کی اس طلسماتی دنیا کا حسن تشکیل دیتے ہیں۔ یہ تالاب سب کے لیے آبِ حیات ہے۔ یہ مقام دیگر صحرائی علاقوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ متحرک ہے اور اس کی ایک بڑی وجہ پانی کی مستقل موجودگی ہے لیکن اصل حسن درختوں کی بے مثال تراش خراش میں ہے۔ پودے اس قدر درستگی سے تراشے گئے ہیں کہ گویا کوئی پیمائش کا آلہ استعمال کیا گیا ہو۔ ابتدا میں یہ راز پوشیدہ رہتا ہے یہاں تک کہ مقامی لوگ وضاحت کرتے ہیں کہ یہ تراش خراش دراصل ان جانوروں کا کمال ہے جو درختوں سے گرتے پتے کھا کر شاخوں کو ایک سطح پر لے آتے ہیں۔ اس صحرائی چوک نما شہر نواں کوٹ میں، جہاں رینجرز اور خانہ بدوش مسلسل آمدورفت میں رہتے ہیں، حق نواز سب سے مستقل باشندہ ہیں۔ ہر صبح، ابوظہبی کے پیلس آفس کی ایک گاڑی انھیں قریبی شہر سے نواں کوٹ کی مسجد لے آتی ہے۔ دن بھر کے پانچ روحانی پڑاؤ مکمل کرنے کے بعد وہ شام کو واپس لوٹتے ہیں۔ آٹھ ہزار ایک سو ساٹھ روپے کی قلیل تنخواہ کے ساتھ وہ نواں کوٹ کی واحد کریانہ دکان بھی چلاتے ہیں۔ وضو میں بے پناہ احتیاط کے باوجود، حق نواز مذہبی سختی سے کوسوں دور ہیں۔ ان کی گفتگو میں انانیت نہیں نہ ہی بیس سال سے صحرا میں دین کی خدمت کا کوئی دعویٰ۔ ان کی آنکھیں جو گاندھی طرز کے چشمے سے جھانکتی ہیں، ایک ایسے ایمان کی داستان سناتی ہیں جو کسی ندامت کے بعد پیدا ہوا ہو۔ اگرچہ دکان کی نقدی ہو یا مسجد کے نمازی، دونوں میں کمی ہے مگر حق نواز ثابت قدم ہیں۔ ان کا رب سے نادیدہ تعلق کسی ماں اور بچھڑے کے درمیان نادیدہ بندھن کی مانند ہے۔ وہ ہر روز آکر دکان کھولتے ہیں، مسجد کا دروازہ کھولتے ہیں، چاہے گاہک آئیں یا نہ آئیں، نمازی ہوں یا نہ ہوں۔

محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ حکومتِ ریاستِ بہاول پور کے سرکاری انگریزی رسالے ''بہاول پور ریویو'' کے 1953 اور 1954 کے دستیاب 9 شماروں میں 1950 کی دہائی کے نصف اول کا ترقی یافتہ بہاول پور بکھرا پڑا ہے۔ ان شماروں سے مترجم نے 22 مختلف موضوعات کی تحریروں کی ''قوس قزح'' منتخب کی ہے۔

فہرست شمارہ جات بہاول پور ریویو

1- شمارہ -1، جلد-1، اگست 1953

2۔ شمارہ-2 ، جلد-1، ستمبر 1953

3۔ شمارہ -3، جلد-1، اکتوبر 1953

4 - شمارہ-5-4، جلد-1، نومبر، دسمبر 1953

5- شمارہ۔6، جلد-1 ، جنوری 1954

6۔ شمارہ- 8-7، جلد-1، فروری، مارچ 1954

7۔ شمارہ-1، جلد-2، اپریل 1954

8۔ شمارہ-3-2، جلد-2، مئی، جون 1954

9۔ شمارہ-5-4، جلد-2، جولائی، اگست 1954

(1) پاکستان کا روحانی سفر

تحریر: یارک کرامپٹن (شاعر اور بی بی سی سے وابستہ براڈ کاسٹر)

مطبوعہ: بہاول پور ریویو شمارہ 2و3 جلد، 2 مئی۔جون 1954

یہ ایک سچی الف لیلوی قسم کی سی داستان ہے جو ایک کار کے ذریعے انگلستان سے پاکستان تک کے ایک مشن پر مبنی ہے۔ یہ سفر گذشتہ برس اقبال ڈے کے موقع پر لندن سے شروع ہوا۔ بچپن ہی سے مجھے مشرق، اس کے لوگوں، رسم و رواج اور خاص طور پر اس کی مذہبی وفلسفیانہ تعلیمات سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ لندن میں اس شوق کا سب کو علم ہے اسی لیے مجھے اکثر مشاعروں اور ان دیگر تقاریب میں مدعو کیا جاتا ہے جو مشرقی شاعری یا مذہب خصوصاً اسلام سے متعلق ہوتی ہیں۔

گذشتہ اپریل میں مجھے لندن کے اسلامی کلچرل سینٹر میں اقبال کے یومِ ولادت کی تقریب کے دوران (انگریزی میں) اقبال کے کچھ اشعار پڑھنے کی دعوت دی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی کچھ نظمیں پیش کرنے کا موقع بھی دیا گیا۔ اُن دنوں میں بی بی سی سے وابستہ تھا مگر اجازت لے کر اس تقریب میں شرکت کی۔ وہاں میں نے کئی دیگر مقررین کے ساتھ ایک بڑے اور معزز سامعین کے گروہ سے خطاب کیا۔ میری نظم ''The Voice of Islam'' جسے میں نے اسی جوش و جذبے سے پڑھا جس سے یہ لکھی گئی تھی، نے غیر متوقع طور پر خاصا جوش وخروش پیدا کیا۔ اپنی جنگی خدمات کے دوران جب میں انڈین آرمی سے وابستہ تھا تو مجھے کئی مسلمان ملکوں کو قریب سے جاننے کا موقع ملا جنھیں میں ہمیشہ سے دیکھنے کا متمنی رہا تھا مگر ان تمام تجربات میں سب سے زیادہ روحانی تاثر مجھے اُس وقت ملا جب میں نے اذان کی آواز کو کسی صحرائی وسعت یا چھتوں پر گونجتے ہوئے سنا۔ یہی احساس میری اس نظم کا محرک بنا۔ جب میں اسٹیج سے نیچے اترا تو ایک لمبے، دبنگ

پاکستانی نے جس کی داڑھی چھوٹی تھی اور سر پر جناح کیپ تھی مجھے مخاطب کیا۔ اس نے میرا پتہ لیا اور چائے پر مدعو کیا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ یہ بریگیڈیئر نذیر علی شاہ ہیں جو امیرِ بہاول پور کے سابق ملٹری سیکریٹری رہ چکے ہیں۔ ہم دونوں کے خیالات مشرق ومغرب کے درمیان بہتر باہمی تفہیم کے امکانات پر یکساں تھے۔ جب ان کے ایک دوست جو کار کے ذریعے پاکستان واپسی کا سوچ رہے تھے، نے ہمیں ساتھ چلنے کی دعوت دی تو ہم نے اس سفر کو ایک ثقافتی مشن بنانے کا فیصلہ کیا تاکہ انسانیت کی خدمت ہوسکے۔

اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ یہ سفر میرے لیے ایک روحانی زیارت کا موقع بنے گا۔ برصغیر کے مقدس مقامات دیکھنے اوران لوگوں سے سیکھنے کا جنھوں نے ان تعلیمات کے مطابق اپنی عملی زندگیوں کو ڈھالا"۔ بدقسمتی سے بریگیڈیئر کے وہ دوست بیمار ہو گئے اور ان کی کار دستیاب نہ رہی۔ حالات کے بدلاؤ کے بعد ہم ایک نوجوان پاکستانی سے ملے جس نے ''لندن ٹائمز'' میں اشتہار دیا تھا کہ وہ وطن واپسی کے لیے دو ہمسفر تلاش کر رہا ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ جانے کا بندوبست کرلیا۔ سب سے پہلے ہمیں اپنے خیالات کو مرتب کر کے تحریری صورت دینی تھی۔ بریگیڈیئر شاہ کی تجویز پر میں نے ایک فولڈر تیار کیا جس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ہم تمام بڑے مذاہب کی مشترکہ اساس، ایک عالمی زبان کی ضرورت، مشرق ومغرب کے درمیان ثقافتی تبادلے کی ہمدردانہ صورت اور تجارتی وسرحدی رکاوٹوں کو ختم کرنے کی اہمیت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس مشن کے لیے بریگیڈیئر شاہ نے " آفاقیت" کا تصور دیا جو عربی میں "یونیورسل" کے معنی رکھتا ہے اور یوں اس سفر کو ''عالمی ثقافتی مشن'' کا نام دیا گیا۔ میں نے یہ فولڈر ہاتھ سے لکھا اور تصویری شکل میں کئی نسخے تیار کروا کر دنیا بھر میں بھیجے۔ اپنے فارغ وقت میں، میں نے دنیا بھر کی معروف شخصیات سے نیک خواہشات کے خطوط حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کیا تاکہ یہ پیغام دیا جا سکے کہ دنیا کے دانشور اور نامور افراد بنیادی اصولوں پر یکساں خیالات رکھتے ہیں۔ اس ردعمل نے مجھے حیران کر دیا۔ میں نے جن معروف شخصیات کو ذاتی طور پر جانتا تھا ان سے آغاز کیا اور جلد ہی دنیا بھر سے خطوط آنا شروع ہو گئے جن میں آغا خان، صدر نقیب، ڈیوڈ بن گوریان، ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن، آرڈر آف میرٹ اور نوبیل انعام

یافتہ افراد، سائنس دان، شاعر، مصور، طبیب اور کھلاڑی شامل تھے۔ کینٹر بری کے آرچ بشپ نے بھی ایک متاثر کن خط میں اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ ان پیغامات میں سب سے پر اثر خط مشہور فیلڈ مارشل ارل ویول کے نوجوان بیٹے کا تھا۔ وہ ادب میں دلچسپی رکھتا تھا اور میرے خط کے جواب میں افریقہ روانگی سے قبل فوجی تربیت کے دوران، اس نے اپنے ہاتھ سے چار صفحات پر مشتمل خط لکھا۔ کرسمس کے دن جب میں بریگیڈیئر شاہ کے ساتھ ان کے فلیٹ میں موجود تھا، ریڈیو سے خبر ملی کہ ارل ویول کا بیٹا ایک دن قبل ماؤ بغاوت میں شہید ہو گیا ہے۔ یہ نادر خطوط ابتدا میں ہی ساتھ لے جانے کا ارادہ تھا مگر پھر ان کی تاریخی اہمیت کے باعث ہم نے اصل دستاویزات کو محفوظ مقام پر رکھ کر ان کی نقل ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔

7 جنوری 1954 کی سرد اور برفانی صبح، تین بجے ہم چار افراد اس مہم پر روانہ ہوئے۔ ہماری کار چار سلنڈرز اور سولہ ہارس پاور کی تھی۔ مسافروں میں بریگیڈیئر شاہ، ان کی انگریز اہلیہ آڈری، کار کے مالک پاکستانی انجینئر سمیع اللہ خان اور میں (جسے لوگ اکثر شاعر و نشریاتی کارکن کہتے ہیں) شامل تھے۔ ہم حالات کے باعث سال کے بدترین وقت میں روانہ ہوئے اور ہمیں اس وقت علم نہ تھا کہ ہم جنوبی یورپ کی پچھلی ایک چوتھائی صدی کی بدترین سردیوں کا سامنا کرنے جا رہے ہیں۔ برفانی طوفانوں اور برفیلے راستوں سے گزرتے ہم انگلستان سے یونان تک پہنچے۔ بعض مقامات پر درجہ حرارت منفی 62 ڈگری فارن ہائٹ تک جا پہنچا۔ یہ حالات بہاول پور کے گرم ماحول کے عادی بریگیڈیئر شاہ کے لیے نہایت سخت تھے۔ وہ ایک نفیس سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھے جس کے نیچے کئی تہہ دار کپڑے تھے اور سر پر جناح کیپ کے اوپر خاکستری اسکارف لپیٹے ہوئے تھے۔ گردن پر نیلی کمبل نما چادر اور آستینوں پر سرخ بارڈر والا گاؤن پہنے، برف پر ان کا چہل قدمی کرنا کسی اور دنیا کے انسان کی جھلک دیتا تھا۔ چوں کہ ہمارے سفری چیکوں کی رقم محدود تھی، ہمیں ہر ممکن طریقے سے کفایت شعاری برتنی پڑی۔ ہم روزانہ صرف ایک بار کھانے پر اکتفا کرتے اور نہایت سستے اور اکثر غیر صحت بخش ہوٹلوں سے گریز کرتے۔ کئی مواقع پر تو ہم ہوٹل کا کرایہ بھی ادا نہیں کر سکتے تھے۔ فرانس کے شہر شالون (Chalon) میں ہم ایک برفیلے اصطبل میں سوئے۔ بلغراد اور دیگر مقامات پر ہم میں

سے دو سخت جان افراد نے برف میں گھری گاڑی ہی میں شب بسری کی۔ یوگوسلاویہ کے شہر پاراسین (Paracin) میں ہم ایک وائن سیلر کے ساتھ ملحقہ کمرے میں سوئے جو قریبی دریا سے نکالے گئے برف کے بلاکوں سے بھرا ہوا تھا۔ الپس کی پہاڑیوں پر ہم کئی بار موت کے دہانے تک پہنچے۔ ہمارا مرکزی ڈرائیور سمیع اس سے پہلے کبھی برف سے جمی سڑکوں پر نہیں چلا تھا لہٰذا اس نے وہیں گاڑی پھسلنے اور سینکڑوں فٹ گہری کھائیوں کے کنارے کنارے چلانے کا فن سیکھا۔ ان خطرات سے بچ نکلنے کے بعد ہمیں پہلا سنگین حادثہ اس وقت پیش آیا جب ہم اٹلی میں ٹورین اور میلان کے درمیان شاہراہ پر سفر کر رہے تھے۔ کار برف سے جمی سڑک پر پھسل گئی اور برف میں الٹ کر دس فٹ نیچے اپنے پہلو پر جا گری۔ ہم سے تھوڑے فاصلے پر پچیس فٹ گہری کھائی تھی جس پر سڑک گزرتی تھی۔ بریگیڈیئر شاہ کو صدمے اور چوٹوں کے باعث اسپتال لے جانا پڑا۔ کار کا ایک پہیہ مڑ چکا تھا، مڈگارڈ بگڑ چکا تھا اور گیئر کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ گاڑی اب پہلے جیسی نہ رہی۔ وہ دن بہ دن کمزور ہوتی گئی۔ آخر کار، مقدونیہ کے پہاڑوں پر جب ہم اسے دھکیلتے دھکیلتے تھک گئے تو ہمیں احساس ہوا کہ اب گاڑی ہمیں نہیں بلکہ ہم اسے اٹھائے جا رہے ہیں۔ ہم نے بالآخر اسے یونان کے شہر سالونیکا میں چھوڑ دیا۔ کراچی بھجوائے جانے کے انتظار میں وہ اب تک یہیں موجود ہے۔

پورے یورپ میں ہمارا بیشتر وقت محض زندہ رہنے کی جدوجہد میں صرف ہوا اس لیے ہم باقاعدہ لیکچر تو نہیں دے سکے مگر جہاں بھی ممکن ہوا ہم نے چھوٹے چھوٹے اجتماعات سے گفتگو کی، مختلف زبانوں میں اپنے خیالات پیش کیے اور منتخب افراد کو اپنے "اعلامیے" کی نقول دیں۔ ہماری شکل وصورت اتنی غیر معمولی تھی کہ اکثر دیہات کے لوگ ہمیں دیکھنے کے لیے خود ہی جمع ہو جاتے۔ جب ہم گاڑی کے بوجھ سے آزاد ہو گئے تو ہمیں لیکچر دینے کی زیادہ آزادی ملی۔ مثلاً بغداد میں، امام الخالصی (شیعہ مکتبِ فکر کے سربراہ) کی صدارت میں، میں اور بریگیڈیئر شاہ نے پاکستان ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام ایک پُر جوش سامعین سے خطاب کیا۔ بصرہ سے کراچی تک ہم نے کشتی کے ذریعے سفر کیا۔ میں، بریگیڈیئر شاہ، اور سمیع تینوں عام مزدوروں کی طرح عرشے پر سوئے۔ ہماری مہم کا یہ انچاسواں دن تھا۔ اس دوران ہم نو ملکوں انگلستان، فرانس، اٹلی، یوگوسلاویہ، یونان، ترکی، شام،

عراق اور پاکستان۔ہم نے ان تمام ملکوں کی کرنسی استعمال کی اور سولہ بار کسٹمز سے گزرے۔

کراچی میں ہم نے بڑے اجتماعات سے خطاب کیا اور نجی دعوتوں میں زیادہ گہرائی سے گفتگو کی۔ میری نظم "The Voice of Islam" جس نے بریگیڈیئر شاہ پر گہرا اثر ڈال کر اس سفر کو جنم دیا تھا اب میری حیرت انگیز خوشی کے ساتھ ایک ایسی نظم بن چکی تھی جسے مشرق کے متعلق کسی انگریز کی لکھی ہوئی سب سے مؤثر نظم قرار دیا جا رہا تھا۔ انگلستان سے روانگی سے قبل، اس نظم کو بی بی سی کی پاکستانی سروس نے ریکارڈ کیا اور نشر کیا۔ اسے مسلم اسکولوں میں تدریس کے لیے نجی طور پر بھی ریکارڈ کیا گیا۔ عراق میں یہ نظم انگریزی اور عربی ترجمے کے ساتھ اخبارات میں شائع ہوئی۔ کراچی میں جب میں نے ایک مشاعرے میں یہ نظم پڑھی تو اسے ایک بیرونی نشریہ کے طور پر ریکارڈ کیا گیا۔ راغب نے اس کا بہترین اردو ترجمہ کیا اور یہ دونوں ورژن کراچی کے اخبارات میں شائع ہوئے۔ کراچی سے روانگی سے قبل میں نے اس سفر پر پندرہ منٹ کا ایک نشریاتی خطاب کیا۔ اس کے بعد ہم بہاول پور کی طرف روانہ ہوئے۔ ہمارا ارادہ لاہور، پشاور اور دیگر اہم مقامات پر لیکچرز کا تھا لیکن انگلینڈ سے ایسی اطلاع موصول ہوئی جس نے میری فوری واپسی کو لازمی بنا دیا۔ چناں چہ اب میں طیارے سے روانہ ہو رہا ہوں۔ رہا سوال مستقبل کا — تو اکثر پوچھا جاتا ہے کہ کیا ہم اس زمینی سفر کو ایک مستقل تنظیم میں بدلنے جا رہے ہیں؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ہم خوش ہیں کہ ہم نے اس سفر اور پاکستان میں کچھ بیج بوئے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ان میں سے کچھ بیج زرخیز زمین پر گرے ہوں گے۔ اگر نہیں بھی گرے، تو یہ ہماری کوشش میں کمی کی وجہ سے ہرگز نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں پورے خلوص سے کہتا ہوں کہ میں نے آج تک کسی ملک کو چھوڑتے ہوئے اتنا افسوس محسوس نہیں کیا جتنا پاکستان کو چھوڑتے ہوئے ہو رہا ہے۔ انگلینڈ میں ایک نہایت اہم ذاتی معاملہ میری فوری واپسی کا سبب بن رہا ہے ورنہ جس سرزمین پر مجھے اتنے مخلص دوست ملے ہوں اور جہاں مجھے اپنے وطن جیسا سکون میسر آیا ہو، اسے چھوڑنا آسان نہیں۔ میرے یہ دوست جان کر خوش ہوں گے کہ میں جلد از جلد واپس آنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

(2) بہاول پور

تحریر۔اے۔بی راجپوت
ریسرچ آفیسر، وزارت اطلاعات ونشریات حکومت پاکستان

مطبوعہ: بہاول پور ریویو شمارہ 1 جلد 1 اگست 1953

جب آپ کی ٹرین بہاول پور کے قریب پہنچتی ہے گول اور ابھرے ہوئے گنبد اور سرخ ترکی ٹوپیاں آپ کا استقبال کرتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن، سرکاری دفاتر، عوامی ادارے، کالج، اسکول، اسپتال، مساجد، بازار اور یہاں تک کہ اکثر نجی مکانات بھی تقریباً ہمیشہ سفید یا کریمی گنبدوں سے مزین ہیں جو خوب صورت محرابوں پر قائم ہیں اور یہ سب مل ایک دلکش منظر تخلیق کرتے ہیں اور آنے والے مہمان پر "الف لیلہ" کی داستانوں جیسا ماحول طاری کر دیتے ہیں۔

بہاول پور کراچی کی بندرگاہ سے تقریباً 500 میل اندر مغربی پاکستان میں کراچی-لاہور کی مین ریلوے لائن پر واقع ہے جو پاکستان کی سب سے نمایاں ریاست بہاول پور کا دارالحکومت ہے جس کا رقبہ ہالینڈ کے برابر ہے۔ اسے آج سے تقریباً دوسو سال قبل 1748ء میں نواب بہاول خان (موجودہ امیر کے جدامجد) نے بسایا۔ بہاول پور شاید اس سرزمین کا وہ واحد شہر ہے جو مشرقی بازار کی خالص اور قرونِ وسطیٰ کی روایات کی بھر پور تصویر پیش کرتا ہے۔

بغداد الجدید یا "نیا بغداد"، جیسا کہ آج کل بہاول پور کو عام طور پر کہا جاتا ہے، اپنے ثقافتی ورثے میں قدیم بغداد کا ہم پلہ نظر آتا ہے اور یہ سب کچھ حیران کن نہیں کیوں کہ اس ریاست کے حکمران خاندان کا شجرہ نسب براہ راست عظیم عباسی خلفاء سے جا ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر میں ہر طرف آپ کو الف لیلہ کا ماحول محسوس ہوتا ہے: مینار، محرابیں اور گنبد جو کہ گرمیوں کے مکانات، بارہ دریوں اور باغوں کے گرد پھیلے ہوئے ہیں، یہ ایک ایسی سرزمین ہے جو کھلے میدانوں، ریت کے

ٹیلوں، کھجور کے درختوں اور سرسبز کھیتوں سے آراستہ ہے۔ اسی مشرقی فضا میں لگ بھگ 41,000 افراد آباد ہیں جو قدیم صنعتوں سے وابستہ ہیں جن کی وجہ سے بہاول پور ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔

جب ہم شہر کی پرسکون کشادہ سڑک سے مڑ کر اس کے فصیل بند حصے میں داخل ہوتے ہیں تو محرابی دروازوں میں سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک رنگا رنگ بازار نظر آتا ہے جو روشنیوں سے جگمگا رہا ہوتا ہے۔ اس مرکزی بازار سے تنگ گلیاں نکلتی ہیں جو داستانوں کی گلیوں کی طرح پیچ و تاب کھاتی ہوئی چلتی ہیں۔ آہنی جھروکوں کے نیچے سے اونٹوں کے قافلے نمودار ہوتے ہیں اور مصروف بازاروں سے گزرتے ہیں۔ خریدار لمبے ڈھیلے لباس، چوڑی شلواریں اور سر پر تر کی ٹوپیاں پہنے، ہر سمت دکھائی دیتے ہیں۔ یہی شہریوں کا عمومی لباس ہے جب کہ دیہی علاقوں میں مرد عموماً پگڑیاں باندھے ہوتے ہیں اور خواتین رنگ برنگے ریشمی یا سوتی لباس پہنتی ہیں چاہے وہ دیہات کی ہوں یا شہر کی۔ وہ تمام خوشبوئیں اور مہکیں جو کسی مشرقی بازار کا خاصہ ہوتی ہیں، یہاں ہر جگہ محسوس کی جا سکتی ہیں۔

یہ شہر ریاست بہاول پور کا مرکز ہونے کے ناطے تمام سرگرمیوں کا محور ہے۔ یہ اناج، مویشی اور دیگر اشیاء کی خرید و فروخت کا بھی بڑا مرکز ہے اور ساتھ ہی یہ غیر ملکی سامان کی ریاست میں درآمد اور مقامی مصنوعات جیسے کپاس، گیہوں، تیل والے بیج اور اعلیٰ فن پاروں کی برآمد کا بھی اہم گڑھ ہے۔ ریاست بہاول پور پاکستان کا ایک اہم زرعی علاقہ ہے۔ یہ نہروں کے جال سے سیراب ہوتا ہے اور اس کی زرخیزی ستلج دریا سے آنے والے پانی پر منحصر ہے جس کا منبع پڑوسی ملک بھارت میں ہے۔ بدقسمتی سے بھارت کے غیر دوستانہ رویے کی وجہ سے بہاول پور کو حالیہ برسوں میں سنگین نقصان کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ مطلوبہ پانی کی فراہمی بند کر دی گئی جس سے زراعت بری طرح متاثر ہوئی تاہم یہاں کی روایتی صنعتیں آج بھی فروغ پا رہی ہیں۔ کاریگر ایسی اشیاء تیار کر رہے ہیں جو برآمد کے قابل ہیں مثلاً سوتی کپڑا، سنہری دھاگے (تلّے) والی جوتیاں، نفیس تاروں کا کام یا باریک دھاتوں کی کشیدہ کاری، روغنی اشیا اور نہایت ہلکی مٹی کی بنی اشیا جن میں ایک ایسا پیالہ بھی شامل ہے جو ایک پاؤ پانی سمیٹ سکتا ہے لیکن اس کا وزن بمشکل ایک تولہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں بہاول پور کے جولاہے اپنے خوب صورت ڈیزائن اور عمدہ معیار کے سوتی قالینوں اور دریوں کے لیے بھی مشہور ہیں۔ بہاول پور کی

یہ مصنوعات اتنی نفیس اور جمالیاتی ذوق کی مظہر ہیں کہ دنیا کے کسی بھی عجائب گھر کی زینت بن سکتی ہیں اور اہلِ بہاول پور کے فنونِ لطیفہ سے لگاؤ کی واضح دلیل بھی۔

بہاول پور ایک نسبتاً چھوٹا شہر ہے جو تقریباً مغربی پاکستان کے قلب میں واقع ہے۔ یہاں لوگ سکون اور اطمینان کے ماحول میں زندگی گزارتے ہیں جو بڑے جدید شہروں کے شور وغل اور ہنگامہ خیزی سے یکسر مختلف ہے۔شہر کے گردونواح میں ایک طرح کی یکسانیت اور بے نقش ونگار منظر نامہ دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ یہاں گرمیوں کا موسم شدید ہوتا ہے لیکن سردیاں نہایت معتدل ہوتی ہیں۔شام کے خوشگوار وقت میں شہری باہر نکلتے ہیں، بزرگ لوگ گپ شپ میں مصروف ہوتے ہیں یا موسیقی سنتے ہیں جب کہ نوجوان بازاروں میں چہل قدمی کرتے ہیں۔ بہاول پور کے نوجوانوں کو بیرونی کھیلوں، نشانے بازی، گھڑسواری اور شکار سے خاص دلچسپی ہے۔ پوری ریاست ایک وسیع شکارگاہ ہے جہاں موزوں موسم میں ہرن، تیتر اور آبی پرندے وافر مقدار میں شکار کیے جا سکتے ہیں۔ کھیلوں کے شوقین افراد کے لیے شہر میں بہترین کھیل کے میدان موجود ہیں۔شہر کی عوامی سہولیات میں حالیہ اضافہ ایک اسٹیڈیم کی تعمیر ہے جسے ڈرنگ اسٹیڈیم کہا جاتا ہے اور اسے پورے ایشیا کا بہترین اسٹیڈیم تسلیم کیا گیا ہے۔ دوسال قبل یہاں ایم سی سی (MCC) نے بہاول پور کی کرکٹ ٹیم کے خلاف میچ کھیلا اور حال ہی میں بین الاقوامی ٹینس کے کھلاڑیوں نے بھی ان سبزہ زاروں پر اپنے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ یہ اسٹیڈیم ایک تین منزلہ جدید طرز کے خوب صورت پویلین پر مشتمل ہے جہاں سے پورا میدان نظر آتا ہے۔میدان کے اطراف میں پیدل راہیں، سڑکیں اور پھولوں کی کیاریاں موجود ہیں۔ پویلین کے سامنے کرکٹ گراؤنڈ ہے جب کہ اطراف میں تین فٹبال اور ہاکی کے میدان اور چار سرسبز گھاس سے ڈھکے ہوئے ٹینس کورٹس ہیں۔ ان کے آگے اسکواش کورٹ، جاگنگ ٹریک اور سوئمنگ پول بھی مکمل سہولیات کے ساتھ موجود ہیں۔ پویلین کی نچلی منزل پر آرام دہ لاونج، ٹیبل ٹینس اور بلیئرڈ کے کمرے اور کھلاڑیوں کے لیے غسل، آرام، کھانے اور قیام کے لیے کمرے موجود ہیں۔اس حجم کے کسی دوسرے شہر میں اس درجے کی سہولتیں نایاب ہیں۔

صرف 4 کروڑ 50 لاکھ روپے کی سالانہ آمدنی کے باوجود ریاست بہاول پور نے اپنے

شہریوں کے لیے دیگر کئی سہولیات بھی مہیا کی ہیں۔شہر میں تین آرٹس کالجز ہیں جن میں سے ایک خواتین کے لیےمخصوص ہے۔مردوں کا کالج جو پاکستان کے قدیم ترین اداروں میں سے ایک ہے، 1886ء میں قائم ہوا تھا۔دوسال قبل اس کی نئی عمارت تعمیر ہوئی جس میں کشادہ لیکچر ہال، لیبارٹریز اور اوپن ائیر کھیلوں کے میدان شامل ہیں۔صرف اس کالج میں ہی تقریباً 600 طلبہ زیرِتعلیم ہیں۔اس کے علاوہ ایک اسلامی دینیات کا خصوصی کالج بھی ہے جہاں طلبہ کو مفت تعلیم، رہائش اور طعام کی سہولت حاصل ہے۔شہر میں تین سیکنڈری اسکولز اور دیگر ادارے بھی موجود ہیں جو مختلف پیشہ ورانہ مہارتیں سکھاتے ہیں جیسے کامرس اور مقامی صنعتیں۔ نابینا افراد کے لیے بھی ایک اسکول ہے اور بالغوں کی تعلیم کا مرکز بھی جہاں ناخواندگی کے خلاف کام ہورہا ہے۔شہر میں ایک 300 بستروں پر مشتمل ہسپتال، ایک زچگی خانہ اور متعدد مفت ڈسپنسریاں قائم ہیں مگر سب سے دلچسپ ادارہ مرکزی جیل ہے جہاں ریاست بھر سے قیدی رکھے جاتے ہیں اور انھیں مختلف دستکاریوں کی تربیت دی جاتی ہے جیسے کپڑے اور ریشم کی بنائی، قالین و دری سازی، مٹی، لکڑی، چمڑے کا کام، کڑھائی اور سوئی دھاگے کا فن۔ان قیدیوں کے بہترین کام "صادق انڈسٹریل انسٹیٹیوٹ" اور بیکانیری دروازے کے باہر موجود سیلز سنٹر میں نمائش کے لیے رکھے جاتے ہیں تاہم ادارے کو اس بات کی تشویش ہے کہ ریاست میں قیدیوں کی تعداد تیزی سے کم ہورہی ہے۔ریاست میں جمہوری اداروں کے آغاز کے بعد بہاول پور کے موجودہ امیر کے تمام چھ محلات عوام کے لیے کھول دیے گئے ہیں۔اب ان میں ریاستی دفاتر قائم ہیں سوائے نورمحل یا قصرِ نور کے جو اہم مہمانوں کے لیے مخصوص ہے۔سابق ریونیو وزیر کی رہائش گاہ کو سرکاری مہمان خانہ بنا دیا گیا ہے۔ایک اور ریاستی ریسٹ ہاؤس بھی موجود ہے علاوہ ازیں متعدد معیاری ہوٹل سیاحوں اور زائرین کے لیے دستیاب ہیں۔

اپنی بہادری کی روایات کے عین مطابق بہاول پور کے عوام نے پاکستان کی آزادی کے آغاز سے ہی اس کے استحکام میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ریاست کے عام لوگ پاکستان کو ایک مضبوط اور خوشحال ملک بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔بجلی، پختہ سڑکیں، جدید نکاسی آب، پانی کی فراہمی اور موٹر ٹرانسپورٹ نے قدیم تیل کے چراغوں، رہٹوں، اور اونٹ گاڑیوں کی جگہ لینا شروع کر

دی ہے مگر پیاز نما یا ابھرے ہوئے گول گنبد اور سرخ ترکی ٹوپیاں اب بھی بہاول پور کی شناخت ہیں!

جب ریاست کے امیر نے پاکستان کی حکومت سے ایک نیا معاہدہ کیا اور رضا کارانہ طور پر اپنے اختیارات وفاقِ پاکستان کو منتقل کر دیے جس سے ریاست ایک صوبے کی حیثیت سے پاکستان کا حصہ بن گئی اور بہاول پور نے ترقی کے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ یکم مارچ کو ایک فرمان جاری ہوا جس میں دوررس اصلاحات متعارف کرائی گئیں اور مئی 1952ء میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات منعقد ہوئے۔ 49 نشستوں پر مشتمل اسمبلی منتخب ہوئی جس میں مسلم لیگ نے 39 نشستیں حاصل کر کے پہلی عوامی حکومت تشکیل دی۔ نئی حکومت کو فوری طور پر سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ بہاول پور کچھ عرصہ قبل تک بنجر ریگستان تھا اور اس کی موجودہ زرعی دولت مکمل طور پر نہری آبپاشی پر انحصار کرتی ہے۔ بدقسمتی سے پانی بھارت میں واقع دو ہیڈ ورکس سے آتا ہے۔ دانستہ طور پر پانی کی مقدار میں کمی نے غلّے کی کاشت 20 فیصد کم کر دی۔ مزید براں بہترین خریف کی فصل ٹڈی دل کے ایک غیر معمولی حملے سے تباہ ہوگئی یوں 53 -1952 میں گندم کی پیداوار 1,34,000 ٹن رہی جب کہ معمول کی پیداوار 2,00,000 ٹن تھی جس کے باعث نہ صرف غذائی قلت پیدا ہوئی بلکہ ریاست کی آمدنی میں بھی شدید کمی آئی جس سے ترقیاتی منصوبوں کی مالی معاونت مشکل ہوگئی۔ بہاول پور اسمبلی کے حالیہ بجٹ اجلاس میں انکشاف ہوا کہ 53- 1952 نظر ثانی شدہ بجٹ میں خسارہ 3,42,800 روپے تھا جب کہ 54-1953 کے لیے متوقع آمدنی 4,85,55,700 اور اخراجات 5,34,12,800 روپے ہیں یعنی 48,57,100 روپے کا خسارہ۔ یہ خسارہ مرکزی حکومت سے قرض اور عوامی قرضوں کے ذریعے پورا کیا جائے گا۔ اگر ان تمام مشکلات کے باوجود حکومت نے قابلِ ذکر ترقی کی ہے تو یہ دوہرا قابلِ تحسین ہے۔ سب سے پہلے ریاست میں زراعت کو بھارت سے آنے والے نہری پانی سے آزاد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے بڑی تعداد میں ٹیوب ویل نصب کیے جا رہے ہیں اور موجودہ نہروں کو پنجاب کی نہروں اور آخرکار دریائے سندھ سے جوڑنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ صرف ٹیوب ویلز پر ہی 81 لاکھ روپے خرچ کیے جا رہے ہیں۔

تعلیم کے شعبے میں نہایت متاثر کن ترقی ہوئی ہے۔ 48-1947 میں تعلیمی اخراجات

8,28,920 روپے تھے جو 1953-52 میں بڑھ کر 45,92,570 روپے ہو گئے جب کہ طلبہ کی تعداد 32,307 سے بڑھ کر 98,533 ہو گئی۔ پرائمری تعلیم مفت ہے اگر چہ لازمی نہیں اور حال ہی میں میٹرک تک کی تعلیم اُن بچوں کے لیے مفت کر دی گئی ہے جن کے والدین کی ماہانہ آمدنی 200 روپے سے کم ہے یعنی تقریباً 85 فیصد بچے اس سہولت سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ، ضرورت منداور مستحق طلباء کو فیاضانہ وظائف دیے جاتے رہیں گے، نہ صرف ریاست میں تعلیم کے لیے بلکہ بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی۔ ریاست میں تعلیمی اداروں کی کوئی کمی نہیں۔ یہاں ایک عظیم اسلامی علوم کا کالج ہے۔ ایک پرانا ڈگری کالج جو حال ہی میں جدید اور مکمل سہولیات سے آراستہ عمارت میں منتقل کیا گیا ہے، دوانٹرمیڈیٹ کالجز، تین تربیتی اسکولز، سولہ ہائی اسکولز اور 696 پرائمری اسکولز موجود ہیں۔ اگر تعلیم پر خرچ فراخدلی سے کیا گیا ہے تو طبی خدمات بھی اس سے کم نہیں۔ 53-1952 میں نئی اسکول عمارتوں پر 8,92,259 روپے خرچ کیے گئے جب کہ نئے اسپتالوں پر 9,74,200 روپے صرف ہوئے۔ شہر میں دو بڑے اسپتال اور 56 ڈسپنسریاں قائم ہیں جن میں بہاول پور کا مرکزی اسپتال 40 بستروں سے بڑھا کر 300 بستروں تک وسیع کر دیا گیا ہے۔ چوں کہ بہاول پور اپنے عمدہ مویشیوں کے لیے مشہور ہے اس لیے جانوروں کے علاج کی سہولتیں بھی معیاری طور پر فراہم کی گئی ہیں۔ ویٹرنری اسپتالوں کی تعداد بڑھا کر 28 کر دی گئی ہے اور ڈسپنسریاں 14 ہو گئی ہیں جب کہ جانوروں کی وبائی بیماریوں پر تحقیق اور ویکسین بنانے کے لیے ایک چھوٹی سی لیبارٹری بھی قائم کی گئی ہے۔ اگر چہ یہ ایک مختصر جائزہ ہے پھر بھی بہاول پور کی صنعتی ترقی کی شاندار تاریخ کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ یہاں ایک بڑی نئی کاٹن ٹیکسٹائل مل قائم کی گئی ہے، جس میں 31,000 اسپنڈلز اور 3,000 لومز ہیں۔ اس کے علاوہ، سبزیوں کے تیل اور اس سے متعلق صنعتوں کی فیکٹری اور 100 چھوٹی فیکٹریاں قائم کی گئی ہیں جن میں 29 کاٹن جننگ ملیں شامل ہیں۔ یہاں کی گھریلو صنعتیں عوام کی فنکارانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہیں اور کھیلوں کے میدان میں ان کی مہارت نے بہاول پور کو ملک بھر میں بڑی شہرت عطا کی ہے۔ پاکستان کو بہاول پور سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں اور بہاول پور واقعی ان پر پورا اترنے کے قابل فخر مقام کا حامل ہے۔

(3) بغداد سے بغداد الجدید تک

چودہ گھنٹوں پر محیط تاریخی شاہی تقاریب

عراق کے جلیل القدر بادشاہ معظم شاہ فیصل ثانی اور

ولی عہد شہزادہ معظم امیر عبدل اِلہ کا یادگار دورہ بہاول پور

مطبوعہ۔ بہاول پور ریویو شمارہ 8-7 جلد 1 فروری مارچ 1954

21 مارچ 1954ء کا دن ریاست بہاول پور کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ یہ وہ دن تھا جب ریاست کے قیام کے بعد پہلی بار کسی غیر ملکی شاہی وفد کا اس شان و شوکت سے تاریخی دورہ عمل میں آیا۔ عراق کے جواں سال بادشاہ شاہ فیصل ثانی، اپنے چچا، ولی عہدِ عراق امیر عبدل الہٰ کے ہمراہ چودہ گھنٹے کے اس مختصر مگر یادگار دورے پر بہاول پور تشریف لائے۔ ان کا یہ دورہ ماضی کی عظمتوں اور مقدس یادوں کو ایک بار پھر تازہ کرنے کا ذریعہ بنا۔ جغرافیائی لحاظ سے اگرچہ عراق اور ریاست بہاول پور کے درمیان صدہا میل کا فاصلہ ہے مگر روحانی، تہذیبی اور تاریخی رشتے دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہیں۔

ریاست بہاول پور پر حکومت کرنے والا خاندان وہی معزز عباسی خاندان ہے جس کے بزرگ آج سے سات سو پچیس برس قبل بغداد میں خلافت عباسیہ کے حکمران تھے۔ 655 ہجری میں ہلاکو خان کے ہاتھوں خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد واحد بچ جانے والے شہزادہ ابوالقاسم احمد بن ابوالنصر محمد الظاہر، مصر کی جانب ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ان کی نسل کے افراد بعدازاں محمد تغلق کے دورِ حکومت میں 725 ہجری کے قریب ہندوستان کی طرف کوچ کرنے لگے۔ انہی کی نسل سے پانچویں

پشت میں امیر سلطان احمد ثانی عباسی 767ہجری (1366) میں ہندوستان تشریف لائے۔ سندھ کے حکمران راؤ دھورنگ سے معرکہ آرائی کے بعد انھوں نے سندھ میں سکونت اختیار کی۔ بعدازاں عباسی خاندان نے اندرون ملک نقل مکانی کی اور قلعہ دراوڑ کو فتح کر کے اس تاریخی راجپوت قلعے کو اپنا مسکن بنایا جو آج بھی صحرا میں ان کی فتوحات کی علامت کے طور پر موجود ہے۔ یوں بغداد میں زوال پذیر خلافت عباسیہ کو نئی زندگی ریاست بہاول پور کی صورت میں ملی اور قدیم بغداد کی جگہ آج "بغداد الجدید" عباسی اقتدار کا مرکز ہے۔ عراق اور بہاول پور کے مابین تعلقات یہاں ختم نہیں ہوتے۔ شاہ فیصل ثانی ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور براہِ راست نواسہ رسول حضرت امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کی نسل سے ہیں جب کہ بہاول پور کے امیر اعلیٰ حضرت عباس علمدار رضی اللہ عنہ کی نسل سے چھٹی پشت کے فرد ہیں۔ یہ روحانی اور نسبی رشتہ دونوں حکمرانوں کے درمیان ربط کو مزید مستحکم بناتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ شاہ معظم کے پاکستان کے دورے میں ریاست بہاول پور کو بھی شامل کیا گیا۔ اہلِ بہاول پور کو اس وقت بے حد مسرت ہوئی جب جنوری 1954ء کے اوائل میں اخبارات کے ذریعے یہ خبر ملی کہ شاہی مہمانوں کا تین روزہ دورہ بہاول پور طے پا گیا ہے مگر عراق میں بعض داخلی حالات کے سبب ان کا دورہ ملتوی ہو گیا۔ بالآخر اعلان ہوا کہ وہ 12 مارچ کو کراچی پہنچیں گے مگر اب دورے کا دورانیہ 12 دن کر دیا گیا تھا۔ نتیجتاً ریاست بہاول پور کا تین روزہ شیڈول گھٹ کر محض چودہ گھنٹوں پر محدود ہو گیا۔ طے پایا کہ شاہی وفد 21 مارچ کو صبح 9:30 بجے خاص ریل گاڑی کے ذریعے ڈیرہ نواب صاحب پہنچے گا اور اسی شب 11:30 بجے سکھر روانہ ہو جائے گا۔ بالآخر وہ مبارک دن آ پہنچا جس کا بہاول پور کے باسیوں کو بے چینی سے انتظار تھا۔ یہ دن ریاست کی تاریخ میں اپنی مثال آپ تھا جہاں شاہی شان و شوکت اور والہانہ استقبال کی جھلک دیکھی گئی۔ حکومت کے صدر مقام سے حکمران کے مسکن تک 34 میل طویل سڑک کو خوب صورت جھنڈیوں، محرابوں اور عراقی، پاکستانی و بہاول پوری پرچموں سے سجایا گیا تھا۔ ڈیرہ نواب صاحب میں ریلوے اسٹیشن سے لے کر صادق گڑھ محل تک دونوں اطراف پاکستان آرمی کے چاک و چوبند سپاہی تعینات تھے۔ اختتامی راستے پر حکمران ریاست کے باڈی گارڈز اپنی نہایت دیدہ زیب وردیوں میں قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ احمد پور شرقیہ کے

مضافات سے گزرنے والی شاہراہ پر عربی زبان میں خیر مقدمی پیغامات اور رنگ برنگی جھنڈیوں کی ایک میل طویل چھت نے ایک روح پرور منظر پیدا کر دیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کی عمارت کو دلکش انداز میں سجایا گیا تھا۔ پورا پلیٹ فارم سرخ قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہی جگہ شاہی مہمانوں کی ریل کی شاہی سیلون کے رُکنے کی متعین جگہ تھی۔ دیواروں کے ساتھ فوجی جوان قطار اندر قطار کھڑے تھے جو شاہ کو گارڈ آف آنر پیش کرنے والے تھے۔

ریلوے اسٹیشن کے تینوں گنبد برقی قمقموں، جھنڈیوں اور پرچموں سے سجے ہوئے تھے جب کہ وسط میں چاند ستارے کی ایک شاندار برقی ترتیب بھی نمایاں تھی۔ پلیٹ فارم پر ان تمام ممتاز شخصیات کی آمد صبح 7:30 بجے سے شروع ہو چکی تھی جنھیں استقبال کے خصوصی اجازت نامے جاری کیے گئے تھے اور پورے راستے پر عوام طلوعِ آفتاب سے پہلے ہی جمع ہو چکے تھے۔ صبح 9 بجے تک ریاست کے وزرا، جی او سی بہاول پور، چیف جسٹس، آئی جی پولیس، اسپیکر اسمبلی اور دیگر اعلیٰ حکام تشریف لا چکے تھے۔ اسی دوران "زندہ باد امیرِ بہاول پور" کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ یہ معزز میزبان، حضور والا امیرِ بہاول پور اور ولی عہد کی سواری کی آمد کا اعلان تھا جو پانچ کاروں پر مشتمل ایک شاہی جلوس میں، پولیس کے سفید ہیلمٹ والے موٹر سائیکل سوار محافظوں کے جلو میں داخل ہو رہے تھے۔ 9:25 پر شاہی ریل دور سے نظر آنے لگی۔ برقی ڈیزل انجن پاکستانی و عراقی پرچموں سے مزین تھے۔ جیسے جیسے ریل نزدیک آئی اس کی رفتار کم ہوتی گئی اور بالآخر شاہی سیلون سرخ قالین کے ساتھ آ کر رک گئی۔ سب سے پہلے معزز نواب مشتاق احمد گورمانی، وزیرِ داخلہ و ریاستی و سرحدی امور ریل سے اترے اور امیرِ بہاول پور، ولی عہد اور چیف منسٹر سے مصافحہ کیا۔ اس کے بعد دربانوں نے شاہی سیلون کے دروازے کھولے۔ دو اے ڈی سی اترے، جن کے پیچھے شاہ فیصل ثانی اور ولی عہد امیر عبدالہ باہر تشریف لائے۔ دونوں نے عراقی اور پاکستانی ترانے بجتے وقت سلامی دی اور پھر فوجی دستے کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد شاہی مہمانوں کا تعارف ریاستی وزرا اور اعلیٰ افسران سے کروایا گیا اور پھر جلوس شاہی محل کی طرف روانہ ہوا۔ پہلی گاڑی میں شاہ معظم اور امیرِ بہاول پور جب کہ دوسری گاڑی میں ولی عہد، نواب گورمانی اور ولی عہد بہاول پور سوار تھے۔ باقی اے ڈی سی اور عملہ ان کے پیچھے تھا۔ سارا

راستہ شاہی جلوس کے استقبالی نعروں سے گونج رہا تھا۔ احمد پور کے نواح میں خواتین کے لیے پردہ کیمپ بھی قائم کیا گیا تھا۔ محل کے نزدیک پہنچتے ہی توپوں کی سلامی دی گئی۔ محل میں شاہ نے باڈی گارڈز کے گارڈ آف آنر کا معائنہ کیا۔ پریس کے نمائندے، سرکاری فوٹوگرافر اور مرکزی افسروں کا ہجوم ان کے ہمراہ تھا۔ اس کے بعد شاہی مہمانوں نے صادق گڑھ محل کے عجائب گھر کا دورہ کیا جو نایاب نوادرات، اسلحہ، قلمی نسخہ جات، زیورات اور سکوں کا خزانہ ہے۔ دوپہر کے کھانے میں شاہی مہمانوں نے میزبان کے ساتھ پرسکون لنچ کیا۔ بعدازاں حضور والا نے ساہیوال نسل کا ایک بیل اور دو گائیں ولی عہد کو تحفے میں دیں، جو مویشی پروری کے شوقین تھے۔

شام 4 بجے شاہی وفد بغدادالجدید (بہاول پور شہر) روانہ ہوا جہاں نور محل میں باغیچہ پارٹی منعقد کی گئی۔ گلزار محل سے شروع ہونے والی شاہی سواری چھ گھوڑوں کی بگھی میں تھی جن پر سرخ و سنہری وردیوں میں سوار پیادے سجے تھے۔ راستے میں اسکاؤٹس نے سلامی دی۔ نور محل پہنچنے پر شاہ کے اترتے ہی قومی ترانہ بجایا گیا۔ چائے کے بعد وزیرِ اعلیٰ نے شاہ کو اسمبلی کے اراکین سے ملوایا اور وزیرِ تعلیم نے ولی عہد سے تعارف کرایا۔ یہ تقریب غروبِ آفتاب کے وقت اختتام کو پہنچی جس کے بعد شاہی مہمان واپس ڈیرہ نواب روانہ ہو گئے۔ رات 9 بجے صادق گڑھ محل میں شاہی ضیافت دی گئی جس میں تمام وزرا، اعلیٰ سول و فوجی افسران شریک ہوئے۔ ضیافت کے بعد شاہی وفد رات 11:45 پر شاہی ریل کے ذریعے سکھر روانہ ہو گیا۔

(4) مشرق اور مغرب کا ملاپ

"ایک نامہ نگار کی رپورٹ"

تحریر: شاہد چشتی

مطبوعہ: شمارہ 3 جلد 1 بہاول پور ریویو ستمبر 1953

مشرقی پاکستان کے طلبہ کے خیر سگالی مشن کا دو روزہ دورہ بہاول پور کئی لحاظ سے یادگار واقعہ تھا۔ اس دورے نے نہ صرف بہاول پور اور مشرقی بنگال کے درمیان ثقافتی روابط کے لیے ایک نادر موقع فراہم کیا بلکہ ریاستی دارالحکومت کی یکسانی کی حامل معاشرتی زندگی سے بیزار لوگوں کے لیے بھی خوشگوار تبدیلی ثابت ہوا اگرچہ یہ تبدیلی عارضی ہی سہی۔ تقریباً چھتیس گھنٹے تک بہت سے لوگ مصروف اور متحرک رہے اور معمول سے ہٹ کر ایک نئے انداز میں سرگرم دکھائی دیے۔ اگرچہ مہمانوں کی آمد کی اطلاع بہت قلیل مدت میں ملی مگر بہاول پور نے شایانِ شان میزبانی کا حق ادا کیا۔ حکومت اور عوام دونوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک یادگار قیام کو ممکن بنانے کے لیے درکار تھا۔ یہ ساری کاوش دراصل بہاول پور کی طرف سے اس مشن کے مقصد میں ایک چھوٹی سی لیکن مخلصانہ معاونت تھی یعنی ملک کے دونوں بازوؤں کے عوام کے درمیان قومی اخوت کے رشتوں کو مضبوط بنانا۔ مشرقی پاکستان سے خیر سگالی مشن جس کی قیادت جناب ظہورالاسلام کر رہے تھے اور ان کی نائب ڈاکٹر محترمہ آمنہ رحمٰن تھیں، آٹھ لڑکیوں اور بائیس لڑکوں پر مشتمل تھا۔ یہ قافلہ 10 اکتوبر کی صبح حیدرآباد (سندھ) سے ٹرین کے ذریعے رحیم یار خان پہنچا۔ اگرچہ آمد کا وقت کچھ عجیب تھا لیکن لوگ سینکڑوں کی تعداد میں مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ سرکاری اہلکاروں، طلبہ، اسکاؤٹس اور عام شہریوں نے

مل کر استقبال کو ایک شاندار تقریب بنا دیا۔ مشن کے اراکین عوام کے والہانہ جوش و محبت سے بے حد متاثر ہوئے۔ ریلوے اسٹیشن سے براہ راست مشن کو ڈرنگ کلب لے جایا گیا تاکہ ناشتہ کے بعد ' مارچ کی تقریب کے لیے تیار ہو سکیں۔ چوں کہ میزبانوں کے پاس وقت کم تھا اور پروگرام کافی مصروف تھا اس لیے ہر چیز جلد بازی میں انجام دی گئی۔

دورے کی پہلی منزل نو تعمیر شدہ ٹاؤن ہال تھی۔ یہ شاندار عمارت جس کا بلند ٹاور 70 فٹ اونچا تھا، مہمانوں کو بے حد پسند آیا۔ انھیں یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ مقامی میونسپلٹی نے اس کی تعمیر پر تین لاکھ روپے خرچ کیے ہیں۔ یہ عمارت بنیادی طور پر مقامی اداروں کے اجلاسوں کے لیے بنائی گئی تھی مگر عوام کے علاوہ ریاست کے پی ڈبلیو ڈی کا عملہ بھی یہاں اہم اجلاس منعقد کرتا تھا۔ سب ہی ٹاؤن ہال کے سبزہ زار اور وسیع لانوں سے بہت متاثر ہوئے۔ اگرچہ مہمانوں کا دل چاہا کہ وہ کچھ دیر اس ہریالی میں سکون سے بیٹھے رہیں مگر مصروف شیڈول نے یہ اجازت نہ دی۔ گاڑیوں میں واپسی کے بعد قافلہ پہلے پرانے شہر کی سیر پر روانہ ہوا اور پھر ماڈل ٹاؤن کی طرف گیا۔ وہاں گذشتہ دو تین برسوں میں نمایاں فرق نمایاں تھا۔ ایک طرف قدیم طرزِ تعمیر، دوسری طرف جدید ترقی کی جھلک۔ اس کے بعد قافلہ صنعتی بستی کی طرف بڑھا جہاں پاکستان کے دو بڑے صنعتی ادارے موجود تھے: عباسی ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ اور صادق ویجیٹیبل آئل ملز اینڈ الائیڈ انڈسٹریز لمیٹڈ اور ان کے ساتھ صادق صابن فیکٹری۔

مشن کے اراکین نے یہاں تین گھنٹے گزارے۔ خود کو تین گروپوں میں تقسیم کر کے انھوں نے تقریباً تمام اہم شعبوں کا معائنہ کیا۔ لڑکے زیادہ تر اعداد و شمار اور کارخانوں کی وسعت سے متاثر ہوئے جب کہ لڑکیاں اپنی دلچسپی کی چیزوں کی طرف راغب ہوئیں۔ ان کے لیے سب سے زیادہ دلکش مقام یونی لیور کی صابن فیکٹری تھی جو ویجیٹیبل آئل مل کی ذیلی صنعت کے طور پر کام کر رہی تھی۔ انھیں یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ یہ فیکٹری جلد ہی پورے ملک کی صابن کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر پیداوار شروع کرنے والی ہے۔ فیکٹری میں انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ کس طرح مزدور روئی کے بیج پھینک رہے تھے اور مشینوں سے تیار شدہ صابن کی ٹکیاں تیار ہو کر باہر نکل رہی تھیں۔ ڈالڈا ویجیٹیبل گھی۔ وٹامن سے بھرپور اور لذیذ پکانے کا تیل بھی مشرقی پاکستان کے

مہمانوں کی دلچسپی کا مرکز رہا۔ فیکٹری انتظامیہ نے اپنے قابل ترین افراد کو مہمانوں کی رہنمائی کے لیے مامور کیا جنھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے سب کچھ سمجھایا۔ تین گھنٹے طویل دورے کے بعد مہمان اور میز بان دونوں وقت کی تنگی کا شکار ہو گئے لہٰذا "ہنگامی حالت" کا اعلان کرنا پڑا۔ دس بارہ مزید مقامات کی سیر منسوخ کر دی گئی اور قافلے کو سیدھا کلب لے جایا گیا تا کہ ایک جلدی میں مختصر ''دو پہر کا کھانا'' کھایا جا سکے۔ اگر چہ ہدایت تھی کہ جلدی کریں اور وقت ضائع نہ کریں لیکن بہت کم لوگ اس کی پرواہ کر رہے تھے۔ زیادہ تر مہمان سکون اور ذہنی وجسمانی آرام کے موڈ میں تھے۔ لڑکیاں البتہ اس سکون سے مستثنیٰ رہیں۔ وہ اپنے تاثرات خطوط میں قید کرنے میں مشغول ہو گئیں تا کہ اپنے پیاروں تک پہنچا سکیں۔ سب کچھ ختم ہونے کا نام نہ لے رہا تھا تو مشن کے قائد نے سب کو دو پہر کے کھانے کے لیے میز پر آنے کا حکم دیا۔ کھانے کی میزیں ہر قسم کے لذیذ پکوانوں سے سجی ہوئی تھیں، میز بانوں نے کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔ انھیں اندازہ تھا کہ مہمان انگور پسند کریں گے چناں چہ خوب مقدار میں انگور دستیاب تھے۔ (مشرقی پاکستان میں انگور خاصے مہنگے تھے یا اس سے زیادہ قیمت پر ملتے تھے، جو صرف امیر لوگ ہی خرید سکتے تھے) دو پہر کے کھانے کے بعد قافلہ خوب صورت اور سایہ دار 80 میل طویل نہری سڑک کے ذریعے پنجند کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں پہلی بار مہمانوں نے "چاندی کے ریشے" والے مشہور کپاس کے کھیت دیکھے۔ بسیں روک کر قریب سے کپاس کے پودے دیکھنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ لڑکے کھیتوں میں کود گئے اور لڑکیاں نہر کے کنارے بیٹھ کر ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈال کر لطف اندوز ہوئیں۔ چند مہمانوں نے برجستہ کہا": مغربی پاکستان واقعی جنت ہے"!

آخر کار قافلہ پنجند پہنچا جہاں پنجاب کے پانچ دریا ملتے ہیں۔ یہاں کا نہری ہیڈ ورکس انجینئرنگ ایک ایک شاندار کارنامہ ہے جو عباسیہ نہری نظام کو پانی فراہم کرتا ہے۔ نیلا جھیل نما فیڈر جو انسان کی مشینی مہارت کا شاہکار ہے، آنکھوں اور دل دونوں کو بھاتا ہے۔ مہمان اس عظیم فولادی ڈھانچے کو دیکھ کر حیران رہ گئے جو پانچ عظیم دریاؤں کے شدید بہاؤ کو اپنے قابو میں لاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس ڈھانچے کو اسکول کی سیڑھیوں سے تشبیہ دی اور خوشی خوشی اس پر چڑھنے لگے۔ دیگر بشمول مشن لیڈر مسٹر اسلام، نہر کے پل پر ٹہلنے نکلے۔ چوں کہ تھکن کا خدشہ تھا لہٰذا انھیں گاڑیوں میں

بٹھا کر واپس لایا گیا۔ پنجند ویئر کا مشاہدہ زیادہ تر مہمانوں کے لیے ایک نیا تجربہ تھا اور یہ جان کر وہ دنگ رہ گئے کہ اس پر ریاست نے بیس کروڑ روپے سے زائد خرچ کیے تھے۔

ہلکی پھلکی تواضع کے بعد وفد ریاستی دارالحکومت کی جانب روانہ ہوا جہاں وہ شام کے وقت پہنچا۔ زیادہ تر لڑکوں کو ایک وزیر کے بنگلے میں ٹھہرایا گیا جب کہ باقی وفد جس میں زیادہ تر لڑکیاں، قائد اور نائب قائد شامل تھے کو عباس منزل، ریاستی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ چوں کہ شام ہو چکی تھی اس لیے وفد کے کسی ادارے کے باقاعدہ دورے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس شام کے دو پروگرام تھے: ریاستی عشائیہ اور کیمپ فائر اور دونوں ہلکے پھلکے، خوشگوار نوعیت کے تھے۔ رات 9 بجے تک عشائیہ مکمل ہو چکا تھا۔ یہ پہلی باقاعدہ ملاقات کا موقع تھا جس میں مشرقی پاکستان کے طلبہ اور مقامی مہمانوں کے درمیان خوشگوار میل جول ہوا۔ مقامی مہمانوں میں تقریباً تمام محکموں کے سربراہان، کچھ عوامی شخصیات اور آدھا درجن خواتین شامل تھیں۔ سب سے پہلے وفد کے اراکین نے ایک ایک کر کے اپنا تعارف کروایا۔ اس کے بعد ریاست کے وزیر تعلیم راؤ حفیظ الرحمٰن نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ اس کے جواب میں وفد کے قائد جناب ظہور الاسلام نے ریاستی حکومت کی بہترین میزبانی اور ان کے قیام کو دلچسپ اور آرام دہ بنانے پر اپنی دلی مسرت اور شکریہ کا اظہار کیا۔ ایک شخصیت جس کی عدم موجودگی عشائیہ میں سب نے شدت سے محسوس کی وہ ریاست کے وزیر اعلیٰ مخدوم زادہ سید حسن محمود تھے۔ انھیں کراچی سے واپسی پر لاہور جانا پڑا تھا تاہم انھوں نے خیر سگالی مشن کے نام ایک خصوصی پیغام بھجوایا جس سے ان کی عدم موجودگی کی تلافی ہوگئی۔ عشائیہ کے بعد مہمانوں کو بہاول پور اسکاؤٹس ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا جہاں ان کے اعزاز میں کیمپ فائر منعقد کیا گیا تھا۔ حسبِ روایت، مسٹر سیموئیل بیدی نے شو کی قیادت کی۔ جیسے ہی مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھے قریبی علاقوں سے لوگ بڑی تعداد میں آ گئے، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سرکس شو ہونے والا ہے۔ لیکن یہ ایک کیمپ فائر تھا، ایک روایتی اسکاؤٹس کا مظاہرہ۔ تقریب کا افتتاح ریاستی ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن مسٹر بی ایم خان نے کیا۔ پروگرام میں عوامی رقص، قوالیاں اور ایک ایکٹ کے مزاحیہ ڈرامے شامل تھے۔ نذیر حسین نامی ایک مقامی طالب علم نے اپنے دلچسپ انداز سے سب کی توجہ حاصل کر لی اور ہال میں بار بار قہقہوں کی گونج

سنائی دی۔ آخر میں ہجوم کی فرمائش پر مشرقی پاکستان کے طلبہ نے بھی اسٹیج پر آ کر خوب صورتی سے اپنی ایک بنگالی نظم سنائی۔ اگر چہ سامعین زبان سے واقف نہ تھے لیکن مدھر آواز اور جذبے نے ہر دل کو چھو لیا۔ نظم کے اختتام پر تالیوں کی آواز ہال میں گونج اٹھی۔ تقریب کے اختتام پر تمام مہمان طلبہ کو بہاول پور اسکاوٹس کے بیجز بطور تحفہ دیے گئے۔ جب ہجوم منتشر ہوا تو مقامی نوجوان "چل چل چل چل" (نظم کی ابتدائی سطر) گنگناتے دکھائی دیے اور بنگالی مہمان "بیدی صاحب" کی نقل اتارتے۔ یوں مشرق اور مغرب کا ملاپ اپنے ابتدائی نتائج دینے لگا تھا۔

دوسرے دن کا شیڈول انتہائی مصروف تھا۔ دن کا آغاز ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اور صادق ڈین ہائی اسکول کے دورے سے ہوا۔ اس کے بعد وفد کو صادق ایجرٹن کالج لے جایا گیا۔ افواہ پھیل چکی تھی کہ مشرقی پاکستان کے طلبہ وہاں موسیقی اور رقص کا مظاہرہ کریں گے چناں چہ لوگ جوق در جوق جمع ہو گئے اور کالج کا ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ تقریب کی ابتدا قرآن پاک کی تلاوت سے ہوئی پھر علامہ اقبال کی ایک نظم سنائی گئی۔ بعد ازاں کالج یونین کے صدر پروفیسر ایم ڈی حسن نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ اس کے بعد ایک شاندار پپٹ شو (کٹھ پتلی تماشا) پیش کیا گیا جس نے سب کو حیران کر دیا۔ پھر بہاول پور کے سہگل خالد نے اپنی سریلی آواز میں گیت گایا۔ اس کے جواب میں مشرقی پاکستان کے طلبہ نے ایک کورس میں بنگالی نغمہ "پاکستان زندہ باد" پیش کیا، جس کے بول میں صرف دو اردو الفاظ شامل تھے — "پاکستان زندہ باد"۔ یہ دھن سن کر ہال جذبات سے لبریز ہو گیا۔ بعد ازاں ایک اور خوب صورت بنگالی نظم، قاضی نذر الاسلام کی تخلیق، سنائی گئی۔ خواتین طلبہ نے اپنی دلکش بنگالی دھنوں سے سب کا دل موہ لیا۔ بعد ازاں، وفد کو جامعہ عباسیہ، یتیم خانہ، گرلز کالج، صنعتی ادارہ، خواتین صنعتی ہوم اور بہاول وکٹوریہ اسپتال کا دورہ کرایا گیا۔ دار الاصلاح میں طالبات نے کئی دستکاریاں خریدیں۔ اسپتال میں مہمانوں کو جدید ایکسرے مشین کا عملی مظاہرہ بھی دکھایا گیا۔ مختلف اداروں میں طلبہ کو تحائف بھی دیے گئے جن میں بہاول پور کا مشہور کھسہ بھی شامل تھا۔ وفد کے اعزاز میں اسٹیٹ گورنمنٹ نے ڈرنگ اسٹیڈیم میں شاندار چائے پارٹی کا اہتمام کیا جہاں ریاستی وزیر تعلیم نے وزیر مالیات سردار محمد ایوب خان کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ وفد نے مغرب کے وقت کوئٹہ پسنجر ٹرین کے ذریعے

لاہور روانہ ہوتے وقت "پاکستان زندہ باد" اور "خیر سگالی مشن زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ رخصتی پائی۔ لوکل طلبہ اور عوام نے بھی اپنی محبت کے اظہار میں بنگالی اور بہاول پوری نعرے آپس میں بانٹ کر مشرق و مغرب کے اس دلنشین ملاپ کو حقیقی معنوں میں مکمل کر دیا۔

(5) فارن آپریشنز ایڈمنسٹریشن (FAO) کی ٹیم کا ریاست بہاول پور کا دورہ

مطبوعہ: بہاول پور ریویو شمارہ 3-2 جلد 2 مئی، جون 1954

30 اپریل کو چند لمحے قبل "اپ پاکستان میل" کے پہنچنے سے پہلے، رحیم یار خان ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم ضلعی افسران، مقامی ایڈ ہاک میونسپل کمیٹی کے ارکان، اراکین اسمبلی اور دیگر ممتاز شہریوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جو ریاست کے چیف منسٹر مخدوم زادہ سید حسن محمود کو خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھے۔ چیف منسٹر وفاقی دارالحکومت سے "ہفتہ صفائی" کے افتتاح کے لیے آرہے تھے جس کا اہتمام اُس صبح ٹاؤن کونسل نے کیا تھا۔ ایڈ ہاک میونسپلٹی کے صدر اس بات سے ناواقف تھے کہ اُن کے ایک جھاڑو کا انتظام، جو انھوں نے چیف منسٹر کو صفائی کی علامتی کارروائی کے لیے دیا تھا، ناکافی ثابت ہوگا کیوں کہ جب ٹرین پہنچی تو چیف منسٹر اکیلے نہ تھے۔ وہ امریکا کی فارن آپریشنز ایڈمنسٹریشن (FAO) ماہرین کی ایک ٹیم کے ہمراہ تھے جس کی قیادت مسٹر وِل کر رہے تھے جو کہ چیف منسٹر کے مطابق، تقریب میں بھی شرکت کریں گے۔ یوں میونسپل صدر کو عجلت میں مزید جھاڑوؤں کا بندوبست کرنا پڑا اور ایف۔ او۔ اے ٹیم کے سربراہ نے چیف منسٹر کے ہمراہ سڑک صاف کر کے ہفتہ صفائی کا افتتاح کیا جس میں سینکڑوں افراد نے شرکت کی۔

معزز مہمانوں نے ایک تقریب میں شرکت کی، "شہر کے عمائدین" کی جانب سے پیش

کیے گئے استقبالیہ خطاب کو سنا اور چیف منسٹر کی مختصر تقریر بھی سماعت کی۔اس طرح انھیں ریاست کے شہریوں کی سرگرمیوں کا مشاہدہ کرنے کا براہ راست موقع ملا۔تقریب کے اختتام پر، چیف منسٹر نے پوری ٹیم کو شہر اور اس کے نواح کا تفصیلی دورہ کرایا۔رحیم یار خان ریاست کا اہم صنعتی مرکز ہے اور یہاں کے دو بڑے کارخانے: صابن سازی اور ویجیٹیبل آئل کی مصنوعات، برصغیر میں سب سے بڑے شمار ہوتے ہیں۔شہر تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور دو یا تین برسوں میں یہاں ایک خوب صورت ماڈل ٹاؤن، جدید افسر کالونی، 70 فٹ بلند لوکل باڈیز ہال، نیا اسپتال، نئی جیل، نئی عدالتیں، بجلی گھر اور دیگر عمارات تعمیر ہوئی ہیں جو ریاست کی ترقی اور منصوبہ بندی کا عکاس ہیں۔ایف۔او۔اے کی ٹیم نے ان عمارات کا دورہ کیا جو حال ہی میں عدالتوں کے لیے مخصوص تھیں اور اب انھیں زرعی اور صنعتی ترقی (Agricultural and Industrial Development) مرکز کے لیے مختص کیا جا رہا ہے جو ایف۔او۔اے اور فورڈ فاؤنڈیشن کے تحت چلایا جائے گا۔ٹیم کو ان عمارات کا بھی مشاہدہ کرایا گیا جنھیں ہوسٹل وغیرہ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔

چیف منسٹر نے ٹیم کو ریاست کی ضروریات، خاص طور پر ورکشاپوں، تجربہ گاہوں اور نقل و حمل کے لیے درکار ساز و سامان کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا۔اس کے بعد ٹیم کو مجوزہ ہوائی اڈے کے مقام پر لے جایا گیا جہاں انھوں نے ایک گھنٹہ منصوبے کی تفصیلات پر تبادلہ خیال کیا۔ایک انجینئر ماہر نے پوچھا: "اگر مناسب امداد فراہم کی جائے تو ہوائی اڈے کی تعمیر میں کتنا وقت لگے گا؟" چیف منسٹر نے اپنے چیف انجینئر کی طرف دیکھا اور بغیر جواب کا انتظار کیے کہا: "تین مہینے! چیف انجینئر اور دیگر افسران نے اثبات میں سر ہلایا اور سب مطمئن دکھائی دیے۔

جمالدین والی میں: دوپہر کو وفد جمالدین والی یعنی ریاستی چیف منسٹر کے آبائی گاؤں پہنچا جہاں ان کا استقبال مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ چیف منسٹر کے والد اور بہاول پور مسلم لیگ کے صدر نے کیا۔ٹیم نے ریاست میں جدید زرعی ترقیات کا مشاہدہ کیا، کھیتوں، باغات اور مزارعین کی رہائش گاہوں کا دورہ کیا اور ہر طرف بہتر حالات کو سراہا۔

ریاستی دارالحکومت میں: اگلی صبح ٹیم ریاستی دارالحکومت روانہ ہوئی جہاں

دو دن کا بھر پور پروگرام ان کے انتظار میں تھا۔ انھیں نہ صرف دارالحکومت کے اہم مقامات کا دورہ کرنا تھا بلکہ ریاست کے مستقبل کے ترقیاتی منصوبوں، ان پر عملدرآمد اور امداد کی نوعیت پر اعلیٰ سطحی اجلاس بھی منعقد کرنے تھے۔ آمد کے پہلے دن، ٹیم نے مقامی اداروں اور اہم عمارات کا دورہ کیا، مثلاً ڈرنگ اسٹیڈیم جو ریاست کی ثقافت، ذوق اور امنگوں کا مظہر ہے جسے برصغیر کا سب سے عمدہ اسٹیڈیم مانا جاتا ہے، اپنے کرکٹ کے میدان کے ساتھ جسے "بلے بازوں کی جنت" کہا جاتا ہے۔ انھوں نے سینٹرل جیل اور صادق انڈسٹریل انسٹی ٹیوٹ کا بھی دورہ کیا، جن کی ساکھ بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ ہے۔ بعدازاں انھوں نے بہاول وکٹوریہ اسپتال کا دورہ کیا جسے حالیہ توسیع کے بعد 40 بستروں سے 400 بستروں تک بڑھایا گیا ہے، اور جو اس وقت این ڈبلیو ایف پی، سندھ اور پنجاب کے مریضوں کو بھی اپنی سہولیات سے فائدہ پہنچا رہا ہے۔ پھر انھیں ماڈل ٹاؤن لے جایا گیا جہاں خوب صورت بنگلوں، جدید گھروں اور نو قائم شدہ صادق پبلک اسکول کا مشاہدہ کیا۔ یہ نظارے ایف۔او۔اے ماہرین کے لیے بے حد متاثر کن ثابت ہوئے اور انھوں نے اپنی آئندہ سفارشات کے لیے ضروری مشاہدات جمع کیے۔ ان کا آخری دورہ ڈیری فارم اور قریبی فاریسٹ ریزرو تھا جہاں حکومت پھل، سبزی، پولٹری اور بیجوں کی افزائش کے منصوبے رکھتی ہے۔ جب یہ دورہ ختم ہوا تو ایف۔او۔اے اور ایف ایف کے تمام اراکین مطمئن تھے۔ انھوں نے ترقی کے وہ آثار دیکھے جو صحرا کے وسط میں ممکن بنائے گئے تھے۔ تین سالہ حکومتی کارکردگی ان کے سامنے زندہ مثالوں کی صورت میں موجود تھی۔ یہ تمام منصوبے محدود فنڈز اور ساز وسامان کی قلت کے باوجود مکمل کیے گئے۔ اگر ریاست کو مالی اور مادی امداد دستیاب ہو تو وہ کس قدر ترقی کر سکتی ہے!

کانفرنس: اس پروگرام کے بعد اگلے دن چیف منسٹر نے اپنے رفقاء اور محکموں کے سربراہان کے ساتھ ایف۔او۔اے ٹیم کے ساتھ دربار ہال میں اجلاس منعقد کیا۔ محکموں کے سربراہان نے اپنے ساتھ منصوبوں کے خاکے لائے جن میں ان کے شعبوں کی ترقیاتی تجاویز شامل تھیں۔ چیف منسٹر نے صحت، تعلیم، صنعت، زراعت، آبپاشی، بجلی وغیرہ جیسے تمام شعبہ جات کا جائزہ لیا اور ہر معاملے میں درکار امداد، مقامی ذرائع اور منصوبے کی تکمیل سے عوام کو ہونے والے فوائد کی تفصیلات

ایف۔او۔اے ماہرین کو بتائیں۔ جب ٹیم اور ماہرین منصوبے کو مکمل طور پر سمجھ گئے تو مخصوص ماہر کو وہ معاملہ سونپ دیا گیا تا کہ وہ متعلقہ محکمے کے سربراہ سے مزید تفصیل سے بات کرے۔ یہ اجلاس چار گھنٹے سے زیادہ جاری رہا جس میں ریاست کے تقریباً تمام ترقیاتی منصوبے حقیقی ٹیم ورک کے جذبے کے تحت زیر بحث آئے۔ 3 مئی 1954 کی صبح ٹیم نے چولستان کا مختصر دورہ کیا تا کہ اس پسماندہ علاقے کی ترقی اور مالی امداد کی ممکنہ نوعیت کا جائزہ لیا جا سکے۔ ایف۔او۔اے ٹیم اُسی دوپہر کو کراچی روانہ ہوگئی۔

(6) پیارا ستلج

(پراثر تاثراتی تحریر۔تصوراتی محبوبہ کے نام)

تحریر: شاہد چشتی

مطبوعہ۔ بہاول پور ریویو، شمارہ 6 جلد 1 جنوری 1954

سومی، سنو —:

یہ رات کا پہلا پہر ہے اور میں جاگ رہا ہوں، تمہیں یہ چند سطریں ایک نہایت ہی رومانوی، حسین اور دلکش مقام سے لکھ رہا ہوں اور جانتی ہو! یہ خوب صورت جگہ بہاول پور کی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم حیران ہو کر کہو گی کہ یہ تو ایک نئی بات ہے! بالکل ٹھیک، ایسا ہی ہے۔

یہ جگہ دریائے ستلج کا کنارہ ہے۔ سردیوں کی جوان چاندنی ہلکی سی مرتعش سطح پر دلفریب عکس ڈال رہی ہے۔ میرے باقی ساتھی جو گذشتہ سال بہاول پور آنے کے بعد سے میری دوستی کا کل سرمایہ ہیں، دن بھر کی سیر و تفریح کے بعد گہری نیند میں ہیں مگر میں جاگ رہا ہوں کیوں کہ نیند کا خیال بھی میرے لیے اس وقت بوجھل ہے چناں چہ میں خیمے سے باہر آ گیا ہوں، تمھارے بارے میں سوچتے ہوئے، کتنی عجیب بات ہے کہ میں بسکٹ کے ریپرز پر لکھ رہا ہوں کیوں کہ کوئی اور کاغذ موجود نہیں ہے۔ میں جانتا

ہوں، تم سوال کروگی کہ آخر میں اس قدر بے چین ہوکر تم سے اس رات گئے اور اس عجیب سی جگہ، ایک ہچکولے کھاتی کشتی کی نشست پر بیٹھ کر کیوں مخاطب ہوں؟ تمھاری پریشانی بلا جواز نہیں، خاص طور پر میری "نرالی" عادتوں کو دیکھتے ہوئے۔ آہ، کیسی رات ہے! چاندنی کی نرم کرنیں، اتنی لطیف اور دل کو بھانے والی میرے وجود میں سرایت کر رہی ہیں اور مجھے ایک خوشگوار تازگی کا احساس ہو رہا ہے۔

جس کشتی میں بیٹھا ہوں، اس کا نام " کونسٹینٹ نمف " (مستقل اپسر) ہے۔ کیسی دلچسپ رفاقت ہے! میرا ارادہ ہے کہ خط مکمل کر کے اسے دھیرے دھیرے بہاؤ کی مخالف سمت لے جاؤں۔ دراصل، ہم نے پوری رات کشتی رانی کا پروگرام بنایا تھا مگر دیکھو ان آوارہ مزاج ساتھیوں کو جو بمشکل رات دس بجے تک میرا ساتھ دے سکے۔ وہ سب تو تب تک جاگ رہے تھے جب تک کہ وہ مرغِ بریاں اور کافی کے عشائیے پر دھاوا بولنے میں مصروف رہے اور ہمارے خشک سیل والے ریڈیو نے فلمی گانوں کی تان چھیڑ رکھی تھی — جن سے مجھے اب بھی شدید نفرت ہے۔

مگر جیسا کہ تم جانتی ہو، وقت اور فطرت کو ایسے لوگوں کی پروا نہیں ہوتی۔ دیکھو سومی، دیکھو! چاند اپنی چاندنی میں پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے۔ ستلج بڑی ہی متانت سے بہہ رہا ہے۔ مشرق سے آتی معطر ہوا نے پورے ماحول کو سرشاری میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کاش تم میرے ساتھ ہوتیں، میرے برابر بیٹھی ہوتیں اور میں تمہیں یہ بتا پاتا کہ وہی ستلج جسے ہم نے برسوں پہلے "دنیا کا سب سے گدلا اور بدصورت دریا" کہا تھا بہاول پور میں آتے ہی کس قدر حسین اور شفاف ہو جاتا ہے جیسے کوئی دلکش دوشیزہ، جس کا بدن خمدار ہو، جو خوشبو بکھیر رہی ہو۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ میں تب بھی کبھی کبھار تمہیں یہ کہتا تھا کہ کوئی دریا بدنما یا بدصورت نہیں ہوتا؟ مگر اب ماننا پڑے گا کہ وہ ستلج، جو ہم نے پھلور کے قریب دیکھا تھا، واقعی اتنا خوشنما نہ تھا، جتنا کہ یہاں ہے، خاص طور پر اس مقام پر۔

حقیقت تو یہ ہے کہ سلیمانکی ہیڈ ورکس سے لے کر پنجند، جہاں پنجاب کے پانچوں دریا ملتے ہیں، ستلج کئی حسین موڑ کاٹتا ہے۔ کہیں کوئی کریک بناتا ہے، کہیں مدہوشی میں ڈوبا ہوا سا جھیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کہیں یہ کسی شاعر کی محبوبہ کی کمر کی مانند پتلا ہو جاتا ہے، اور کہیں دوشیزہ کے سینے کی طرح کشادہ۔

یہ ہے بہاول پور کا ستلج — دلکش اور محبوب!

میں جس جگہ سے لکھ رہا ہوں، وہ شاید دریائے ستلج کا سب سے حسین مقام ہے جو شہر کی ہنگامہ خیزی سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہم ریلوے پل سے جو بہاول پور اور پنجاب کو جوڑتا ہے ایک فرلانگ اوپر کی طرف خیمہ زن ہیں۔ ہمارے خیمے کے سامنے ایک خوب صورت کریک بہتی ہے جو کافی فاصلے تک پھیلی ہوئی ہے۔ کچھ خوش مزاج لوگوں نے اس کریک کا نام "خالد کریک" رکھ دیا ہے۔ خیر، میں نہیں جانتا کہ یہ خالد کون ہے؟ خالد ابن ولید یا پھر بہاول پور کے معروف ادیب محمد خالد اختر، جو H.G Wells کی خیالی دنیا کی طرز پر لکھے گئے اور 1950 میں شائع ہونے والے ناول ''بیس سو گیارہ'' کے مصنف ہیں؟ خیر، میرے سامنے وہی دل پسند کریک ہے۔ میرے دائیں جانب کوئی دو میل کے فاصلے پر، دریا ایک مصنوعی نہر کی صورت میں بہہ رہا ہے، جو محض دو تین فٹ گہری ہے، مگر اس کا بہاؤ تیز ہے۔ نوزائیدہ ملاحوں کے لیے آئیڈیل جگہ۔ یہ نہر نما گزرگاہ شاید ہمارے خیمے کے عقب میں موجود ایک نیم دائرہ نما جھیل سے نکل رہی ہے جسے ستلج نے بہت ہی فنی انداز میں تراشا ہے۔ یہ جھیل اتنی گہری ہے کہ اس کی تہہ تک پہنچنا ممکن نہیں اور اس کے پانی پر ہر طرف سبزی مائل جھلک ہے۔ اب ذرا تصور کرو کہ اس جھیل کے گرد سرسبز چراگاہیں ہیں جنھیں ٹیلے گھیرے ہوئے ہیں تو یوں محسوس ہوگا جیسے ہم کسی لمحے کشمیر پہنچ گئے ہوں۔ جھیل سے آگے دریا ایک بار پھر تنگ اور پتلا ہو جاتا ہے بالکل ایک نہر کی طرح اور کشتی رانی کے لیے نہایت موزوں ہو جاتا ہے اور پھر وہاں ہر طرف سفید، ہموار ریت کا میدان دکھائی دیتا ہے، جسے چھوٹے چھوٹے ندی نالے، جھیلیں اور کریکس جگہ جگہ سے کاٹتے ہیں۔ پس منظر میں کھجور کے لمبے قطار در قطار درخت اور ننھے ریتیلے ٹیلے منظر کو اور بھی سحر انگیز بنا دیتے ہیں۔ ذرا دیکھو! کیا یہ لمبی قطار میں کھڑے کھجور کے درخت کسی ایسے فرشتوں کے جھرمٹ جیسے نہیں لگتے جو ہاتھ باندھے، نظریں آسمان کی طرف اٹھائے، اللہ کے حضور عبادت میں محو ہوں؟ سومی، یقین کرو، جو ایک بار یہاں آ جائے، اس کا واپس جانے کو دل نہیں کرتا۔ اس جگہ کی خاص کشش کا ایک اور پہلو بھی ہے — رانجھا، کشتی بان۔

یہ وہی رانجھا ہے، جس نے برسوں پہلے جھنگ سیال کی ہیر سے سچی محبت کی تھی مگر آج کل

وہ صرف دریائے ستلج سے محبت کرتا ہے۔

ایک گھنٹہ پہلے وہ میرے پاس بیٹھا کہہ رہا تھا:

"صاحب! آپ نہیں جانتے یہ دریا کتنا حسین اور دلکش ہے؟ میں کئی بار بھوک اور بے روزگاری کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے چھوڑ کر گیا مگر اس کی جدائی کے زخم نہ سہہ سکا۔ جب بھی یہاں سے گیا ستلج کی یاد مجھے بیوی بچوں کی طرح ستاتی رہی اور جلد ہی میں اپنی نوکری چھوڑ کر پھر سے یہیں آ بسنے پر مجبور ہو گیا" اور جب میں نے رانجھے سے کہا کہ میں بھی اس فطرت کے خمار حسن سے محبت کرتا ہوں اور جب اس کی آغوش میں ہوتا ہوں تو واپس جانے کا دل نہیں چاہتا، تو رانجھا قہقے کا ایک گہرا کش لے کر خاموش ہو گیا جیسے وہ مجھ سے نالاں ہو جیسے میں اس کی محبت میں اس کا حریف ہوں۔

رانجھا تو جا چکا، مگر سچ کہوں، سومی، اس لمحے ہیر چپکے چپکے میرے سامنے آ رہی ہے۔ میں اس کے دل فریب خدوخال کو چھو سکتا ہوں۔ میں اس کی گھنی زلفوں کو سہلا سکتا ہوں، میں اس کے لبوں اور رخساروں کو چوم سکتا ہوں، مگر نہیں ایسا نہیں کروں گا کیوں کہ میں مانتا ہوں کہ ہیر تو رانجھے کی ہی ہے۔

سومی! تابناک چاند نے واپسی کا سفر شروع کر دیا ہے۔ خالد کریک کے اوپر کھجوروں کے سائے لمبے اور گہرے ہو رہے ہیں۔ ریلوے پل کا دھندلا عکس پانی میں جھک سا گیا ہے۔ خیالات کی ایک عجیب دنیا میرے ذہن پر چھا رہی ہے جیسے میں کسی خواب میں ہوں۔ دیکھو! پل کے اس پار وہ بوٹ کلب ہے جہاں کچھ لوگ لکڑی کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہیں۔ وہ ہنس رہے ہیں۔ کتنی شیرینی، کتنی موسیقیت بھری ہے ان کی ہنسی میں! ایسا لگتا ہے کہ خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ شاید یہ کوئی بڑی تفریحی محفل ہے یا کچھ چھوٹے چھوٹے گروہ مل کر ایک بے فکر اور خوش دل ہجوم بنا چکے ہیں۔ کیسے مہذب اور نفیس ذوق والے لوگ ہیں بہاول پور کے!

ادھر دیکھو! کریک کے قریب کچھ سائے پھر سے متحرک ہو رہے ہیں۔ شاید کچھ لوگ ریلوے لائن کے پار سے ادھر آ گئے ہیں۔ پائل کی چھن چھن اور گٹار کی نغمگی جیسے وہیں سے آ رہی ہو۔ ہاں! وہاں کوئی رقص کر رہا ہے۔ کشتی بان اپنی کشتیاں لے کر بوٹ کلب کی طرف دوڑ پڑے ہیں۔ پھر، میں دیکھتا ہوں کہ سنگ مرمر کی سفید بارہ دری کے قریب، جو لمبے گلابی پھولوں کی

کیاریوں سے گھری ہے دوسائے آپس میں گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں۔اور پھر جیسے ہی لمحہ گزرتا ہے، سب کشتیاں لوگوں سے بھر کر مختلف سمتوں میں روانہ ہو چکی ہیں۔کچھ دھارے کے مخالف جا رہی ہیں، کچھ بہاؤ کے ساتھ بہہ رہی ہیں۔ابھی ابھی ایک کشتی میرے سامنے سے گزری۔اس میں چار لڑکیاں تھیں، مختلف لباس پہنے۔ان میں سے ایک ستار پر "نٹ بیہاگ" راگ چھیڑ رہی تھی۔کتنی نفیس، کتنی شائستہ تھیں وہ سب! کتنے آزاد دل اور کھلے مزاج کے لوگ تھے وہ! انھوں نے میرے جانب ہاتھ لہرا کر کہا": ہیلو! تنہا شخص! کیسی ہے یہ رات؟ کیسی ہے زندگی؟" اور میں بس مسکرا کر رہ گیا۔

سومی، کاش تم آج میرے ساتھ ہوتیں۔اگر ممکن ہو، تو کل آجانا کیوں کہ یہ دریا ان دنوں جلد سوکھ جاتا ہے۔پچھلے پانچ چھ سالوں سے اس کی رگیں تناؤ اور کھچاؤ کا شکار ہیں۔سلیمانکی ہیڈ ورکس پر ستلج جیسے فالج زدہ ہو گیا ہے۔ایک دن رانجھا مجھ سے بولا تھا": صاحب! اگر آج دریا کا یہ حال ہے تو سوچو جب بھارت شوالک پہاڑوں میں بھاکڑا ڈیم مکمل کر لے گا، تب کیا ہوگا؟" میں خاموش رہا، مگر دل میں سوچا": تب ہیر کو کھیڑے اٹھا کر لے جائیں گے اور رانجھا پھر کبھی نہ رہے گا۔"

ذرا سنو! کہیں سے فلمی موسیقی کی آواز آ رہی ہے۔کتنی بے سلیقہ بات ہے! شاید کوئی خیمے میں جاگ رہا ہے۔ہاں کوئی ضرور جاگ رہا ہے اسی لیے بوٹ کلب کی سیڑھیاں جیسے غائب ہو گئی ہیں۔سرو کے درخت، گلاب کی کیاریاں، بارہ دری، کشتیاں اور سب لوگ جیسے کہیں کھو گئے ہیں۔اب تو خالد کریک پر رقص کرنے والے کا بھی کوئی سراغ نہیں — بس رانجھا کے ماہیے کی مدھ بھری آواز، جو ہوا میں کہیں تحلیل ہو رہی ہے۔خیر، الوداع!

ہاں — جو دعوت میں نے تمہیں چند لمحے پہلے دی تھی کہ فوراً آجاؤ اسے شاید دس سال بعد پر رکھنا بہتر ہوگا کیوں کہ جس منظر کو دیکھنے کی تم آرزو کر سکتی ہو وہ درحقیقت اس وقت موجود ہی نہیں ہے۔رانجھا چلا گیا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اور جو کچھ میں نے تمہیں دکھایا وہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں تھا۔بلکہ جیسا کہ فیض نے کہا تھا": یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے۔۔۔"

بوٹ کلب تو اب بھی موجود ہے مگر بہاول پور کے لوگ جو کسی زمانے میں چاندنی راتوں میں دریا کی جانب آتے تھے اب ایسی راتوں میں سوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ اگر وقت ملا تو بس

یہی پوچھتے ہیں کہ "تم ہر روز دریا کی طرف کیوں جاتے ہو؟" اور سچ کہوں سومی! ہم سب میں اتنی ہمت نہیں کہ ہم انھیں بتا سکیں کہ وہاں، شیریں ستلج کے کنارے ایک رانجھا رہتا ہے — جس کی ہیر، جس کے دلکش کریکس، جس کی گہری جھیلیں اور جس کے ننھے جھرنے، اب بھی وہیں ہیں۔۔۔اور اس کے اردگرد وہی سفید اور چمکتا ہوا ریت کا سمندر ہے جس کی گود میں اگر کوئی ایک چھوٹا سا خیمہ لگا لے، تو اس کی روح یکدم رومانوی خوابوں کی جنت میں پہنچ جاتی ہے۔ اب تم سو سکتی ہو، میری پیاری سومی۔۔۔شاہد چشتی

(7) چولستان

تحریر۔ بیگم یاسمین یٰسین

مطبوعہ۔ بہاول پور ریویو، شمارہ 1 جلد 1 اگست 1953

اگر قاری پاکستان کے مغربی حصے کا نقشہ دیکھنے کی زحمت کرے تو وہ اس کے جنوبی کنارے پر معروف صوبہ پنجاب کے جنوب مغرب میں بہاول پور ریاست کو پائے گا۔ اگر وہ دریا کے علاقوں کے گرد نشان زد تمام ناموں کو نظر انداز کر کے جنوب کی طرف، بھارتی سرحد کی جانب دیکھے تو وہ خود کو ایک بالکل خالی علاقے کو گھورتا ہوا پائے گا جہاں کوئی نام نہیں — یہ چولستان ہے۔

یہ برصغیر ہمیشہ سے ہی انتہاؤں کی سرزمین کہلایا ہے اور چولستان ان انتہاؤں میں بھی ایک انتہا ہے؛ ایک پیاسی اور بنجر ریگستانی زمین جہاں اوسط درجہ حرارت 120 (49 سنٹی گریڈ) ہوتا ہے اور جہاں تازگی بخش ہوائیں بھی کسی گرم بھٹی سے نکلتی ہوئی شعلوں کی مانند محسوس ہوتی ہیں۔ بہاول پور ریاست کی بڑی نہریں اور سرسبز درختوں سے گھری نہری سڑکیں جو دریائے سندھ اور ستلج سے نکلتی ہیں، ابھی تک اس سنسان علاقے کی ریتلی گہرائیوں میں داخل نہیں ہو سکیں۔ یہ وہ خطہ ہے جو جدید تہذیب سے تقریباً ناواقف ہے مگر یہ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک کا گہوارہ رہ چکا ہے اور مغلیہ دور

کی نسبتاً جدید تہذیب سے بھی آشنا رہا ہے۔ آج یہ ایک بھولی بسری زمین ہے جو زندگی کی بنیادی سہولیات سے بھی محروم ہے حالانکہ یہ سہولتیں محض چند میل کے فاصلے پر موجود ہیں۔ یہاں نہ بجلی ہے، نہ پانی کی پائپ لائنیں نہ سڑکیں، نہ کوئی مشینری مگر اس کے باوجود یہ اپنی مخصوص دولت رکھتا ہے — ایک منفرد کشش اور پراسراریت کے ساتھ قدیم روایات اور صدیوں پرانی ثقافت کی عظمت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ چولستان میں تقریباً کوئی مستقل بستی یا گاؤں نہیں کیوں کہ یہاں کے باشندے خانہ بدوش ہیں جو بارش کے بعد جمع ہونے والے پانی کے تالابوں یا کنوؤں کے گرد چند ہفتوں کے لیے قیام کرتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ سب مسلمان ہیں، دل کے صاف، سادہ اور فیاض — اگرچہ ظاہری شکل میں رعب دار نظر آتے ہیں۔ ان کا واحد ذریعہ معاش ان کے مویشی ہیں۔ یہ اپنی بھیڑ، بکریوں، گائے، بیل اور اونٹوں کے ساتھ ایک سے دوسرے آبی ذخیرے تک سفر کرتے رہتے ہیں اور پانی ختم ہوتے ہی پھر سے کوچ کر جاتے ہیں۔ چولستان کی اس منفرد، خالص اور فطری حالت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں بیرونی دنیا سے رابطہ بہت مشکل اور شاذ و نادر ہی ممکن ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ اونٹوں پر چالیس میل کا سفر طے کر کے قریبی قصبے تک پہنچتے ہیں جہاں ضروری اشیاء یا طبی امداد حاصل کی جا سکتی ہے۔ کبھی کبھار کوئی جیپ بھی اس بے کراں ریت کے سمندر میں مہم جوئی کے لیے آنکلتی ہے اور میں بھی اسی طرح اس پراَسرار سرزمین سے اپنی پہلی دفعہ شناسا ہوئی۔

ہمارا سفر "دارالسلام" سے شروع ہوا جو کہ بہاول پور کے نواب کی جانب سے "معزز مہمانوں" کے لیے مخصوص ایک خاموش اور خوب صورت نیم محل تھا۔ یہاں ہمیں نہایت شائستگی کے ساتھ (اگرچہ کچھ پھیکے انداز میں) انگریزی کھانے پیش کیے گئے اور سونے چاندی کے کام والے سرخ و سنہری لباس میں ملبوس مگر ننگے پاؤں خدمت گاروں نے انتہائی ادب کے ساتھ ہماری خدمت کی۔ ہمارے قافلے میں بہاول پور ریاست کے زرعی مشیر، پاکستان کے اینیمل ہسبنڈری کے ڈپٹی کمشنر (جو کہ میرے شوہر بھی ہیں)، ہماری چھوٹی بیٹی، میں خود، ایک ڈرائیور اور ایک مکینک شامل تھے۔ کچھ دیگر عملہ بھی ہمارے ساتھ تھا جو ایک ٹرک میں نہری سڑکوں کے ذریعے سفر کرتا رہا اور ہماری خوراک، لباس اور دیگر ضروری سامان لے کر چلتا رہا۔ ہر صبح ہم "سڑک" اور اپنے معاون عملے کو چھوڑ

کر، کسی مقامی رہنما عموماً کوئی بزرگ اونٹ بان، جو بالکل کرسمس کارڈز میں دکھائے جانے والے مشرقی دانا کی مانند نظر آتا تھا، کی مدد سے صحرا میں نکل جاتے۔ ہمیں روزانہ کئی میل کا فاصلہ طے کرنا ہوتا، درست مقام تک پہنچنا ہوتا، درکار معلومات حاصل کرنا ہوتیں اور پھر شام ہونے سے پہلے واپس لوٹنا ہوتا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمارے گائیڈ ہمیشہ منزل تک پہنچنے میں کامیاب رہتے حالانکہ یہ وہ زمین تھی جہاں کوئی واضح نشان یا شناخت کے قابل مقام موجود نہ تھا مگر وہ تیس سے ساٹھ میل کا فاصلہ طے کر کے، معمولی سی غلطی کے ساتھ، مطلوبہ مقام تک پہنچ جاتے حالانکہ ریت کے طوفان مسلسل پرانے نشانات مٹا رہے ہوتے تھے۔ بس ایک دن ایسا ہوا جب ہم اپنا ہدف کھو بیٹھے۔ کئی گھنٹے بھٹکنے کے بعد ہمارے رہنما نے اعتراف کیا کہ وہ الجھ گیا ہے اگرچہ وہ بضد تھا کہ گاؤں "اِسی طرف" ہے لیکن جب ہم آگے بڑھے تو اچانک ہمیں اپنی ہی جیپ کے تازہ نشانات دوبارہ نظر آ گئے۔ ہمارے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا سوائے اس کے کہ ہم اسی سرائے میں واپس لوٹ آئیں جہاں سے صبح روانہ ہوئے تھے اور اگلے دن ایک نئے رہنما کے ساتھ قسمت آزمانے کا فیصلہ کریں۔ ظاہر ہے کہ اس رات ہم اپنے طے شدہ کھانے تک بھی نہ پہنچ سکے۔

چولستان کے عارضی باسی، جو چند مہینوں کے لیے کسی مقام پر قیام کرتے ہیں، عام طور پر خاص مٹیریلسے بنی ہوئی چھوٹی، چوکور کمروں کی قطاروں میں رہتے ہیں۔ یہ کمرے تقریباً اتنے ہی بڑے ہوتے ہیں جتنا کہ کسی گھوڑے کا اصطبل۔ یہ سب کمرے آپس میں جڑے ہوتے ہیں تا کہ آندھیوں اور ریت کے طوفانوں سے بچا جا سکے اور اخراجات میں بھی کمی کی جا سکے۔ بعض اوقات چھتیں محض کھردری بوریوں سے بنی ہوتی ہیں۔ اندر کوئی بستر، میز یا کرسی نہیں ہوتی، نہ ہی چاقو، چمچ یا کانٹے جیسا کوئی برتن مگر انہی چھوٹے جھونپڑوں میں مجھے اکثر قد آور، شائستہ اور نازک نقوش والی عورتوں نے خوش آمدید کہا جو شاہانہ وقار، نرم رویے اور بے مثال متانت کی مالک تھیں اور وہ گاڑھا، خوش ذائقہ اونٹنی کا دودھ جو وہ پیتل یا مٹی کے بڑے کٹوروں میں پیش کرتیں، واقعی حیرت انگیز ہوتا۔ چولستان میں کچھ مستقل بستیاں بھی موجود ہیں جہاں پانی کی دستیابی ممکن ہے۔ یہ گاؤں عام طور پر کسی قدیم قلعے کے اندر یا اس کی محفوظ سمت میں آباد ہوتے ہیں۔ ان کھنڈرات کی اینٹیں نئی عمارتیں بنانے

کے لیے استعمال ہوتی ہیں اور مٹی بطور سیمنٹ کام آتی ہے۔ ایسا ہی ایک گاؤں، جو ایک وسیع مغل قلعے کے سائے میں آباد ہے، وہ "رُکن پور" ہے جس کا اکثر تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ پاکستان کی حدود سے سب سے دور اور بھارتی سرحد کے سب سے قریب ہے۔ جو لوگ ہجرت کر سکتے تھے وہ جا چکے مگر اس کے سنسان بازاروں اور خستہ حال گھروں میں چند بدقسمت لوگ اب بھی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ہر وقت یا تو سرحد پار حملوں کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں یا وباؤں کے اور ان دونوں سے بچاؤ کے لیے ان کے پاس کوئی وسیلہ نہیں۔

ان مستقل بستیوں میں کنواں ہمیشہ ہی سرگرمی کا مرکز ہوتا ہے جہاں کام بھی ہوتا ہے اور خواتین کی محفلیں بھی جمی رہتی ہیں۔ میں گھنٹوں کنوؤں کے قریب کھڑی ان کا مشاہدہ کر سکتی تھی۔ ہر کنواں اپنے کام کے انداز میں منفرد ہوتا۔ بعض اوقات آنکھوں پر پٹی بندھا ایک بیل مسلسل چکر کاٹ کر ایک چرخی گھماتا جو قیمتی پانی کے چھوٹے برتن اوپر کھینچتی۔ کبھی کوئی اونٹ پچاس گز کے فاصلے پر آگے پیچھے چل کر کھال سے بنے ایک خام پانی کے تھیلے کو کھینچتا۔ زیادہ تر مرد و خواتین خود آگے پیچھے چل کر اپنے پیاسے بھیڑ، بکریوں اور اونٹوں کے لیے پانی نکالتے اور دن کے اختتام پر اپنے گھروں کے لیے پانی لے جاتے۔

چولستان ایک فنکار کے لیے جنت ہے۔ صحرا کے بادشاہ، مدر اینڈ چائلڈ یا کسی مسیحا کی تصویر کشی کے لیے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں خوب صورت، بدصورت، نرم و نازک یا جھریوں بھرے چہرے سب ملیں گے مگر سب سے زیادہ حیران کن ان عورتوں کے چہرے ہوتے ہیں جو کبھی کسی دکان کے شوکیس میں نہیں جھانکیں، کسی سینما کی چمک دمک سے روشناس نہیں ہوئیں، کسی فیشن میگزین کے ورق نہیں پلٹے، کبھی چہرے پر پاؤڈر نہیں لگایا اور جن کے لبوں نے کبھی سرخ لپ اسٹک کے وجود کا تصور بھی نہیں کیا۔ ہمارے سفر کے یادگار مناظر میں سے ایک، موج گڑھ (یہاں قلعے کا نام Mager لکھا ہوا ہے) قلعے میں غروب آفتاب کا منظر تھا۔ ہم اس سرخ اینٹوں سے بنے وسیع کھنڈر پر ایک شام پہنچے جب صحرائی شام کی خاموشی ہر سو چھائی ہوئی تھی۔ سورج ابھی ابھی اس کی بلند دیواروں کے پیچھے ڈوبا تھا اور اس کے پس منظر میں کھڑے بے ترتیب پتھر واضح نظر آ رہے تھے۔

آسمان پر سرخی مائل رنگ بکھر گیا تھا جو ریت اور اس چھوٹے تالاب میں جھلک رہا تھا جہاں گاؤں کی کچھ عورتیں اپنے گھڑے بھر رہی تھیں۔ انھوں نے وہی رنگ برنگے لباس پہن رکھے تھے جن کی وجہ سے اس خطے کو اس کا نام ملا — لال گھریلو کپڑے پر کڑھائی شدہ چولی، سیاہ پس منظر پر سرخ، پیلے یا نارنجی جھولتے گھاگھرے اور سر سے ٹخنوں تک وقار کے ساتھ لپٹے دوپٹے۔ وہ بے فکری سے آپس میں ہنستی، خوش گپیاں کرتیں، اپنے گھڑے ایک دوسرے کے سروں پر تین تین کر کے رکھتی جا رہی تھیں۔ ہم کچھ دیر اس حسین منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے یہاں تک کہ میں شاید زیادہ قریب چلی گئی اور ایک خاتون نے مجھے دیکھ لیا۔ فوراً ہی انھوں نے اپنے دوپٹے سختی سے لپیٹ لیے اور دبے قدموں قلعے کی اونچی دیواروں کے پیچھے غائب ہوگئیں جن کی حفاظت میں انھوں نے اپنا ریگستانی گھر بسایا تھا۔

غروبِ آفتاب کے انہی دل فریب مناظر میں ایک اور منظر وہ تھا جو مجھے ہر بار مبہوت کر دیتا — گاؤں کی مسجد میں مردوں کی صف بندی۔ امیر و غریب، بوڑھے اور جوان، مالک اور مزدور سب ایک ہی صف میں، سر ڈھانپے، ننگے پاؤں، ایک ساتھ جھکتے، ہاتھ اٹھاتے، پھر سجدے میں گر کر زمین سے لگتے اور ایکہم آہنگی میں جھکتے اور اٹھتے، دن کی آخری نماز ادا کرتے۔ یہ سادہ، دین دار اور محبت کرنے والے صحرا کے لوگ آج بھی ویسے ہی زندگی گزار رہے ہیں جیسے صدیوں سے گزارتے آئے ہیں۔ ان میں سے کم ہی جانتے ہیں کہ جنگ کب آتی اور کب جاتی ہے اور بہت کم ان افواہوں کو سمجھ سکتے ہیں جو وہ ہوائی جہازوں اور ایٹم بم کے بارے میں سنتے ہیں اور جب میں ان کے پُرسکون، مطمئن چہروں کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں، شاید ان کے پاس واقعی کوئی اور ہی قوت ہے، کوئی ایسا راز، جسے بیرونی دنیا اب تک تلاش نہیں کر سکی حالانکہ وہ اسے دیوانگی کی حد تک تلاش کرنے میں لگی ہوئی ہے۔

(8) چنن پیر کے مزار پر حاضری

تحریر: ایم۔خالد

مطبوعہ: بہاول پور ریویو شمارہ 7،8 جلد 1 فروری مارچ 1954

دنیا میں کچھ مقامات اور مناظر ایسے ہوتے ہیں کہ جب ایک بار انسان ان کو دیکھ لے تو وہ تا عمر اس کی یادوں کا حصہ بن جاتے ہیں اور ہمیشہ اس کے ذہن میں نغمہ بن کر گونجتے رہتے ہیں۔ایسا ہی ایک مقام چنن پیر ہے جہاں ہر سال مارچ کے آخر میں ایک رنگین اور دلکش میلہ لگتا ہے، جیسا کہ کوئی اور کہیں شاید دیکھ سکے۔

یہ جگہ بہاول پور سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ریگستان کے بیچ واقع ہے جہاں وسیع "ڈاہریں" ہیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہیں۔ میلے کے دنوں کے علاوہ، یہ مقام سال بھر تقریباً سنسان رہتا ہے۔کبھی کبھار پیر کے مزار پر حاضری دینے والے مجاور یا آوارہ پھرنے والے چرواہے ہی اس ویران مقام کو دیکھتے ہیں اور اس کی بے رونقی اور تنہائی پر افسوس کرتے ہیں لیکن جب میلہ لگتا ہے تو یہ مقام زندگی سے بھر جاتا ہے، جی اٹھتا ہے اور رنگا رنگی اور خوش باش انسانیت کا منظر پیش کرتا ہے۔اگر چہ مجھے کھلی فضا اور رومانوی مناظر سے محبت ہے مگر میں زندگی میں صرف ایک بار چنن پیر کے دربار پر حاضری دے سکا وہ بھی پچھلے سال۔اس ایک حاضری کے بعد میں پیر کے عشق میں ایسا مبتلا ہو گیا کہ گویا عمر بھر کے لیے ان کا عقیدت مند بن گیا۔اس سنسان اور دلکش مقام کو میں ایک ایسے بزرگ کی جائے آرام کے طور پر دیکھتا ہوں جس نے شہروں کے شور وغل اور گہما گہمی سے دور، سکون اور خلوت کو پسند کیا۔ میں چنن پیر کو ایک سادہ طبیعت، معصوم خصلت اور خوش گفتار انسان کے روپ میں دیکھتا ہوں جو ہمدردی اور محبت کا پیکر تھے۔ان کی شخصیت بھی شاید اسی سادہ دیہاتی لوگوں کی طرح

بے تکلف اور صاف دل رہی ہو جو آج بھی سیکڑوں میل کا سفر طے کر کے ان کی درگاہ پر اپنے دکھوں کا مداوا ڈھونڈنے آتے ہیں۔ یہ میری پہلی زیارت کی داستان ہے۔ جو لوگ پہلے ہی وہاں جا چکے ہیں وہ شاید ہی اس تحریر میں کچھ نیا یا دلچسپ پائیں اور کچھ کے لیے یہ محض ایک یادگاری تاثر ہوگا۔ جیسا بھی ہو، مجھے اپنی یادوں کو تازہ کر کے اور قلم بند کر کے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیان کرنے کے لیے زیادہ کچھ نہیں۔ ہم احمد پور ایسٹ سے ایک خستہ حال جیپ میں مارچ کی ایک صبح روانہ ہوئے۔ ہم چار ساتھی تھے۔ ان میں سے کم از کم ایک شخص ایسا تھا جو خوابوں اور رومان پرستی کا دلدادہ تھا۔ اگر آدمی میں تھوڑی سی بھی رومانوی طبیعت نہ ہو تو ایسے سفر کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ وہ گھر پر ہی بیٹھا رہے اور مکانوں اور زمینوں کے جھمیلوں میں الجھا رہے۔ شاہی والہ کے قریب ہم نے پختہ سڑک چھوڑ دی اور صحرا کی سمت رخ کر لیا۔ ہم صحرائی ڈاہروں میں جیپ دوڑاتے چلے گئے جہاں صبح کی سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں کسی پرانے نہری ریسٹ ہاؤس کے کھنڈر دکھائی دیتے جو جھاڑیوں میں گم اور ویران محلوں کی مانند لگتے۔ راستہ کبھی کبھار بھول بھی جاتے اور پھر رہنما نہ لانے پر خود کو کوستے۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک ریتلے ٹیلے پر پہنچے جہاں ایک بڑا "ٹوبہ (آبی ذخیرہ) تھا جس کے گرد مٹی کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ کچھ آبادی کے آثار دکھائی دیے۔ تھوڑا آگے گئے تو ایک کٹورا نما گڑھا نظروں کے سامنے آ گیا جو دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔ یہ گڑھا کچھ دور، کہر زدہ ریت کے ٹیلوں میں جا کر گم ہو جاتا تھا۔ یہ دراصل ایک وسیع زرخیز میدان تھا۔ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس دیہاتی لوگ، اونٹوں پر سجے سجائے پالان (کجاوے) اور گھنٹیاں، یہ سب ایک خواب ناک منظر پیش کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی دلچسپ طلسماتی کہانی کا منظر ہو، سب کچھ اتنا غیر حقیقی معلوم ہوتا کہ یقین کرنا مشکل تھا۔ سنسان جگہ اور ویرانے میں اچانک اتنی رنگینی اور رونق دیکھ کر حیرانی ہو رہی تھی۔ ہم اپنی جیپ دوڑاتے میلے میں گھس گئے۔ ہجوم کو ہٹاتے ہوئے راستہ بناتے چلے گئے۔ لوگ ہنستے مسکراتے، خوش باش تھے جیسا کہ دیہاتی عموماً ہوتے ہیں۔ شہروں میں تو ہم نے خوشی کا راز ہی کھو دیا ہے۔ شہروں میں محض مقابلہ بازی ہے، ہر کوئی دوسروں سے آگے نکلنے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے اور حقیقی اطمینان بھلا بیٹھا ہے۔ جیپ روک کر ہم پیدل بازار میں جا نکلے۔ جگہ جگہ کھانے پینے کے اسٹالز اور کھلونوں کی

دکانیں تھیں جیسی دیہاتیوں کو پسند آتی ہیں۔ ایک طرف میلہ بھی لگا ہوا تھا جہاں تین کچے جھولے اور دو 'ہنڈولے' کرخت آوازوں کے ساتھ گھوم رہے تھے۔ بچے، بوڑھے سب اپنی دنیا میں مگن تھے۔ ہنسی قہقہوں کی آوازیں سب سے نمایاں تھیں۔

پیر صاحب کی قبر ایک چھوٹے سے ریتلے ٹیلے پر تھی، محض مٹی کا ایک ڈھیر جس پر کنکریاں اور بجری جمی ہوئی تھیں۔ ایک قدیم 'جنڈ' کا درخت اپنی شاخیں پھیلائے اس قبر پر سایہ فگن تھا۔ درخت کی شاخوں پر سرخ، نیلے، پیلے دھاگے بندھے ہوئے تھے جو عقیدت مندوں نے اپنی منتوں کے طور پر باندھے تھے۔ قبر کے پاس کچھ زائرین بیٹھے تسبیح کے انداز میں کنکریاں گن کر قرآن کی آیات پڑھ رہے تھے۔ بعض اوقات کوئی جذباتی عقیدت مند مٹی کے اس ٹیلے کو عقیدت سے چوم لیتا۔ اسی دوران ہماری نظر ایک عجیب شخصیت پر پڑی۔ ایک شخص جو مغلیہ دور کے شاہی لباس میں ملبوس تھا مگر اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کی کمر سے ایک زنگ آلود تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کا وقار مصنوعی اور مضحکہ خیز تھا مگر اس کی درویشی اور غربت میں ایک عجیب سی دلکشی بھی تھی۔ بتایا گیا کہ وہ کسی اور درگاہ کا 'خلیفہ' ہے اور ریگستان کے لوگوں میں اپنی پرہیزگاری اور زُہد کے سبب بڑا محترم ہے۔ پھر ہم نے ان زائرین کا مشاہدہ کیا جو اپنی منتیں پوری ہونے کے بعد یہاں شکرانے کی نیت سے آئے تھے۔ ایک دیہاتی خاندان، مرد، عورتیں اور بچے، ڈھول کی تھاپ پر ناچتے گاتے ہماری طرف بڑھے۔ ان میں ایک تنومند مرد عورتوں کا لباس پہنے جھانجھریں باندھے ناچ رہا تھا۔ جب اس کا ناچ ختم ہوا تو ہم میں سے ایک نے تجسس سے پوچھا۔ "بھائی، یہ عورتوں کا لباس پہن کر ناچنے کا مطلب؟" ناچنے والے نے جواب دیا: "بھائی، یہ کوئی مذاق نہیں۔ پچھلے سال منت مانی تھی کہ میرے چھوٹے بھائی کی شادی ہو جائے تو میں یہاں عورتوں کے لباس میں ناچتا ہوا آؤں گا۔ اللہ اور پیر صاحب کے کرم سے بھائی کی شادی ہو گئی، اب ہم منت پوری کرنے آئے ہیں۔" یہ لوگ مظفر گڑھ کے کسی گاؤں سے آئے تھے۔ پانچ دن کا سفر طے کر کے، اونٹوں پر سوار ہو کر۔ بہت سے ایسے قافلے میلے میں اپنی منتیں پوری کرنے کے لیے آتے تھے۔ میں نے ان سادہ دل لوگوں کی خوشی اور عقیدت کو دیکھ کر رشک محسوس کیا۔ میں نے چاہا کاش میں بھی ایسا ہوتا، مگر افسوس کہ میں "مہذب" اور "شہری"

تھا، جس کی زندگی ایک سنجیدہ اور خشک سانچے میں ڈھل چکی تھی۔

چنن پیر ایک خوش دل، نرمی اور محبت سے بھرپور ولی معلوم ہوتے ہیں۔ کسی سخت گیر فقیر کی طرح نہیں بلکہ یونانی دیوتاؤں کی مانند ایک خوش باش اور رحم دل بزرگ۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے چھوٹے چھوٹے دکھوں اور خوشیوں کے شریک ہیں۔ چنن نام شاید محبت اور پیار کی علامت تھا بالکل ایسے جیسے انگریزی میں محبوب کو ہنی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ جب ہم نے واپسی کا رخ کیا تو میں نے سوچا کہ چنن پیر جیسی محبت اور عقیدت والی حیات ابدی کسی بادشاہ یا جنرل کی عظمت سے کہیں بہتر ہے۔ وہ ہزاروں لوگوں کے دلوں میں خوشی، محبت اور معصوم مسکراہٹیں بانٹ گئے۔ ایٹمی دور اور صنعتی ترقی کے ساتھ شاید وہ معصوم خوشیاں ختم ہو جائیں اور مشینیں انسانیت کو نگل لیں مگر چنن پیر جیسے بزرگوں کی محبت بھری یادیں زمانے کے سفاک تھپیڑوں میں بھی ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

(9) آل پاکستان اردو کانفرنس

بہاول پور ریویو شمارہ 3-2 جلد 2 مئی، جون 1954

یکم، دوم اور سوم مئی 1954ء کو منعقد ہونے والی آل پاکستان اردو کانفرنس، بغداد الجدید (ریاستی دارالحکومت) کے ماتھے پر ایک اور روشن تمغہ بن کر چمکی۔ یہ شہر اب تیزی سے ایسے قومی اجتماعات، علمی و فکری نشستوں اور کل پاکستان نوعیت کی تقریبات کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ گذشتہ دو تین برسوں میں جہاں ڈرنگ اسٹیڈیم میں آل پاکستان کھیلوں کی تقریبات سے اہلِ ذوق وشوق لطف اندوز ہوتے رہے وہیں سنجیدہ نوعیت کے اجتماعات کا آغاز اس وقت ہوا جب مارچ 1953ء میں پاکستان ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن نے اپنی پانچویں سالانہ نشست یہیں منعقد کی جس کے بعد آل پاکستان طبی کانفرنس بھی یہیں ہوئی۔

جہاں تک اردو کانفرنس کا تعلق ہے، اس کی کامیابی کا سہرا سید شوکت علی اور اُن کے رفقا کے سر ہے جنھوں نے ایک چھوٹے سے " کافی ہاؤس" کے تصور کو بے شمار رکاوٹوں کے باوجود ایک قابلِ رشک حقیقت میں ڈھال دیا۔ اس بات پر اتفاقِ رائے تھا کہ پاکستان میں اس کانفرنس کے لیے اس سے موزوں مقام کوئی اور نہ ہوسکتا تھا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنے صدارتی خطاب میں ریاست بہاول پور کے عوام اور حکومت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ کانفرنس کے منتظمین نے بڑی محنت و جانفشانی سے اس تین روزہ اجتماع کو کامیاب بنانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں سے آنے والے مندوبین نے اسے حقیقی معنوں میں ''آل پاکستان'' رنگ عطا کیا۔

بابائے اردو کی آمد: بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، یکم مئی کو پاکستان میل کے ذریعے کراچی سے بہاول پور پہنچے، اُن کے ہمراہ مرد وزن پر مشتمل ایک معزز وفد بھی تھا۔ بابائے اردو، جواب خود ایک قومی ادارہ بن چکے ہیں، کو ریلوے اسٹیشن پر پُر تپاک استقبال دیا گیا۔ شدید گرمی کے باوجود ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد طلبہ، اساتذہ، پروفیسرز، صحافی، تاجر اور سیاست دان اُن کے خیر مقدم کے لیے امڈ آئے۔ مقامی اسکاؤٹس بینڈ نے دھنیں بجائیں اور نعرہ ہائے تحسین کے درمیان انھیں ''مقبول منزل'' لے جایا گیا جو استقبالیہ کمیٹی کے صدر کرنل مقبول حسن قریشی کی رہائش گاہ تھی۔

کانفرنس کا آغاز: کانفرنس کا پہلا اجلاس اُسی شام ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا، جس کی صدارت ڈاکٹر عبدالحق نے کی۔ کانفرنس کے کنوینر جناب شوکت علی نے رسمی افتتاح کے بعد کرنل مقبول حسن کو دعوتِ خطاب دی۔ انھوں نے اپنے استقبالیہ خطاب میں اس امر پر روشنی ڈالی کہ ریاست بہاول پور کے عوام اردو سے کس درجہ والہانہ محبت رکھتے ہیں۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر کو یقین دلایا: "اردو کے لیے ہم کوئی بھی قربانی دینے سے دریغ نہیں کریں گے، یہ واحد زبان ہے جو ملک کی قومی زبان کے طور پر تسلیم کیے جانے کی اہل ہے۔"

صدارتی خطاب اور بیگم شریف: بدقسمتی سے اس روز ڈاکٹر عبدالحق کی طبیعت ناساز ہونے کے باعث اُن کا صدارتی خطاب مؤخر ہوگیا جس سے سامعین میں کچھ مایوسی ہوئی، تاہم بیگم شریف

کے پُر جوش اور اثر انگیز خطاب نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ بیگم شریف جو انجمن کے خواتین شعبہ کی سیکرٹری تھیں، نے ایسی ولولہ انگیز تقریر کی کہ حاضرین نے بے ساختہ داد دی۔

خواتین اور عمومی اجلاس: دوسرے روز کانفرنس کے تین اجلاس منعقد ہوئے، جن میں سے دو کا خطاب بابائے اردو نے کیا جب کہ تیسرا مکمل طور پر خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ بیگم سید احمد اس اجلاس کی صدر تھیں۔ اس موقع پر بیگم شریف، بیگم حافظ اور ثریا سلیم صاحبہ نے تقاریر کیں۔

ڈاکٹر عبدالحق کے علمی خطابات: ڈاکٹر عبدالحق نے اس روز دو تقریریں کیں۔ ایک صبح صادق ایجرٹن کالج میں اور دوسری شام ٹاؤن ہال میں۔ ان دونوں تقریروں کو ملا کر اُن کا جامع صدارتی خطاب مکمل ہوا۔ حسبِ روایت، ان کا خطاب ایک علمی مقالہ تھا جو اردو کو برصغیر کے عوام کی زبان کے طور پر تسلیم کیے جانے کے نظریے پر مبنی تھا۔ اُن کی گفتگو میں جذبات کم اور دلائل و حقائق زیادہ تھے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ اردو کو پاکستان کی "لینگوا فرانکا" تسلیم کیا جانا ناگزیر اور ناقابلِ تردید ہے۔ انھوں نے زبان کے مسئلے کو سیاستدانوں کی نااہلی کا شکار قرار دیا اور تنبیہ کی کہ اگر یہی روش جاری رہی تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ ٹاؤن ہال کے خطاب کے اختتام پر بابائے اردو نے انکشاف کیا کہ انجمن، مغربی پاکستان میں ایک اردو یونیورسٹی کے قیام کی منصوبہ بندی کر رہی ہے جس کے لیے جلد ہی جگہ کا تعین کیا جائے گا اور مالی معاونت کے لیے ایک مہم بھی شروع کی جائے گی۔

ادبی و فقاہی اجلاس: ریاست کے اندر اور باہر سے آئے مندوبین نے اردو زبان پر مختلف مقالے پڑھے۔ خواجہ شفیع دہلوی کا مزاحیہ لہجے میں لکھا گیا مقالہ ''اردو کا دربار'' خاص طور پر پسند کیا گیا۔

اختتامی اجلاس اور مشاعرہ:

3 مئی کو سورج غروب ہونے کے بعد کانفرنس کا اختتامی اجلاس منعقد ہوا جس کا آغاز سخت لب و لہجے پر مبنی قراردادوں سے ہوا جنھیں بعد میں مزید پر اثر تقریروں نے تقویت بخشی۔ اجلاس کی صدارت مولوی فیض محمد (ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر بہاول پور) نے کی۔ قراردادوں کے بعد ایک بھرپور مشاعرہ منعقد ہوا، جس کے لیے ٹاؤن ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ صدارت کے فرائض خواجہ شفیع دہلوی نے انجام دیے۔ حسبِ روایت کچھ تنقیدی آوازیں، سیٹیاں اور ہوٹنگ بھی سننے میں آئیں، لیکن ظہیر

کاشمیری، حیدر دہلوی، نازش اور دیگر ممتاز شعرانے مشاعرہ لوٹ لیا۔ یہ مشاعرہ رات 2 بجے تک جاری رہ اور یوں تین روزہ اردو کانفرنس اختتام پذیر ہوئی۔

اختتامیہ: یہ تمام تر کامیابی اُن منتظمین کے مرہونِ منت ہے جنھوں نے انتھک محنت سے اس کانفرنس کو یادگار اور تاریخی بنا دیا!

(10) تیسری آل بہاول پور ریاستی اساتذہ کانفرنس

ایک راہرو کے قلم سے

مطبوعہ: بہاول پور ریویو شمارہ 6 جلد جنوری 1954

بہاول پور حکومت ریاست میں تعلیمی معیار کو بہتر بنانے اور ریاستی اساتذہ کی حالت سنوارنے کے لیے ہر ممکن کوششیں کر رہی تھی۔ اس نے اپنے سالانہ تعلیمی بجٹ میں پانچ گنا سے زائد اضافہ کیا یعنی 48-1947 میں 8,28,920 روپے سے بڑھا کر 54-1953 میں 45,92,570 روپے کر دیا گیا۔ دوسری طرف ریاستی اساتذہ نے بھی متحد ہو کر جہالت کے داغ کو اپنی سرزمین سے مٹانے کا عزم کر لیا تھا۔ انھوں نے " آل بہاول پور سٹیٹ ٹیچرز کانفرنس" کے ذریعے اپنے وسائل یکجا کر کے حکومت کی ترقی پسند تعلیمی پالیسیوں سے بھرپور تعاون کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ نہ صرف تعلیم کی رفتار تیز کی جا سکے بلکہ اپنی فلاح و بہبود اور بہتری بھی ممکن ہو سکے۔ ان کی انجمن کا نصب العین تھا": حقوق اور فرائض کے مسائل کو خوش اسلوبی سے حل کرنا۔"

تیسری آل بہاول پور اسٹیٹ ٹیچرز کانفرنس کا دو روزہ اجلاس بغداد الجدید میں گذشتہ سال کے آخری اور نئے سال کے پہلے دن منعقد ہوا۔ یہ کئی لحاظ سے ایک یادگار تقریب تھی۔ یہ اجلاس ریاست بھر سے اسکول اساتذہ کو اکٹھا کرنے کے ساتھ ساتھ پنجاب کے نمایاں اساتذہ کی نمائندگی

سے بھی معطر ہوا۔ پاکستان کے وزیر تعلیم اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جیسے جلیل القدر ماہرین تعلیم نے اپنے پیغامات بھیجے۔ کانفرنس کی نمایاں خصوصیات میں اساتذہ اور طلباء کی دلچسپیوں (Hobbies) کی نمائش، قرآن پاک کی بین الاقوامی طرزِ تلاوت کی پیشکش اور ایک مشاعرے کا انعقاد شامل تھا۔

نمائش: کانفرنس کے پہلے دن "دلچسپیوں کی نمائش" (Hobbies) (Exhibition کا افتتاح خان بقا محمد خان، سیکریٹری تعلیم اور ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے صادق ڈین ہائی اسکول میں کیا۔ یہ نمائش اساتذہ اور نوجوان طلباء کی مختلف تخلیقی سرگرمیوں پر مشتمل تھی جو اسکول کے مرکزی ہال اور ایک بڑے ملحقہ کمرے تک پھیلی ہوئی تھی۔ نمائش میں کتابیں، رسالے، نقشے، خاکے، میزوں کی سجاوٹ، جرابیں، اُونی اشیاء، کیلنڈر، دیوار پر لٹکانے والی آرائشی اشیاء) خالی سگریٹ کے پیکٹوں یا پلائی ووڈ سے تیار کی گئی (اور مٹی یا لکڑی کے بنے ہوائی جہازوں اور دیگر ماڈل شامل تھے۔ بہترین نمائش میں نوجوان طلباء کے بنائے ہوئے قومی رہنماؤں کے پینسل سے کھینچے گئے اور رنگین خاکے شامل تھے جن میں نہ صرف ان کی مہارت بلکہ حب الوطنی اور قومی جذبہ بھی جھلکتا تھا۔ " آرٹ ماسٹر " اپنی تخلیقات کے ساتھ کھڑے ہوکر مہمانوں کو ان کی وضاحت کرتے رہے۔ ایک دلچسپ منظر یہ تھا کہ دور دراز علاقوں کے اسکول بھی اس نمائش میں شریک ہوئے تھے اور ان کی نمائندگی بھی دکھائی گئی تھی۔ اس نمائش میں ایک دلگیر منظر بھی پیش کیا گیا: بینائی سے محروم اسکول کے طلباء نے "بریل" نظام کا مظاہرہ کیا۔ دس سالہ ایک نابینا لڑکے نے کرسی کا بان بننے کا مظاہرہ کیا جب کہ ڈائریکٹر تعلیم خان بقا محمد خان نے ایک تحریر بول کر سنائی، جسے نابینا طالب علم نے حرف بہ حرف درست تحریر کیا۔ یہ منظر مقامی آبادی میں زبردست دلچسپی اور پذیرائی کا باعث بنا۔

پہلا اجلاس: دوپہر کو کانفرنس کا پہلا اجلاس نیو کالج کے ہال میں ہوا جس کی صدارت خان بقا محمد خان نے کی۔ پروفیسر ایف۔ ایم۔ خان (ایم ایڈ، فل برائٹ اسکالر) مرکزی ٹریننگ کالج لاہور نے " ثانوی اسکولوں میں ریاضی کی تدریس" پر افتتاحی لیکچر دیا۔ اس کے بعد صادق ایجرٹن کالج، بہاول پور کے پروفیسر محمد اعظم خان نے "بچوں کی تعلیم کے موجودہ مسائل" پر خطاب کیا اور اپنی کتاب

سے اقتباسات پیش کیے۔ محترمہ ایف۔ ایم۔ شاہ، ڈپٹی انسپکٹریس گرلز اسکولز بہاول پور ریاست، نے "بہاول پور ریاست میں لڑکیوں کی تعلیم" پر ایک شاندار مقالہ پڑھا جس کا مرکزی نکتہ تھا": اگر آپ ایک لڑکے کو تعلیم دیتے ہیں تو ایک فرد کو تعلیم دیتے ہیں لیکن اگر آپ ایک لڑکی کو تعلیم دیتے ہیں تو ایک خاندان کو تعلیم دیتے ہیں۔" اس کے بعد محکمہ تعلیم کے خصوصی ڈیوٹی آفیسر جناب علامہ شبیر بخاری نے "اجتماعی تعلیم" (Mass Literacy) پر مقالہ پیش کیا جس میں بہاول پور حکومت کے پانچ سالہ تعلیمی منصوبے کا تفصیل سے ذکر کیا گیا۔ اندھے اسکول کے استاد جناب شوکت علی نے بریل سسٹم میں "اندھے افراد کے مسائل" پر ایک پراثر اور دل کو چھو لینے والا مقالہ پیش کیا جسے سامعین نے بہت سراہا۔ آخری مقالہ "بچوں کی نفسیات" پر تھا جو ہارون آباد ہائی سکول ہیڈ ماسٹر جناب ایم۔ اے شاہ نے پیش کیا۔ تلاوت قرآن پاک: اسی شام 6:30 بجے کالج ہال میں "بزمِ قرأت" منعقد ہوئی۔ قاری سردار محمد نے اس تقریب کی صدارت کی اور مصری، یمنی، مکی، مدنی اور پنجابی طرزِ تلاوت کے نمونے پیش کیے۔ انھوں نے ہر طرز کی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا۔ بعد ازاں ایک زبردست مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مقامی شہریوں اور اساتذہ نے بھرپور شرکت کی۔

دوسرا دن: دوسرے دن کا پہلا اجلاس یکم جنوری 1954ء کو پروفیسر ایف۔ ایم۔ خان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر محمد علی باجوہ (صدر، پنجاب ٹیچرز یونین) نے خطاب کرتے ہوئے بہاول پور کے اساتذہ کو سب سے مضبوط تنظیم قائم کرنے پر مبارکباد دی اور امید ظاہر کی کہ مزید محنت سے وہ ریاست سے ناخواندگی کا داغ مٹا دیں گے۔ مسٹر محمد خان (صدر، آل اسٹیٹ ٹیچرز کانفرنس) نے پنجاب کے اساتذہ کا شکریہ ادا کیا اور راولپنڈی، سیالکوٹ اور دیگر یونینز کے وفود کی شرکت پر اظہارِ مسرت کیا۔

وزیر تعلیم کا خطاب: دوسرے دن کا دوسرا اجلاس صبح 11 بجے ایس۔ ای۔ کالج میں منعقد ہوا جس کی صدارت عالی مرتبت راؤ حفیظ الرحمٰن خان (وزیر تعلیم ریاست بہاول پور) نے کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا": آپ مستقبل کے معمار ہیں۔ آپ کی محنت، بصیرت اور جذبہ قوم کی خوشحالی کی ضمانت ہے۔ میری تمام امیدیں آپ کی کوششوں سے وابستہ ہیں۔" تعلیم ہی وہ بنیاد ہے جس پر

ایک ایسا معاشرہ قائم ہوسکتا ہے جہاں بھوک، ناخواندگی اور بیماری نہ ہو۔ میں مطمئن ہوں کہ آپ نے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھ لیا ہے۔" انھوں نے آل اسٹیٹ ٹیچرز کانفرنس کو ایک فعال اور کارآمد تنظیم قرار دیا۔

پیغامات: کانفرنس کے صدر مسٹر محمد خان نے وزیر تعلیم پاکستان ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر بشیر احمد سمیت دیگر اکابرین تعلیم کے پیغامات پڑھ کر سنائے۔

(11) نظامِ تعلیم عامہ

دینی اور عصری تعلیم کے امتزاج کا منصوبہ

راؤ حفیظ الرحمٰن خان، وزیرِ تعلیم

مطبوعہ۔ بہاول پور ریویو شمارہ 1 جلد 1 اگست 1953

تعلیم، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کسی بھی قوم کی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے تناظر میں، جب ہمیں نہ صرف اپنا مستقبل خود تراشنا ہے بلکہ دنیا کی آزاد اقوام کی صف میں باوقار مقام حاصل کرنا ہے تو تعلیم کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ میرے خیال میں تعلیمی صورتحال پورے پاکستان میں یکساں ہے مگر چوں کہ میں بہاول پور کے تعلیمی مسائل سے براہِ راست وابستہ رہا ہوں اس لیے میں کچھ حقائق اور اعداد و شمار پیش کرنا چاہتا ہوں تا کہ اس خطے میں جہالت کی سنگینی کا اندازہ ہوسکے۔

آخری مردم شماری میں یہ انکشاف ہوا کہ ہماری شرحِ خواندگی محض پانچ فیصد ہے۔ اگر چہ بعض دیگر علاقوں میں یہ شرح کچھ بہتر ہوسکتی ہے لیکن یہ امر واضح ہے کہ ہم اُن ترقی یافتہ ممالک سے

کس قدر پیچھے ہیں جہاں شرحِ خواندگی 98 فیصد تک پہنچ چکی ہے۔ بہاول پور ریاست کا کل رقبہ 17,471 مربع میل ہے اور آبادی 18 لاکھ 23 ہزار 200 نفوس پر مشتمل ہے۔ تمام تر کوششوں اور حالیہ پیش رفت کے باوجود یہاں محض 696 اسکول اور 260 مکاتب قائم کیے جا سکے ہیں جب کہ دیہاتوں کی تعداد 2654 ہے۔ اس ضمن میں پیش رفت کرنے کی رفتار یقیناً باعثِ تشویش ہے۔ اس تاخیر کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ نجی شعبے کی شمولیت نہ ہونے کے برابر ہے اور تعلیمِ عامہ کی تمام تر ذمہ داری ریاستی حکومت پر آن پڑی ہے جو پہلے ہی شدید مالی دباؤ اور اقتصادی چیلنجز کا شکار ہے۔

یہ بات کسی باشعور فرد سے پوشیدہ نہیں کہ جب تک ہم مختصر مدت میں تعلیم کو عام نہیں کرتے، ہم نہ صرف قومی بقا کی ضمانت نہیں دے سکتے بلکہ آزادی کے ثمرات سے بھی محروم رہیں گے۔ چناں چہ یہ ناگزیر ہو گیا کہ ہم ایک جامع اور قابلِ عمل حل کی جانب بڑھیں۔ بہاول پور حکومت اس ضرورت سے پوری طرح باخبر تھی اور اس نے حقیقی معنوں میں عوام کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا عزم کیا وہ بھی جتنی جلد ممکن ہو چناں چہ ملک کے ممتاز ماہرین تعلیم کے ساتھ طویل مشاورت کے بعد ایک قابلِ تقلید منصوبہ مرتب کیا گیا جو اشتراکی کاوشوں پر مبنی ایک انقلابی اقدام ہے۔ اس ماڈل کو معمولی ترمیم کے ساتھ پاکستان کے دیگر حصوں میں بھی نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس اسکیم کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تعلیم کا ہدف صرف بچوں کو خواندہ بنانا نہیں بلکہ انھیں باکردار، سچے اور ذمے دار شہری بنانا بھی ہے لہٰذا، محض خواندگی کی شرح بڑھانا کافی نہیں بلکہ تعلیم کے معیار، مقصد اور اخلاقی جہت پر بھی بھرپور توجہ دینا لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس منصوبے میں کردار سازی کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے اور یہ اصول مدنظر رکھا گیا ہے کہ "صحتمند ذہن صحتمند جسم میں پروان چڑھتا ہے۔" ایک اور اہم اصول جسے بہاول پور کے پرائمری اور سیکنڈری نظامِ تعلیم کی تشکیل میں مدنظر رکھا گیا یہ تھا کہ کوئی قوم اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی جب تک وہ اپنی ثقافت سے جڑی نہ رہے، اپنی تاریخ پر فخر نہ کرے اور ساتھ ساتھ ترقی پسند، وسیع النظر اور سائنسی سوچ کو نہ اپنائے۔ طلبہ میں تنگ نظری، فرقہ پرستی یا رجعت پسندی کے رجحانات کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ ان میں تجسس، سوال اٹھانے، تحقیق اور سچائی تک رسائی کا جذبہ ہونا چاہیے تاہم، یہ سائنسی طرزِ فکر مادہ پرستی کی طرف

جھکاؤ نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ نہ صرف عبادات اور رسوم کا مجموعہ ہے بلکہ ایک عقلی، اخلاقی اور متوازن طرزِ زندگی کی دعوت دیتا ہے۔ ایک سچے مسلمان کی زندگی میں مذہب اور دنیاوی امور جداگانہ خانوں میں تقسیم نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں کو ہم آہنگی کے ساتھ یکجا کرنا ایک متوازن، باکردار اور مہذب شخصیت کی تشکیل کے لیے ناگزیر ہے۔ ہمارا موجودہ تعلیمی نظام دینی اقدار اور عصری علوم کے امتزاج سے خالی تھا۔ یہی خلا معاشرے میں فکری انتشار اور اخلاقی زوال کا سبب بن رہا تھا۔ پاکستان کے طول و عرض میں اس بات کا احساس شدت سے پیدا ہو رہا تھا کہ نصاب اور تعلیمی نظام کی فوری اصلاح ضروری ہے۔ اسی مقصد کے لیے بہاول پور حکومت نے ملک بھر سے ممتاز ماہرین تعلیم اور علماء کو دعوت دی تاکہ وہ ایک ایسا متوازن تعلیمی ماڈل تیار کریں جو دینی اور دنیاوی تعلیم کے مابین حائل خلیج کو پاٹ سکے۔ ان مشاورتوں کا نتیجہ نہایت حوصلہ افزا رہا۔ ایک گیارہ سالہ جامع نصاب وضع کیا گیا جس میں جدید تعلیمی نظام، دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کو ہم آہنگ کر کے ایک متوازن اور نتیجہ خیز تعلیمی خاکہ تشکیل دیا گیا۔ اس کا اجمالی خاکہ یوں ہے:

- پہلا مرحلہ "ورود" کہلاتا ہے جو ابتدائی جماعت (پرائمری) کے مساوی ہوگا؛
- دوسرا مرحلہ تین سالہ "رُشد" کہلاتا ہے، جو متوسط (مڈل) درجے کے برابر ہوگا؛
- تیسرا مرحلہ تین سالہ "عبور" پر مشتمل ہوگا، جو میٹرک کے مساوی تسلیم کیا جائے گا۔

یہ نیا تعلیمی ڈھانچہ اسلامی اصولوں کے مطابق ہوگا اور اس سے موجودہ نظامِ تعلیم کی کئی خامیاں، تضادات اور فکری بحران ختم ہو سکیں گے۔ ابتدائی طور پر ورود کی سطح کو جامعہ عباسیہ میں تجرباتی طور پر نافذ کیا گیا ہے — ایک ایسا ادارہ جہاں اب تک صرف دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ ورود کا یہ مرحلہ اب ریاست بھر میں نافذ کیے جانے کے لیے تیار ہے۔ اب میں اس منصوبے کے اُس پہلو کی طرف آتا ہوں جو براہِ راست تعلیمِ عامہ سے متعلق ہے اور جس کے ذریعے اِسے وسیع پیمانے پر قابلِ عمل بنایا گیا ہے۔ پاکستان کے ہر گاؤں میں تقریباً مسجد موجود ہے اور تقریباً ہر مسجد میں ایک امام مقرر ہوتا ہے جو پنجگانہ نماز کی امامت کرتا ہے؛ بعض مقامات پر وہ بچوں کو قرآنِ مجید کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ ہر باشعور مسلمان جانتا ہے کہ ماضی میں مسجدی مکتب ہی صدیوں تک مسلمانوں کا ابتدائی تعلیمی ادارہ رہا ہے۔

انھی اداروں سے بڑے بڑے مفکرین، ادباء، شعرا، محدثین اور سائنسدان پیدا ہوئے۔ بہاول پور حکومت نے جب اعداد و شمار کا تفصیلی مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر مساجد کے اس روایتی تعلیمی کردار کا احیا کر دیا جائے اور مکتب کو ابتدائی تعلیم کی باقاعدہ اساس بنایا جائے تو تعلیمِ عامہ کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو سکتا ہے۔ اس طریقے سے حکومت اپنے محدود مالی وسائل کے باوجود ناخواندگی کے خلاف جنگ لڑ سکتی ہے اور وہ بھی کسی اضافی مالی بوجھ کے بغیر۔ اسی مقصد کے تحت، حکومت نے ایک وسیع سروے کرایا تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ مساجد، اماموں، مکاتب اور وقف جات کی جو آمدنیاں غیر منظّم طریقے سے استعمال ہو رہی ہیں انھیں کیسے مربوط اور بامقصد بنایا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ان مالی ذرائع کو ایک منظّم طریقے سے استعمال کیا جائے تو ہر مسجد میں ایک ورود اسکول قائم کیا جا سکتا ہے جہاں بچوں کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ ابتدائی دنیاوی تعلیم بھی دی جائے اور ان میں شہری شعور، فرائض کی پہچان اور اخلاقی تربیت پیدا کی جائے۔ اس اسکیم کے نفاذ کے لیے دیہاتی آبادی کو صرف اتنا کرنا ہوگا کہ وہ اپنی مسجد کے لیے ایسا امام منتخب کریں جو تعلیم بھی دے سکے یعنی کم از کم پرائمری سطح تک بچوں کو پڑھا سکے۔ اس مقصد کے لیے حکومت نے ایسے اماموں کو تربیت دینے کا منصوبہ بنایا ہے جو "معلمین" کہلائیں گے یعنی ایسے دینی و دنیاوی اُستاد جو تدریس کے بنیادی اصولوں اور اسلامی تعلیمات (نماز، اخلاق، تہذیب) کی تربیت حاصل کریں گے۔ ان معلمین کی تربیت کے لیے حکومت پندرہ موبائل تربیتی مراکز قائم کر رہی ہے۔ یہ منصوبہ صرف تعلیمی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ نفسیاتی طور پر بھی بے پناہ اثر انگیز ہوگا۔ اس کی کامیابی عوام کے بھرپور تعاون سے مشروط ہے جسے مناسب تشہیر، آگاہی مہم اور شخصی رابطوں کے ذریعے حاصل کیا جائے گا۔ اگر یہ اسکیم کامیاب ہو جاتی ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہوگی تو پاکستان کے ہر گاؤں میں ایک نہ ایک ابتدائی اسکول قائم ہو جائے گا بغیر کسی اضافی بوجھ کے، نہ حکومت پر، نہ عوام پر۔ ان ورود اداروں کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ مڈل اور ہائی اسکولوں کی طلب بھی بڑھے گی۔ چوں کہ ابتدائی تعلیم پر خرچ کی بچت ہوگی، اس بچت کو مڈل اور ہائی اسکولوں کے قیام پر استعمال کیا جائے گا۔ اس طرح جیسے ہی ورود نظام مکمل طور سے رائج ہوگا، تعلیمی ترقی کا اگلا مرحلہ یعنی ثانوی تعلیم خود بہ خود شروع ہو جائے گا۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ اس

منصوبے کو ریاست کے تمام طبقات، خصوصاً دیہی علاقوں میں، بہت مثبت پذیرائی ملی ہے۔ اگر اُن تمام افراد کا تعاون حاصل ہو جائے جن پر اس عوامی اسکیم کے انتظام کی ذمہ داری ہے تو ہمیں یقین ہے کہ مختصر ترین مدت میں ناخواندگی کا خاتمہ ممکن ہو سکے گا۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ بہاول پور کا تعلیمی منصوبہ ایک مثالی ماڈل ہے۔ یہ منصوبہ بہتر بنانے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے ہر طرح کی تعمیری تنقید، اصلاحی مشورے اور مفید تجاویز کا خیر مقدم کیا جائے گا تاہم، جو بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ معاشی حالات میں اور دستیاب وسائل کے ساتھ، یہ واحد قابلِ عمل اور نتیجہ خیز حل تھا۔ ذاتی طور پر مجھے اس منصوبے کی افادیت، دیانت داری اور مؤثریت پر پورا یقین ہے اور مجھے اُمید ہے کہ ورود اسکول بہت جلد پاکستان کے ہر گوشے میں قائم ہوں گے — علم، کردار، اور خدمتِ خلق کا پرچم تھامے۔

(12) صادق پبلک اسکول بغداد الجدید کی افتتاحی تقریب

بہاول پور ریویو: شمارہ 6 جلد 1 جنوری 1954

کوئی ملک اس وقت تک ترقی اور خوشحالی حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس کے عوام کو صحیح طور پر تعلیم نہ دی جائے تا کہ وہ اپنے گرد و پیش میں ہونے والے حالات کو سمجھ سکیں اور نیکی و بدی میں تمیز کر سکیں۔ موجودہ تیز رفتار دور میں تعلیم کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے کیوں کہ اب ہماری قوم بنیادی حقوق کے حصول، جمہوریت کے ثمرات اور ترقی یافتہ اقوام میں بلند مقام حاصل کرنے کی خواہاں ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وسیع مالی وسائل، محتاط منصوبہ بندی اور نئے اور بہتر تعلیمی طریقے ناگزیر ہیں تا کہ ہمارے تعلیمی ادارے محض بابو اور چھوٹے موٹے روزگار کے متلاشی پیدا کرنے کے بجائے ایسے نوجوان تیار کریں جو مضبوط کردار، وسیع صلاحیتوں اور بلند حوصلے کے ساتھ ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے اہل ہوں۔

ریاست بہاول پور کا حکمران خاندان جو عباسی خلفائے بغداد کی نسل سے ہے، علم و حکمت کے مرکز کے طور پر پوری دنیا میں مشہور رہا ہے۔ انھوں نے مشرق میں علم وفن کے دلدادہ کی حیثیت سے خود کو ممتاز کیا۔ بڑے بڑے جاگیری عطیہ کر کے انھوں نے مذہبی اداروں کو فروغ دیا جو اُس وقت تعلیم وروشنی کے مراکز تھے۔ یہ سب ان کے عظیم آباؤ اجداد کی روایات کو زندہ رکھنے کی عملی تصویر ہے۔ تعلیم کے میدان میں ان کی کوششیں آج بھی بغیر رکے جاری ہیں اور تسلی بخش ترقی حاصل ہو رہی ہے۔ ریاست بہاول پور نے موجودہ تعلیمی منصوبہ بندی کے تحت، جو آئندہ پانچ برسوں میں خواندگی کی شرح کو پانچ سے ستر فیصد تک لے جانے کا ہدف رکھتی ہے، یہ بھی محسوس کیا کہ ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہے جو نوجوانوں کو اس انداز میں تربیت دے کہ وہ مستقبل میں اعلیٰ منتظمین، ماہرین تعلیم، سائنس دان، انجینئر اور سفارت کار بن سکیں۔ ماہرین نے اس منصوبے پر غور کیا، اس کی افادیت اور ضرورت کو تسلیم کیا، منصوبہ جات تیار کیے گئے، ضروری رسمی کارروائیاں مکمل ہوئیں اور پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ نے عملی کام شروع کر دیا۔ اس ادارے کی بنیاد اعلیٰ حضرت سرکارِ عالی، امیر بہاول پور نے 4 مارچ 1953ء کو رکھی۔ منصوبے کے مطابق ایک کشادہ اور خوب صورت عمارت تعمیر کی جانی تھی جس میں 240 طلبہ، 150 عملے کے افراد، بنگلے، اسپتال، مسجد، عملے کے رہائشی کوارٹرز، کھیل کے میدان اور پانی کی فراہمی کا نظام شامل تھا اور اس پر تقریباً 12 لاکھ روپے کی لاگت کا تخمینہ لگایا گیا تھا۔ 4 مارچ 1953ء کو جب اعلیٰ حضرت نے سنگ بنیاد رکھا تو شاید ہی کسی کو امید تھی کہ اتنے قلیل عرصے میں اتنے بڑے تعمیری منصوبے، تربیت یافتہ عملے کا تقرر اور دیگر ضروریات کی تکمیل ممکن ہوگی۔ لیکن جیسا کہ کہا جاتا ہے، بہاول پور حکومت کے پاس "جادو کی چھڑی" یا "اللہ دین کا چراغ" موجود تھا۔ بہاول پور فارسٹ ریزرو کے بالمقابل، ڈیرہ نواب صاحب جانے والی سڑک کے بائیں جانب، 150 ایکڑ پر مشتمل جنگلی جھاڑیوں اور زمین کی قدرتی ناہمواریوں کو بلڈوزروں اور سینکڑوں مزدوروں کی محنت سے ہموار کر کے تعمیراتی کام شروع کیا گیا۔ چند ہفتوں میں زمین برابر کر دی گئی، عمارتیں اور عملے کے مکانات بننے لگے اور وسط جنوری 1954ء تک اسکول استعمال کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ "یہ سب کچھ محض نو مہینے کے مختصر عرصے میں نوجوان چیف منسٹر کی ذاتی دلچسپی اور انتھک محنت کی بدولت ممکن ہوا

جنھوں نے سنگ بنیاد کے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ صادق پبلک اسکول ایک سال کے اندر مکمل ہو جائے گا۔ اگر چہ اعلیٰ حضرت امیر بہاول پور کی طبیعت ناساز تھی لیکن انھوں نے 18 جنوری 1954ء کو صادق پبلک اسکول کی افتتاحی تقریب میں شرکت فرمائی اور صادق گڑھ محل ڈیرہ نواب صاحب سے بغدادالجدید تشریف لائے۔

عظیم الشان افتتاحی تقریب: اسکول کی مرکزی عمارت کے سامنے ایک عظیم الشان تقریب منعقد ہوئی جس میں گورننگ کونسل، عالی مرتبت مشیر اعلیٰ، وزراء، بہاول پور قانون ساز اسمبلی کے اراکین، میونسپل کمشنر اور دیگر معززین شریک ہوئے۔ تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا جس کے بعد پرنسپل خان انور سکندر نے خطاب کیا": اعلیٰ حضرت کی خدمت میں عرض ہے": آج سے ایک برس قبل جہاں ہم کھڑے ہیں وہاں صرف سنسان میدان تھا مگر آپ کی عنایت سے 4 مارچ 1953ء کو یہاں سنگ بنیاد رکھا گیا اور صرف نو ماہ کے اندر یہ ویران میدان سرسبز لانز، کھیل کے میدانوں اور خوب صورت عمارتوں میں تبدیل ہو گیا۔ اسکول بلاک، سینئر اور جونیئر بورڈنگ ہاؤس، عملے کے مکانات، اور دیگر عمارتیں مکمل ہو چکی ہیں۔ مزید ایک سال میں ماڈل جونیئر اسکول، دو سوئمنگ پولز، اسپتال اور دیگر سہولیات بھی مکمل کر لی جائیں گی اور آج پچاس بچوں کا یہ اسکول شہد کے چھتے کی مانند گونج رہا ہے۔

چیف منسٹر کی درخواست: پرنسپل کے بعد چیف منسٹر مخدوم زادہ سید حسن محمود نے خطاب کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ": حکومت کی تیز رفتار ترقی آپ کی دانائی اور سرپرستی کی مرہون منت ہے۔ ہم آپ کے حکم سے یہ ادارہ کھولنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔"

اعلیٰ حضرت کا افتتاحی خطاب؛ اعلیٰ حضرت نے اپنے خطاب میں فرمایا": جب میں نے گذشتہ برس 4 مارچ کو اس عظیم الشان اسکول کا سنگ بنیاد رکھا تھا تو مجھے یقین نہ تھا کہ ایک سال کے اندر اندر یہ ادارہ اس شان سے مکمل ہو جائے گا۔ میں ریاستی حکومت اور نوجوان چیف منسٹر کی مخلصانہ کوششوں کو سراہتا ہوں۔ میں یہ بھی خوشی سے دیکھ رہا ہوں کہ تعلیم ریاست کے دور افتادہ علاقوں تک پہنچ رہی ہے اور مدارس و مسجدوں کے تعلیمی نظام کو بھی زندہ کیا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خان انور اسکندر، بطور

پرنسپل، اسے کامیابی کی بلندیوں پر پہنچائیں گے۔ بہاول پور پاکستان کی دوسری اکائیوں سے کسی طور پیچھے نہیں ہے۔ بہاول پور پائندہ باد، پاکستان زندہ باد۔" آخر میں اعلیٰ حضرت نے ربن کاٹ کر صادق پبلک اسکول کا باقاعدہ افتتاح کیا۔

(13) صادق ایجرٹن کالج

پنجاب یونیورسٹی کے ابتدائی پانچ کالجوں میں سے ایک

پروفیسر اے۔ ایم۔ دلشاد کلانچوی

مطبوعہ: بہاول پور ریویو شمارہ 1 جلد 2 اپریل 1954

1882 میں ریاست بہاول پور میں سب سے پہلا تعلیمی ادارہ قائم ہو جسے "ایجرٹن اپر اسکول" کا نام دیا گیا۔ یہ نام اس وقت کے پنجاب اور اس کے ماتحت علاقوں کے لیفٹیننٹ گورنر کے نام پر رکھا گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا ادارہ تھا مگر اسی نے ریاست میں تعلیمی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اسی سال پنجاب یونیورسٹی کا قیام بھی ہوا اور نواب صادق محمد خان چہارم عباسی (1899–1866) کو یونیورسٹی کے اولین فیلوز میں شامل کیا گیا۔

صرف چار سال بعد ہی ایجرٹن اپر اسکول کو پنجاب یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کلاسز کے لیے الحاق مل گیا اور اس کا نام "صادق ایجرٹن کالج" رکھ دیا گیا۔ اس کالج کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ پنجاب میں قائم ہونے والے ابتدائی پانچ کالجوں میں سے ایک ہے۔ آغاز سے ہی یہ ادارہ ہر قوم، مذہب اور طبقے کے طلبہ کے لیے کھلا رہا ہے۔ 1892 میں اس ادارے کو ڈگری کالج کے درجے پر ترقی دی گئی اور بی۔ اے کلاسز کا آغاز ہوا۔ بدقسمتی سے یہ کلاسز 1900 میں بند کرنا پڑیں۔ بیسویں صدی کی پہلی سہ ماہی میں کالج میں کوئی خاص ترقی نہ ہوسکی۔ چار گریجویٹ پرنسپلز نے باری باری ادارے کو

سنبھالا لیکن ڈگری کلاسز نہ ہونے کی وجہ سے تعلیمی ترقی نہ ہوسکی۔ 1907 میں کالج کی عمارت کی توسیع کی گئی تاکہ میٹرک طلبہ کو سہولت دی جاسکے۔ یہ عمارت اب صادق ڈین ہائی اسکول کے نام سے جانی جاتی ہے۔ صدی کی دوسری سہ ماہی کے آغاز پر ڈگری کلاسز دوبارہ شروع ہوئیں۔ اس وقت کالج کے پرنسپل مشتاق احمد زاہدی بی۔اے تھے جنھوں نے 1934 تک اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا۔ 1927 میں انٹرمیڈیٹ سطح پر سائنس (نان میڈیکل) کی تدریس کے انتظامات کیے گئے۔ ایف۔ ایس سی (میڈیکل) کی سہولتیں بھی تقسیم سے چند سال قبل مہیا کی گئیں۔

ان اصلاحات کے علاوہ خاص طور پر مقامی طلبہ کی تعداد میں دیگر طلبہ کی تعداد کی نسبت خاص اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے اُن طلبہ کو فیس اور ہوسٹل کے کرایے سے مستثنیٰ قرار دیا تھا جن کے والدین یا سرپرستوں کی ماہانہ آمدنی سو روپے سے کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ڈگری کالج سے فارغ التحصیل طلبہ کی کئی جماعتیں نکلیں جنھیں ریاستی حکومت نے مزید تعلیم کے لیے پنجاب یونیورسٹی یا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلے کے لیے معاونت فراہم کی۔ ان میں سے بیشتر نے اعلیٰ کامیابی حاصل کی اور ریاست میں واپس آ کر مختلف شعبوں میں خدمات انجام دیں۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ آج ہمارے گریجویٹس اور پوسٹ گریجویٹس بہاول پور ریاست میں یا تو سرکاری اداروں میں خدمات انجام دے رہے ہیں یا ذاتی کاروبار میں مشغول ہیں۔

اس صدی کی دوسری سہ ماہی کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے میں تاریخ کے ممتاز طالبعلم شیخ عبدالمجید ایم۔اے۔ کا ذکر کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا جنھوں نے تین مرتبہ کالج کے پرنسپل کے طور پر خدمات انجام دیں۔ جب اُنہیں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کے طور پر ترقی دی گئی تو ان کی جگہ انگریز پرنسپل ایرک چارلس ڈکنسن (M.A. Honours,Oxon) نے 1950 میں کالج سنبھالا۔ پرنسپل ڈکنسن نے کالج کی بہتری کے لیے کئی جرات مندانہ اقدامات کیے، تاہم وہ زیادہ کام نہ کر سکے کیوں کہ وہ 17 دسمبر 1951 کو انگلینڈ میں وفات پا گئے جب وہ طویل رخصت پر تھے۔ اسی وقت حافظ عبدالحق ایم۔اے۔ نے پرنسپل کی حیثیت سے چارج سنبھالا۔ انہی کے دور میں کالج کو ایک نئی اور کشادہ عمارت میں منتقل کیا گیا جو اصل میں ایک ہائی اسکول کے لیے مخصوص تھی۔ پرنسپل ڈکنسن کی

ذاتی کوششوں سے اس عمارت میں توسیع کی گئی تا کہ کالج کی ضروریات پوری کی جاسکیں۔ جلد ہی اس نئی عمارت میں ایک آثارِقدیمہ کا عجائب گھر بھی قائم کیا گیا جسے "ڈکنسن آثارِقدیمہ میوزیم" کا نام دیا گیا۔ یہ عجائب گھر حافظ صاحب کی کاوشوں سے پروفیسر ایم۔ڈی۔حسن کی نگرانی میں قائم ہوا جنھوں نے بہاول پور ریاست کے مختلف علاقوں سے تاریخی نوادرات جمع کرنے میں گہری دلچسپی لی۔ تعلیم کے میدان میں بھی ہمارے کالج کو حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی سے متعدد نئے مضامین جیسے سیاسیات، شماریات، سوشیالوجی، اسلامیات وغیرہ میں بی۔اے کی سطح تک الحاق حاصل ہوا۔ اسی طرح ہمارے کالج میں مختلف جامعات سے آئے ہوئے اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کا بھی اچھا خاصا عملہ موجود ہے۔ تدریسی ونگہبانی (Tutorial & Proctorial) نظام بھی کالج میں نافذ ہے جس کا مقصد تعلیم کے معیار کو بلند کرنا اور طلبہ کی اخلاقی تربیت ہے۔ ان کے علاوہ کالج میں درجن سے زائد علمی، سماجی، ادبی، اور ثقافتی سوسائٹیاں فعال ہیں جو طلبہ کی فکری اور سماجی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں معاون ہیں۔ ہماری کالج لائبریری اور ریڈنگ روم میں سینکڑوں موضوعات پر ہزاروں کتابیں، اخبارات اور رسائل طلبہ کو علمی خوراک مہیا کر رہے ہیں۔

کالج کی مطبوعات بھی نہایت سرگرمی سے جاری ہیں۔ اردو میں "نخلستانِ ادب" اور انگریزی میں "Oasis" کے عنوان سے جاری سہ ماہی مجلّات ہمارے کالج کی فکری وادبی ترقی کی عکاس ہیں۔ ان جرائد کے مضامین طلبہ اور اساتذہ کے ادبی ذوق، ذہنی بلوغت اور فکری وسعت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہمارے مجلّہ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ مشہور ادیب احمد ندیم قاسمی، جو 1935 میں اس کالج کے طالبعلم تھے، انہی کی ادارت میں اس میگزین کا اجرا ہوا۔ اسی طرح کئی اور ممتاز شخصیات بھی اس مجلّہ سے وابستہ رہیں۔ کالج کا ایک ماہانہ خبرنامہ بھی پرنسپل کی منظوری سے کالج ڈینز کی نگرانی میں شائع کیا جاتا ہے تا کہ کالج کی سرگرمیوں اور کامیابیوں سے عوام کو باخبر رکھا جا سکے۔ کالج سوشل فنڈ اس ادارے کی ایک منفرد خصوصیت ہے جو پرنسپل کی زیرنگرانی چلایا جاتا ہے۔ اس فنڈ کے ذریعے غریب اور ذہین طلبہ کو تعلیم جاری رکھنے کے لیے مالی امداد دی جاتی ہے۔

مختصراً یہ کہ ہمارا ڈگری کالج گذشتہ چند برسوں سے تعلیم، کھیل، سماجی سرگرمیوں اور اساتذہ

وطلبہ کی تعداد کے لحاظ سے قابلِ ذکر ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ اس سب کا کریڈٹ موجودہ حکومت کو جاتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ان کی مسلسل حمایت سے ہم اس ادارے کو پاکستان میں اپنی نوعیت کے منفرد تعلیمی اداروں میں شامل کر سکیں گے۔

(14) ریاست بہاول پور میں تعلیمی ترقی

تحریر: ایس. فخرالدین محمد بلے بی ایس ای، ادیب کامل (علیگ)

مطبوعہ: شمارہ 2 جلد 1 بہاول پور ریویو ستمبر 1953

ترقی اور خوشحالی کا راستہ ہمیشہ مشکلات اور آزمائشوں سے بھرپور ہوتا ہے لیکن جو قوم کامیابی کے حصول کا پختہ عزم کر لیتی ہے وہ مشکلات اور رکاوٹوں سے گھبراتی نہیں اور نہ ہی یہ مشکلات اس کے قدم روک سکتی ہیں۔ ریاست بہاول پور کے عوام اب اس حقیقت کو بخوبی جان چکے ہیں اور تیزی سے ترقی کی جانب گامزن ہیں۔ انھیں اس بات کا بھی بھرپور احساس ہے کہ وسیع پیمانے پر خواندگی (Literacy) ان کی کامیابی کے لیے ناگزیر ہے۔

بہاول پور مسلم لیگ، جس نے ریاست میں پہلی جمہوری حکومت قائم کی ہے، نے اپنے انتخابی منشور میں دیگر وعدوں کے ساتھ ساتھ خطے سے ناخواندگی کو جلد از جلد ختم کرنے کا بھی عہد کیا تھا۔ لیگ کے منشور نے عوام کو یقین دلایا تھا کہ میٹرک تک تعلیم مفت کر دی جائے گی۔ یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ مسلم لیگ کی حکومت نے عوام کے تعاون اور مدد سے اپنا یہ وعدہ ان طلبا کے لیے پورا کیا ہے جن کے والدین کی ماہانہ آمدنی 200 روپے یا اس سے کم ہے اور اب حکومت عام تعلیم کے لیے مزید وسیع اور بہتر سہولیات فراہم کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے تاکہ چند سالوں کے اندر خواندگی کی موجودہ شرح 5 فیصد سے بڑھ کر 85 فیصد تک پہنچ جائے۔ گذشتہ برسوں میں جو کام سرانجام دیے گئے

ہیں اور اس نیک مقصد کے حصول کے لیے کی گئی کوششوں کی واضح تصویر پیش کرنے کے لیے چند حقائق واعداد کا سامنے لانا ضروری ہے۔

بہاول پور حکومت کا تعلیمی بجٹ ہماری حالیہ کامیابیوں کا واضح آئینہ دار ہے۔ 48-1947ء (قیامِ پاکستان کے وقت) میں یہ بجٹ صرف 8,29,000 روپے تھا جو 54-1953ء میں بڑھ کر 45,92,570 روپے تک جا پہنچا ہے۔ ان چھ سالوں میں ریاست کے طلبہ کی تعداد بھی 35,156 سے بڑھ کر 98,533 تک پہنچ گئی ہے۔ اسی طرح پرائمری اسکولوں کی تعداد 548 سے بڑھ کر 800 ہوگئی ہے اور مزید 45 "وروود" (Warood) پرائمری اسکولوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ سیکنڈری اسکولوں کی تعداد 48 -1947ء کے 72 اسکولوں سے بڑھ کر 188 ہوگئی ہے اور ایک کالج کی جگہ اب ہمارے پاس تین کالج موجود ہیں۔ گذشتہ سال ریاست میں 52 نئے پرائمری اسکول قائم کیے گئے یعنی ہر ہفتے ایک نیا اسکول۔ کئی پرائمری اور لوئر مڈل اسکولوں کو بھی لوئر مڈل اور مڈل معیار تک اپ گریڈ کر دیا گیا ہے۔ ریاست میں خواتین کی تعلیم پر بھی برابر توجہ دی جا رہی ہے۔ 1947 سے 1953 کے دوران لڑکیوں کے لیے 9 نئے اسکول کھولے گئے۔ اب ریاست میں لڑکیوں کے لیے 25 پرائمری، 2 لوئر مڈل، 5 مڈل اور ایک ہائی اسکول موجود ہیں۔ ان کے علاوہ صادق انٹرمیڈیٹ کالج برائے خواتین بہاول پور خواتین کی اعلیٰ تعلیم کا اہم مرکز ہے۔ اس انٹرمیڈیٹ کالج میں اعلیٰ کلاسز بھی قائم ہیں اور یہاں طالبات کی کل تعداد 388 ہے۔ کالج کے لیے ایک وسیع نئی عمارت مکمل ہو چکی ہے اور کالج جلد ہی وہاں منتقل ہو جائے گا۔ ریاست کی تعلیمی کامیابیوں میں ایک اہم خصوصیت مشہورِ زمانہ جامعہ عباسیہ بھی ہے جو دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کی طرز پر قائم مذہبی علوم کا ایک اہم مرکز ہے۔ ریاست بھر میں تقریباً 200 عربی مدارس اس جامعہ سے منسلک ہیں۔ حال ہی میں حکومتِ بہاول پور نے ایک نئی اسکیم شروع کی ہے جس کا مقصد جامعہ عباسیہ کو الازہر یونیورسٹی قاہرہ کے نمونے پر یونیورسٹی میں تبدیل کرنا ہے۔ جامعہ کے لیے ایک نئی عمارت 5 لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کی گئی ہے اور مستقبل میں اس ادارے کا روشن مستقبل نظر آتا ہے۔ محکمہ تعلیم نے کچھ عرصہ قبل ماہر علما و ماہرین تعلیم پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس کی صدارت علامہ سید سلیمان ندوی کے سپرد کی گئی۔

اس کا مقصد جامعہ عباسیہ کے نصاب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا اور مذہبی اور سیکولر تعلیم کو یکجا کرنا ہے تاکہ ہماری تہذیب کے تحفظ کے ساتھ جدید علوم بھی نئی نسل تک منتقل کیے جا سکیں۔

ریاست کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ 40 طلبہ میڈیکل کالجوں میں ریاستی وظائف پر زیر تعلیم ہیں جن میں 5 خواتین بھی شامل ہیں۔ اسی طرح کئی ریاستی طلبہ انجینئرنگ، زراعت اور ویٹرنری کالجوں میں بھی زیر تعلیم ہیں۔ طلبہ اور سرکاری افسران کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے بیرونِ ملک بھی بھیجا جا رہا ہے۔ ہمیں مختلف محکموں کے لیے قابل اور ماہر افراد کی ضرورت ہے اور حکومتِ بہاول پور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن اقدامات کر رہی ہے۔

حکومت نے صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کی ترقی پر بھی بھرپور توجہ دی ہے۔ یہ کالج پاکستان کے قدیم ترین تعلیمی اداروں میں سے ایک ہے۔ گذشتہ سال یہاں 30 ہزار روپے کی لائبریری کتب اور فرنیچر فراہم کیا گیا اور موجودہ سیشن کے اخراجات کے لیے 23 ہزار روپے منظور کیے گئے۔ بی۔ ایس۔ سی کلاسوں کے اجرا کے انتظامات بھی کیے گئے ہیں۔ سماجی ترقی کے لیے ایٹن (Eton) اور ہیرو (Harrow) جیسے پبلک اسکول کا قیام بھی ناگزیر ہے۔ ایسے اداروں کا قیام مشکل ضرور ہے لیکن حقیقی انسان وہ ہیں جو ایسے ادارے تعمیر کر کے اساتذہ اور طلبہ دونوں کا سر فخر سے بلند کر دیتے ہیں۔ ایسے ادارے ہماری نوجوان نسل کے کردار کی تعمیر کرتے ہیں جو مستقبل میں ملت کا سرمایہ ہیں۔

حکومتِ بہاول پور نے ایسے ہی ایک ادارے کی تعمیر کا آغاز کیا ہے جس کا سنگِ بنیاد مارچ 1953ء میں اعلیٰ حضرت سرکارِ عالی نے رکھا۔ اس اسکول (صادق پبلک اسکول بہاول پور) میں ابتدا میں 240 طلبہ کی تعلیم و تربیت ہوگی اور 150 طلبہ کے لیے رہائشی سہولتیں بھی ہوں گی۔ اس سال کے آخر تک یہ اسکول کام شروع کر دے گا۔ تعلیمی اداروں کے لیے اساتذہ کی ضرورت بھی ہے۔ اس وقت ریاست میں 3 نارمل اسکول اور ایک پوسٹ میٹرک ادارہ موجود ہے جہاں سالانہ 260 اساتذہ تیار ہوتے ہیں۔ محکمہ تعلیم اس پوسٹ میٹرک ادارے کو ڈگری معیار تک بلند کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ ریاست بہاول پور کی اکثریت غریب طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے حکومت نے پرائمری سطح تک مفت تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ اس سے قبل ثانوی اور کالج کی سطح پر صرف 18 فیصد طلبہ کے لیے فیسوں میں رعایت تھی لیکن اس مالی سال سے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ پانچ سالوں تک میٹرک کی سطح تک مکمل طور پر ٹیوشن فیس معاف کر دی جائے گی۔ یہ رعایت ایسے طلبہ کے لیے ہوگی جن کے والدین کی ماہانہ آمدنی 200 روپے یا اس سے کم ہے۔ اس رعایت سے تقریباً 85 فیصد طلبہ کو براہِ راست فائدہ پہنچا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم تو کالج کی سطح تک مفت کر دی گئی ہے۔ حکومت پہلے ہی مستحق اور باصلاحیت طلبہ کو میرٹ کی بنیاد پر وظائف اور مالی امداد فراہم کر رہی ہے اور اب اس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے مزید وظائف اور مالی امداد جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حکومتِ بہاول پور کی دیرینہ خواہش ہے کہ ریاست کو ایک مثالی اسلامی ثقافت کا مرکز بنایا جائے جو چاروں طرف اپنی روشنی پھیلائے۔ اس عظیم مقصد کو پانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر صحیح اسلامی روح پیدا کریں اور اپنی زندگی کو دوسروں کے لیے نمونہ بنائیں۔ اس مقصد کے تحت یکم مارچ 1953ء سے ریاست کے تمام تعلیمی اداروں میں عربی، دینیات (Theology) اور اخلاقیات (Ethics) کے مضامین کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ سادگی، نظم و ضبط اور طبقاتی امتیازات کے خاتمے کے لیے طلبا و طالبات کے لیے یونیفارم بھی لازمی قرار دی گئی ہے۔

حکومت نے ایک انقلابی پروگرام شروع کیا ہے جس کے ذریعے خواندگی کی شرح تیزی سے بڑھے گی اور سرکاری خزانے پر اضافی بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔ اس پروگرام کے تحت ریاست بھر کی آبادیوں میں موجود 2000 مساجد کو بنیادی تعلیم کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ ان مساجد کے اماموں کو 15 موبائل یونٹوں اور ریفریشر کورسز کے ذریعے پرائمری اسکول کے استاد کے طور پر تربیت دی جائے گی۔ مساجد کی بکھری ہوئی اور غیر منظّم آمدنی کو ایک جگہ منظّم کیا جائے گا اور انھیں زمینوں کے ساتھ منسلک کر کے مالی مدد فراہم کی جائے گی۔ امام صاحبان کو اسی فنڈ سے معاوضہ دیا جائے گا، نیز ورود (پرائمری) اسکولوں یا مکاتب کی دیکھ بھال پر آنے والے اخراجات بھی اسی فنڈ سے پورے ہوں گے۔ اس منصوبے پر عمل درآمد ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن اور ناظمِ امورِ مذہبیہ مشترکہ طور پر کریں گے۔

ایک اور پانچ سالہ تعلیمی منصوبے کے تحت لوئر مڈل اور مڈل اسکولوں کو بالترتیب مڈل اور اپر مڈل سطح پر ترقی دی جائے گی تاہم اس ترقی کا دارومدار ''مساجد کے ذریعے بنیادی تعلیم'' کے منصوبے کی کامیابی پر ہوگا۔ اگر یہ دونوں منصوبے کامیاب ہو گئے تو موجودہ 5 فیصد خواندگی کی شرح یقیناً آئندہ چند برسوں میں بڑھ کر 85 فیصد تک پہنچ جائے گی۔

(نوٹ) جامعہ عباسیہ کے نئے نصاب کا مسئلہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس کی وضاحت تفصیل سے ضروری ہے، لہٰذا اس مسئلے پر آئندہ شمارے میں علیحدہ تفصیلی مضمون شائع کیا جائے گا۔ (مدیر)

(15) بہاول پور میں صحافت
ماضی، حال اور مستقبل

تحریر: شاہد چشتی

مطبوعہ: شمارہ 5-4، جلد 1، بہاول پور ریویو، نومبر و دسمبر 1953

تھامس جیفرسن نے کہا تھا:

"میں ایسے ملک میں رہنا پسند کروں گا جہاں اخبارات ہوں مگر حکومت نہ ہو بہ نسبت ایسے ملک کے جہاں حکومت تو ہو مگر اخبارات نہ ہوں۔"

ان کے یہ خیالات یقیناً ان اخبارات کے بارے میں تھے جو آزادانہ پالیسی اختیار کرتے ہیں اور اپنے قارئین کے سامنے معلوماتی، اصلاحی اور تعمیری نظریات پیش کرتے ہیں اور کسی ذاتی عناد یا پوشیدہ مقصد کے تحت بے جا تنقید کا سہارا نہیں لیتے۔ ایک صحافی کی حیثیت سے، جو اب مقامی حالات کا کافی تجربہ حاصل کر چکا ہے، میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ریاست میں بہت کم

اخبارات ایسے ہیں جو اس معیار پر پورا اترتے ہیں۔ ماضی میں صحافت کے ایک طبقے میں یہ رجحان رہا ہے کہ اپنے اخبارات کے ذریعے یہ تاثر دیا جائے کہ جاگیردارانہ ریاستوں میں اظہارِ رائے اور تحریر کی آزادی ممنوع ہے۔ میں نے پاکستان کی سب سے بڑی نوابی ریاست بہاول پور میں ان حالات کا بغور مشاہدہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی بھی مرحلے پر یہاں اظہارِ رائے یا تحریر کی آزادی خطرے میں نہیں رہی۔ اس کے برعکس، یہ ریاست ہمیشہ سے صحافت کے حوالے سے نہایت کشادہ دل رہی ہے اور صحافیوں کو اپنے فرائض منصبی کی درست اور بروقت ادائیگی کے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی خواہاں رہی ہے۔ حکومت نے کبھی بھی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے یا صحافتی رجحانات کو قابو میں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے باوجود بہاول پور کے ایک بڑے حصے کی صحافت مطلوبہ معیار تک پہنچنے میں ناکام رہی۔ اس کے اسباب کا جاننا چنداں مشکل نہیں۔ مثلاً تعلیم کا فقدان جو عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے کا بنیادی ذریعہ ہے اور آزاد و فطری صحافتی ترقی کے لیے اولین شرط ہے جو قیامِ پاکستان تک بہاول پور میں اپنی کم ترین سطح پر تھا۔ سیاسی پسماندگی کے ساتھ ساتھ مالی مشکلات، ٹیلی فون، ٹیلی گراف، ٹیلی پرنٹر جیسی سہولتوں کی عدم دستیابی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مقامی باصلاحیت افراد کی جانب سے صحافت کو بطور پیشہ اپنانے میں عدم دلچسپی بھی اس زوال کا سبب بنی۔

تقسیم سے پہلے ریاست کے لوگ اپنی تمام تر توانائی اپنے آبائی کھیتوں میں محنت اور کاشتکاری پر صرف کرتے تھے اور ایک پرسکون و بے فکری کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے تھے چناں چہ وہ سیاست میں دلچسپی رکھتے تھے نہ صحافت میں۔ جو تھوڑے بہت تعلیم یافتہ تھے، وہ بھی اس طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود، کچھ سرگرمی 1867 کے زمانے میں نظر آتی ہے جب "صادق الاخبار" نامی ایک سرکاری اخبار جاری ہوا جو حکومت اور محدود تعلیم یافتہ عوام دونوں کے لیے معلومات کا واحد ذریعہ تھا۔ "صادق الاخبار" کو ریاست بہاول پور میں صحافت کا پیش رو یا نقیب قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ اکیلا اخبار 1940 تک شائع ہوتا رہا، جس کے بعد اخبارات کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہونا شروع ہوا۔ تاہم صحافت ابھی بھی پیشے کے طور پر نہیں اپنائی گئی تھی بلکہ ایک مشغلہ کے طور پر دیکھی جاتی تھی۔ اخبار مالکان زیادہ تر کاروبار یا ملازمت کو اپنی اصل پیشہ ورانہ مصروفیت سمجھتے

تھے۔ ان کے رجحانات بھی زیادہ تر کانگریس کی طرف تھے جو اس وقت ملک کی واحد مضبوط سیاسی جماعت تھی۔ 1947 سے پہلے بہاول پور سے شائع ہونے والے اخبارات میں "العزیز"، "انصاف"، "کائنات"، "سخنور"، "کرن" اور "ستلج" شامل تھے اور یہ سب تقریباً یکساں نظریات کے حامل تھے۔ علاوہ ازیں دو انگریزی ہفت روزہ بھی شائع ہوتے تھے": ڈیزرٹ کالنگ" (مدیر: کرنل عسکری) اور "بہاول پور ٹائمز" (مدیر: ڈاکٹر پیر جی نذیر) یہ دونوں انگریزی جریدے 1940 کی دہائی کے اوائل میں شائع ہوئے مگر زیادہ دیر تک نہ چل سکے اور بند ہو گئے۔ اسی زمانے میں "لالہِ صحرا" نامی ایک اعلیٰ معیار کا اردو ماہنامہ بھی منظرِ عام پر آیا، جسے جناب روش صدیقی نے مرتب اور شائع کیا۔ "لالہِ صحرا"، جسے شاعر روش کا " گلدستہ " کہا جاتا تھا، قارئین کی مسلسل عدم دلچسپی کے باعث جلد ہی بند ہو گیا۔ یہ ہے ریاست بہاول پور میں صحافت کے آغاز اور تقسیم سے پہلے کے دور کی مختصر تاریخ۔ (لالہ صحرا ضلع رحیم یار خاں میں واقع قصبہ سنجر پور کے سید مبارک شاہ جیلانی نے 1931 کے دوران بحیثیت مدیر مسئول شائع کیا تھا جس کے مدیر اعلیٰ سہارن پور کے روش صدیقی تھے اور وہیں سے یہ جاری کیا گیا۔ اس کا صرف ایک شمارہ ہی شائع ہو سکا۔ مترجم)

مسائل اور صحافت: 1947 میں، 14 اگست کو، اچانک حالات میں ڈرامائی تبدیلی آ گئی۔ پہلے جو لوگ مسائل سے بے نیاز تھے وہ یکا یک سنگین مشکلات سے دوچار ہو گئے۔ مقامی صحافت نے بھی ایک نیا رخ اختیار کیا کیوں کہ اب ایک آزاد ملک معرضِ وجود میں آ چکا تھا جس کی اپنی عظیم روایات، مذہب اور ثقافت تھی۔ ریاست بہاول پور میں تقسیم کے فوری بعد ہی ملک گیر سیاسی بیداری کی لہر نے زور پکڑ لیا۔ کانگریسی نظریات اپنی اہمیت کھو بیٹھے اور بہاول پور میں مسلم لیگ کی شاخ قائم ہو گئی۔ سیاسی جماعتوں نے اپنے آئینی حقوق کے لیے سخت جدوجہد کی جیسا کہ سرحد پار ان کے ہم وطنوں نے پہلے ہی کر لی تھی۔ انھیں اپنے مقاصد کے لیے عوامی رائے عامہ کو متحرک کرنے کے لیے اخبارات کی مدد کی ضرورت تھی چناں چہ اس شعبے میں کام کرنے کا موقع کئی افراد کو ملا اور ایک ہی سال میں اخبارات کی تعداد 6 سے بڑھ کر 36 ہو گئی۔ تاہم ایک مضبوط صحافت کی بنیادی ضرورت یعنی روزانہ اخبار کا وجود اب بھی ناپید تھا۔ تمام اخبارات ہفتہ وار، پندرہ روزہ یا ماہانہ بنیادوں پر نکلتے تھے۔

"دی لیڈر": ریاست میں دوہری طرزِ حکومت کے آغاز کے وقت، سید حسن محمود، جواب ریاست کے چیف منسٹر تھے، مسلم لیگ کے رکن کی حیثیت سے سیاست میں داخل ہوئے۔ نوجوان مخدوم زادہ نے جلد ہی عوامی قیادت حاصل کر لی۔ انھوں نے اپنی جماعت کے لیے رکنیت سازی کی ایک بھرپور مہم شروع کی اور جلد ہی مسلم لیگ ایک مضبوط سیاسی قوت بن کر ابھری۔ جیسا کہ سیاسی میدان میں دستور ہوتا ہے کہ مختلف جماعتوں نے اپنی حمایت حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ اخبارات کا سہارا لینا شروع کر دیا۔ آنے والے حالات کے پیش نظر یہ واضح ہو گیا تھا کہ مسلم لیگ بازی لے جائے گی چناں چہ مقامی صحافت کے ایک بڑے حصے نے خود بخود مسلم لیگ کے حق میں پالیسی اختیار کر لی۔ بہت کم اخبارات ہی ایسے بچے تھے جو مسلم لیگ کی مخالفت کر رہے تھے۔ یوں ریاست بہاول پور کی صحافت، جو اپنی ابتدائی عمر گزار رہی تھی، اب جوانی کی دہلیز پر پہنچ گئی تھی۔ اس کی آواز بلند تر ہوتی گئی۔ کبھی کبھی ایسی گونج پیدا ہوتی کہ دور دور تک سنی جاتی۔ ہفتہ وار "انصاف" اور "ستلج" کا بند کیا جانا ریاست میں صحافت کے ڈرامے کا پہلا اہم موڑ تھا۔ ریاست سے باہر بھی بہاول پور کی صحافت کے وجود کا احساس ہونے لگا۔ پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز کانفرنس (P.N.E.C) نے بہاول پور کی صحافت کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے 1951 میں اپنا سالانہ اجلاس بغداد الجدید میں منعقد کیا۔

بہاول پور میں صحافت کا عروج: انتخابی مہم سے قبل کے مہینے بہاول پور کی صحافت کے لیے گویا عروج کا دور ثابت ہوئے۔ اخبارات کی تعداد، اشاعت اور باقاعدگی کے اعتبار سے یہ زمانہ خاصا بھرپور تھا۔ یہ اخبارات مکمل طور پر سیاسی جماعتوں کی مالی معاونت پر انحصار کرتے تھے اور وقت کی پابندی سے شائع ہوتے تھے۔ جذبات اور جوش کے عالم میں اکثر یہ اخبارات چار صفحات پر مشتمل خصوصی ضمیمے کے ساتھ سنسنی خیز سرخیوں کے تحت شائع کیے جاتے تھے۔ اشاعت کا حجم جان بوجھ کر بڑا رکھا جاتا تھا تا کہ ان جماعتوں کو زیادہ سے زیادہ تشہیر حاصل ہو جن کی یہ حمایت کرتے تھے۔ بسا اوقات شہر کی گلیاں اور سڑکیں اخباروں کے اوراق سے اٹی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ جہاں تک ان اخبارات میں پائے جانے والے صحافتی معیار کا تعلق ہے تو ایک تجربہ کار صحافی نے بہاول پور کے اس دورِ عروج

کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ صحافت بالکل مایوس کن، نا قابلِ برداشت اور مکروہ تھی۔" اس نے مزید کہا": یہ ایک ایسی غیر تربیت یافتہ فوج کی مانند لگتی تھی جس کا کوئی سپہ سالار بھی نہ ہو۔" اور یہ بھی کہ ": چند اچھے صحافتی مضامین جو کبھی کبھار دیکھنے میں آ جاتے تھے وہ بھی زیادہ تر سطحی اور گھٹیا مواد کے ڈھیر میں دب کر رہ جاتے تھے۔" تاہم یہ بدنظمی زیادہ دیر نہ چل سکی۔ جونہی انتخابات مکمل ہوئے اور سیاسی جماعتوں نے اپنے مقاصد حاصل کر لیے، وہ اخبارات سے دلچسپی چھوڑ بیٹھیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ زیادہ تر اخبارات کی مالی حالت دگرگوں ہو گئی۔ خوشحالی کا جو دور انتخابات کے دوران میسر تھا، اس کے بعد سخت وقت آن پہنچا۔ تجارتی طبقہ بھی، جو پہلے ہی تشہیر سے گریزاں تھا، مستقبل میں کوئی مدد دینے کو تیار نہ تھا۔ عوام میں بھی ان اخبارات کی مانگ باقی نہ رہی۔ ایسے حالات میں کچھ نے اپنا کاروبار بند کرنے کا سوچا جب کہ دوسروں نے کسی نہ کسی طور پر جاری رہنے کا فیصلہ کیا۔

اٹھارہ اخبارات: اگرچہ آج زیادہ تر وہ اخبارات جو انتخابات سے پہلے باقاعدگی سے نکلتے تھے، اپنی اشاعت کے معمولات میں انتہائی بے قاعدہ ہو چکے ہیں تاہم ریاستی اطلاعاتی محکمے کے ریکارڈ میں 1952 کے عام انتخابات کے وقت یا اس سے پہلے کے 24 میں سے 18 اخبارات کی "موجودگی" کا ثبوت موجود ہے۔ یہ اخبارات درج ذیل ہیں:

☆ تین دو ہفتہ وار: انصاف، رہبر، پرواز ☆ دس ہفتہ وار: ستلج، کائنات، الہام، مسلمان، بیباک، سنہرہ دیس، الامام، رفیق، العزیز اور صدائے نسواں ☆ دو پندرہ روزہ: نوائے بہاول پور، عزم ☆ تین ماہنامے: کاروان، تبلیغ، خاتون ☆ دو ہفتہ وار اخبارات نیا دور اور نوائے مسلم کو فحش اور غیر اخلاقی مواد شائع کرنے پر بند کر دیا گیا تھا جو نہ صرف قانون کی خلاف ورزی تھا بلکہ صحافتی اقدار کی توہین بھی۔ حکومتی اقدام پر کسی نے افسوس کا اظہار نہ کیا بلکہ بعض کے نزدیک تو یہ کارروائی بہت پہلے ہی ہونی چاہیے تھی۔

دو ہفتہ وار اخبارات: دو ہفتہ واروں میں "رہبر" ہی نسبتاً باقاعدگی سے شائع ہونے والا اخبار تھا۔ باقی دونوں "انصاف" اور "پروان" عام طور پر ہفتہ وار یا پندرہ روزہ ضمیموں کی صورت میں

سامنے آتے تھے چناں چہ "انصاف" تو ایک ہفتہ وار کے طور پر اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا مگر "پرواز" ایک پندرہ روزہ پرچہ بن کر رہ گیا جو ایک مصور سرورق کے ساتھ ہفتہ وار طرز پر شائع ہوتا تھا۔ رہبر 1951 میں جناب امین الدین صحرائی نے لاہور سے جاری کیا۔ یہ اخبار ابتدا سے ہی مسلم لیگ کا حامی رہا ہے۔ موجودہ دور میں یہ اخبار ملک محمد حیات کی ملکیت اور زیرِ ادارت ہے جو ایک محنتی مدیر ہیں۔ ادارتی انتظام عامر عثمانی سنبھالتے ہیں، جو ایک پیشہ ور مدیر اور باقاعدہ لکھاری ہیں۔ انصاف، اگرچہ کاغذات میں دو ہفتہ وار تھا مگر درحقیقت ہفتہ وار ضمیمے کے طور پر نکلتا تھا۔ اس کی ادارت جناب حیات ترین جیسے مشہور صحافی نے کی۔ ابتدا میں یہ اخبار مسلم لیگ کا حامی تھا مگر بعد میں حزبِ اختلاف کے کیمپ میں چلا گیا۔ کبھی حکومت نے اس سے سیکیورٹی مانگی اور ایک مرحلے پر "ستلج" کے ساتھ مل کر اسے انتہا پسندانہ خیالات شائع کرنے کے جرم میں بند بھی کر دیا۔ یہی پابندی بعد میں "انصاف" کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی اور اسے ریاست کا ایک معروف اخبار بنا دیا۔ باوجود اس کے کہ "انصاف" بظاہر حزبِ اختلاف کی حمایت کرتا تھا اس کے اندرونی رجحانات میں کہیں نہ کہیں مسلم لیگ کی ہمدردی جھلکتی رہی تاہم "انصاف" آج بھی ایک اثر انگیز اور طاقتور اخبار ہے جو صرف اور صرف حیات ترین کی ادارت اور قلمی مہارت کی بدولت زندہ ہے۔) حیات ترین نے "نقوش" نامی ایک ماہنامہ بھی نکالا تھا جو اب بند ہو چکا ہے۔ پرواز جناب محی الدین شان کی ملکیت اور ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ یہ ایک نیم سیاسی اخبار تھا، جو اپنے قارئین کو معیاری ادبی مواد مہیا کرتا تھا اور سیاسی تبصرے بھی متوازن ہوتے تھے۔ یہ اخبار ملتان میں چھپتا تھا اور اپنے معیار کے لحاظ سے ریاست کا ایک شائستہ ہفتہ وار شمار ہوتا تھا۔

ہفتہ وار اخبارات: ہفتہ وار ستلج 1940 کی دہائی کے اوائل میں بہاول پور کا نمایاں ادبی ماہنامہ تھا جسے کرنل نذیر علی نے جاری کیا۔ حکومتی ہدایت پر جنگی پروپیگنڈے کے لیے اسے ماہنامے سے ہفتہ وار میں تبدیل کیا گیا۔ حالیہ دور میں چوہدری علی احمد رفعت جو سیاستدان، تاجر، شاعر اور صحافی سبھی کچھ ہیں اس کے مدیر اور ناشر ہیں۔ جیسے دریائے ستلج کی روانی بے قابو ہوتی ہے ویسے ہی ستلج اخبار بھی ایک ہنگامہ خیز انداز رکھتا ہے اور اس کی بنیادی پالیسی کو سمجھنا آسان نہیں۔ یہ اخبار ابتدا میں

کانگریسی قوم پرستوں کا ترجمان تھا، پاکستان اور مسلم لیگ دونوں کا مخالف۔ 1951 میں انتہا پسندانہ خیالات شائع کرنے پر اسے بند کر دیا گیا تھا مگر جب دوبارہ جاری ہوا تو مدیر رفعت کے ہمراہ مسلم لیگ کے کیمپ میں شامل ہو گیا، اگرچہ اس کی تحریریں اب بھی کبھی کبھی اس "نئی" شناخت سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ کائنات (مدیر: ولی اللہ اوحد) بنیادی طور پر ان سیاستدانوں کا ترجمان تھا جو مسلم لیگ کی حکومت کے مخالف تھے۔ اس کے اداریے بہاول پور کے مشہور عالمِ مولانا ارشد، ولی اللہ اوحد کے بھائی، تحریر کرتے تھے جنھیں مسلم لیگ سے نکال دیا گیا تھا۔ یہ اخبار بہت مقبول اور مختلف طبقات میں یکساں پسند کیا جاتا تھا اور اس کی اشاعت ریاست میں سب سے زیادہ تھی۔ مسلمان (مدیر: ملک محمد دین) نے ابتدا میں حزبِ اختلاف کی ترجمانی کی لیکن اب خود کو مسلم لیگ کا حامی قرار دیتا تھا۔ ہفتہ وار بیباک ایک مسلم لیگ نواز اخبار سمجھا جاتا تھا کیوں کہ اس کے مدیر عبدالحمید صحرائی ریاستی مسلم لیگ کے عہدیدار تھے تاہم وقتاً فوقتاً اخبار کے اداریوں میں بے ربطی آ جاتی تھی کیوں کہ مولانا صحرائی خود تجربہ کار صحافی نہ تھے اور دوسروں پر انحصار کرتے تھے۔

بہاول پور ریویو

وہ رسالہ جس میں یہ مضمون شائع ہو رہا ہے یعنی "بہاول پور ریویو"، بہاول پور کے محکمہ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ کی ایک بلاشبہ پرعزم مگر مہنگی کاوش ہے۔ یہ ماہنامہ بنیادی طور پر حکومت کا ترجمانی کا ذریعہ ہے تاہم اس میں ایسے لکھنے والوں کی تحریروں کو بھی خوش آمدید کہا جاتا ہے جو قومی اہمیت کے موضوعات پر غیر جانبدارانہ انداز میں قلم اٹھا سکتے ہوں۔ ریاست کے طرزِ زندگی اور حالات کا سرکاری نقطۂ نظر سے جائزہ لینا "بہاول پور ریویو" کی بنیادی پالیسی کا حصہ رہا ہے اور غالباً آئندہ بھی رہے گا۔

نتائج اور تجاویز: اب تک کی گفتگو اور ایک سنجیدہ مشاہدہ کرنے والے طالب علم کی رائے کی روشنی میں، ریاست میں صحافت کی جو ناگفتہ بہ صورتِ حال ہے، اس سے چند ناقابلِ تردید نتائج اخذ کرنا دشوار نہیں۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بہاول پور کی صحافت کچھ نمایاں خامیوں کا شکار رہے جنھیں دور کرنا ضروری ہے تاکہ صحافت اپنی شناخت اور وقار کو برقرار رکھ سکے۔ اخبارات کو ذاتی حملوں

اور الزام تراشی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ ایسا طرزِ عمل ہے جو اخبارات کے وقار کو مجروح کرتا ہے اور کسی بھی مفید مقصد کو پورا نہیں کرتا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، یہ اخبارات محض ایک ضمنی مشغلے کے طور پر چلائے جا رہے ہیں۔ مدیر حضرات اشاعت کی باقاعدگی کا خیال نہیں رکھتے اور اکثر اخبارات صرف اپنے ڈیکلریشن برقرار رکھنے کے لیے شائع کیے جاتے ہیں۔ ریاست کے اخبارات مکمل طور پر سرکاری ذرائع سے حاصل کردہ معلومات پر انحصار کرتے ہیں اور عوام سے براہِ راست معلومات حاصل کرنے یا ان کے مسائل، شکایات اور ضروریات معلوم کر کے انھیں حکومت کے علم میں لانے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔

ردِعمل کی ضرورت: یہ امر خوش آئند ہے کہ مقامی صحافت اور حکومتی حکام کے درمیان تعلقات عمومی طور پر خوشگوار رہے ہیں۔ گذشتہ ایک دہائی میں حکومت نے صرف دو بار مداخلت کی۔ ایک بار "ستلج" اور "انصاف" پر اس بنا پر پابندی عائد کی گئی کہ انھوں نے اپنے ہی مرتب کردہ "ضابطہ اخلاق" کی خلاف ورزی کی تھی۔ بعدازاں "نوائے مسلم" اور "نیا دور" پر فحش مواد شائع کرنے کے الزام میں کارروائی کی گئی۔ حکومت کی اس نرمی پر مبنی پالیسی مقامی صحافت سے بہتر ردِعمل کی متقاضی ہے۔ اگر دونوں فریق درمیانی راستہ اختیار کریں تو نتائج یقیناً دونوں کے لیے سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔

مشکلات: ریاست بہاول پور میں صحافیوں کو درپیش بے شمار مشکلات میں سب سے بڑی رکاوٹ مناسب پرنٹنگ کی سہولیات کا فقدان ہے۔ پورے دارالحکومت بغداد الجدید میں صرف ایک واحد چھاپہ خانہ موجود ہے جو پوری ریاست کی صحافت کا بوجھ اٹھا رہا ہے۔ مزید برآں، اس چھاپہ خانے کی کارکردگی اس قدر ناقص ہے کہ وہاں سے نکلنے والا بیشتر مواد محض ردی معلوم ہوتا ہے۔ اخبارات کو باہر سے چھپوانے پر اخراجات اس قدر زیادہ ہیں کہ قلیل آمدنی کے پیشِ نظر بہت کم اخباری مالکان یہ بوجھ برداشت کر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ اخبارات کو اشتہارات سے بھی کوئی خاص سہارا حاصل نہیں۔ جو تھوڑے بہت اشتہارات آتے ہیں وہ بھی محض سرکاری محکموں کی طرف سے محکمہ اطلاعات کے توسط سے فراہم ہوتے ہیں۔ پاکستان جیسے ملک میں اشتہارات، چاہے وہ نجی ہوں یا سرکاری،

اخبارات کی مالی زندگی کا سرچشمہ ہوتے ہیں مگر بہاول پور کی ریاست میں تو مجموعی طور پر تمام اخبارات کی اشاعت چند ہزار سے زیادہ نہیں۔ ان اخبارات میں نیا مواد پیدا کرنے کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ زیادہ تر تحریریں باہر کے اخبارات سے چُرا کر یا کاٹ کر شائع کی جاتی ہیں۔ نتیجتاً یہ اخبارات ریاست کے باشعور طبقے میں بھی مقبولیت حاصل کرنے میں نا کام ہیں۔ ریاست کے کمزور معاشی وسائل رکھنے والے اخبارات نہ تو قابلِ ذکر ناموں والے صحافیوں کو ملازم رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی معروف مصنفین کو اپنی طرف راغب کر سکتے ہیں۔ آج کے دور میں جب مفت محنت کو برا سمجھا جاتا ہے، بہت کم لوگ خالص جذبے کے تحت صحافت کو اپناتے ہیں۔ یوں تجربہ کار صحافیوں کی عدم دستیابی نے ریاستی اخبارات کو مزید پستی میں دھکیل دیا ہے۔

ایسے مایوس کن حالات میں جب ترقی کے لیے موافق حالات موجود نہیں، بہاول پور کی صحافت کا کوئی روشن مستقبل نظر نہیں آتا جب تک کہ وہ اپنی روش خود نہ بدلے۔ اگر سنجیدہ اخباری مالکان متحد ہو جائیں اور باہمی تعاون کے تحت ایک جدید چھاپہ خانہ قائم کریں تو صورتحال میں بہتری آ سکتی ہے۔ اسی طرح ریاست کے تاجر طبقے کو بھی قائل کرنا ہوگا کہ وہ اپنی مصنوعات کی تشہیر کے ذریعے اخبارات کی سرپرستی کریں تاکہ انھیں اس سے مثبت فوائد حاصل ہو سکیں۔

صحافت ایک فن: آخر میں یہ کہنا لازم ہے کہ صحافت سے وابستہ ایسے افراد کو ضرور الگ کیا جانا چاہیے جو نااہل اور غیر سنجیدہ ہیں۔ صحافت، میرے نزدیک، تفریح کا پیشہ نہیں ہے۔ آج کے سائنسی ترقی یافتہ دور میں صحافت ایک تخصصی فن بن چکی ہے جس کی کئی شاخیں ہیں اور اسے اختیار کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مکمل سنجیدگی اور وقار کے ساتھ اس پیشے کو اپنائے۔

حکومت کی ذمہ داری: بہاول پور کی حکومت جو اپنے ترقی پسندانہ مزاج کے لیے مشہور ہے، اس شعبے میں بھی ایک وہ اپنے بنیادی فرض سے غافل نہیں ہے۔ میری معلومات کے مطابق ریاست نے اب تک کوئی ایسا ضابطہ اخلاق مرتب نہیں کیا جس کے تحت اخبارات میں آنے والے افراد کی اہلیت کا جائزہ لیا جا سکے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ حکومت بہاول پور صحافت کی ترقی سے غافل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت ایک غیر ضروری نرمی کا مظاہرہ کرتی رہی ہے شاید اخبارات

کی تعداد میں تیزی سے اضافے کے شوق میں اور غیر معیاری مواد کو بھی برداشت کرتی رہی ہے۔ اخباری مالکان کے لیے جدید چھاپہ خانہ قائم کرنے کی سہولت دینا ہو یا خبروں کے ترسیلی ذرائع جیسے ٹیلی گراف، ٹیلیفون، ٹیلی پرنٹر کی فراہمی، یہ سب حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ فوری اقدامات کرے۔ اسی ضمن میں ریلوے میل سروس (RMS) کے قیام کے لیے مرکز سے سنجیدہ رابطہ کیا جانا چاہیے تاکہ اخبارات کی ترسیل میں تاخیر کا مسئلہ حل ہو سکے۔

میں پُر امید ہوں کہ بہاول پور کی صحافت کا مستقبل روشن ہوسکتا ہے بشرطیکہ حکومت مزید تاخیر کے بغیر مناسب قوانین اور سہولیات فراہم کرے تاکہ صحافت کا چوتھا ستون وقار کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکیں اور وقتی فائدے یا سطحی مفادات کی بجائے اعلیٰ اقدار کو اپنا شعار بنائے۔ جیسا کہ مشہور فرانسیسی مصنف وکٹر ہیوگو (1802–1885) نے کہا تھا": "یہ سماجی دنیا کا چراغ ہے — ایک زندہ بگل جو اقوام کی بیداری کی صدا بلند کرتا ہے، انصاف اور دیانت کی آمد کا اعلان بڑی صراحت سے کرتا ہے؛ رات کے اندھیروں کو خاطر میں نہیں لاتا مگر سحر کی پیشوائی میں سر جھکاتا ہے؛ یہ خود دن کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور دنیا کو آگاہ کرتا ہے۔"

(16) بہاول پور کی ٹاؤن پلاننگ

تحریر: چوہدری حبیب اللہ سیکریٹری امپرومنٹ ٹرسٹ

مطبوعہ: شمارہ 3- جلد 1 بہاول پور ریویو اکتوبر 1953

شہری منصوبہ بندی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی قدیم کسی بھی قدیم تہذیب کی تاریخ جس کا سراغ مؤرخین نے آج تک لگایا ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں کی گئی کھدائیوں سے جو قدیم شہر زمین کے نیچے سے دریافت ہوئے ہیں وہ بلا شک وشبہ اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ جب سے

انسان نے اجتماعی زندگی اختیار کی اور قصبے اور شہر آباد کرنے شروع کیے تبھی سے شہر بندی اس کی اولین ترجیح رہی ہے۔ پاکستان میں موجود موئن جودڑو، جو 3000 سال قبل مسیح کا شہر ہے اور زیریں سندھ کے کنارے آباد ہے؛ بابل، جو عراق میں دریائے فرات کے بائیں کنارے بغداد سے 60 میل جنوب میں واقع ہے اور 5000 سال قبل بابل کی سلطنت کا دارالحکومت تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہاں نمرود کے بت پرست عوام کو خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی تھی؛ ہلیو پولس جو قاہرہ کے قریب مصری سورج پرستوں کا مندر شہر تھا؛ یا پومپیائی جو پہلی صدی میں رومن تہذیب کا مرکز تھا؛ ان تمام مقامات کی دریافت سے ان ادوار کی قصبہ بندی کی واضح تصویریں سامنے آتی ہیں۔ ان میں مزید حیرت انگیز حقائق بھی دریافت ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر، 1900 سال قبل پومپیائی شہر کے لوگوں کے پاس پانی کی ترسیل کا نظام موجود تھا اور مٹی کے ایسے پائپ بھی موجود تھے جن میں پانی کی مقدار ماپنے کے آلات نصب تھے۔ اسی طرح بابل کی کھدائیوں سے واضح ہوا کہ اس زمانے کے انجینئر ہائیڈرالک پریشر اور سائفن کے نظام سے بخوبی واقف تھے۔ وہاں ایسے محل دریافت ہوئے ہیں جن میں بلند باغات (Terrace Gardens) تھے اور ان میں دریائے فرات سے پانی فراہم کیا جاتا تھا حالانکہ دریا کی بلند ترین سطح ان باغات سے تقریباً 60 فٹ نیچے تھی۔ ہلیو پولس کے مندر عمارتوں کی خوب صورت منصوبہ بندی کا مظہر ہیں جب کہ موئن جودڑو کا دریافت شدہ شہر 5000 سال قبل کے انجینئرز اور معماروں کی غیر معمولی مہارت کا عکاس ہے۔ تعجب کی بات نہیں کہ دنیا نے اپنی قدیم روایتوں کو قائم رکھا ہے اور ہر نئے قصبے کی تعمیر کے لیے منصوبہ بندی بنیادی شرط رہی ہے تاہم نئی تعمیراتی اشیاء اور سائنسی آلات کی ایجاد سے اس قدیم فن میں انقلاب آیا ہے۔ یہ تبدیلی مغل طرزِ تعمیر میں واضح طور پر نظر آتی ہے جس کی عمدہ یادگاریں لاہور، پشاور، دہلی، آگرہ، ٹھٹھہ (سندھ) اور دیگر تاریخی شہروں میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں جدید قصبہ بندی کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ اس کا آغاز پچاس برس سے بھی کم عرصہ قبل ہوا البتہ برطانوی طرز تعمیر کا وہ شاہکار جو اس خطے میں موجود رہا یعنی نئی دہلی، برطانوی ماہرین کے ہنر اور مہارت کی شاندار مثال ہے۔ نئی دہلی کی پرشکوہ اور خوب صورت عمارتیں، وائسرائے ہاؤس، کونسل چیمبرز، سیکریٹریٹ اور اس شہر کی بے مثال

منصوبہ بندی کے باعث ہر صوبائی حکومت اور اکثر ریاستوں کے حکمرانوں میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ وہ اپنے قدیم شہروں کو بھی جدید انداز میں ڈھالیں۔

ریاست بہاول پور کے فرمانروا اعلیٰ حضرت امیر بہاول پور کی ریاست کی عمومی ترقی اور خوشحالی میں گہری دلچسپی کے باعث 1943ء میں دارالحکومت بہاول پور اور دیگر اہم شہروں کی ترقی کے لیے قصبہ بندی کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس مقصد کے لیے حیدرآباد دکن کی نظام حکومت کے ممتاز ماہرِ تعمیرات اور قصبہ بندی کے ماہر، ایم فیاض الدین (F.R.I.B.A) کی خدمات حاصل کی گئیں جنھوں نے مقامی ریاستی انجینئرز کے تعاون سے ایک جامع اور عظیم الشان منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے میں سب سے پہلے بہاول پور میں ایک مثالی ہاؤسنگ سکیم ماڈل ٹاؤن کی تعمیر کو ترجیح دی گئی۔ اس تفصیلی منصوبے کے تحت گذشتہ دس برسوں میں جو کام ہوا ہے اس کا جائزہ پیش کرنے سے قبل قارئین کی دلچسپی کے لیے قدیم شہر بہاول پور، جسے "دروازوں کے اندر کا شہر" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنا ضروری ہے۔ بہاول پور دریائے ستلج کے بائیں کنارے، 20 درجے شمالی عرض البلد اور 71 درجے مشرقی طول البلد پر واقع ہے جس کی آبادی تقریباً 60,000 نفوس پر مشتمل ہے۔ موسم گرما انتہائی گرم اور موسم سرما خاصا سرد ہوتا ہے۔ دیگر قدیم شہروں کی طرح اس شہر کی تعمیر بے ترتیب ہے۔ شہر کو دو مرکزی شاہراہیں چار حصوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ یہاں کی آبادی اتنی گنجان ہے کہ صحت و صفائی کی صورتحال ہمیشہ میونسپل کمیٹی اور حکومت کے لیے تشویش کا باعث رہی ہے۔ گنجان آبادی کی وجہ سے آگ کے حادثات کے بھی خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ تمام محلے جو تنگ گلیوں سے گھرے ہوئے ہیں، وہاں آبادی اس قدر گنجان ہے کہ میونسپل کمیٹی اور حکومت دونوں کے لیے ہمیشہ پریشانی کا باعث رہی ہے۔ "دروازوں کے اندر شہر" میں آبادی کی یہ کثافت نہ صرف صفائی ستھرائی کی صورتحال کو برقرار رکھنے میں مشکلات پیدا کرتی ہے بلکہ آگ لگنے کی صورت میں بھی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ پرانے شہر کی سڑکوں اور گلیوں کا کل رقبہ بمشکل 12 فیصد ہے جب کہ معیار کے مطابق اسے کم از کم 25 فیصد ہونا چاہیے، اسی لیے یہاں فی ایکڑ آبادی کی گنجانی 90 تک پہنچ جاتی ہے جب کہ منظور شدہ معیار 50 افراد فی ایکڑ ہے۔ شہر کے مرکزی چوک میں ایک نئی جامع مسجد زیرِ

تعمیر ہے جو مکمل ہونے پر ریاست کی سب سے بڑی اور خوب صورت مساجد میں سے ہوگی۔ یہ دو منزلہ عمارت ہے جس کی بالائی منزل پر مسجد ہے جو بڑے گنبدوں سے مزین ہے اور یہ اوپر کی تعمیر پتھر کے ستونوں پر کھڑی ہے۔ زمینی منزل کو بازار اور گوداموں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

پرانے شہر کے اردگرد، یعنی دروازوں سے باہر سول اسٹیشن واقع ہے جس میں خوب صورت رہائشی بنگلے، دفاتر، عوامی عمارات مثلاً اسکول، ہسپتال، ٹاؤن ہال، مرکزی لائبریری، پولیس ہیڈکوارٹر، عدالتیں، بینک، ڈاکخانہ اور ٹیلی گراف دفتر، جیل، پاور ہاؤسز، ورکشاپس، سرسبز نہری کالونی، فوجی کیمپ، محلات جن میں سیکریٹریٹ، اعلیٰ شخصیات کے لیے گیسٹ ہاؤس اور وزیراعلیٰ کی رہائش گاہ، اسکاؤٹس ہیڈکوارٹر، وسیع میدان والا اسٹیڈیم اور عیدگاہ شامل ہیں۔ حال ہی میں یہاں نکاسیِ آب اور سڑکوں کی بہتری کے ساتھ گلیوں میں پانی کی پائپ لائن کا نظام بھی نصب کیا گیا ہے۔ شہر کو بجلی ڈی سی پاور ہاؤس سے فراہم کی جاتی ہے جو سول اسٹیشن کو بھی بجلی فراہم کرتا ہے تاہم ہسپتال، نور محل اور ماڈل ٹاؤن کے علاقوں کے لیے نیا اے سی بجلی کا پاور ہاؤس بنایا گیا ہے۔ بہاول پور کی ٹاؤن پلاننگ اسکیم کو 1949ء میں حتمی شکل دے کر اسی سال نافذ العمل کیا گیا۔ یہ اپنی نوعیت کے بڑے منصوبوں میں سے ایک ہے جو تین مربع میل رقبے پر مشتمل ہے اور دیگر مجوزہ اسکیموں جیسے صادق پبلک اسکول، ڈیری فارم، زرعی فارم اور فروٹ نرسری وغیرہ شامل کرنے پر یہ کم از کم چار مربع میل تک پھیل جائے گا۔ اس اسکیم کو حتمی شکل دینے کے پیچھے عالی حضرت امیرِ ریاست کی اپنی رعایا سے محبت شامل ہے جو ہمیشہ عوام کی بہتر اور صاف ستھری رہائش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس منصوبے کی ابتدائی سوچ اور عملی منصوبہ بندی کا سہرا سر رچرڈ کرافٹن اور نواب مشتاق احمد گورمانی (سابق وزرائے اعظم ریاست بہاول پور 1942-47 اور 1947-48 بالترتیب) کی مخلصانہ محنت اور دلچسپی کو جاتا ہے۔ اس منصوبے کو تیزی سے عملی جامہ پہنانے کا کریڈٹ کرنل سرائے جے ڈرنگ (وزیراعظم ریاست بہاول پور 1952-1949) اور موجودہ وزیراعلیٰ مخدوم زادہ سید حسن محمود کو بھی جاتا ہے۔

ماڈل ٹاؤن بہاول پور پرانے شہر کے شمالی اور مغربی جانب گنے، مکئی اور سبزیوں کے بے ترتیب کھیتوں اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں کی جگہ اب ماڈل ٹاؤن کے دو حصے اُبھر کر سامنے آئے ہیں

جو مرکزی سڑک کے دونوں جانب ہیں جو ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتی ہے۔ جہاں دو سال پہلے صرف بے ترتیب کھجوروں کے جھنڈ، کچرے کے ڈھیر، کچھ اینٹوں کے بھٹے یا جنگلی جھاڑیاں دکھائی دیتی تھی اب وہاں خوب صورت جدید عمارتیں موجود ہیں جو مکمل ہو چکی ہیں یا زیرِ تعمیر ہیں، باقاعدہ ترتیب سے سڑکیں، گلیاں، گھاس کے پلاٹ، عوامی عمارات کے لیے مخصوص جگہیں اور بہت سی دلکش چیزیں موجود ہیں۔ شہر کی ترقی دیکھنے والے یقین سے کہتے ہیں کہ پانچ سال بعد کا بہاول پور (بغداد الجدید) رہائش کا بہترین نمونہ پیش کرے گا۔ بہاول پور کی ٹاؤن پلاننگ اسکیم کے نفاذ کے لیے حکومت نے ابتدائی طور پر امپر وومنٹ ٹرسٹ کے لیے 14 لاکھ روپے کی گرانٹ منظور کی۔ یہ رقم زمین کی خریداری پر خرچ ہوئی۔ حاصل شدہ علاقہ کو مختلف زونز میں تقسیم کر کے عوام کو فروخت کے لیے پلاٹ مختص کیے گئے۔ اس 14 لاکھ کی گرانٹ کے علاوہ حکومت اور عوامی عمارتوں کے لیے 7 لاکھ روپے مالیت کی زمین بھی خریدی گئی۔ یہ زونز مختلف طبقات اور کاروبار کے لیے مختص کیے گئے ہیں تاکہ مخصوص قسم کے لوگوں کو ایک جگہ آباد کر کے باہمی تعاون کی روح پیدا کی جا سکے۔ زونز کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

1۔ جنرل سرکاری کالونی۔ یہ کالونی ریلوے روڈ کے دائیں جانب واقع ہے، جس میں تقریباً 220 پلاٹ ہیں جو ماتحت سرکاری ملازمین کے لیے مخصوص ہیں۔ 90 فیصد پلاٹ فروخت ہو چکے ہیں اور بیشتر پر مکانات تعمیر ہو چکے ہیں۔

2۔ گزیٹڈ افسران کالونی۔ مرکزی سڑک کے بائیں جانب 85 بڑے پلاٹوں پر مشتمل ہے جہاں 27 بنگلے تعمیر ہو چکے ہیں۔ ہر بنگلے کے سامنے اور اطراف میں وسیع سبز پلاٹ ہیں۔

3۔ زمیندارہ بلاک۔ 65 پلاٹوں پر مشتمل اس بلاک میں مہاجرین کے لیے بھی 12 پلاٹ مختص ہیں جن میں خوشحال مہاجرین نے تعمیرات شروع کر دی ہیں۔ اب تک صرف 31 پلاٹ الاٹ ہوئے ہیں۔

4۔ کمرشل سینٹر۔ یہ علاقہ مرکزی سڑک کے دونوں طرف واقع ہے جو اسے دو نیم دائروں میں تقسیم کرتی ہے۔ اس کا ڈیزائن دہلی کے کناٹ سرکس کی طرز پر ہے۔ یہاں جدید دکانیں، فلیٹ اور رہائشی بنگلے تعمیر ہوں گے۔

5۔منڈی مارکیٹ۔ ماڈل ٹاؤن کے جس حصے کو منڈی کے طور پر تجویز کیا گیا ہے وہاں ایک گھڑیال ٹاور پہلے ہی تعمیر ہو چکا ہے جو بیچوں بیچ واقع ہے۔ یہ زون ریلوے اسٹیشن جانے والی سڑک کے دائیں جانب واقع ہے۔اس علاقے میں 76 دکانوں کے پلاٹ ہیں جن کی نچلی منزلیں دکانوں اور بالائی منزلیں رہائشی فلیٹس کے لیے مختص کی گئی ہیں۔ یہ تمام پلاٹ الاٹ کیے جا چکے ہیں لیکن اس وقت تعمیراتی سامان کی مہنگائی کے باعث تعمیر کا عمل سست روی کا شکار ہے تاہم تقریباً 20 نئی دکانوں کی بنیادیں رکھی جا رہی ہیں اور تین دکانیں پہلے ہی تعمیر ہو چکی ہیں۔توقع ہے کہ پوری منڈی 1954 کے اختتام تک مکمل ہو جائے گی۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ منڈی صرف غلہ منڈی ہوگی، ایسا نہیں ہے، یہ ایک جامع تجارتی مرکز ہوگا جس میں ہر قسم کی اشیائے ضروریہ کی دکانیں ہوں گی، مثلاً کپڑے، خوشبویات، اناج، کریانہ، کراکری اور کٹلری وغیرہ۔

6۔عوام الناس کی رہائشی کالونی۔ یہ ماڈل ٹاؤن کا وہ علاقہ ہے جو عام عوام کے لیے مختص ہے۔اس میں اے اور بی کلاس کے 85 پلاٹ شامل ہیں اور یہ بھی ریلوے اسٹیشن روڈ کے دائیں جانب واقع ہے۔ان میں سے 90 فیصد سے زائد پلاٹوں پر مکانات تعمیر ہو چکے ہیں۔اس کالونی میں یک منزلہ اور دومنزلہ دونوں اقسام کے مکانات موجود ہیں۔خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ تمام مکانوں کا بیرونی منظر ہم آہنگ ہو اور ہر گھر کے سامنے یکساں سائز کے باغیچے ہوں۔ یہ کالونی مکمل طور پر آباد ہو چکی ہے، بیشتر نئے مکانات کو بجلی فراہم کی جا چکی ہے اور ان میں مالکان یا باوقار کرایہ دار مقیم ہیں۔اس علاقے کی کشش اتنی زیادہ ہے کہ ترقی یافتہ طبقہ یہاں کا رخ کر رہا ہے اور کرایوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

7۔ کم تنخواہ یافتہ عملہ و مزدوروں کی کالونی۔ اس زون میں چپڑاسیوں، مزدوروں، ہنرمندوں جیسے کمہار، بڑھئی، موچی اور خاکروبوں کے لیے پلاٹ فراہم کیے گئے ہیں۔ یہ علاقہ ٹاؤن پلاننگ اسکیم کے انتہائی دائیں جانب واقع ہے۔

8۔ بھاری صنعتیں۔ریلوے اسٹیشن جانے والی سڑک کے دائیں طرف ایک خاصا وسیع علاقہ بھاری صنعتوں جیسے فیکٹریوں، ورکشاپس اور کولڈ اسٹوریج کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ یہاں پر 10 پلاٹ

ہیں، ہر ایک کا رقبہ تقریباً 4 ایکڑ ہے۔ ان میں سے اب تک صرف تین پلاٹوں پر تعمیرات ہو چکی ہیں۔

9۔ ہلکی صنعتیں۔ ہلکی صنعتوں کا علاقہ بھی بھاری صنعتوں کے قریب واقع ہے اور اس میں 12 پلاٹ ہیں۔ فی الحال صرف 5 پلاٹ الاٹ کیے جا چکے ہیں۔ یہاں آٹے کی چکیاں، دھاتی کاریگری، دھات یا لکڑی کو گھما کر تراشنے کے کام وغیرہ ہوں گے۔

10۔ دو منزلہ بنگلیر یلوے۔ اسٹیشن روڈ کے دائیں جانب دو منزلہ بنگلوں کے پلاٹ بھی مختص کیے گئے ہیں لیکن اب تک کسی کو الاٹ نہیں کیا گیا کیوں کہ مجوزہ بنگلوں کے خاص ڈیزائن اب بھی امپروومنٹ ٹرسٹ اور حکومت کی منظوری کے منتظر ہیں۔

11۔ سرکاری وعوامی عمارات۔ ماڈل ٹاؤن میں اسکولوں، ہسپتالوں، زرعی فارموں، کلبوں وغیرہ جیسی عوامی عمارات کے لیے وسیع رقبہ مختص کیا گیا ہے۔ اسی طرح وزراء کی سرکاری رہائش گاہوں کے لیے 25 ایکڑ رقبہ مخصوص کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈیری فارم، سبزی فارم، مرغی خانہ اور فروٹ نرسری کے لیے بھی زمین حاصل کی گئی ہے۔ تمام منصوبے میں بس اڈے، تانگہ اڈے، پانی کے نل، پاور سب اسٹیشن، بینک، ڈاک و ٹیلی گراف دفتر، ڈسپنسریاں اور ایندھن کے اسٹیشن بھی شامل ہیں۔ مزید براں، سڑک کے دونوں طرف مساجد کی تعمیر کے لیے پلاٹ مخصوص کیے گئے ہیں۔ مجوزہ سرکاری سیکرٹریٹ کی عمارت پر 12 لاکھ روپے سے زائد لاگت آئے گی اور اس کے لیے 110 ایکڑ کا وسیع رقبہ مختص کیا گیا ہے۔

12۔ تفریحی مقامات۔ اس منصوبے میں تفریحی مقامات بھی شامل کیے گئے ہیں، مثلاً بچوں کے کھیل کے میدان، پھولوں کے باغات اور مناسب مقامات پر ٹک شاپس۔ ایک بڑے ریاستی ہوٹل کی تعمیر کا منصوبہ بھی زیر غور ہے جس پر 7 لاکھ روپے سے زائد لاگت آئے گی۔ ماڈل ٹاؤن میں ایک سینما ہاؤس پہلے سے موجود ہے۔ لاگت۔ زمین کی خریداری پر حکومت کی جانب سے مجموعی طور پر 21 لاکھ روپے خرچ کیے گئے جن میں سے 14 لاکھ روپے امپروومنٹ ٹرسٹ کو بطور گرانٹ دیے گئے۔ ماڈل ٹاؤن میں دو ہاؤس بلڈنگ سوسائٹیاں قائم کی گئیں جنھوں نے مرکزی کوآپریٹو بینک سے ساڑھے تین لاکھ روپے قرض حاصل کیا۔ حکومت نے اپنے مستقل ملازمین کے لیے اضافی سہولیات

فراہم کیں جن میں 18 ماہ کی تنخواہ کے برابر گھر تعمیر کرنے کا قرض، جو 72 ماہانہ اقساط میں واپس لیا جانا ہے اور ساتھ ہی لکڑی، سیمنٹ، اسٹیل وغیرہ جیسے تعمیراتی سامان کی کنٹرول نرخوں پر فراہمی شامل ہے۔ اندازہ ہے کہ اب تک نجی کوششوں اور حکومتی امداد سے ڈیڑھ کروڑ روپے کی لاگت سے عمارات تعمیر ہو چکی ہیں، اور توقع ہے کہ یہ وسیع تر منصوبہ اگلے چار یا پانچ سالوں میں مکمل ہو جائے گا۔

(17) رحیم یار خاں کی شہری منصوبہ بندی

تحریر: انجینئر نور علی ضامن حسینی سپرینٹینڈنٹ انجینئر ریاست بہاول پور

مطبوعہ: بہاول پور ریویو شمارہ 4،5 جلد 1، نومبر، دسمبر 1953

''خان پور سے روانگی سے قبل ہم شہر سے گزرے... یہ چار ہزار
گھروں پر مشتمل ایک بے رونق اور معمولی سا شہر معلوم ہوتا ہے۔"

لیفٹیننٹ اے ایچ ای بوئلیو نے 1835ء کے اپنے سفرنامے A brief visit to the Idus and to Bahawalpur in 1835 with thw passage of the Great Desert" میں درج بالا الفاظ لکھے۔

احمد پور شرقیہ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"یہ شہر گھروں کی غیر معمولی پست قامتی اور بناوٹ کے باعث خاصا معمولی اور بے رنگ دکھائی دیتا ہے جو کہ مزید نچلے اس لیے لگتے ہیں کہ ان کی چھتیں بھی ہموار اور سپاٹ ہیں۔ اسی نام کا ایک اور قصبہ داؤد پوتروں کے ملک کے مغربی کنارے پر بھی موجود ہے، مگر اُسے عموماً ''احمد پور غربی یا لماں" کے نام سے پکارا جاتا ہے تا کہ اُس کی شناخت اِس بیان کردہ شہر سے الگ رہے۔"

بہاول پور کے متعلق ان کے تاثرات نسبتاً کم منفی ہیں:

"میں تین روز بہاول پور میں قیام پذیر رہا تا کہ شہر کی جغرافیائی پوزیشن کا تعین کر سکوں اور اس دوران میں نے گردونواح میں جو کچھ بھی قابلِ دید ہو سکتا تھا، معائنہ کیا مگر دلچسپی کی اشیاء قلیل تھیں محض باغات اور ریشم کی مصنوعات کی تیاری قابلِ ذکر ہیں۔ مسافر کی نگاہ کو متاثر کرنے والی کوئی خاص عمارت یا فنِ تعمیر کا نمونہ نظر نہیں آیا۔ آٹھ ہزار گھروں اور دو بڑے بازاروں پر مشتمل ہونے کے باوجود، بہاول پور کا عمومی منظر نامہ بھی وہی شکستہ اور عارضی نوعیت کا تاثر دیتا ہے جو خانپور اور احمد پور کے متعلق بھی نظر آتا ہے۔"

یہ تاثرات اُس سرکاری مسافر کے ہیں جو 1835ء میں جیسلمیر سے اسلام گڑھ کے راستے بہاول پور کی حدود میں داخل ہوا، "عظیم ریگستان" عبور کیا، خان پور پہنچا پھر مٹھن کوٹ، اوچ اور احمد پور سے گزرتے ہوئے بہاول پور آیا اور بالآخر بیرسل پور کے نزدیک بیکانیر کی حدود میں واپس داخل ہوا۔ اس کے بعد سے وہ تمام قدیم قصبے جن کا وہ مشاہدہ کر چکا تھا، کم و بیش اسی حالت میں ہیں سوائے بہاول پور کے جہاں نواب سر صادق محمد خان چہارم اور نواب محمد بہاول خان پنجم کے دور میں شاندار تعمیراتی ترقی اور باغبانی کی گئی۔

نوابِ وقت کے والد اور دادا کے دورِ حکومت میں لیفٹیننٹ بوئیلو نے جن "عظیم صحرا" کے منڈی ٹاؤنز کا ذکر کیا تھا وہ درحقیقت ستلج ویلی پراجیکٹ کے تحت آباد کیے گئے نئے علاقے تھے جو ریاست میں نئے شہروں کا اضافہ تھے پرانے علاقوں کی ترقی نہیں۔ قاری نوٹ کرے گا کہ بہاول پور سے احمد پور لمّہ تک تقریباً تمام مغربی تحصیلوں کا ذکر آ چکا ہے مگر اُس وقت رحیم یار خان کا نام نقشے پر تک موجود نہ تھا۔ یہ وسیع و عریض شہر جو آج ہم دیکھتے ہیں اُس وقت تو ایک معمولی سا گاؤں بھی نہ تھا۔ انیسویں صدی کے آخری عشرے میں نوشہرہ نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں تحصیل ہیڈ کوارٹر قائم ہوا جس کے اردگرد ایک آبادی ریت کے ٹیلے پر وجود میں آئی۔ اسے ایک شاہی شہزادے کی یاد میں "رحیم یار خان" کا نام دیا گیا جو ایک المناک انجام سے دوچار ہوا تھا۔ پاکستان کے قیام تک، ریلوے اسٹیشن لاہور تا کراچی مرکزی لائن (اور اس کے قریب سرکاری عمارتوں کے چند جھرمٹ کے سوا یہاں کچھ نہ

تھا۔1944ء میں وزیرِ اعظم سر رچرڈ کرافٹن کی دعوت پر حیدر آباد دکن سے تشریف لانے والے فیاّض الدین صاحب نے بہاول پور، خانپور اور رحیم یار خان کے لیے منصوبہ بندی کی۔رحیم یار خان کے لیے صرف غلہ منڈی کی جگہ تجویز کی اور پرانے ریسٹ ہاؤس کے قریب زمینوں کی رہائشی اسکیم تیار کی۔ اپنی رپورٹ میں انھوں نے لکھا:"

شہر کی عمومی حالت نہایت غیر تسلی بخش ہے۔" مگر 1945ء میں حالات بدل گئے۔ڈپٹی کمشنر کا دفتر بہاول پور سے رحیم یار خان منتقل کر دیا گیا۔حکومت نے اِسے مکمل ضلع ہیڈ کوارٹر کی شکل دینے کا فیصلہ کیا اور اس مضمون کے مصنف نے ایک جامع منصوبہ پیش کیا جسے فیاّض الدین صاحب کی تائید کے بعد حکومت نے منظور کر لیا۔ پاکستان کے قیام تک یہ منصوبہ موقوف رہا مگر آزادی کے فوراً بعد اصلاحات کی پہلی قسط اعلیٰ حضرت نواب بہادر نے 1949ء کے وسط میں نافذ کی اور پچھلے چار سال کا عرصہ رحیم یار خان کے لیے تبدیلی کا دور تھا اور عوام کی سیاسی بیداری کے لیے بھی اب وہ ایک منتخب اسمبلی کو جوابدہ وزراء کی کونسل کے زیرِ سایہ حکومت کر رہے تھے۔

رحیم یار خان اب واقعی ایک صنعتی شہر بن چکا ہے، دو شور مچاتی اور چمنیوں سے دھواں اگلتی ہوئی ملیں: ایک ٹیکسٹائل مل، دوسری ویجیٹیبل آئل مل بمع صابن سازی کی فیکٹری۔ زرعی صنعتوں میں بھی کپاس کی صفائی اور گانٹھ سازی کی چند فیکٹریاں قائم ہوئیں جن کی پیداوار کراچی بندرگاہ سے برآمد ہونے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے "صنعتی شہر" کا غیر موزوں لقب ملا۔ جو مسافر شاہی روڈ (جو دہلی کو تاریخی شہر ٹھٹھہ سے ملاتی تھی) کے سیاہ چمکتے فرش سے گزرتا ہے جہاں 1949ء تک گرد آلود کچی سڑکیں تھیں، آج دونوں طرف سرسبز لان اور پھولوں کی کیاریاں ہیں، وہ تیز رفتار آئل و ٹیکسٹائل ملوں، اونچے چمنیوں، صاف ستھری دکانوں، ہوٹلوں، سینما، بیس ایکڑ پر مشتمل انوکھے بیضوی طرز کے ٹاؤن ہال، خوب صورت سرکاری رہائشی کالونیوں، ڈسٹرکٹ کورٹس، ریسٹ ہاؤسز، دفاتر، اور افسروں کے کلب کو دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔شور وغل سے دور مرکزی سڑک پر ایک 30 ایکڑ پر مشتمل جدید میڈیکل کالونی ہے جس میں ضلع اسپتال، رہائشی کوارٹرز، دائی تربیتی مرکز، موبائل ڈسپنسری عملے اور زچگی وارڈز شامل ہیں۔اس کے بعد نیا ضلعی جیل، وسیع پریڈ گراؤنڈ کے ساتھ نئی پولیس لائن اور نیا

تھانہ ہے۔ سڑک پر طواف کرتے ہوئے آپ کو ایک نیا عید گاہ اور ہر محلے میں لڑکوں کے پرائمری اسکول دکھائی دیں گے جو لازمی تعلیم اسکیم کے تحت تعمیر ہو رہے ہیں۔ ایک نیا کرکٹ اسٹیڈیم زیرِ تعمیر ہے، جب کہ ہوائی جہازوں کے لیے ایک رَن وے، خصوصی طور پر ٹڈی دَل اور کیڑوں کے کنٹرول کے لیے بھی زیرِ غور ہے۔ دو حصوں پر مشتمل پناہ گزینوں کی بستی، ایک صنعتی زون میں، ایک سول اسٹیشن کی طرف کا منصوبہ بنایا گیا ہے اور جیسے ہی فنڈز دستیاب ہوں، اس پر عمل درآمد ہوگا۔ 1949ء میں ایک "امپرُ ومنٹ ٹرسٹ" قائم ہوا، جس نے نمایاں نتائج دیے۔ شہر کے پرانے حصے میں منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ کچی آبادیوں کو صاف کیا گیا۔ بلدیہ نے PWD کی مدد سے گلیوں کی پختہ کاری، نکاسیِ آب، مذبح خانہ، گوشت و مچھلی کی مارکیٹیں، سب فراہم کیں۔ قدیم نہری نظام کی چوڑی پٹیاں جو لیفٹیننٹ بوئیلو کے دور میں موجود تھیں، انھیں سرسبز باغوں، جھاڑیوں، اور روش دار پارکوں میں تبدیل کیا گیا۔ AC پاور ہاؤس اور ٹیلیفون ایکسچینج کی عمارات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ رحیم یار خان کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

(18)

ریاستی شہروں میں بجلی کی فراہمی (1)

تحریر: ایس۔ زیڈ۔ حق ایگزیکٹو انجینئر ای اینڈ ایم

مطبوعہ: شمارہ 2، جلد 1 بہاول پور ریویو ستمبر 1953

برقی توانائی جدید تہذیب کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے ریاست بہاول پور طویل عرصے تک اس نعمت سے محروم رہی کیوں کہ یہ برصغیر کے اُس حصے میں واقع تھی جسے بجا یا بے جا طور پر پسماندہ سمجھا جاتا تھا۔ چوں کہ ریاست کی معیشت بنیادی طور پر زرعی تھی اس لیے دیگر ترقیاتی

پہلوؤں پر خاص توجہ نہ دی گئی۔ ماضی میں دریائے ستلج، پنجند اور سندھ ریاست کی شمالی سرحد بناتے ہیں، ان کے کنارے آباد زمینوں کو سیراب کرتے تھے لیکن 1933 کے اختتام سے پہلے مکمل ہونے والے "ستلج ویلی پراجیکٹ" نے اُن وسیع علاقوں کو قابلِ کاشت بنا دیا جو پہلے چولستان کے صحرا کا حصہ سمجھے جاتے تھے۔ ریاست میں آبپاشی کے اس نظام کے باعث لاہور سے کراچی جانے والی ریلوے لائن اور جنوبی پنجاب ریلوے (جو سمہ سٹہ کو بھٹنڈہ سے ملاتی ہے) کے ساتھ واقع دیہات آہستہ آہستہ قصبوں اور منڈیوں میں تبدیل ہونے لگے۔ اب ان ریلوے لائنوں کے ساتھ ساتھ ریاست کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بازاروں کا ایک تسلسل نظر آتا ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں ان قصبوں اور بازاروں کی آبادی مسلسل بڑھتی رہی اور اسی نسبت سے جدید سہولتوں کی طلب بھی پیدا ہوئی جن میں سب سے زیادہ ضروری اور مطلوب سہولت "برقی توانائی" یعنی بجلی تھی۔

برصغیر کی تقسیم سے قبل ایسے حالات نہیں تھے کہ کوئی بڑا ترقیاتی منصوبہ ہاتھ میں لیا جا سکتا۔ سب سے بڑا مسئلہ ستلج ویلی پراجیکٹ کی تکمیل کے لیے مرکزی حکومتِ ہند سے لیے گئے قرض کی واپسی تھی، بجلی جیسی سہولت کی فراہمی تو بہت دور کی بات تھی مگر قیامِ پاکستان کے بعد جب مالیاتی معاملات طے پائے اور ریاست کا انتظام ہمارے اپنے ہاتھوں میں آیا تو ترقی کے نئے راستے کھلنے لگے جن میں بجلی کاری (Electrification) کا منصوبہ بھی شامل تھا۔ ایک منظّم منصوبہ تیار کیا گیا اور ایک برقی انجینئر مقرر ہو لیکن اس کے نتیجے میں صرف ایک رپورٹ اور ایک خاکہ تیار ہو سکا۔ جب وہ 1950 میں چلا گیا تو اس معاملے پر دوبارہ سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ محکمہ تعمیرات عامہ (PWD) کے برقی شعبے نے مفصل منصوبے تیار کیے اور ضروری سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ اگر چہ دوسری عالمی جنگ کے بعد سامان اور مشینری کی قلت تھی لیکن ہم نے مستقل مزاجی سے اپنی رفتار قائم رکھی اور پچھلے اٹھارہ مہینوں کے دوران چار نئے بجلی کاری کے منصوبے کامیابی سے شروع کیے۔ اس پس منظر کو جاننے کے بعد قاری بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ریاست بہاول پور کی آبادی کو اس بنیادی اور اشد ضروری سہولت یعنی برقی توانائی کی فراہمی کے لیے کس قدر سنجیدہ اور مسلسل کوششیں کی گئی ہیں۔ چوں کہ بہاول پور ریاست کا دارالحکومت ہے اس لیے ہم اپنی داستان کا آغاز اسی شہر سے کرتے ہیں۔

بہاول پور:

بہاول پور میں بجلی کی فراہمی کی تاریخ 1911 سے شروع ہوتی ہے جب پہلی بار مقامی محکمہ تعمیرات عامہ کی ورکشاپ میں ایک پانچ کلوواٹ ڈی سی (220 وولٹ) جنریٹر نصب کیا گیا۔اس کا مقصد صرف روشنی کے لیے بجلی فراہم کرنا تھا اور وہ بھی صرف مخصوص اوقات میں،نواب کے محلات جیسے نور محل، دولت خانہ (دارالسلام)،گلزار محل اور بہاول گڑھ تک محدود تھی۔ جب یہ محلات روشن ہوئے تو عوام بالخصوص امراءاور سرکاری اہلکاروں میں یہ خواہش جاگ اٹھی کہ مٹی کے تیل سے جلنے والے دیے اور کھینچنے والے پنکھوں کی جگہ خوب صورت بجلی کے بلب اور پنکھے استعمال کیے جائیں۔ اس وقت چھوٹے بجلی گھر کی توسیع ناگزیر محسوس ہونے لگی۔لیکن 1914 سے 1918 تک جاری پہلی جنگِ عظیم کے باعث عوام کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔جنگِ عظیم اول کے فوراً بعد محکمہ تعمیرات عامہ (برقی شعبہ) نے اس منصوبے کو دوبارہ شروع کیا اور 1920 میں تین ڈی سی پیٹر ڈیزل جنریٹنگ سیٹ، ہر ایک 46 کلوواٹ اور 440 وولٹ کے،خرید کر اسی بجلی گھر میں نصب کیے گئے۔اس سے بغدادالجدید کے سرکاری دفاتر اور بنگلوں سمیت شہر کے چند اہم علاقوں کو بجلی کی فراہمی ممکن ہوئی۔ 1925 میں ایک نیا100 کلوواٹ کا ڈیزل جنریٹر بھی وہیں نصب کیا گیا۔ یوں مجموعی طور پر 230 کلو واٹ بجلی کی فراہمی ممکن ہوگئی۔ 1931 تک پیٹر جنریٹنگ سیٹوں کی حالت خراب ہونے لگی اور ان میں خرابی آنے لگی۔ مالی حالات کے مطابق انھیں سال بہ سال تبدیل کیا گیا لیکن بجلی کی طلب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا جس کے باعث استعداد بڑھانا ناگزیر ہوگیا۔ چناں چہ 1939 (دوسری جنگِ عظیم سے قبل) تک بجلی گھر کی پیداواری صلاحیت کو 245 کلوواٹ تک بڑھا دیا گیا۔ جنگ کے دوران مٹی کے تیل کی قلت کے باعث بجلی کی طلب میں اضافہ ہوا۔اگرچہ مشینری کی درآمد میں بے پناہ مشکلات پیش آئیں پھر بھی ایک اور 50 کلوواٹ کا جنریٹر شامل کرلیا گیا جس سے کل پیداوار تقریباً300 کلوواٹ ہوگئی۔ برصغیر کا مشرق بعید سے رابطہ منقطع ہوگیا تھا جس سے برما وغیرہ سے تیل

کی ترسیل رک گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈیزل اور لبریکنٹس کی قلت نے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ مزدوری کی لاگت بھی تین سے چار گنا بڑھ گئی۔ پورے ہندوستان میں بجلی گھروں کی کارکردگی محدود کر دی گئی اور فی یونٹ قیمتیں بڑھا دی گئیں۔ تاہم ریاست بہاول پور نے اپنے سابقہ معیار کو برقرار رکھتے ہوئے بجلی کے نرخ وہی رکھے جو جنگ سے پہلے تھے۔ مشینوں کے پرزے بیرون ملک سے منگوانے میں مشکلات کے باوجود ہمارے عملے نے مقامی ورکشاپ میں پرزے تیار کر کے یا پرانے پرزے مرمت کر کے بجلی گھر کا نظام جاری رکھا۔ یہ کامیابی بجلی گھر اور مکینیکل ورکشاپ کے عملے کے خلوص، ہنر اور انتھک محنت کا ثبوت ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد تعمیرِ نو کے منصوبے کے تحت جنوبی علاقوں میں مزید کنکشن دیے گئے۔ صنعتی مقاصد کے لیے بجلی کی طلب بھی بڑھتی چلی گئی لہٰذا اب ایک بڑے بجلی گھر کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ 1950 سے پہلے ہمارے پاس صرف 839 گھریلو اور 46 صنعتی کنکشن تھے لیکن 1950 کے بعد یہ تعداد بڑھ کر 1613 گھریلو اور 82 صنعتی کنکشن ہو گئی۔ اگرچہ بجلی کے نرخ جنگ سے پہلے اور بعد میں یکساں رہے لیکن چوں کہ سامان اور مزدوری کی لاگت تین سے چار گنا بڑھ چکی تھی اس لیے سرکاری بجلی گھر نے نہ تو کوئی نفع کمایا اور نہ ہی نقصان اٹھایا البتہ رواں مالی سال کے آغاز سے ہم نے فی یونٹ صرف ایک آنے کا اضافہ کیا ہے اور اس اضافے کے باوجود ہمارے نرخ کئی ہمسایہ صوبوں کے شہروں سے اب بھی کم ہیں۔ یہ جاننا بھی دلچسپ ہے کہ ریاست میں بجلی کاری کے منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے کسی بیرونی ادارے کی خدمات نہیں لی گئیں۔ مقامی مزدور اور عملہ ہی اس سارے عمل میں شامل رہا تاکہ کفایت شعاری کو یقینی بنایا جا سکے۔ زیادہ تر سامان حکومتِ پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل سپلائیز کے ذریعے حاصل کیا گیا۔ بہاول پور کا بجلی گھر ایک ''مشترکہ ادارے'' کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ یہ نہ صرف بجلی پیدا کرتا ہے بلکہ اس میں ایک ورکشاپ بھی موجود ہے جہاں ہر قسم کی مشینری کی مرمت کے علاوہ بعض اہم پرزے اور لوازمات تیار کیے جاتے ہیں جو اگر باہر سے منگوائے جائیں تو مہنگے بھی پڑیں اور وقت بھی ضائع ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا بجلی گھر نسبتاً سستے داموں بجلی فراہم کرنے کے قابل ہوا ہے۔

(2)

مطبوعہ: شمارہ3، جلد1 بہاول پور ریویو اکتوبر1953

اپنے اس مضمون کی پہلی قسط میں، میں نے بہاول پور (ریاستی دارالحکومت) کو بجلی کی فراہمی کا تفصیلی حال بیان کیا تھا اور قارئین کو ان رکاوٹوں سے آگاہ کیا تھا جن کا ہمیں سامنا رہا جب ہم عوام کی گھریلو اور صنعتی ضروریات کے لیے بجلی کی مسلسل بڑھتی ہوئی مانگ پوری کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قارئین کو وہ تمام ضروری تفصیلات فراہم کی گئیں جو اُن حالات سے متعلق تھیں جن میں ہم نے ڈی۔سی اور اے۔سی بجلی گھروں کی صلاحیت بڑھانے کی کوششیں کیں۔

بہاول پور کے لیے مزید بجلی

یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ بہاول پور شہر کے دو موجودہ بجلی گھروں کی مجموعی صلاحیت، جو کہ 515 کلوواٹ ہے، اب شہری آبادی کی بڑھتی ہوئی ضروریات بالخصوص پرانے شہر اور وسیع وعریض ماڈل ٹاؤن کے مکینوں کی طلب کے پیشِ نظر ناکافی محسوس کی جانے لگی ہے۔ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے بہاول پور ایک نہایت گرم مقام ہے جہاں گرمیوں میں درجہ حرارت بعض اوقات 120 فارن ہائیٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں تاحال نہ تو گھنے درختوں والی سڑکیں ہیں اور نہ ہی کوئی باغات جیسا کہ فصیل بند شہر کے شمال، مشرق اور جنوب میں سول اسٹیشن کے حصوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس جدید بستی کے کشادہ بنگلے اور خوب صورت عمارات دن بھر سورج کی تپش میں تپتے رہتے ہیں۔ پختہ عمارتوں کی دیواریں سورج کی گرمی اس قدر جذب کر لیتی ہیں کہ رہائشیوں کے لیے اندر کا ماحول ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ بجلی کے پنکھے کچھ زیادہ مددگار ثابت نہیں ہوتے کیوں کہ ان کی ہوا بھی ریگستانی ہواؤں کی طرح گرم ہوتی ہے چناں چہ واحد مؤثر حل برقی کولر ہی دکھائی دیتا ہے۔ اسی برقی کولنگ کے ساتھ جب سٹریٹ لائٹنگ کی توانائی کا استعمال بھی شامل ہو جائے تو بجلی کی طلب میں جو اضافہ ہوتا ہے وہ ہمارے وسائل کی قلت کا بخوبی اندازہ کراتا ہے۔ حکومت اب اس موجودہ بجلی کی فراہمی کے نئے ڈھانچے پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ تجویز دی گئی ہے کہ سپلائی کو 1500 کے۔وی۔

اے تک بڑھا دیا جائے اور وولٹیج کو 3300 کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے تین 500 کے۔ وی۔ اے کے اے سی جنریٹرز موجودہ بجلی گھر میں نصب کیے جائیں گے۔ اس توسیعی منصوبے کی تکمیل کی مدت 1954 کے اختتام تک مقرر کی گئی ہے۔ جب یہ توسیع مکمل ہو جائے گی، تو بجلی کو چار سب اسٹیشنوں کے ذریعے تقسیم کیا جائے گا۔

رحیم یار خان

ریاست کا اگلا اہم شہر جہاں بجلی کی فراہمی کی ضرورت محسوس کی گئی، وہ رحیم یار خان تھا۔ یہ ریاست کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ چوں کہ یہ ضلع کپاس کی کاشت کا سب سے بڑا مرکز ہے اس لیے یہاں روئی دھننے اور پریس فیکٹریوں کے قیام کے ساتھ ساتھ یہ ایک خوشحال تجارتی مرکز میں بھی بدل گیا۔ 1936 میں اس شہر میں ایک ٹیکسٹائل مل کے قیام پر سنجیدگی سے غور کیا گیا لیکن یہ منصوبہ 1950 سے قبل عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔ صنعتی ترقی کے سبب کئی صنعت کاروں نے رحیم یار خان کا رُخ کیا اور مختلف پیداواری یونٹس یہاں قائم ہونے لگے۔ عباسیہ ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ مغربی پاکستان کی بڑی ٹیکسٹائل ملوں میں شمار ہوتی ہے۔ صرف تین سال قبل لیور برادرز نے یہاں بناسپتی گھی اور صابن کی تیاری کے لیے برصغیر کا سب سے بڑا پلانٹ قائم کیا جسے اب صادق ویجیٹیبل آئل اینڈ الائیڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان صنعتی پیش رفتوں اور تجارتی وسعت کے ساتھ ساتھ پرانا شہر تیزی سے پھیلنے لگا۔ اس کے گرد و نواح کو خوب صورت ماڈل ٹاؤن میں ڈھال دیا گیا اور چوں کہ رہائش، تجارت اور صنعت میں ترقی ہو رہی تھی لہٰذا بجلی کی مانگ ایک قدرتی اور ناقابلِ تاخیر ضرورت بن گئی۔ یہ اہم مرکز بجلی جیسے جدید دور کے تقاضے کا مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

عباسی ٹیکسٹائل مل نے اپنے بجلی گھر میں دو جنریٹنگ سیٹ نصب کیے جن کی انفرادی صلاحیت 500 کلوواٹ تھی جو مل کی ضروریات سے کہیں زیادہ بجلی پیدا کرتے تھے۔ مل کی انتظامیہ نے بہاول پور حکومت سے درخواست کی کہ وہ اس بجلی کو شہر میں مہیا کرے۔ کچھ وقت تک مذاکرات جاری رہے لیکن دونوں فریق کسی معقول معاہدے پر نہ پہنچ سکے چناں چہ حکومتِ بہاول پور نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنا بجلی گھر خود قائم کرے اور کم سے کم وقت میں اسے فعال بنایا جائے۔ ہمیں بالکل دارالحکومت کی

برقی کاری کی طرح یہاں بھی لائن میٹریل اور جنریٹرز کی عدم دستیابی جیسے سنگین مسائل کا سامنا تھا لیکن ان مشکلات پر قابو محکمہ تعمیرات اور پاکستان کے محکمہ بجلی کی مدد سے پایا گیا۔

دسمبر 1951 میں تنصیب کا کام شروع ہوا۔ جنریٹرز اپریل 1952 کے آخر تک نصب اور آزمائے گئے اور جون 1952 کے آخر تک تقسیم کی کچھ لائنیں بھی لگا دی گئیں۔ اسی مہینے سے محدود پیمانے پر بجلی کی ترسیل کا آغاز ہوگیا۔ بجلی کی فراہمی رحیم یار خان کے عوام کے لیے گویا ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ پورا شہر خوشی سے جھوم اٹھا اور لوگ سینکڑوں کی تعداد میں ان مقامات پر پہنچے جہاں برقی بلب روشن کیے گئے تھے۔ دیہات سے لوگ دور دراز سے اپنے ضلعی ہیڈ کوارٹر کو نئی روشنی میں جگمگاتے دیکھنے آئے۔ بجلی کی فراہمی کو محدود رکھنا ممکن نہ رہا۔ عوامی مطالبات اور سرکاری دفاتر، سرکاری بنگلوں، عظیم الشان لوکل باڈیز ہال، اسپتال، کلب اور ریسٹ ہاؤس جیسے عوامی عمارات میں بجلی کی فوری ضرورت کے پیشِ نظر، توسیعی منصوبے کو انتہائی تیزی سے مکمل کرنا پڑا۔ یہ کہنا برقی اور مشینی عملے کی کوششوں کا اعتراف ہوگا کہ محض آٹھ ماہ کی قلیل مدت میں یہ بجلی گھر پوری صلاحیت سے کام کرنے لگا۔ یہ 24 فروری کی بات ہے جب معزز وزیراعلیٰ نے ایک پروقار تقریب میں 225 کے وی اے کے اے سی بجلی گھر کا افتتاح کیا جس میں اعلیٰ افسران، صنعتکاروں، تاجروں اور ممتاز شہریوں کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔

(3)

مطبوعہ: شمارہ 5،4، جلد 1 بہاول پور ریویو نومبر، دسمبر 1953

بجلی کی فراہمی سے متعلق ہمارے منصوبوں میں سب سے بڑی رکاوٹ جو سال بہ سال درپیش رہی ہے وہ لائن کے سامان اور مشینری کی شدید قلت ہے جنھیں بیرونِ ملک سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان کی کوئی اور اکائی، جس کے مالی وسائل بہاول پور ریاست جتنے محدود ہوں اتنی قلیل مدت میں برقی کاری کے دو بڑے منصوبے یعنی بہاول پور اور رحیم یار خان جیسے بڑے شہروں میں پایہ تکمیل تک پہنچانے کے بعد شاید ہی کوئی نیا منصوبہ ہاتھ میں لے سکتی ہو۔ لیکن ہم نے ہار نہیں مانی۔ برقی

کاری کے منصوبوں میں تیسرا شہر احمد پور شرقیہ تھا اور محکمہ تعمیرات (برقیات) نے بھی اس اہم مقام پر بجلی کی فوری فراہمی میں کوئی تاخیر نہ ہونے دی۔

احمد پور شرقیہ، بہاول پور سے تقریباً 32 میل اور دربار گاہ یعنی ڈیرہ نواب صاحب سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ڈیرہ نواب صاحب میں ایک چھوٹا سا ڈی سی بجلی گھر قائم تھا جو محلات، ان سے ملحقہ عمارات، فوجی بیرکوں اور عملے کی چند کوٹھیوں کو بجلی مہیا کرتا تھا۔ یہ بجلی گھر چند نجی گھروں کو بھی محدود پیمانے پر بجلی فراہم کر رہا تھا لیکن یہ صورتحال زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ جب دارالحکومت اور رحیم یار خان میں بڑے پیمانے پر توسیع ہو چکی اور وہاں بھی علیحدہ بجلی گھر قائم کر دیا گیا تو احمد پور کے شہریوں نے بھی حکومت سے انفرادی درخواستوں، اجتماعی نمائندگیوں اور عوامی قراردادوں کے ذریعے بجلی کی فراہمی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کیوں کہ یہ شہر ریاست کے دیگر تجارتی مراکز سے کسی طور کم اہم نہیں تھا۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ صرف دو میل کے فاصلے پر واقع ڈیرہ نواب صاحب میں اعلیٰ حضرت کے باڈی گارڈز کے ہیڈکوارٹر اور پاکستان آرمی کے متعدد یونٹ موجود تھے اور ان میں سے اکثر کے رہائشی بھی احمد پور شرقیہ میں مقیم تھے۔ چناں چہ بجلی جیسی جدید سہولت کی مانگ ان کے ہاں بہت شدت سے پائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ طبقہ بھی موجود تھا جو سمجھتا تھا کہ اگر بجلی دستیاب ہو تو چھوٹے پیمانے کی صنعتیں نہ صرف بہتر انداز میں چل سکیں گی بلکہ منافع بخش بھی بن سکیں گی۔ انھی وجوہات کے پیش نظر ریاست بہاول پور کی حکومت نے جلد از جلد احمد پور شرقیہ کے لیے برقی کاری کا منصوبہ نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چناں چہ جون 1952 کے وسط میں، عام انتخابات کے بعد جب مکمل اختیارات والی حکومت تشکیل پا چکی تھی، اس نے کئی اہم منصوبوں میں سب سے پہلے احمد پور شرقیہ کی برقی کاری کو ترجیح دی۔ اس منصوبے کے تحت بجلی کی لائن کے سامان اور پاور ہاؤس کی مشینری کا بندوبست کیا گیا اور نومبر 1952 میں تعمیراتی کام کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔

یہ محکمہ تعمیرات کے شعبہ برقیات کی بے حد کامیابی تھی کہ منصوبہ ریکارڈ مدت میں مکمل ہوا اور اے سی بجلی گھر نے کام شروع کر دیا۔ اس بجلی گھر میں جو مشینری نصب کی گئی وہ اصل میں بہاول

وکٹوریہ اسپتال بہاول پور کے لیے منگوائی گئی تھی لیکن چوں کہ وہاں ایک اضافی اے سی پاور ہاؤس پہلے ہی قائم ہو چکا تھا اس لیے یہ مشینری احمد پور شرقیہ منتقل کر دی گئی۔ یہ اے سی پاور ہاؤس میں جو رحیم یار خان روڈ پر واقع ہے، میں 50 کلو واٹ کے چار جنریٹر نصب کیے گئے ہیں جن کی سپلائی وولٹیج 400/230 ہے۔ پاور ہاؤس مکمل ہونے کے بعد اگلا مرحلہ بجلی کی لائنیں بچھانے کا تھا، خاص طور پر گنجان آباد علاقوں میں۔ تانبے کی تاریں اور فولادی کھمبے شہر کی اہم گلیوں اور بازاروں میں نصب کیے گئے، اور اگست کے مہینے تک محدود پیمانے پر بجلی کی فراہمی شروع کر دی گئی۔ اس وقت صرف رات کے وقت بجلی کی ترسیل کی جاتی ہے۔

اس مرحلے تک ہم 315 گھریلو کنکشنز فراہم کر چکے ہیں جب کہ اسٹریٹ لائٹس اور صنعتی استعمال کے لیے کنکشنز بھی زیرِ غور ہیں۔ فی الوقت بجلی سے مستفید ہونے والے صارفین کی تعداد اتنی نہیں کہ بجلی گھر چوبیس گھنٹے پوری استعداد سے چل سکے۔ اس وقت جنریٹرز پر صرف ایک تہائی لوڈ ڈالا جا رہا ہے۔ جوں جوں مزید کنکشنز دیے جائیں گے اور لوڈ بڑھے گا، بجلی کی ترسیل بھی چوبیس گھنٹے ممکن ہو سکے گی۔ دوسرے بجلی گھروں کی طرح، اس پاور ہاؤس کے ساتھ بھی ایک پی۔ ڈبلیو۔ ڈی ورکشاپ منسلک ہے تا کہ چھوٹے موٹے مرمت کے کام موقع پر ہی مکمل ہو سکیں اور معمولی خرابی کی صورت میں بجلی گھر بند نہ ہو۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس قصبے میں بجلی کی فراہمی کے بعد اس کا نقشہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ کچھ چوک جو چند ماہ پہلے سورج ڈھلتے ہی ویران ہو جاتے تھے اب آدھی رات تک زندگی سے بھرپور دکھائی دیتے ہیں۔ خوب صورت مرکری لائٹس، ریڈیو کی موسیقی اور چائے خانوں میں چہل پہل اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔

(19) مہاجرین کی بحالی اور سماجی انضمام

مطبوعہ: شمارہ 2 جلد 1 بہاول پور ستمبر 1953

ریاست بہاول پور کے لوگ اپنی مہمان نوازی اور خوش اخلاقی کے لیے بہت مشہور ہیں اوران کی معاشرتی زندگی کی تاریخ ایسی روایات سے بھر پور ہے جو قدیم عربوں کی روایات کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ بظاہر اس کا بڑا سبب وہ اثرات ہیں جو سندھ پر عرب فاتحین کے حملوں کے نتیجے میں یہاں کے معاشرتی ڈھانچے پر مرتب ہوئے جس میں موجودہ ریاست بہاول پور اس وقت ایک لازمی جزو تھی۔ یہاں روزمرہ کا معمول تھا کہ اگر مہمان اچانک اور واقعی اکثر ایسا ہوتا تھا، اس وقت آجاتے جب کہ گھر والے کھانے کے لیے بیٹھنے ہی والے ہوتے اور گھر میں کھانے پکانے کے لیے کچھ بھی موجود نہ ہوتا تو پورا گھرانہ خوش دلی سے اپنا کھانا مہمانوں کو پیش کر دیتا اور اپنی قربانی کا کسی طور پر اظہار نہ کرتا۔ یہ ضرب المثل بن چکی مہمان نوازی قومی سطح پر بھی دیکھنے میں آئی جب 1935 میں کوئٹہ کے تباہ کن زلزلے کے بعد متاثرہ افراد کو لے جانے والی ریل گاڑیاں اس ریاست سے گزریں۔ ہر ریلوے اسٹیشن پر، جہاں کہیں بھی یہ ریل گاڑیاں رکیں، ریاست کے لوگ کھڑکیوں کے گرد جمع ہو گئے اور مصیبت زدگان کو کھانے پینے کی اشیاء، کپڑے اور نقد رقم فراہم کی۔ خود ریاست کے حکمران نے کئی دن اور راتیں ڈیرہ نواب صاحب ریلوے اسٹیشن پر گزاریں اور ذاتی طور پر ان ریل گاڑیوں میں سوار مظلوموں کی امداد کی۔

اسی جذبہ مہمان نوازی اور انصارانہ روح کا ایک اور بھر پور مظاہرہ بارہ سال بعد 1947ء میں دیکھنے میں آیا جب مشرقی پنجاب اور ریاستوں میں مسلمانوں پر ہونے والے غیر انسانی مظالم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان مظالم کی شدت اتنی تھی کہ اگر کئی کوئٹہ جیسے سانحات کو بھی یکجا کر دیا جائے تو وہ ان مظالم کے برابر نہیں آ سکتے۔ جو لوگ اپنی جان بچا کر، سب کچھ لٹا کر، پاکستان دنیا کی سب سے

بڑی نئی مسلم ریاست کی سرحدوں کی طرف نکلنے میں کامیاب ہوگئے، ان کی تعداد چھ ماہ کے مختصر عرصے میں ہی پانچ لاکھ سے تجاوز کرگئی اور مغربی پاکستان میں داخل ہوگئی۔ پاکستان کی سب سے بڑی نوابی ریاست بہاولپور نے ان مہاجرین کے لیے اپنے دروازے کھول دیے۔ صرف چار ماہ کے قلیل عرصے میں ساڑھے تین لاکھ سے زائد مہاجرین نے یہاں پناہ لی۔ بہاول پور حکومت نے مہاجرین کی زمینوں، کارخانوں، دکانوں، خدمات اور دیگر معاشرتی میدانوں میں بحالی اور آبادکاری کے اہم کام کو فوری طور پر شروع کیا اور چار لاکھ مہاجرین میں سے چند ہزار کے سوا باقی سب کو کامیابی سے دوبارہ آباد کیا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے، گذشتہ چھ برسوں میں ریاست بہاول پور کی جانب سے مہاجرین کی فلاح و بہبود کے لیے کی گئی کاوشوں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ 1952 کے آخر تک ریاست میں داخل ہونے والے مہاجرین کی کل تعداد 3,86,595 تھی۔ ان میں سے 79.8 فیصد مہاجرین نے اگست 1947ء سے دسمبر 1948ء کے درمیان ریاست میں پناہ لی تھی اور باقی مہاجرین آئندہ چار سالوں میں داخل ہوئے۔ ان میں سے 69,923 مہاجرین نے شہری علاقوں اور 3,16,672 نے دیہی علاقوں میں سکونت اختیار کی۔

کل 3,77,153 مہاجرین میں سے 2,70,628 کو مہاجر اراضی پر، 10,155 کو کراؤن ویسٹ (کم اہم سرکاری اراضی) پر آسان اقساط پر عباسیہ ایکسٹینشن اسکیم کے تحت، اور 396 کو بہاول کینال ایریا میں آباد کیا گیا۔ 48,419 مہاجرین کو خالی شدہ دکانوں میں، 2,637 کو خالی شدہ صنعتی اداروں میں، 43,022 کو نجی کاروبار یا خدمات میں اور 1,896 کو سرکاری ملازمتوں میں کھپایا گیا۔ تقریباً 9,000 مہاجرین جو 1952ء میں ریاست میں آئے تھے اب بھی آبادکاری کے منتظر تھے جن کے بارے میں امید ظاہر کی گئی کہ انھیں بھی جلد ہی کامیابی سے بسایا جائے گا۔ جہاں 3,86,586 مسلمان مہاجرین ریاست میں آئے، وہاں 2,40,000 غیر مسلم افراد یہاں سے ہجرت کر گئے یعنی ریاست میں آنے والوں کی تعداد نکلنے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔ غیر مسلموں کے چھوڑے گئے کل زرعی رقبے کا تخمینہ 8,86,833 ایکڑ تھا جس میں سے 1,02,981 ایکڑ ناقابلِ کمانڈ (نکاسی آب نہ ہونے والی) زمین تھی اور 7,30,046 ایکڑ زمین مہاجرین کو الاٹ کرنے کے

لیے دستیاب تھی۔ان میں سے 7,20,546 ایکڑ یا تقریباً پوری اراضی مہاجرین میں تقسیم کر دی گئی۔ 11,193 دکانوں اور 29,609 مکانات میں سے 6,012 دکانیں اور 25,327 مکانات مہاجرین کو الاٹ کیے گئے جب کہ 88 دکانیں اور 2,111 مکانات رہائش کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے ناقابلِ استعمال قرار دیے گئے۔ باقی دکانیں اور مکانات وہ تھے جنھیں غیر مسلم باشندے تقسیمِ ہند سے بہت پہلے مقامی افراد کو کرائے پر دے چکے تھے اور وہ باقاعدگی سے کرایہ ادا کر رہے تھے لہٰذا نہ انھیں بے دخل کرنا مناسب تھا اور نہ ممکن۔اسی طرح خالی شدہ صنعتی ادارے، سنیما گھر، اینٹوں کے بھٹے، باغات وغیرہ بھی مہاجرین کو ان کی کاروباری صلاحیت، مالی حیثیت اور متعلقہ شعبے میں تجربے کو مدنظر رکھتے ہوئے الاٹ کیے گئے۔ عام طور پر فی خاندان زمین کی الاٹمنٹ کی اکائی بارانی علاقوں میں ساڑھے بارہ (12½) ایکڑ اور غیر بارانی علاقوں میں 25 ایکڑ رکھی گئی لیکن بہتر درجے کے مہاجرین کے لیے یہ حد 25 سے 100 ایکڑ تک بڑھا دی گئی۔ "عارضی مستقل دوبارہ آباد کاری اسکیم" Re-settlement(Provisional andPermanent Scheme) جو پنجاب اسکیم کی طرز پر بنی اور مرکزی حکومت سے منظور شدہ تھی، کے تحت مہاجرین کو ان کی کلیم فارم کی بنیاد پر زمین الاٹ کی گئی۔مختصر الفاظ میں یہ اسکیم ان مہاجرین کی عارضی مستقل دوبارہ آباد کاری کا بندوبست کرتی ہے جو متفقہ علاقوں (Agreed Areas) سے آ کر پہلے ہی ریاست میں آباد ہو چکے تھے اور جن کے کلیم فارم مرکزی ریکارڈ آفس سے تصدیق شدہ تھے۔ غیر متفقہ علاقوں (Non-Agreed Areas) سے آنے والے مہاجرین جو ریاست میں آباد کیے گئے تھے ان کی زمینوں کی الاٹمنٹ فی الحال عارضی حیثیت میں برقرار رکھی گئی ہے اور ان کے بارے میں کوئی حتمی پالیسی مرکزی حکومت کے فیصلے تک مؤخر کر دی گئی ہے۔اب تک تقریباً 45,000 کلیم فارم جمع ہو چکے ہیں جن میں سے 38,000 کلیم فارموں کی تصدیق مرکزی ریکارڈ آفس سے ہو چکی ہے۔ چوں کہ بڑی تعداد میں کلیم فارم ادھورے تھے یا ان میں کچھ خامیاں موجود تھیں اس لیے انھیں دوبارہ تصدیق کے لیے واپس بھیجا گیا۔ جیسے ہی تصدیق کا عمل مکمل ہوگا، عارضی مستقل دوبارہ آباد کاری کا باضابطہ عمل شروع کر دیا جائے گا۔

مہاجرین کی دوبارہ آباد کاری کو مزید سائنسی خطوط پر استوار کرنے کے لیے اگست 1952ء میں الگ سے "وزارتِ بحالی" (Ministry of Rehabilitation) قائم کی گئی۔اب محصولات اور بحالی کا سارا کام ضم کر دیا گیا ہے تا کہ ضلع حکام مؤثر طور پر اپنے احکامات اور ہدایات نافذ کر سکیں۔ ایک "مرکزی مہاجرین مشاورتی کونسل" (Central Refugees AdvisoryCouncil) بھی قائم کی گئی ہے جس میں 5 سرکاری اور 15 غیر سرکاری ارکان شامل ہیں تا کہ مہاجرین کی فلاح و بہبود اور ریاست میں ان کی مستقل دوبارہ آباد کاری کے معاملات پر حکومت کو مشورہ دیا جا سکے۔

امیرِ بہاول پور مہاجرین فنڈ: ریاست بہاول پور کی حکومت نے "امیر بہاول پور مہاجرین بحالی و امداد فنڈ" کے نام سے ایک فنڈ قائم کیا جس میں کل 22,69,105 روپے جمع ہوئے۔ان میں سے 16,69,105 روپے مقامی طور پر اور 6 لاکھ روپے "قائداعظم مہاجرین ریلیف فنڈ" سے عطیہ کیے گئے۔اس فنڈ سے اب تک 18,49,022 روپے خرچ کیے جا چکے ہیں جو زیادہ تر تقاوی قرضے، روزمرہ گزارے کے وظائف، طالب علموں کے وظیفے، مہاجرین کو کمبل اور لحاف مہیا کرنے اور مہاجر کاریگروں اور ہنر مندوں کو قرض دینے پر خرچ ہوئے۔ رہائشی ضروریات پوری کرنے کے لیے حکومت بہاول پور نے "مہاجر کالونیاں" تعمیر کرنے کی منظوری دی جن میں سے تین کالونیاں بہاول پور، بہاول نگر اور ہارون آباد میں مکمل ہو چکی ہیں۔ان کالونیوں پر تقریباً 8 لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ ریاست کے دارالحکومت میں زمین مہاجرین کو 5 روپے فی مرلہ (یعنی 272.25 مربع فٹ) کے معمولی نرخ پر فروخت کی گئی اور انھیں تعمیراتی کاموں کے لیے پیشگی رقوم بھی مہیا کی گئیں۔

مہاجرین کے صنعتی مالیات کے لیے سہولتیں: پاکستان ریفیوجیز انڈسٹریل فنانس کارپوریشن کی ایک شاخ بہاول پور میں کھولی گئی جس نے مہاجرین کو خاطر خواہ سہولتیں فراہم کیں۔ اب تک اس کارپوریشن نے ایک لاکھ روپے سے زیادہ قرضے اور گرانٹ دیے اور تقریباً 400 سلائی مشینیں مہاجر خواتین میں تقسیم کیں تا کہ وہ اپنی روزی روٹی کما سکیں۔حال ہی میں امیر بہاول پور مہاجرین فنڈ سے مزید 2 لاکھ روپے اس کارپوریشن کے حوالے کیے گئے تا کہ مہاجر ہنر مندوں اور

دستکاروں کو سہارا دیا جا سکے اور کاٹیج انڈسٹری کو فروغ دیا جا سکے۔اسی مقصد کے لیے دو سال قبل "ویمن انڈسٹریل ہوم" بھی قائم کیا گیا جہاں مہاجر خواتین کو کشیدہ کاری، بُنائی، سلائی، ہینڈلوم ویونگ اور دیگر ہنر سکھائے گئے۔اس کے نتیجے میں کئی غریب خواتین معقول آمدنی حاصل کر کے خود کفالت کی راہ پر گامزن ہو گئی ہیں۔ریاست بہاول پور بصورت وفاقی امداد مزید خدمات فراہم کر سکتی ہے۔

(20) بھاکڑا ڈیم-1

مخدوم زادہ سید حسن محمود

مطبوعہ: بہاول پور ریویو شمارہ 4، 5 جلد 2 جولائی اگست 1954

عام طور پر لوگ پوچھتے ہیں: " کشمیر کا مسئلہ تو سرد خانے میں ڈال دیا گیا ہے؛ بھارت بھاکڑا ڈیم کے منصوبے پر عملدرآمد کرتے ہوئے ستلج کا پانی بھاکڑا ننگل کینال میں پہلے ہی موڑ چکا ہے، اب کیا ہوگا؟" میری رائے یہ ہے: " خاموشی اور سکون اختیار کریں، اپنی مرکزی حکومت سے مکمل تعاون کریں اور باقی معاملات انہی پر چھوڑ دیں۔آپ کی حکومت بھارت کی ایک طرفہ کارروائی سے پیدا شدہ نازک صورتحال سے پوری طرح باخبر ہے اور اس چیلنج سے نمٹنے اور ممکنہ تباہی کو روکنے کے لیے ضروری اقدامات کر رہی ہے۔" فی الحال بہاول پور ریاست سب سے زیادہ متاثر ہوگی اور اس کی قابل کاشت اور کمانڈ شدہ سبز زمینوں کا تقریباً 50 فیصد حصہ پانی کی کمی یا بالکل عدم فراہمی کے باعث صحرا میں تبدیل ہو جائے گا جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار اور حقائق سے واضح ہوگا۔ بہاول پور ریاست پر بھارت کی جانب سے ستلج اور بیاس کے پانیوں کے رخ موڑنے کے اثرات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ریاست کی جغرافیائی کیفیت کا کچھ اندازہ لگایا جائے۔

بہاول پور ریاست کا رقبہ تقریباً 20,000 مربع میل ہے جس میں سے صرف ایک تہائی حصہ زیرِ کاشت ہے جب کہ باقی علاقہ جو عموماً چولستان کے نام سے جانا جاتا ہے، تقریباً ریگستان

ہے۔ شمالی پٹی جو زیرِ کاشت ہے، زیادہ تر ستلج، چناب اور سندھ دریاؤں کے جنوبی کناروں پر واقع ہے۔ ریاست کا موسم نہایت گرم اور خشک ہے؛ گرمیوں میں درجہ حرارت 100° سے 123° فارن ہائیٹ کے درمیان رہتا ہے اور اکثر گرد وغبار کے طوفان آتے ہیں۔ سردیوں میں درجہ حرارت رات کو 45° سے 60° فارن ہائیٹ تک گر جاتا ہے۔ بارش بے قاعدہ ہوتی ہے اور سالانہ اوسط 5 سے 7 انچ کے درمیان ہوتی ہے۔

1925-26 تک ریاست میں آبپاشی یا تو دریا کے بہاؤ سے ہوتی تھی یا پھر سیلابی نہروں کے ذریعے جو صرف سیلاب کے موسم میں چلتی تھیں۔ ستلج کے گھار اعلاقے میں، جو اب بھارتی اقدام سے براہِ راست متاثر ہوا ہے، صرف 3,81,556 ایکڑ زمین ان 11 سیلابی نہروں سے سیراب ہوتی تھی۔ 1854 میں برطانوی حکومت سے مذاکرات شروع ہوئے تاکہ ستلج اور بیاس کے پانی کو فیروز پور کے نیچے واقع زمینوں کی آبپاشی کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ طویل مشاورت کے بعد 1920 میں ہندوستان، بہاول پور اور بی کانیر کی حکومتوں کے درمیان سہ فریقی معاہدہ طے پایا جس کی بنیاد پر ستلج ویلی پروجیکٹ قائم ہوا۔ اس معاہدے کے تحت بیاس کا مکمل پانی اور ستلج کا وہ پانی جو فیروز پور سے اوپر کی نہروں کی ضروریات سے زائد ہوتا، ستلج ویلی کینالز کے لیے مختص کیا گیا۔ ستلج ویلی پروجیکٹ پر کام دسمبر 1921 میں شروع ہوا، جس کے تحت چار بند تعمیر کیے گئے۔

پہلا بند فیروز پور میں تعمیر ہو جہاں سے بہاول پور کے لیے مشرقی نہر اور اس کی تقسیم کار نہروں کے ذریعے 564 کیوسک پانی مختص کیا گیا۔ دوسرا بند سلیمانکی پر تعمیر ہوا جہاں سے بہاول پور ریاست کے لیے ایک دائمی (perennial) نہر جس کا اخراج 4917 کیوسک تھا اور ایک موسمی (non-perennial) نہر، جس کا اخراج 3346 کیوسک تھا، نکلتی ہیں۔ تیسرا بند اسلام کے مقام پر واقع ہے جہاں سے بہاول کینال اور قایم کینال نکلتی ہیں جنھیں بالترتیب 2499 کیوسک دائمی اور 3459 کیوسک غیر دائمی پانی کی منظوری دی گئی تھی۔ چوتھا بند پنجند میں دریائے چناب اور ستلج کے سنگم سے نیچے واقع ہے۔ یوں دیکھا جائے تو 7416 کیوسک دائمی اور 7399 کیوسک غیر دائمی پانی کی مقدار بہاول پور کی نہروں کے لیے 1920ء کے سہ فریقی معاہدے کے تحت گھار اعلاقے سے مختص کی

گئی۔ اس منصوبے کا مقصد کل 17,30,000 ایکڑ اراضی کو دائمی اور 12,72,216 ایکڑ کو غیر دائمی نہری آبپاشی کے تحت لانا تھا۔ مجموعی طور پر 21,17,538 ایکڑ اراضی کو سیراب کرنے کا منصوبہ تھا جن میں 10,81,430 ایکڑ دائمی اور 10,38,105 ایکڑ غیر دائمی تھے۔

مذکورہ بالا نہریں گھارا علاقے میں 27-1926 سے فعال ہوئیں۔ اس وقت بنجر علاقوں میں آبادکاری کا آغاز ہوا جہاں پہلے میٹھے پانی تک دستی رسائی بھی ممکن نہ تھی۔ مضبوط عزم کے حامل آبادکاروں اور مقامی زمینداروں کی مسلسل کوششوں سے 16,32,081 ایکڑ زمین زیرِ کاشت آئی۔ تاہم بہاول پور کے پانی کے کوٹے کو 14,805 کیوسک سے کم کر کے 13,040 کیوسک کر دیا گیا (جن میں 6340 دائمی اور 6700 غیر دائمی شامل تھے)۔ اینڈرسن کمیٹی کی سفارشات کے باوجود 21,17,538 ایکڑ کا ہدف مکمل نہ ہو سکا۔ تقسیم ہند کے بعد فیروز پور ہیڈ ورکس بھارت میں چلا گیا اور بہاول پور کے خلاف پہلا وار پانی کی بندش کی صورت میں ہوا جس سے منچن آباد تحصیل کی 67,000 ایکڑ زرخیز زمین کاشت سے نکل گئی۔ بھارتی حکومت نے تقسیم سے پہلے کے معاہدوں اور پانی کی تقسیم کے اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مزید پانی لینا شروع کر دیا۔ بھارتی حکومت نے سرہند کینال کو وسیع کرنے، روپڑ ہیڈ ورکس کو بیراج میں تبدیل کرنے، 95 فٹ اونچا ننگل ڈیم بنانے اور 680 فٹ اونچا بھاکڑا ڈیم تعمیر کرنے کا منصوبہ شروع کیا جس کی ذخیرہ صلاحیت 7.4 ملین ایکڑ فٹ ہے۔ بھاکڑا کینال جسے جولائی میں بھارتی وزیرِاعظم نے کھولا، کی گنجائش 12,500 کیوسک ہے۔ اس کے علاوہ ہریکا ویئر ستلج اور بیاس کے سنگم سے نیچے بنایا گیا تا کہ پانی کو مکمل طور پر راجستھان کی طرف موڑ دیا جائے جو کہ 1920ء کے معاہدے کی کھلی خلاف ورزی ہے جس کے تحت بیاس دریا کا سارا پانی ستلج ویلی کینالز کے لیے مخصوص تھا۔

بھاکڑا ننگل کینال پہلے ہی کھولی جا چکی ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ بھارت دیگر منصوبوں پر کہاں تک پہنچا ہے۔ اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بھارت کا مقصد ستلج اور بیاس کا تمام پانی مشرقی پنجاب اور راجستھان کی طرف موڑنا ہے اور اس مقصد کے لیے تقسیم سے قبل کے معاہدے اور بین الاقوامی قوانین کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے۔ بھارت نے بہاول پور اور مغربی پنجاب کے پانی

کے قدرتی حقوق کو بھی نظر انداز کر دیا ہے جس سے لاکھوں افراد بے گھر ہو جائیں گے کیوں کہ ان کی نہروں کو پانی نہیں ملے گا۔ ورلڈ بینک کی سرپرستی میں پانی کے تنازع پر مذاکرات کے حتمی نتائج سامنے نہیں آئے تاہم عالمی بینک نے تجویز دی ہے کہ راوی، بیاس اور ستلج بھارت کے کنٹرول میں ہوں اور مغربی دریا یعنی چناب، جہلم، اور سندھ پاکستان کے پاس ہوں۔ ماہرین کی جو بھی رائے ہو ایک بات طے ہے کہ مغربی دریاؤں کا پانی ستلج تک لانے کے لیے لنک کینالز بنانی ہوں گی جو کہ ایک طویل المیعاد عمل ہے اور مکمل ہونے میں کئی سال لگیں گے۔ ورلڈ بینک سمجھتا ہے کہ مغربی دریا پاکستان کی ضروریات پوری کر سکتے ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ نہ صرف یہ ترقی پذیر علاقوں کی ضروریات پوری نہیں کریں گے بلکہ موجودہ حقوق کی بحالی بھی ممکن نہ ہوگی۔ اگر بھارت کی یہ یکطرفہ کارروائیاں جاری رہیں تو صرف بہاول پور ریاست کو ہی اربوں روپے کے نقصان کا سامنا ہوگا حالانکہ اس نے اپنی محدود وسائل سے ستلج ویلی پراجیکٹ پر 14 کروڑ روپے اور سالانہ 16 لاکھ روپے خرچ کیے ہیں۔ تقریباً نو لاکھ ایکڑ زرعی زمین براہِ راست متاثر ہوگی اور دس لاکھ افراد کو بیدخل ہونا پڑے گا۔ بھارت کی تجویز ہے کہ خریف کے موسم میں بھی کوئی پانی فراہم نہ کیا جائے جب کہ مستقل طور پر سیراب ہونے والا رقبہ ربیع کے موسم میں مکمل طور پر پانی سے محروم ہو جائے گا۔ یہ صدمہ سب سے زیادہ ان چھوٹے کسانوں پر پڑے گا جن کے پاس تھوڑی سی زمین ہے اور جو نہری پانی پر انحصار کرتے ہیں یہاں تک کہ پینے کا پانی بھی وہیں سے ملتا ہے۔ اس سے پاکستان میں مہاجرین کا ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگا کیوں کہ وہ لوگ بغیر پانی اور فصل کے اپنی زمینوں پر نہیں رہ سکیں گے۔ مغربی دریاؤں سے پانی موڑنے کا نتیجہ پنجاب کے علاقوں پر بھی منفی اثر ڈالے گا کیوں کہ وہاں بھی ربیع اور خریف کے کچھ حصوں میں مغربی دریاؤں میں اتنا زیادہ پانی نہیں ہوتا۔ اگر فوری اقدامات نہ کیے گئے تو بہاول پور کی 16 لاکھ ایکڑ زمین بنجر ہو جائے گی اور 10 لاکھ افراد ہجرت پر مجبور ہو جائیں گے اور تقریباً 150 کروڑ روپے کی زمین ترک کر دی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ سالانہ نقصان کچھ یوں ہوگا:

☆72 لاکھ من گندم: 5.5 کروڑ روپے☆45 لاکھ من گنا: 90 لاکھ روپے☆8 لاکھ من کپاس: 2 کروڑ روپے☆ دیگر فصلیں: 2 کروڑ روپے☆ • حکومت کو پانی اور محصولات کی مد میں

سالانہ نقصان: 11 کروڑ روپے۔ اسی طرح کے نقصانات پنجاب کی ستلج ویلی کینالز اور لوئر باری دوآب کینال میں بھی ہوں گے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بہاول پور کی حقیقی ترقی اور خوشحالی کا دور ستلج ویلی کینالز کے افتتاح سے شروع ہوا۔ 25-1924 میں ان کی سالانہ آمدنی صرف 40 لاکھ روپے تھی جواب بڑھ کر 610 لاکھ روپے ہو چکی ہے جس سے ریاست کو کئی ترقیاتی اسکیمیں شروع کرنے اور عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کا موقع ملا۔ اگر بھارت کی پالیسیوں کے باعث یہ معاشی ترقی رک گئی تو تمام ترقیاتی کام ٹھپ ہو کر رہ جائیں گے۔

نہری پانی-2

ریاست بہاول پور کے تمام اخبارات میں 8 جولائی 1954 کو شائع ہونے والے ایک مشترکہ اداریے کا متن:

مطبوعہ: بہاول پور ریویو شمارہ 4، 5 جلد 2 جولائی اگست 1954

ہم ذیل میں ریاست بہاول پور کے تمام اخبارات میں شائع ہونے والے ایک مشترکہ اداریے کا انگریزی متن پیش کر رہے ہیں جو بھارت کی جانب سے دریائے ستلج کے پانی کو یکطرفہ طور پر بھاکڑا۔ ننگل کینال میں موڑنے کے اقدام کے خلاف شائع ہوا۔ یہ اقدام ریاست بہاول پور اور پنجاب کے وسیع علاقوں میں پانی کی شدید قلت پیدا کر رہا ہے۔ یہ اداریہ 8 جولائی 1954ء کو اس وقت شائع ہوا جب بھارتی وزیرِ اعظم نے بھاکڑا ننگل کینال کا افتتاح کیا۔ (ادارہ)

یہ امر مزید وضاحت کا محتاج نہیں کہ بھارت کی جانب سے دریائے ستلج کے پانی کو بھاکڑا ننگل کینالوں میں موڑنے سے نہ صرف پنجاب اور بہاول پور کی زرخیز زمینیں بنجر صحرا میں تبدیل ہو جائیں گی بلکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان پہلے سے کشیدہ تعلقات کو بھی شدید نقصان پہنچے گا۔

مسئلہ کشمیر، جونا گڑھ اور مہاجرین کی جائیدادیں پہلے ہی سے حل طلب ہیں اور تمام تر کوششوں کے باوجود ان کا کوئی قابلِ عمل حل سامنے نہیں آ سکا۔ ان معاملات میں ناکامی افسوسناک ضرور ہے مگر نہری پانی کا تنازعہ ایک خطرناک مرحلہ ہے۔ ہر قوم کے لیے پانی زندگی اور موت کا سوال ہے، خاص طور پر اس ملک کے لیے جہاں لاکھوں ایکڑ زرخیز زمین کروڑوں افراد کے لیے غذا پیدا کرتی ہے اور وہ نہری پانی سے سیراب ہوتی ہے۔ پاکستان کو دریائے ستلج کے پانی سے محروم کرنا درحقیقت ہمیں روٹی اور پانی دونوں سے محروم کرنا ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ حکومت پاکستان اور ریاست بہاول پور بھارتی حکومت کے ان ایک طرفہ اقدامات کے خلاف کیا حکمتِ عملی اپنائیں گے لیکن ایک بات واضح ہے کہ بھارت اور اس کے رہنما جن میں پنڈت نہرو بھی شامل ہیں، اپنے پاکستان مخالف عزائم میں مکمل طور پر بے نقاب ہو چکے ہیں۔ ان کے اندر اور باہر، دونوں پہلوؤں سے ان کا مقصد پاکستان کو کمزور اور مفلس کرنا ہے۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی بعض خودغرض انسان ایسی بنیادی نعمتوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں جنھیں قدرت نے سب کے لیے برابر پیدا کیا ہے صرف اس لیے کہ دوسروں کو نقصان پہنچایا جا سکے۔

''ورلڈ بینک" نے ماضی میں جو کیا، کرتا رہا مگر اب ہمیں حد سے زیادہ انحصار ترک کر دینا چاہیے۔ ہمیں خود انحصاری کی پالیسی اپنانی چاہیے۔ کچھ فوری اور ٹھوس اقدامات کرنے چاہییں تاکہ اس سنگین بحران کا بروقت سدِ باب کیا جا سکے۔ اقوامِ متحدہ یا امریکا پر انحصار بھی بے کار ہے جب تک ہم خود اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ نہ سیکھیں۔ ایک طرف امریکا بھارت کو بار بار امداد دے رہا ہے تاکہ وہ اپنے منصوبے مکمل کر سکے اور دوسری طرف وہ ہماری دوستی کا خواہشمند ہے۔ ہم تذبذب میں ہیں کہ امریکا کا اصل دوست کون ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے رہنما اس مسئلے کو صحیح زاویے سے دیکھیں گے۔

بھارت کا یہ اقدام، ابتدائی تخمینوں کے مطابق، تقریباً 18 لاکھ ایکڑ زمین کو صحرا میں بدل دے گا جو کہ ایک عظیم سانحہ ہوگا۔ بہاول پور اور بہاولنگر کے اضلاع کی پوری آبادی پانی کی عدم دستیابی

کی وجہ سے ختم ہو جائے گی۔ بھارت کا یہ عمل پاکستان کی معیشت پر ایک سوچا سمجھا وار ہے۔ پاکستان اب تک بھارت سے برداشت اور رواداری کی پالیسی کے تحت معاملہ کرتا آیا ہے مگر اب صبر کی حد ختم ہو چکی ہے۔ پورے بہاول پور میں غصے اور بے چینی کی ایک شدید لہر دوڑ رہی ہے۔ ہر شخص کی آنکھوں میں عزت کے ساتھ جینے یا غیرت کے ساتھ مرنے کا عزم جھلک رہا ہے۔ لہٰذا ہم حکومتِ پاکستان اور بالخصوص حکومتِ بہاول پور کو واضح پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہم ان کے ساتھ متحد ہیں اور اپنی قومی غیرت اور وقار کے تحفظ کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے جسے بھارت بارہا چیلنج کر چکا ہے۔ پاکستان کو وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ قوم مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ وہ اس مسئلے کا فوری اور ٹھوس حل چاہتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حکایات بہاول پور

(14)

چاہیں یقین کریں یا نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ بہاول پور میں کوئی تاجر غروبِ آفتاب کے بعد لین دین نہیں کرتا، خاص طور پر جب اسے ادائیگی کرنی ہو۔ آپ جتنی بھی کوشش کر لیں، سورج غروب ہونے کے بعد آپ کو کسی تاجر سے نقد رقم یا چیک کی صورت میں ادائیگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تحقیق سے یہ عجیب وغریب رسم سامنے آئی کہ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر سورج ڈوبنے کے بعد پیسہ جیب یا تجوری سے نکلے تو یہ بدشگونی کی علامت ہے اور جلد ہی مالی نقصان یا بدحالی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ میری رائے میں یہ توہم پرستی ہندو دیومالا کے اثرات کا نتیجہ ہے جو تقسیم سے پہلے یہاں کے عوام پر غالب تھے۔ اس وقت بہاول پور کی معیشت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی، جو دولت کی دیوی لکشمی کی پوجا کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دیوی لکشمی غروبِ آفتاب کے بعد اپنے عقیدت مندوں کے پاس آتی ہے؛ چناں چہ یہ عقیدہ مسلمانوں کے تاجروں میں بھی سرایت کر گیا۔

(15)

بہاول پور میں مکھن ہمیشہ خالص اور وافر مقدار میں دستیاب رہتا ہے۔ عام طور پر سردیوں میں مکھن کی کھپت زیادہ ہوتی ہے کیوں کہ ان دنوں انڈوں اور پراٹھوں کے ساتھ اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن بہاول پور میں معاملہ الٹ ہے۔ ہم نے بہاول پور میں سردیوں کے موسم میں رہائش اختیار کی تھی اور ہمسایوں سے بھینسوں کا دودھ لے کر آسانی سے مناسب قیمت پر مکھن حاصل کر لیتے تھے۔ مگر جیسے ہی گرمی کا موسم آیا، مکھن کی قیمت پچاس فیصد بڑھ گئی، حالانکہ دودھ کی قیمت سردیوں کے مقابلے میں کم ہوگئی تھی۔ یہ بات ہمیں کچھ عرصہ تک حیران کرتی رہی لیکن پھر خود ہی وجہ واضح ہو گئی۔ میرے استفسار پر ہمسائے نے بتایا کہ بہاول پور کے لوگ بٹیر بازی کے نہایت شوقین ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں وہ جالوں کے ذریعے بٹیر پکڑتے ہیں۔ عام طور پر دانے وغیرہ بطور چارہ استعمال کیے جاتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ وہ خاص طور پر تربیت یافتہ بٹیر بھی میدان میں چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ سدھائے ہوئے بٹیر اپنی مخصوص چہچہاہٹ سے آزاد بٹیروں کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں، جو بے خبری میں آ کر جال میں پھنس جاتے ہیں۔ ان 'شکاری' بٹیروں کی تربیت کے دوران انھیں مکھن کھلا کھلا کر ایسا شوقین بنا دیا جاتا ہے کہ وہ روزانہ مکھن کی لذت کے عوض اپنے مالک کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ یوں بٹیر کے اس شوق کے باعث گرمیوں میں مکھن کی کھپت دوگنا بڑھ جاتی ہے۔

(16)

چاہیں یقین کریں یا نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ بہاول پور میں کوئی تاجر غروبِ آفتاب کے بعد لین دین نہیں کرتا، خاص طور پر جب اسے ادائیگی کرنی ہو۔ آپ جتنی بھی کوشش کر لیں، سورج غروب ہونے کے بعد آپ کو کسی تاجر سے نقد رقم یا چیک کی صورت میں ادائیگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تحقیق سے یہ عجیب و غریب رسم سامنے آئی کہ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر سورج ڈوبنے کے بعد پیسہ جیب یا تجوری سے نکلے تو یہ بدشگونی کی علامت ہے اور جلد ہی مالی نقصان یا بدحالی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ میری رائے میں یہ توہم پرستی ہندو دیومالا کے اثرات کا نتیجہ ہے جو تقسیم سے پہلے یہاں کے عوام پر

غالب تھے۔اس وقت بہاول پور کی معیشت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی، جو دولت کی دیوی لکشمی کی پوجا کرتے تھے۔ان کا عقیدہ تھا کہ دیوی لکشمی غروبِ آفتاب کے بعد اپنے عقیدت مندوں کے پاس آتی ہے؛ چناں چہ یہ عقیدہ مسلمانوں کے تاجروں میں بھی سرایت کر گیا۔

(17)

ایک ایماندار، سادہ اور وفادار خادم بلا شبہ کسی بھی گھرانے کے لیے ایک عظیم اثاثہ ہوتا ہے لیکن میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اگر وہ شخص بہاول پوری ہو اور حد سے زیادہ ایماندار، فرض شناس اور سادہ ہو تو اکثر نادانستہ طور پر ایسے مضحکہ خیز حالات پیدا کر دیتا ہے جو ایک مخصوص کردار کی جھلک پیش کرتے ہیں۔

کئی سال پہلے، میرے والد جو انجینئرنگ کے شعبہ محل PalaceDivision میں بطور سول انجینئر کام کر رہے تھے، کو قلعہ دراوڑ تعینات کر دیا گیا۔قلعہ دراوڑ، ریاست بہاول پور کے صدر مقام "ڈیرہ نواب صاحب" سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر ایک تاریخی قلعہ ہے اور صحرا میں واقع ہے۔ چونکہ والد صاحب کا وہاں کئی ہفتوں قیام کرنا تھا اس لیے انہوں نے پورے خاندان کو اپنے ساتھ لے لیا جس پر وہ بعد میں پشیمان ہوئے۔قلعہ دراوڑ کی کل آبادی قلعہ میں تعینات چھاؤنی کے چند سپاہیوں یا قلعہ کی دیواروں کے اردگرد پناہ گزین بدووں پر مشتمل تھی۔ وہاں کوئی دکانیں موجود نہ تھیں اس لیے ہر ہفتے ڈیرہ نواب صاحب سے ضروری اشیاء منگوانا پڑتی تھیں یوں ہفتے میں چھ دن بغیر گوشت کے گزرتے۔ایک محنتی، دیانتدار اور صاف ستھرا خادم تلاش کرنا بھی ایک مسئلہ تھا۔یہ مسئلہ الٰہی بخش کے ذریعے حل ہوا۔ایک بوڑھا، دیندار اور فرض شناس شخص جسے ہم نے ملازم رکھا۔ چند دن بعد جب میں اپنی گرمیوں کی چھٹیوں میں)اس وقت میں کالج میں تھا(گھر آیا تو والدہ نے الٰہی بخش کی دیانت، وفاداری اور محنت کے قصے سنانے شروع کیے۔ میں نے بھی جلدی محسوس کیا کہ والدین اس بوڑھے آدمی سے خوش تھے۔ چند دنوں میں مجھے بھی اس کی سادگی، انکساری، صفائی پسندی اور باقاعدگی سے نماز پڑھنے کی عادت پسند آ گئی۔ پھر عید الفطر آ پہنچی اور عید کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ اگرچہ خصوصی اشیاء کئی دن پہلے ہی منگوالی گئی تھیں لیکن چند چیزیں ایسی تھیں جنہیں نئے چاند کے طلوع

ہونے تک نہیں خریدا جا سکتا تھا، جیسے تازہ گوشت۔ چاند نظر آتے ہی ہم نے ایک ٹرک ڈیرہ نواب صاحب بھیجنے کا انتظام کیا اور تمام ملازموں کو آخری لمحات میں ہدایات دے دی گئیں کہ کون کون سی خریداری کرنی ہے اور سامان راتوں رات واپس لانا ہے۔ جیسے ہی الٰہی بخش گھر سے نکلنے لگا، والدہ نے مزید پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور اسے کچھ خاص قسم کے ریشمی دھاگے خریدنے کو کہا جو وہ اپنی ایک نامکمل کڑھائی کے لیے لینا چاہتی تھیں۔ ٹرک آدھی رات کو واپس آیا مگر گھر کے باقی ملازم تو واپس آ گئے تھے، الٰہی بخش غائب تھا۔ ہم سب پریشان ہو گئے کیونکہ ڈیرہ نواب صاحب اور دراوڑ کے درمیان آمدورفت کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود نہ تھا۔ ڈرائیوروں نے بتایا کہ وہ دو گھنٹے تک شہر میں اسے تلاش کرتے رہے لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ ہم نے گمان کیا کہ شاید الٰہی بخش کسی واقف کار اونٹ والے کے ساتھ واپس آ جائے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ عید کا دن آیا اور الٰہی بخش نہ پہنچا۔ ہماری عید نہایت پھیکی رہی بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ عید کے دن کے علاوہ یہ دن بھی بغیر گوشت کے گزر گیا۔ الٰہی بخش دوسرے دن بھی نہ آیا۔ تیسرے دن ہم واقعی فکرمند ہو گئے۔ ڈیرہ نواب صاحب میں معلومات لینے کے باوجود اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ اس کی گمشدگی قلعہ اور باہر ہر جگہ موضوعِ گفتگو بن گئی۔ چوتھے دن شام کو الٰہی بخش اچانک دروازے پر نمودار ہوا مٹی سے اٹا ہوا، گرد سے اٹا، بیمار اور تھکا ہارا۔ اس کے جسم سے ایک ناقابل برداشت بدبو اٹھ رہی تھی جس سے ہم سب نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیے۔ جتنا وہ قریب آتا گیا بدبو کی شدت بڑھتی گئی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کندھے سے ایک گٹھڑی اتاری اور والدہ کے ہاتھ میں دی۔ والدہ نے خوف سے چیخ ماری اور گٹھڑی ان کے ہاتھ سے گر گئی۔ تب ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ بدبو اسی گٹھڑی سے آ رہی ہے۔ معاملہ جلد ہی کھلا۔ الٰہی بخش نے بتایا کہ اس نے عید کی رات ڈیرہ نواب صاحب سے تین سیر گوشت خریدا اور اپنی پگڑی میں باندھ لیا تاکہ دوسری اشیاء خرید سکے۔ مگر جب ریشمی دھاگے بازار میں دستیاب نہ ہو سکے اور بتایا گیا کہ یہ صرف بہاول پور میں مل سکتے ہیں تو وہ والدہ کو مایوس کرنا گوارا نہ کر سکا۔ بقیہ پیسے بچا کر ریل کا کرایہ بھی نہ ہونے کے باعث وہ پیدل ہی بہاول پور روانہ ہو گیا۔ اگلی شام بہاول پور پہنچا، دھاگے خریدے اور دو دنوں اور تین راتوں میں پیدل واپس لوٹا۔ اس دوران تین دنوں کا گوشت تیز گرمی میں سڑ چکا تھا اور اسی سے ناقابل برداشت تعفن اٹھ رہا تھا۔

(19)

یقین کریں یا نہ کریں لیکن یہ واقعہ واقعی ریاست بہاول پور کے دارالحکومت میں پیش آیا اور بہت سے لوگ اس کے گواہ ہیں۔ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا جو ایک نہایت خوب صورت اور وفادار لڑکی سے شادی کر چکا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے دیوانہ وار محبت کرتے تھے۔مگر قسمت کی ستم ظریفی سے نوجوان کی بیوی اچانک فوت ہوگئی۔ یہ حادثہ شوہر پر اس قدر گراں گزرا کہ وہ تقریباً اپنا ہوش کھو بیٹھا۔ اس نے دنیا سے منہ موڑ لیا اور اپنی زندگی کا بیشتر وقت اپنی مرحومہ بیوی کی قبر پر گزارنے لگا۔ وہ وہاں بیٹھ کر روتا یا قرآن کی آیات پڑھتا۔اس نے بیوی کی قبر کے سرہانے ایک پودا لگایا اور اسے باقاعدگی سے پانی دیتا رہا۔ چند مہینوں میں وہ پودا ایک چھوٹے درخت میں تبدیل ہوگیا، جس پر ہری بھری پتیاں اور خوب صورت پھول کھلنے لگے۔لوگ اکثر اسے دیکھتے کہ وہ اس درخت کو گلے لگا کر اس کی ٹہنیوں اور پھولوں سے لپٹا ہوتا جیسے وہ اپنی محبوبہ سے باتیں کر رہا ہو۔ بڑے بھائی اور دوستوں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر سب بے سود رہا۔تب کسی نے مشورہ دیا کہ اسے ایک نفسیاتی تدبیر سے سنبھالا جائے۔ چناں چہ وہ جب بھی قبر پر آتا، دوست اس کے سامنے نوجوان حسین لڑکیوں کی تعریفیں کرتے جو اس کی حالت پر دکھی تھیں۔ یوں اسے یہ احساس دلایا گیا کہ بہت سی لڑکیاں اس سے ہمدردی رکھتی ہیں اور شادی کی خواہشمند ہیں۔رفتہ رفتہ اس کا دل مائل ہونے لگا۔ پھر اس کے بھائی نے ایک حسین لڑکی کی تصویر اسے دکھائی پھر جب وقت مناسب ہوا تو اس کی منگنی کر دی گئی۔نکاح کا دن بھی طے ہوگیا۔ جب وہ دوسری شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوا تو بیوی کی قبر پر جانا کم ہوگیا اور بالآخر ختم ہوگیا۔ چوں کہ وہ درخت اس کی مستقل توجہ اور پانی کے بغیر رہا تو جلد ہی وہ سوکھ کر مرجھا یا ختم ہوگیا۔ مادی طور پر دیکھا جائے تو یہ بالکل فطری بات تھی لیکن لوگوں نے اسے روحانی تعبیر دی کہ مردہ بیوی کی روح اس درخت میں بس گئی تھی اور جب شوہر نے محبت میں بے وفائی کی تو درخت بھی مرجھا گیا۔آج بھی کچھ لوگ ہر جمعرات کو اس قبر پر جا کر چراغ جلاتے ہیں، درخت کی جڑ پر پانی چھڑکتے ہیں اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں۔

سپریم کورٹ آف پاکستان کا بہاولپور کے نواب کی جائیداد کے بارے میں یکم جون 2006 کا فیصلہ

یہ دستاویز پاکستان کی عدالت عظمیٰ کا یکم جون 2006 کا ایک تفصیلی عدالتی فیصلہ ہے جو اپیل کی روشنی میں کیا گیا جس میں بہاولپور کے آخری نواب سر صادق محمد خان عباسی کی وفات کے بعد اُن کی جائیداد کی تقسیم سے متعلق قانونی تنازعات کو حل کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے مطالعے سے ریاست بہاولپور کی تاریخ، الحاق اور انضمام اور اس کے بعد کی صورت حال سے جڑے حقائق سامنے آتے ہیں۔ اس فیصلے کا ہو بہو ترجمہ اور تلخیص کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ترجمہ کرتے وقت فیصلے کی روح اور ہر قسم کی قانونی اصطلاحات کی صحت کو برقرار رکھنے کی ہر چند کوشش کی گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی غلطی ہو تو اسے غیر ارادی اور قابل معافی انسانی خطا تصور کیا جائے۔ مترجم

سپریم کورٹ آف پاکستان (اپیلیٹ دائرہ اختیار)

بعدالت: 1۔ جناب جسٹس فقیر محمد کھوکھر۔ 2: جناب جسٹس ایم. جاوید بٹر

سول درخواستیں نمبر: 700 اور 1539-ایل/2004

لاہور ہائی کورٹ بہاولپور بینچ کے 8 مارچ 2004 کے فیصلے کے خلاف اپیل جو رٹ پٹیشنز نمبر 1141/2003 اور 3237/2003/BWP میں سنایا گیا تھا۔

سول پٹیشن نمبر 700/2004 درخواست گزاران: صاحبزادہ محبت خان عباسی اور سات دیگران بنام: حکومت پاکستان بذریعہ سیکرٹری برائے امورِ کشمیر و شمالی علاقہ جات اور ریاستی و

سرحدی امورڈویژن (کاناوسیفرون (اسلام آباداور 32 دیگران)

درخواست گزاران کی طرف سے 1 ۔: میاں اللہ نواز، ایڈووکیٹ سپریم کورٹ

2۔: جناب مہر خان ملک، ایجنٹ آن ریکار

جواب دہندگان کی طرف سے (چند متعلقہ برائے 16,9.(2),(1)14 (3)7,(

5(2),6(2),7(iii)-1 محمد منیر پراچہ، ایڈووکیٹ سپریم کورٹ 2۔ارشد علی چوہدری، ایجنٹ آن ریکارڈ

سول پٹیشن نمبر-1539 ایل 2004/درخواست گزاران:

محمد افضل عباسی اور 21 دیگران بنام: حکومت پاکستان بذریعہ جوائنٹ سیکرٹری، وزارتِ ریاستی وسرحدی امور، سیکرٹریٹ راولپنڈی، ودیگران

درخواست گزار کی طرف سے-1: جناب مجیب الرحمٰن، ایڈووکیٹ سپریم کورٹ 2۔ جناب جی. این. گوہر، ایجنٹ آن ریکارڈ

جواب دہندگان کی طرف سے-1: جناب جعفر حسین، ایڈووکیٹ سپریم کورٹ-2ارشد علی چوہدری، ایجنٹ آن ریکارڈ (برائے 9(ii)11(III),(ii)9iاور 15)

ریاست کی طرف سے 1:۔ جناب ناصر سعید شیخ، ڈپٹی اٹارنی جنرل 2۔راجہ عبدالغفور، ایجنٹ آن ریکارڈ

سماعت کی تاریخ 1: جون 2006) اسلام آباد

حکم (ORDER)

جناب جسٹس ایم. جاوید بٹر:

ہم دونوں ان درخواستوں کا فیصلہ ایک مشترکہ حکم کے ذریعے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں کیونکہ دونوں میں قانون اور حقائق کے مشترکہ سوالات شامل ہیں۔

2۔ یہ درخواستیں لاہور ہائی کورٹ، بہاولپور بینچ کی 8 مارچ 2004 کے اس ڈویژن بینچ کے حکم کے خلاف دائر کی گئی ہیں جس میں درخواست گزاروں کی رٹ پٹیشنز نمبر 1141/2003 اور 3237/2003 ابتدائی مرحلے میں ہی خارج کر دی گئی تھیں۔

3۔ دونوں درخواستوں کے درخواست گزار بہاولپور کے مرحوم امیر سر صادق محمد خان عباسی جو 24 مئی 1966 کو فوت ہوئے، کی چھوڑی گئی جائیداد میں اپنے حصے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ یہ جائیداد وہ بطور شرعی وارث نہیں مانگ رہے بلکہ بطور قریبی رشتہ دار (collaterals) مانگ رہے ہیں اور دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ سابق امیر کے پیش رو نوابوں کی نسل سے ہیں۔

درخواست گزاران، سول پٹیشن نمبر 700/2004 میں، اپنے آپ کو پانچویں حکمران کے وارث قرار دیتے ہیں جبکہ سول پٹیشن نمبر-1539 ایل 2004/ کے درخواست گزاران خود کو پہلے حکمران کے وارث قرار دیتے ہیں جو 1750ء سے کچھ عرصہ پہلے وفات پا چکے تھے۔ پٹیشن نمبر 700/2004 میں درخواست گزاران نے اپنی رٹ پٹیشن نمبر 1141/2003 کے پیرا 3(i) میں خود کو مرحوم امیر بہاولپور سے اس طرح منسلک کیا ہے:

''مرحوم سر صادق محمد خان عباسی پنجم، ریاست بہاولپور کے آخری حکمران، ان کے والد عالی جاہ بہاول خان پنجم حکمران تھے۔ مرحوم بہاول خان کی ایک بیٹی، محترمہ شہزادی مہر النساء عباسی بھی تھیں۔ درخواست گزاران، محترمہ شہزادی مہر النساء اور معتصم باللہ عباسی حاجی محمد خان کے پہلے بیٹے کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ حاجی محمد خان، بہاول خان عباسی کے حقیقی بھائی تھے اور جناب سر صادق محمد خان عباسی کے چچا تھے اور یہی حاجی محمد خان، درخواست گزاروں کے جدامجد ہیں۔ اس لیے درخواست گزاروں کے حقوق دونوں جدامجد حاجی محمد خان (چچا) اور شہزادی مہر النساء (بہن) سے ماخوذ ہیں۔"

4۔ دوسری پٹیشن یعنی-1539 ایل 2004 میں، پیرا 9 اور 10 میں مندرجہ ذیل مؤقف اختیار کیا گیا:

9"۔ درخواست گزاران سات مختلف خاندانوں کے سربراہ ہیں جو حکمران خاندان کی شاخیں ہیں اور ان کا ایک مشترکہ جد ہے جس کے نتیجے میں ان کا مساوی طور پر اس مشترکہ خاندانی جائیداد میں حق بنتا ہے جو مرحوم سر صادق محمد خان عباسی پنجم نے چھوڑی اور جب خاندانی جائیداد قانونی طور پر تقسیم ہو رہی ہو تو شریعت کے مطابق ان کو ان کا حصہ ملنا چاہیے۔ یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ ریاست بہاولپور اپنے قیام کے وقت سے ایک خودمختار ریاست تھی جس میں ذاتی معاملات جیسے نکاح، طلاق، ولایت اور

جائیداد کے حوالے سے شریعت کا قانون نافذ العمل تھا اور یہ اس ریاست کی ایک نمایاں خصوصیت سمجھی جاتی تھی۔

10۔ اگرچہ ممکن ہے کہ درخواست گزاران کو سر صادق محمد خان عباسی پنجم کا فوری شرعی وارث نہ سمجھا جائے تاہم اسلامی فقہ کے مطابق، انصاف، نیک نیتی اور خاندانی عرف کی روشنی میں انہیں جائیداد میں حصہ دار سمجھا جانا چاہیے۔ وہ افراد جو مشترکہ خاندانی جائیداد سے اپنی ضرورت کے مطابق فائدہ اٹھاتے رہے ہیں وہ درحقیقت شرعی قانون کے تحت حصہ دار ہیں۔"

5۔ دونوں درخواستوں میں درخواست گزاروں کا مؤقف بنیادی طور پر یہ ہے کہ مرحوم امیر بہاولپور کی چھوڑی ہوئی جائیداد غلط طور پر صرف اُن کے شرعی ورثاء (تین بیوگان، دس بیٹے اور دس بیٹیاں) میں تقسیم کی گئی ہے حالانکہ وہ جائیداد مرحوم امیر کی ذاتی ملکیت نہ تھی بلکہ وہ مشترکہ خاندانی جائیداد تھی جو ان کے آباؤ اجداد سے چلی آ رہی تھی اور پورے خاندان کی ملکیت تھی۔

درخواست گزاران نے مؤقف اختیار کیا کہ:

''ریاستی جائیداد اور مرحوم امیر کی ذاتی جائیداد کے علاوہ ایک تیسری قسم کی جائیداد بھی موجود تھی جسے "امارت کی جائیداد" کہا جا سکتا ہے۔ 2۔ یہ تیسری قسم کی جائیداد ہمیشہ حکمرانوں کے اختیار و انتظام میں رہتی تھی تاکہ پورے خاندان کے فائدے میں استعمال ہو۔ 3 ۔مرحوم امیر کی وفات کے بعد جب ان کی ذاتی جائیداد تقسیم کی گئی تو اس اماراتی جائیداد کو بھی غیر قانونی طور پر شرعی ورثاء میں شامل کر کے تقسیم کر دیا گیا۔''

اس جائیداد کی تفصیل یا فہرست درخواستوں میں بیان نہیں کی گئی تاہم اس کو شامل کرنے کے عمل کو لاہور ہائی کورٹ بہاولپور بینچ میں دائر آئینی درخواستوں کے ذریعے چیلنج کیا گیا تھا جو کہ ابتدائی سماعت میں ہی خارج کر دی گئیں۔

6۔ ہم نے تمام وکلاء کے دلائل غور سے سنے اور متعلقہ ریکارڈ اور قانون کا مطالعہ کیا ہے۔

7۔ مرحوم امیر بہاولپور کی جائیداد کی تقسیم کا معاملہ ایک پیچیدہ تاریخی پس منظر رکھتا ہے۔ مختصر طور پر بیان کیا جائے تو برطانوی ہند کا علاقہ بنیادی طور پر دو حصوں میں منقسم تھا۔ 1: برٹش انڈیا، وہ

علاقے جو براہ راست برطانوی حکومت کے زیر انتظام تھے، جیسے گورنر، صوبے؛ 2۔ ریاستیں، وہ خودمختار ریاستیں جن پر مقامی حکمرانوں یا نوابوں کی حکومت تھی۔

ریاست بہاولپور ان متعدد بھارتی ریاستوں میں سے ایک تھی۔ برطانوی ہند براہ راست برطانوی پارلیمان کے قوانین اور ہندوستانی مقننہ کے تحت چلتا تھا جبکہ بھارتی ریاستیں تاجِ برطانیہ کی بالادستی (Suzerainty) کے تحت لیکن اندرونی طور پر خودمختار تھیں سوائے ان ریاستوں کے جنہوں نے خصوصی معاہدے کیے تھے۔ 1858ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی سے اقتدار تاجِ برطانیہ کو منتقل ہوا تو ہندوستان کے تمام علاقوں پر برطانوی حکومت کی بالادستی قائم ہوئی۔ ان ریاستوں کے دفاع اور خارجی امور کی ذمہ داری برٹش انڈیا پر تھی جب کہ داخلی معاملات میں ریاستیں خودمختار تھیں۔ 1935 کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اس امر کا قائل تھا کہ اگر کوئی ریاست وفاقِ ہند سے الحاق کرنا چاہے تو رضاکارانہ معاہدے کے تحت کر سکتی ہے بشرطیکہ تاجِ برطانیہ اسے قبول کرے۔ 1947 کے انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ کی رو سے تاجِ برطانیہ کی بالادستی ختم کر دی گئی۔ اس طرح ریاستیں اس حیثیت میں واپس آ گئیں جیسا کہ وہ تاج کے تحت آنے سے قبل تھیں۔ 3 اکتوبر 1947 کو امیر بہاولپور الحاج سر صادق محمد خان عباسی نے پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کیا اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کے سیکشن 6 کے تحت الحاقی دستاویز (Instrument of Accession) پر دستخط کیے۔ یہ الحاق اس وقت کے گورنر جنرل پاکستان نے منظور کیا جیسا کہ 1947 کے عبوری آئینی حکم (PCO) میں بیان کیا گیا تھا۔ بعدازاں، 11 اپریل 1952 کو امیر بہاولپور نے ایک دوسرا بڑا معاہدہ کیا جسے گورنر جنرل پاکستان نے تسلیم کیا۔ اس معاہدے کے مطابق:

1۔ امیر بہاولپور نے یہ قبول کیا کہ پاکستان کے لیے بننے والا آئندہ آئین ریاست بہاولپور پر نافذ العمل ہوگا۔ 2۔ اس کے عوض امیر کو سالانہ 29 لاکھ 50 ہزار روپے بطور "پرائیوی پرس" (Privy Purse) ادا کیے جائیں گے۔ 3۔ ذاتی حقوق، مراعات، عزت و توقیر، اور جائیداد کی تفصیلات آرٹیکل II تا IV میں بیان کی گئیں، جو کہ درج ذیل ہے:

آرٹیکل: II۔ 1- امیر کو مکمل ملکیت، استعمال اور فائدے کا حق حاصل ہوگا، ان تمام جواہرات،

زیورات، حصص، سیکیورٹیز اور دیگر منقولہ اور غیر منقولہ ذاتی جائیداد پر جو ریاستی جائیداد نہ ہو اور جو اس معاہدے کے دن ان کی ملکیت ہو۔ 2۔ امیر اس معاہدے کے تین ماہ کے اندر اپنی ذاتی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کی فہرست حکومتِ پاکستان کو فراہم کرے گا۔ 3۔ اگر کسی جائیداد کے متعلق تنازعہ پیدا ہو کہ آیا وہ ذاتی ہے یا ریاستی تو یہ فیصلہ گورنر جنرل پاکستان کرے گا اور وہ فیصلہ حتمی ہوگا۔

آرٹیکل: III۔ امیر اور ان کے خاندان کے افراد کو تمام ذاتی مراعات، اعزازات اور القابات حاصل رہیں گے جیسا کہ وہ اس معاہدے سے پہلے ریاست کے اندر یا باہر استعمال کرتے تھے۔

آرٹیکل: IV۔ حکومتِ پاکستان اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ بہاولپور کی گدی اور امیر کی ذاتی مراعات و القابات کا جانشینی نظام ریاستی قانون اور رواج کے مطابق ہوگا۔

8۔ 17 دسمبر 1954 کو، "ون یونٹ" کے قیام سے قبل حکومتِ پاکستان اور امیر بہاولپور کے درمیان "بہاولپور انضمامی معاہدہ" (Bahawalpur Merger Agreement) طے پایا۔ اس معاہدے کے ذریعے:

بہاولپور کی خودمختاری، تمام اختیارات اور حقوق حکومتِ پاکستان کو منتقل کیے گئے؛ امیر نے ریاستی حاکمیت مکمل طور پر ترک کر دی۔ حکومتِ پاکستان نے امیر کو مخصوص مراعات کی ضمانت دی جن کی تفصیل معاہدے کے آرٹیکل II تا V میں دی گئی۔

آرٹیکل: II امیر بہاولپور کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے ہر سال 32 لاکھ روپے پر مشتمل پرائیوی پرس ملے گا، جو ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا۔ یہ رقم درج ذیل اخراجات کے لیے مختص کی گئی تھی:

- امیر اور ان کے خاندان کا نان نفقہ، ذاتی محافظ (باڈی گارڈ)، سفری اخراجات، مہمان نوازی، رہائش گاہ کا انتظام، شادی و دیگر خاندانی تقاریب۔ یہ رقم ہر سہ ماہی کے آغاز پر، چار برابر اقساط میں ایڈوانس میں ادا کی جائے گی۔ حکومتِ پاکستان اس ادائیگی کی مکمل ضمانت دیتی ہے۔

آرٹیکل: III ۔ امیر کو درج ذیل چیزوں پر مکمل ملکیت، استعمال اور فائدہ حاصل رہے گا• تمام جواہرات، زیورات، آرائش کی اشیاء، حصص، سیکیورٹیز، منقولہ اور غیر منقولہ جائیدادیں بشرطیکہ وہ

ریاستی جائیداد نہ ہوں اور امیر کی ذاتی ملکیت ہوں (اگر کسی جائیداد کی نوعیت پر تنازع ہو کہ آیا وہ ذاتی ہے یا ریاستی تو گورنر جنرل پاکستان اس کا فیصلہ کرے گا جو حتمی اور سب پر لازم ہوگا۔
آرٹیکل :IV ذاتی اعزازات و مراعات:۔امیر، ان کی اہلیہ (Her Highness) اور ان کی اولاد درج ذیل حقوق کے حقدار ہوں گے: وہ تمام ذاتی القابات، اعزازات، مراعات جو معاہدے کی تاریخ سے پہلے انہیں ریاست کے اندر یا باہر حاصل تھیں۔
آرٹیکل :V ۔حکومتِ پاکستان اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ گدی کی جانشینی اور ذاتی مراعات، اعزازات، القابات ریاست بہاولپور کے قانون اور رواج کے مطابق ہی ہوگی۔
(حصہ iii کے پیرا نمبر 2) میں واضح کیا گیا کہ اگر کوئی تنازع پیدا ہو کہ کون سی جائیداد امیر کی ذاتی ہے اور کون سی ریاستی تو اس کا فیصلہ گورنر جنرل کرے گا اور وہ فیصلہ حتمی ہوگا۔

9۔8 جون 1955 کو ایک فہرست مرتب کی گئی جس میں حکومتِ پاکستان نے امیر کی ذاتی جائیداد (محلات، عمارات اور دیگر املاک) کو تسلیم کیا اور اس پر دستخط کیے گئے۔ یہ فہرست بعد میں امیر کو دے دی گئی۔

10۔"ویسٹ پاکستان کے قیام کا ایکٹ، "1955 کی دفعہ 10(1)، جو 3 اکتوبر 1955 کو منظور ہوا، اگرچہ اس نے "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، "1935 کی دفعہ 6 کو منسوخ کر دیا لیکن ویسٹ پاکستان میں مقررہ تاریخ سے قبل نافذ تمام قوانین کو برقرار رکھا۔ اسی طرح "اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین" کی دفعہ 202(3) جو 29 فروری 1956 کو نافذ ہوئی، کے تحت موجودہ ریاستوں کے حکمرانوں کے حقوق، مراعات وغیرہ کو تسلیم کیا گیا اور اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا گیا کہ شق (1) میں جس کسی معاہدے کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کے تحت دی گئی ضمانتوں یا یقین دہانیوں کا احترام کیا جائے گا جو مذکورہ حکمرانوں کے ذاتی حقوق، مراعات اور عزت و وقار سے متعلق ہوں۔
اس کے بعد 7 اکتوبر 1958 کو مارشل لا نافذ ہونے اور 10 اکتوبر 1958 کو "قوانین برقرار رکھنے کا حکم 1958" جاری ہونے کے بعد صدرِ پاکستان کا حکم نمبر 15 بابت 1960، جسے "حکمرانوں) جانشینوں کے اعتراف کا حکم 1960" کہا گیا، 16 جون 1960 کو جاری کیا گیا جس

میں یہ رعایت دی گئی کہ کسی ریاست کے حکمران کے حوالہ سے کیا جانے والا کوئی بھی اقدام اس شخص پر بھی منطبق سمجھا جائے گی جسے صدر نے وقتی طور پر اس حکمران کا جانشین تسلیم کیا ہو۔

2 ستمبر 1961 کو صدر پاکستان کا حکم نمبر 12 بابت 1961، جسے "الحاق شدہ ریاست (املاک) حکم، 1961" کہا گیا، نافذ کیا گیا۔ اس میں یہ قرار دیا گیا کہ اگر کسی ریاست یا اس کے حکمران کی کسی جائیداد کی تقسیم یا اس کے وارث یا جانشین ہونے کے دعوے پر اختلاف ہو تو ایسے تنازع کا فیصلہ مرکزی حکومت کرے گی۔

11۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین 1962 کا نفاذ 8 جون 1962 کو ہوا۔ مذکورہ آئین کے آرٹیکل 225 میں موجودہ قوانین کے جاری رہنے کی ضمانت دی گئی تھی اور آرٹیکل (3)223 میں حکومت کی جانب سے کسی معاہدے یا دیگر ذرائع سے پیدا ہونے والے حقوق، ذمہ داریوں اور فرائض کے برقرار رہنے کی شق شامل تھی۔

12۔ سر صادق محمد خان عباسی، امیر ریاست بہاولپور 24 مئی 1966 کو وفات پا گئے۔ بریگیڈیئر نواب محمد عباس خان عباسی ریاست بہاولپور کے امیر کی حیثیت سے ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ پاکستان حکومت نے 4 جون 1966 کے حکم نامے کے ذریعے اس جانشینی کو تسلیم کیا۔ مرحوم سر صادق محمد خان عباسی کے زیادہ تر ورثاء نے پاکستان کی حکومت سے رجوع کیا اور مرحوم امیر کی ذاتی جائیداد میں اپنے اپنے حصے کا دعویٰ کیا۔ بریگیڈیئر نواب محمد عباس خان عباسی نے ان دعوؤں کی تردید کی اور یہ مؤقف اختیار کیا کہ چونکہ وہ بہاولپور کے امیر کے طور پر جانشین ہو چکے ہیں اس لیے وہ مرحوم امیر کی تمام ذاتی جائیداد کے واحد حقدار ہیں۔ حکومت پاکستان نے ان کا یہ مؤقف تسلیم نہیں کیا اور اس معاملے کو AcceedingStates Property Order 1961 کی دفعات کے دائرہ کار میں شمار کیا جو کہ مرحوم امیر کی چھوڑی ہوئی جائیداد کی تقسیم پر لاگو ہوتی تھیں۔ اسی مناسبت سے، مذکورہ 1961 کے آرڈر کے آرٹیکل 3 کے تحت بورڈ آف ریونیو کے دو سینئر ارکان پر مشتمل ایک کمیشن تشکیل دیا گیا تا کہ مرحوم امیر کی نجی جائیداد کے بارے میں تحقیقات کی جائیں اور اس کی تقسیم سے متعلق سفارشات پیش کی جائیں۔ کمیشن کے ارکان نے مرحوم امیر کی جائیداد کی مکمل چھان بین کی

اوراس کی تفصیل مرتب کر کے اس کی تقسیم کے لیے اپنی سفارشات پیش کیں۔ یہ سفارشات صدرِ پاکستان نے منظور کر لیں اور اس مقصد کے لیے ایک حکم نامہ بعنوان (The Devolution and Distribution of Property (Ameer of Bahawalpur) order "1969 حکومت پاکستان نے 19 فروری 1969 کو جاری کیا اور یہ حکم نامہ 20 فروری 1969 کے پاکستان گزٹ (غیر معمولی اشاعت) میں شائع ہوا۔ اس حکم نامے کے تحت پہلی فہرست (First Schedule) میں درج منقولہ اور غیر منقولہ جائیدادیں نواب محمد عباس خان عباسی کی ملکیت قرار پائیں لیکن یہ جائیدادیں ان کی بحیثیت امیر بہاولپور کے عہدے سے مشروط رہیں اور وہ جب تک امیر رہیں ان کی ملکیت برقرار رہیں گی۔ باقی جائیدادیں دوسری فہرست (Schedule II) کے مطابق تمام شرعی وارثوں میں تقسیم کر دی گئیں جن میں نواب محمد عباس خان عباسی بھی شامل تھے۔ پہلی فہرست میں شامل جائیدادوں کے بارے میں یہ پابندی عائد کی گئی کہ نواب محمد عباس خان عباسی مرکزی حکومت کی پیشگی منظوری کے بغیر ان جائیدادوں کو فروخت یا کسی اور طریقے سے منتقل نہیں کر سکیں گے۔ اس حکم نامے میں یہ بھی درج کیا گیا کہ مرحوم امیر کے تمام وارثین ان جائیدادوں پر عائد وراثتی محصول (Estate Duty) کی ادائیگی کے ذمہ دار ہوں گے۔

13۔ نواب محمد عباس خان عباسی نے "The Devolution and Distribution of Property (Ameer of Bahawalpur) order 1969 سے متأثر ہو کر رٹ پٹیشن نمبر 346 آف 1969 لاہور ہائی کورٹ، لاہور میں دائر کی اور اس کے جواز کو چیلنج کیا۔ انہوں نے مؤقف اختیار کیا کہ 1954 کا انضمامی معاہدہ (Merger Agreement) ایک آئینی دستاویز تھا جو عام قوانین کے تابع نہیں تھا اور حکومت پاکستان اس معاہدے میں مرحوم امیر کو دی گئی ضمانتوں اور یقین دہانیوں کی پابند تھی۔ اس لیے Acceding States Property Order 1961 (صدرِ پاکستان کا آرڈر نمبر 12 آف 1961) کی دفعات اس پر غالب نہیں آتیں۔ انہوں نے یہ بھی مؤقف اختیار کیا کہ اگر صدر کا آرڈر نمبر 12 آف 1961 انضمامی معاہدے کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تب بھی حکومت پاکستان اس بات کی پابند تھی کہ

جائیداد کے جانشینی سے متعلق اس تنازعے کا فیصلہ ریاستی قوانین، رسوم ورواج اور پہلوٹ (Primogeniture) کے قاعدے کے مطابق کرے جس کے تحت صرف نواب محمد عباس خان عباسی مرحوم امیر کی تمام جائیداد کے اکیلے وارث قرار پاتے۔ انہوں نے صدر کے آرڈر نمبر 12 آف 1961 کی آئینی حیثیت کو بھی چیلنج کیا اور کہا کہ اس آرڈر کے ذریعے مرکزی حکومت کو لامحدود اور بلا روک ٹوک اختیارات تفویض کر دیے گئے ہیں جس میں اختیارات کی حد سے زیادہ منتقلی اور قدرتی انصاف (Natural Justice) کے اصول کی خلاف ورزیاں شامل ہیں۔ دوسری طرف حکومت پاکستان نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ 1954 کا انضمامی معاہدہ دو خودمختار ریاستوں کے درمیان ایک معاہدہ (Treaty) تھا جسے ملک کی کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ متبادل کے طور پر انہوں نے کہا کہ انضمامی معاہدہ ملک کے عام قوانین کے تابع تھا اور اس میں صدر کے آرڈر نمبر 12 آف 1961 کی دفعات کے ذریعے ردوبدل اور تبدیلی کی جا سکتی تھی۔ حکومت کا یہ بھی کہنا تھا کہ "The Devolution and Distribution of Property (Ameer of Bahawalpur) order1969 مرحوم امیر بہاولپور کی وفات پر چھوڑی گئی جائیداد کی منصفانہ اور مناسب تقسیم تھی۔ حکومت نے دیگر تکنیکی اعتراضات بھی اٹھائے، جیسا کہ ہائی کورٹ کے دائرہ اختیار پر قدغن وغیرہ۔ دیگر فریقین یعنی مرحوم امیر کے باقی وارثین نے حکومت پاکستان کے اس مؤقف کی تائید کی کہ مذکورہ 1969 کا آرڈر مرکزی حکومت کی طرف سے قانون کے مطابق اور مرحوم امیر کی جائیداد کی منصفانہ اور منظم تقسیم کے لیے جاری کیا گیا تھا تاہم انہوں نے نواب محمد عباس خان عباسی کی اس بات کی حمایت کی کہ جائیداد وراثتی محصول (EstateDuty) کی ادائیگی کی ذمہ دار نہیں تھی۔

14۔ ہائی کورٹ نے 4 دسمبر 1973 کو اپنے تفصیلی فیصلے میں بریگیڈیئر عزت مآب نواب محمد عباس خان عباسی، امیر بہاولپور بنام حکومت پاکستان بذریعہ جوائنٹ سیکریٹری وزارتِ ریاست وسرحدی امور، راولپنڈی (PLD 1978 لاہور [1166]) یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مرکزی حکومت Acceeding1States Property Order 1961 (صدر پاکستان کا

آرڈر نمبر 12 آف 1961) کی دفعہ 3 کے تحت مرحوم امیر کی ریاست کی جائیداد کے جانشینی اور تقسیم کے تنازعے کے فیصلے کی مجاز تھی اور یہ قانون مکمل طور پر جائز تھا۔ تاہم، یہ بھی قرار دیا گیا کہ The Devolution and Distribution of Property (Ameer of Bahawalpur) order1969 قانون کے مطابق جاری نہیں کیا گیا، اس لیے اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ معزز جج صاحبان نے مزید حکم دیا کہ ": یہ معاملہ دوبارہ فیصلہ کرنے کے لیے مرکزی حکومت کو واپس بھیجا جاتا ہے تا کہ اسے قانون کے مطابق نمٹایا جائے۔" چنانچہ نواب محمد عباس خان عباسی کی دائر کردہ رٹ پٹیشن اس حد تک منظور کی گئی۔ حکومت پاکستان اور نواب محمد عباس خان عباسی دونوں نے ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف اپیلیں دائر کیں)(سول اپیل نمبر 128 اور 129 آف 1978)۔ سپریم کورٹ نے 7 اپریل 1982 کو اپنے تفصیلی فیصلے Government of Pakistan VS His Highness Brig,Nawab Abbas Khan Abbasi and others PLD 1982 SC.367 میں دونوں اپیلیں مخصوص آبزرویشنز کے ساتھ خارج کر دیں۔ یہ تاریخی تنازعہ اور اس کی نوعیت اسی فیصلے سے ماخوذ ہے۔ معزز جج ڈاکٹر نسیم حسن شاہ نے اپنے محققانہ فیصلے میں ہائی کورٹ کی طرف سے مختلف نکات پر درج کردہ نتائج کا اس طرح خلاصہ کیا جو یہاں سہولت کی خاطر پیش کیے جا رہے ہیں: ہائی کورٹ نے اپنے 4 دسمبر 1973 کے فیصلے میں رٹ پٹیشن نمبر 346 آف 1969 میں یہ نکات طے کیے:

(الف) 1954 کے انضمامی معاہدے کی نوعیت اور حیثیت کے متعلق قرار دیا کہ 1962 کے آئین کے نفاذ کے بعد اس آئینی پشت پناہی کا سایہ جو اس معاہدے کو حاصل تھا مکمل طور پر ہٹا دیا گیا اور وہ اب مزید دستیاب نہیں رہا۔ نہ ہی آئین خود اس معاہدے میں دی گئی ضمانتوں اور یقین دہانیوں کی کوئی آئینی حفاظت فراہم کرتا تھا۔ اگرچہ انضمامی معاہدہ 1962 کے آئین کی دفعہ 225 کی ذیلی دفعات (1) اور (7) کے تحت محض ایک " قانونی دستاویز" کی حیثیت سے باقی رہا لیکن اب یہ " آئینی دستاویز" نہیں رہا۔ اس لیے یہ محض ایک موجودہ قانون کی طرح تھا اور اس کی حیثیت آئین کے برابر

نہیں رہی۔ نتیجتاً متعلقہ قانون ساز ادارہ اس معاہدے کی دفعات کو بآسانی ختم یا نظرانداز کر کے قانون سازی کر سکتا تھا۔

(ب) آیا انضمامی معاہدہ یا الحاق کا معاہدہ غیر ملکی طاقتوں کے درمیان معاہدے (Treaty) کی طرح تھا اور اس لیے مقامی عدالتوں کے دائرہ اختیار سے باہر تھا؟ اس پر فیصلہ کیا گیا کہ پاکستانی عدالتیں آئین اور ملک میں نافذ قوانین کی پابند ہیں۔ اگرچہ یہ معاہدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کی دفعہ 6 کے تحت بنایا گیا تھا اور اس کی قانونی حیثیت چیلنج نہیں کی جا سکتی مگر اس میں یہ پابندی صرف اس کی درستگی کو چیلنج کرنے پر تھی۔ اس کے برخلاف اگر معاہدے کی شقوں پر عملدرآمد کے لیے کسی تنازعے کی نوبت آئے تو عدالت اس پر فیصلہ کرنے کی مجاز تھی۔ چنانچہ ہائی کورٹ کا دائرہ اختیار محدود نہیں تھا۔

(ج) Acceeding States Property Order 1961 کا 1954 کے انضمامی معاہدے پر اثر کیا تھا؟ اس بارے میں عدالت نے قرار دیا: دفعہ 3 نے محض ایک خصوصی فورم فراہم کیا تا کہ جانشینی کے تنازعے کا فیصلہ کیا جا سکے

2۔ اس آرڈر کی دفعات انضمامی معاہدے سے متصادم نہیں۔

3۔ آرڈر کی دفعہ 7 ہائی کورٹ کو اس حکم کی قانونی حیثیت جانچنے سے نہیں روکتی بشرطیکہ وہ حکم آرڈر کی روح اور دائرہ کار سے تجاوز کر کے جاری کیا گیا ہو۔

said:ChatGPT۔4

(iv) تاہم یہ آرڈر اُن مروجہ (اصل) قوانین کو منسوخ نہیں کرتا جو فریقین کے مابین پیدا ہونے والے اس نوع کے تنازعات پر لاگو ہو سکتے ہیں۔ چونکہ یہ تنازعات دیوانی نوعیت کے ہیں اور فریقین کے اہم حقوق سے متعلق ہیں، لہٰذا وفاقی حکومت جب ان تنازعات کا فیصلہ کرے تو اُسے ایک نیم عدالتی ٹریبونل (quasi-judicialTribunal) یا واحد ثالث (Sole arbitrator) کی حیثیت سے عدالتی طریقے سے عمل کرنا ہوگا۔

(د)) امیرِ بہاولپور (آرڈر 1969، جو صدر کے آرڈر نمبر 12 آف 1961 کی دفعہ 3 کے تحت

مرکزی حکومت نے جاری کیا، نا قابلِ قبول ہے کیونکہ:

(i) یہ آرڈر ایک انکوائری کمیشن کی رپورٹ پر مبنی ہے جو مغربی پاکستان بورڈ آف ریونیو کے دو ارکان پر مشتمل تھا حالانکہ صدر کے آرڈر نمبر 12 آف 1961 کی دفعہ 3 کے تحت مرکزی حکومت کو براہ راست اس تنازعے کا فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ اس آرڈر میں مرکزی حکومت کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنا اختیار کسی اور کو تفویض کرے یا کسی کمیشن یا انکوائری آفیسر کو اس تنازعے کی تحقیقات کے لیے مقرر کرے۔ جو طریقہ کار اپنایا گیا، وہ اصول Delegatus non protest) delegare) یعنی تفویض شدہ اختیار کو دوبارہ تفویض نہیں کیا جا سکتا کے خلاف ہے اور ساتھ ہی دیوانی طریقہ کار کے ضابطے (CPC) کے آرڈر XXVI کی دفعات اور دفعہ 73 کے بھی منافی ہے جو کمیشنوں کے اجرا سے متعلق ہیں۔ لہٰذا مرکزی حکومت صدر کے آرڈر نمبر 12 آف 1961 کی دفعہ 3 کے تحت اپنی آئینی ذمہ داری کمیشن کے سپرد نہیں کر سکتی تھی۔

(ii) حکومت کا جاری کردہ حکم ایک "بولتا ہوا فیصلہ" (Speaking Order) نہیں ہے۔ جائیداد کی تقسیم، جو اپیل کنندہ (عالیجاہ نواب محمد عباس خان عباسی) اور مدعا علیہان نمبر 2 تا 23 کے درمیان کی گئی، بلا کسی واضح اصول یا بنیاد کے کی گئی۔ پہلے شیڈول میں شامل جائیدادیں وہ تھیں جو اپیل کنندہ کو بطور امیر حاصل تھیں اور جب تک وہ امیر رہے وہ ان کی ملکیت تھیں۔ بقیہ متنازع جائیدادیں دوسری شیڈول میں تفصیل کے ساتھ بیان کردہ طور پر فریقین میں علیحدہ علیحدہ تقسیم کی گئیں۔ ہر فریق کو ان کے حصہ کے مطابق اسٹیٹ ڈیوٹی کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ لیکن پہلے اور دوسرے شیڈول میں شامل جائیدادوں کی تفریق کی کوئی بنیاد نہیں بیان کی گئی۔

(iii) دوسری شیڈول میں جائیدادوں کی تقسیم نہ تو کسی رائج الوقت رسم و رواج (Customary Law) پر مبنی ہے اور نہ ہی شریعت کے اصولوں کے مطابق۔ چونکہ ان جائیدادوں کی مالیت کا تعین نہیں کیا گیا، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جائیداد کی تقسیم تمام ورثاء کے شرعی حصوں کے مطابق کی گئی ہے۔

(iv) اپیل کنندہ کا یہ مؤقف کہ وہ واحد وارث ہے اور تمام متنازع جائیداد "اماراتی جائیداد"

(Ameerate Property) ہے جو حکمران کی گدی سے منسلک ہے اور اسی لیے مکمل طور پر اس پر منتقل ہو جاتی ہے، کو بغیر سماعت کے غیر قانونی طور پر مسترد کر دیا گیا۔ یہ مؤقف حکومت نے اپنے خط مؤرخہ 10 جولائی 1967 کے ذریعے ابتداء ہی میں رد کر دیا، اور اپیل کنندہ کو معقول اور مناسب موقع سماعت فراہم نہیں کیا گیا۔

(v) مرکزی حکومت نے اپیل کنندہ کو متنازع حکم کے خلاف صفائی پیش کرنے کا کوئی معقول موقع فراہم نہیں کیا۔ کمیشن کی رپورٹ کو منظور کرنے سے پہلے نہ تو اپیل کنندہ کو سنا گیا اور نہ ہی اسے رپورٹ کی موجودگی یا اس کے مندرجات سے کوئی اطلاع دی گئی۔

(ہ) مرکزی دلیل کہ انضمامی معاہدے کی دفعہ V کے مطابق جانشینی ریاست بہاولپور کے قانون و رواج کے مطابق ہونی تھی (یعنی پہلوٹ کا اصول) اس پر عدالت نے قرار دیا کہ حکومت نے صرف یہ ضمانت دی تھی کہ جانشینی عام قانون کے مطابق ہوگی، اس کی دائمی حیثیت یا عدم تغیر کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔

(و) وراثتی محصول اور زمین اصلاحات پر قرار دیا کہ انضمامی معاہدہ نجی جائیداد کے استعمال اور ملکیت کی ضمانت دیتا تھا لیکن اسے عام قوانین سے مستثنیٰ نہیں کرتا تھا۔ یہ جائیدادیں بھی ملکی قوانین کے تابع تھیں۔ وراثتی محصول کی ادائیگی سے متعلق معاملہ ابھی Estate Duty Act1950 کے تحت متعلقہ حکام کے سامنے زیر التواء تھا۔ چنانچہ عدالت نے اس ضمن میں مزید رائے دینے سے گریز کیا۔

15۔ مرحوم امیر بہاولپور کے قانونی وارثین نے ہائی کورٹ کے فیصلے کی دونوں اپیلوں میں حمایت کی۔ سپریم کورٹ نے فریقین کے معزز وکلا کے دلائل سننے کے بعد 7 اپریل 1982 کو دونوں اپیلیں خارج کرتے ہوئے فیصلہ دیا] حکومت پاکستان بنام بریگیڈیئر حضور والا نواب محمد عباس خان عباسی ودیگر (PLD 1982 SC 367) میں درج ذیل نکات بیان کیے:

1 پہلا نکتہ:

ڈپٹی اٹارنی جنرل نے دلیل دی کہ الحاقی معاہدہ (Instrument of Accession) حکومت پاکستان اور امیر کے درمیان ہوا تھا جو کہ ریاستی عمل State Act تھا اور اس کی کسی شرط پر ملک کی کسی عدالت میں عملدرآمد کا مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ عدالت نے یہ دلیل قبول نہیں کی اور

State Act کی تعریف کے لیے سپرنٹنڈنٹ لینڈ کسٹمز تورخم بمقابلہ زیور خان(PLD 1969 SC(485)اور صدر ذوالفقار علی بھٹو کے ریفرنس PLD 1973 SC 563 میں بیان کردہ اصول کو اپنایا۔

عدالت نے کہا کہ State of Act کا وسیع مفہوم یہ ہے کہ": وہ افعال جو حکومت اپنی غیر ملکی معاملات کی صوابدیدی طاقت کے تحت انجام دیتی ہے، جیسے جنگ یا امن کا اعلان، ریاست کا الحاق یا علیحدگی، کسی نئی حکومت یا ریاست کو تسلیم کرنا وغیرہ اور ایسے معاملات مقامی عدالتوں میں قابل سماعت نہیں ہوتے۔ عدالت نے نتیجہ اخذ کیا کہ حکومت، رعایا کے خلاف State of Act کی دلیل پیش نہیں کرسکتی اور عدالتیں انضمامی معاہدے کے اثرات کا جائزہ لینے سے روکی نہیں جاسکتیں۔

نواب محمد عباس خان عباسی کے اس مؤقف پر کہ پہلوٹ (Primogeniture) کے اصول اور انضمامی معاہدے کی دفعہ V کے تحت وہ مرحوم امیر کی ساری نجی جائیداد کے واحد وارث ہیں، عدالت نے کہا:

+ دفعہ V میں نجی جائیداد کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

+Personal rights میں ملکیتی حقوق شامل نہیں تھے۔

+ معاہدے میں صرف دو اقسام کی جائیداد کا ذکر تھا: ریاستی جائیداد اور نجی جائیداد، کوئی تیسری قسم نہیں تھی س لیے جو کچھ ریاستی جائیداد نہ تھا، وہ نجی جائیداد تھی۔

ریاستی جائیداد کو 1955 کے ویسٹ پاکستان ایکٹ کی دفعہ 9 کے تحت حکومت نے سنبھال لیا اور تنازعہ صرف نجی جائیداد کے جانشینی کا تھا۔ لہٰذا دفعہ V کی ضمانت صرف Personal Rights تک محدود تھی جو نجی جائیداد کو محیط نہیں کرتی تھی۔ یہ تنازعہ صدر پاکستان یا مرکزی حکومت صدر کے آرڈر نمبر 12 آف 1961 کی دفعہ 3 کے تحت حل کرسکتی تھی۔ عدالت نے واضح کیا کہ صدر کا یہ آرڈر انضمامی معاہدے سے متصادم نہیں بلکہ اس کا تکملہ (Complementary) تھا۔

2 دوسرا نکتہ:

ہائی کورٹ نے قرار دیا تھا کہ مرکزی حکومت کی جانب سے کی گئی جائیداد کی تقسیم بغیر کسی اصول اور وضاحت کے کی گئی۔ سپریم کورٹ نے بعض دستاویزات کا جائزہ لینے کے بعد کہا:

+ انکوائری کمیشن کی رپورٹ کے مطابق) جس کی نقل ہائی کورٹ کے سامنے نہ تھی(، پہلی فہرست (Schedule I)) کی جائیداد امیر کی حیثیت سے نئے امیر کے لیے مخصوص کی گئی تھی اور اس شرط پر کہ وہ بغیر مرکزی حکومت کی اجازت کے فروخت نہیں کرسکتا۔

+ باقی جائیداد مسلم قانون اور انصاف کے اصولوں کے مطابق تمام وارثوں میں تقسیم کی گئی۔

عدالت نے مزید کہا کہ:

"تمام وارثین کو کمیشن کے سامنے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ کمیشن نے مرحوم امیر کی جائیدادوں کی نشاندہی اور ان کی قیمت لگوانے کی کوشش کی اور حتی الامکان منصفانہ تقسیم کی۔"

نواب کی دلیل کہ انضمامی معاہدے کے تحت وہ پورے ترکے کے اکیلے وارث ہیں، غلط ثابت ہوئی۔

عدالت نے قرار دیا کہ جائیداد کی تقسیم مسلم پرسنل لاء() شریعت) کے مطابق ہونی تھی۔

3 تیسرا نکتہ:

Schedule I میں جو جائیداد نئے امیر کو خصوصی طور پر دی گئی تھی، اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ وہ بطور امیر اپنا مرتبہ برقرار رکھ سکے۔ عدالت نے کہا:

1954 کے انضمامی معاہدے میں صرف دو قسم کی جائیداد کا تصور تھا: ریاستی جائیداد اور نجی جائیداد۔ کوئی تیسری قسم " گدی سے منسلک جائیداد " نہیں تھی۔

نواب کے وکیل جناب اے کے بروہی نے دلیل دی کہ امیر بہاولپور کو "Corporation "Sole سمجھا جائے، عدالت نے کہا:

"یہ دلیل درست نہیں۔ ہمیں کوئی ایسا قانون نہ دکھایا گیا جو امیر بہاولپور کو Corporation Sole بناتا ہو۔ نہ ہی انضمامی معاہدے میں ایسی شق ہے۔ چنانچہ ریاستی جائیداد حکومت نے قبضے میں لے لی اور باقی نجی جائیداد تمام وارثوں میں مسلم قانون کے مطابق تقسیم ہونی تھی۔"

عدالت نے مزید کہا کہ صدر کے آرڈر نمبر 15 آف 1972 کے تحت 20 دسمبر 1971 سے تمام

Privy Purse اور امتیازی مراعات ختم ہو چکی تھیں۔لیکن چونکہ یہ آرڈر 1969 کے حکم کے بعد آیا تھا، اس لیے اس مقدمے پر اس کا اثر نہیں تھا۔

4 ۔ چوتھا اور آخری نکتہ :

عدالت نے نتیجہ اخذ کیا کہ :

+ کوئی جائیداد نئے امیر کے لیے بطور خاص محفوظ نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

+ جتنی جائیداد نجی قرار دی گئی تھیں، وہ تمام وارثوں میں مسلم پرسنل لاء (شریعت) کے مطابق تقسیم ہونی تھی۔

عدالت نے البتہ یہ بھی کہا کہ دوسری فہرست Schedule) (II میں جائیداد کی تقسیم مکمل شریعت کے مطابق نہیں بلکہ صرف "سبسٹینشلی" (کلی طور پر) اس کے مطابق ہوئی۔لہٰذا ہائی کورٹ کی تنقید درست تھی کہ تقسیم واضح اصولوں پر مبنی نہیں تھی۔اسی لیے ہائی کورٹ کا حکم کہ معاملہ دوبارہ مرکزی حکومت کو بھیجا جائے، برقرار رکھا گیا۔تاہم ہائی کورٹ کی یہ رائے کہ مرکزی حکومت کو انکوائری کمیشن مقرر کرنے کا اختیار نہیں تھا، درست نہیں تھی۔اس وضاحت کے ساتھ دونوں اپیلیں خارج کر دی گئیں۔

16۔نواب محمد عباس خان عباسی کی جانب سے دائر کی گئی سول ریویو پٹیشن نمبر 23 آف 1982 کو اس عدالت نے 27 نومبر 1983 کو خارج کر دیا۔(بریگیڈیئر حضور والا نواب محمد عباس خان عباسی، امیر بہاولپور بنام حکومت پاکستان و دیگر (PLD 1984 SC 67)

17۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عدالت کے مذکورہ فیصلے کے بعد مرکزی حکومت کی جانب سے مرحوم امیر کی جائیداد کو ان کے قانونی وارثوں میں تقسیم کرنے کے لیے دو کمیشن مقرر کیے گئے لیکن دوسری مرتبہ اس عدالت میں مقدمے کے مرحلے تک، ستمبر 2001 تک، سوائے ایک عبوری پیکیج کے (جو دوسرے کمیشن نے 1993 میں جاری کیا)، مرحوم امیر کی جائیداد کی وارثوں میں تقسیم کا تنازعہ اس عدالت کے فیصلے کے مطابق حل نہ ہو سکا۔یہ بات عدالت عظمٰی نے دوسری مرتبہ مقدمے کی سماعت کے دوران اپنے فیصلے مورخہ 12 نومبر 2001 (پیرا نمبر (3 میں بھی نوٹ کی): پرنس اے ایم

عباسی ودیگر بنام وفاقی حکومت بذریعہ سیکریٹری ودیگر 24 فریقین(PLD 2002 SC 170)

18۔ مذکورہ عبوری پیکیج کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ ہائی کورٹ نے اس پیکیج کو برقرار رکھا اور رٹ پٹیشن خارج کر دی، جس کے نتیجے میں سول اپیل نمبر 1915 آف 1998 دائر کی گئی اور اس اپیل پر عدالت عظمیٰ نے 12 نومبر 2001 کو مذکورہ بالا فیصلہ جاری کیا۔ [PLD] پی ایل ڈی 2002 ایس سی (170) اوپر مذکور)

19۔ اس عدالت نے اس مقدمے کی مکمل تاریخ اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد 12 نومبر 2001 کے فیصلے میں (PLD2002 SC 170) قرار دیا کہ انکوائری کمیشن کی جانب سے جاری کیا گیا عبوری پیکیج انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتا اور نہ ہی اس عدالت کی ان ہدایات کے مطابق تھا جو اس معاملے پر مختلف فیصلوں میں دی گئی تھیں، بالخصوص دو اہم مقدمات میں:
حکومت پاکستان بنام نواب محمد عباس خان عباسی(PLD 1982 SC 367) اور بریگیڈیئر عالی جناب نواب محمد عباس خان عباسی بنام حکومت پاکستان(PLD 1984 SC 67)
عدالت نے مندرجہ ذیل نتیجہ اخذ کیا:
(16) ان فیصلوں اور ریکارڈ کا جائزہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس تنازعے کو دوبارہ طے کیا جائے تاکہ اس کا حل ان ہدایات کی روشنی میں ہو جو حکومت پاکستان والا مقدمہ PLD 1982 SC) (367 اور بعدازاں ریویو پٹیشن میں بریگیڈیئر نواب محمد عباس خان عباسی والا مقدمہ میں دی گئی تھیں۔
(17) ہم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ وفاقی حکومت کی جانب سے اس عدالت کے ایک ریٹائرڈ جج کی سربراہی میں کمیٹی مقرر کی جائے تاکہ اس تنازعے سے پیدا ہونے والے تمام سوالات کا فیصلہ کیا جا سکے اور تمام وارثین/دعویٰ داران کے حقوق کا تعین ہو سکے۔ پچھلی کمیٹیوں (برلاس کمیٹی اور ہمایوں فیض رسول کمیٹی) نے تیس سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود محض عبوری پیکیج دیا اور تنازعے کے قانونی نکات کو مکمل طور پر حل نہ کیا۔ اس لیے عدالت نے قرار دیا کہ انصاف، برابری اور منصفانہ فیصلے کے مفاد میں نئی کمیٹی کی سربراہی سپریم کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج کو سونپی جائے تاکہ تنازعہ ہمیشہ

کے لیے ختم کیا جاسکے۔

نتیجہ (18:) ہم نے اس عدالت کے دستیاب ریٹائرڈ ججوں میں سے کسی جج کا نام منتخب کرنے پر غور کیا۔ غور وخوض کے بعد جسٹس (ر) عبدالشکور الاسلام کو اس کمیٹی کی سربراہی کے لیے نامزد کرنے پر اتفاق کیا گیا تاکہ وہ مرحوم امیر بہاولپور کی جائیداد، وارثین کے حصص اور تقسیم کا طریقہ کار دونوں فیصلوں کی روشنی میں طے کریں اور وفاقی حکومت کو اپنی سفارشات پیش کریں۔

(19) معزز جج کی محنتانہ رقم پانچ لاکھ روپے مقرر کی گئی جو لاہور سے بہاولپور آمدورفت اور کسی بھی تعداد میں دوروں کا ٹی اے/ڈی اے شامل کرے گی۔ اگر فریقین خود اس خرچ کا انتظام نہ کریں تو یہ رقم متنازعہ جائیداد سے وصول کی جائے گی۔ معزز جج سے درخواست ہے کہ وہ تین ماہ میں سفارشات مکمل کریں۔ وفاقی حکومت اس کمیٹی کی تشکیل کی کارروائی ساٹھ دن کے اندر مکمل کر کے مطلع کرے گی۔

(20) سول اپیل نمبر 1915 آف 1998 منظور کی گئی، ہائی کورٹ کا 3 جولائی 1997 کا فیصلہ کالعدم قرار دیا گیا اور تنازعے کو مذکورہ بالا ہدایات کی روشنی میں نمٹا دیا گیا۔

(21) مقدمے کے حالات کے پیش نظر عدالت نے قرار دیا کہ فریقین اپنی اپنی لاگت خود برداشت کریں گے۔

20۔ مذکورہ فیصلے کی تعمیل میں وفاقی حکومت نے 7 مارچ 2002 کو جسٹس (ر) عبدالشکور الاسلام کی سربراہی میں کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی نے 25 مارچ 2002 کو مختلف اخبارات میں نوٹس شائع کیے اور متعدد افراد، دعوی داران اور مرحوم امیر کے قانونی وارثوں کو سنا۔ کمیٹی نے 5 جون 2002 کو اپنی رپورٹ پیش کی جس میں درج ذیل سفارشات اور نتائج شامل تھے:

(32) 1۔ مرحوم امیر کی وہ جائیدادیں جو سپریم کورٹ کے فیصلوں میں موضوع بحث بنی تھیں، وہ ابونصر کی رپورٹ اور 1969 کے ڈسٹری بیوشن آرڈر کی پہلی اور دوسری فہرست میں شامل ہیں۔

2۔ وارثوں کے حصے: 3 بیویاں = 1/8 حصہ، باقی 7/8 حصہ 10 بیٹوں اور 10 بیٹیوں میں 2:1 کے تناسب سے تقسیم ہوگا۔

3۔ تقسیم کا طریقہ ان دونوں فیصلوں کی روشنی میں تجویز کیا گیا۔

4۔ناجائز قابضین یا تیسرے فریق کو جائیداد کے حوالے کی گئی ہو تو قانون کے عام اصول لاگو ہوں گے۔
5۔بعض وارثین کو زرعی زمین کے فائدے ملے، بعض کو نہیں۔ مقامی ریونیو حکام تحقیقات کریں اور جن کا نقصان ہوا، اس کی تلافی کریں۔

.33 سفارشات 36 سال گزر چکے ہیں۔ بہت سے وارث اور ان کے وارث بھی وفات پا چکے ہیں۔ کیونکہ شریعت کے اصول کے مطابق تقسیم ہونی ہے، اس لیے یہ نہ صرف سرکاری بلکہ اسلامی ذمہ داری ہے کہ معاملہ جلد نمٹا دیا جائے۔ لہٰذا سفارش کی گئی کہ مرحلہ وار کارروائی کی جائے۔:

(34) وارثوں کے حصے متنازع نہیں: 3 بیویاں=1/8 حصہ اور باقی 7/8 حصہ بیٹوں اور بیٹیوں میں 2:1 کے تناسب سے تقسیم ہو۔

21۔ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسٹس (ر) عبدالقادر چوہدری کی سربراہی میں ایک اور کمیٹی تشکیل دی گئی، تا کہ 5 جون 2002 کی سفارشات پر عمل درآمد ہو سکے۔ جب یہ کمیٹی عمل درآمد کی کارروائی کر رہی تھی تو درخواست گزاروں نے لاہور ہائی کورٹ بہاولپور بینچ میں رٹ پٹیشن دائر کیں، جو 8 مارچ 2004 کو خارج کر دی گئیں۔

22۔مذکورہ بالا حقائق اور بالخصوص 1982 میں عدالت عظمیٰ کے فیصلے میں طے شدہ نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان درخواستوں میں کوئی میرٹ نہیں ملا تاہم، کیونکہ لاہور ہائی کورٹ بہاولپور بینچ نے درخواستیں ابتدائی مرحلے پر ہی خارج کیں اور یہ آبزرویشن بھی دی کہ یہ فیصلہ درخواست گزاروں کو کوئی اور قانونی چارہ جوئی اختیار کرنے سے نہیں روکتا، اس لیے مناسب ہوگا کہ ان درخواستوں کو محض خارج کیا جائے تا کہ اگر درخواست گزاروں کو ان آبزرویشنز کی روشنی میں کوئی ریلیف ملے تو وہ برقرار رہے اور ہم اس سے محروم نہ کریں۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر یہ درخواستیں بلا میرٹ قرار دے کر خارج کی جاتی ہیں۔

اجازت نامنظور۔اسلام آباد 1 جون 2006 (رپورٹنگ کے لیے منظور شدہ)

صادق اعظم

امیر صادق محمد خان پنجم عباسی

(1907 سے موجودہ امیر)

بریگیڈئیر سید نذیر علی کی انگریزی تصنیف صادق نامہ مطبوعہ 1959 کا ایک باب

موجودہ امیر، جنرل الحاج امیر صادق محمد خان پنجم عباسی، ,.G.C.S.I ,.LL.DK.C.V.O.,K.C.S.I.,G.C.I.E، ریاست بہاولپور کے امیر اپنے والد مرحوم امیر کی 1907 میں عدن میں اچانک وفات کے بعد جانشین ہوئے۔ اُس وقت آپ محض تین برس کے بچے تھے۔ اسی کم عمری میں آپ کو خانہ کعبہ لے جایا گیا اور حج کے تمام مناسک ادا کروائے گئے۔

سات برس کی عمر میں امیر نے اپنی فوج کی قیادت کرتے ہوئے دہلی دربار میں مارچ پاسٹ کیا۔ اُن کی شاندار سپاہیانہ کارکردگی پر دربار میں سب سے زیادہ داد و تحسین ملی۔ 1913 میں انہیں انگلستان بھیجا گیا۔ وہاں جنوبی انگلینڈ کے ایک گاؤں پورلاک میں ان کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ سمندر اور خشکی کے سفر کے تجربے نے کمسنی میں ان کی تخیلاتی اور علمی صلاحیتوں کو بہت ترقی دی۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران انگلستان میں قیام نے انہیں فوجی اور فنی اُمور سے دلچسپی کی طرف مائل کیا۔ کوئٹہ میں سنٹرل انڈیا ہارس میں کیڈٹ شپ نے ان کے عسکری کیریئر کو مزید نکھارا۔ آپ اعلیٰ درجے کے نشانہ باز اور عمدہ گھڑسوار بنے۔

1922 میں نوجوان اور وجیہہ امیر کو پرنس آف ویلز کے دورہ ہند کے موقع پر ADC مقرر کیا گیا۔ 1924 میں لارڈ ریڈنگ، وائسرائے ہند بہاولپور تشریف لائے اور ان کی باقاعدہ تخت نشینی کی تقریب میں شریک ہوئے۔ 1931 میں جب انہوں نے قاہرہ سے کراچی بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہو کر روضہ رسولؐ پر حاضری دی تو یہ ان کا پہلا فضائی سفر تھا جو اس زمانے میں نہایت دشوار گزار تھا کیونکہ جدید ہوابازی کی سہولیات موجود نہ تھیں۔ 1935 میں امیر صاحب نے چار سو افراد کے ساتھ حج کا سفر کیا جس کا تمام خرچ انہوں نے خود برداشت کیا۔ خانہ کعبہ کی

"غسل" کی سعادت انہیں شاہ عبدالعزیز ابن سعود اور افغانستان کے سابق بادشاہ امان اللہ خان کے ہمراہ نصیب ہوئی۔ 1935 کے کوئٹہ زلزلہ میں ان کی خدمات پر لارڈ ولنگڈن شملہ سے صادق گڑھ محل بہاولپور تشریف لائے اور حکومت برطانیہ کی طرف سے شکریہ ادا کیا۔ 1937 میں پورے ہندوستان کے چھ سو حکمرانوں میں سے صرف چھ کو انگلینڈ میں جارج ششم کی تاجپوشی میں مدعو کیا گیا، جن میں امیر صادق محمد خان بھی شامل تھے۔ بطور اصول، حضور والا دیگر ریاستوں کے معاملات میں مداخلت سے اجتناب فرماتے تھے مگر اپنی ریاست کی تمام حالات سے مکمل باخبر رہتے۔ ہندو رعایا کی ایک تحریک کی حقیقت جاننے کے لیے ایک سر درات انہوں نے عام اونٹ بان کے بھیس میں خود جا کر معلومات اکٹھی کیں۔ اس موقع پر امیر کی یہ براہ راست مداخلت بڑی سودمند ثابت ہوئی۔

وہ برصغیر میں متوقع سیاسی تبدیلیوں سے پوری طرح آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ ریاست اور دیگر علاقوں میں حالات کس رخ پر جا رہے ہیں۔ ریاست میں نمائندہ حکومت کی اصلاحات اگرچہ تیزی سے نافذ کی گئیں لیکن بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ امیر نے اعلیٰ قیادت کے مشورے پر ہر ممکن تعاون کیا۔ اس ضمن میں خواجہ ناظم الدین، سردار عبد الرب نشتر اور خان عبدالقیوم خان بہاولپور آئے اور مطمئن ہو کر لوٹے۔ ریاستی حکومت جو تین سو برس سے اپنے طریق پر چل رہی تھی، ان اصلاحات کو ہضم کرنا آسان نہ تھا، لیکن امیر کی سیاسی بصیرت اور دانش نے اس ہنگامے کو بخوبی سنبھالا۔ پاکستان کے حکمرانوں اور عوام سے امیر کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ ریاست کے اکثر افسر پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ ریاست کی آمدنی کا بڑا حصہ جنگ عظیم اوّل و دوئم میں صرف ہوا۔ 1924 میں امیر نے ذاتی بجٹ سے دس ہزار سے زائد سپاہیوں کی تربیت و مسلح افواج تیار کیں جو مسلمان، سکھ، ہندو سبھی پر مشتمل تھیں اور ہمیشہ امیر کے وفادار رہے۔ اگر امیر نے عسکری خدمات اور سپاہ میں شرف و شجاعت کی روایات کو زندہ رکھنے کی لگن نہ رکھی ہوتی تو بہاولپور اسٹیٹ فورسز کی فتوحات ممکن نہ تھیں۔ دوران جنگ شمالی افریقہ اور اٹلی میں امیر بنفس نفیس سپاہ کے ساتھ محاذ پر موجود رہے۔ بغداد سے دمشق، لبنان، قاہرہ، اور ترکی۔ شام کی سرحد سے ہوتے ہوئے واپس بغداد تک ان کا سفر نہایت پر خطر تھا۔

1907 سے 1957 تک یادگار واقعات اور کارنامے:

1. نہری نظام کی ترقی
2. دونوں عالمی جنگیں
3. سیاسی تبدیلیاں
4. اسلامی روایات کا تحفظ
5. تعلیم، زراعت اور فوج میں ترقی
6. سیلاب زدگان کی بحالی

ان کی تعلیمی پالیسی کی بدولت کئی نوجوان انگلینڈ جا کر فنی تعلیم حاصل کر کے ریگستان کو زرخیز زمین میں بدلنے میں کامیاب ہوئے۔ 1924 تک بہاولپور میں صرف ایک کالج اور ایک ہائی اسکول تھا۔ آج بغداد الجدید تعلیم کا مرکز ہے۔ پاکستان میں شاید واحد ادارہ صادق پبلک اسکول ہے جو مشرق و مغرب کے امتزاج کی بنیاد پر چل رہا ہے۔

بہاولپور کے دربار اور عدالت:

ہر سال عیدالفطر، عیدالاضحیٰ اور سالگرہ پر تین دربار ہوتے جن میں ہزاروں لوگ نظرانہ پیش کرتے۔ سب سے پہلی رسم قرآن پاک پیش کرنے کی ہوتی۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری درباری قصائد پڑھا کرتے۔

دربار کی خصوصیات:

1. جلوس
2. فوجی پریڈ
3. قیدیوں کی رہائی
4. غربا کی ضیافت
5. عام تعطیل

6. چراغاں
7. شاہی دعوت

امیر کی وفاداری کا یہ عالم تھا کہ رعایا اور درباری بھی انہی کی طرح مخلص رہے۔ ریاست کے انضمام کے بعد بھی انہیں عوام اور حکومت پاکستان کی طرف سے عزت وتکریم حاصل رہی۔

بہاولپور کابینہ:

چیف منسٹرز:

- ملک سرخدا بخش ٹوانہ
- نواب طالب مہدی خان
- نواب مولا بخش
- سرسکندر حیات خان
- نبی بخش محمد حسین
- سر رچرڈ کرافٹن
- نواب مشتاق احمد گرمانی
- کرنل سر جان ڈرنگ
- کرنل بیکن (عارضی)
- مخدومزادہ سید حسن محمود
- اے آر خان) چیف ایڈوائزر(

ریونیو منسٹرز:

- مرزا سلطان احمد
- نواب طالب مہدی خان
- ملک سر خدا بخش

- نواب محمد دین
- کرنل اوبرائن
- سر جیمز فٹز پیٹرک
- مسٹر بارن، ٹاؤنسنڈ، فریڈرک اینڈرسن
- عبدالقیوم، بنیاد حسین، مون

منسٹرز:

- مولوی غلام حسین
- کرنل ایم ایچ قریشی
- میجر شمس الدین
- میہتا ادھوداس
- دیوان سکھانند
- سردار محمد امیر خان
- جنرل صاحبزادہ محمد دلاور خان عباسی
- شیخ محمد عبدالغنی
- کرنل سید سعید احمد ہاشمی
- دیوان فتح چند
- میجر شیخ حفیظ اللہ
- سید غلام مرتضیٰ شاہ
- مولوی کرامت اللہ
- میاں فتح محمد لالیکا
- راؤ حفیظ الرحمٰن

- سید احمد نواز شاہ گردیزی

چیف جج:

- سید میر سراج الدین
- میہتا ادھوداس
- منشی محمد اکبر
- مولوی فضل حسین
- سر عبدالقادر
- کے بی دین محمد
- کے بی شیخ عبدالعزیز
- کے بی شیخ فیض محمد

جنرل افسران:

- میجر جنرل محمد افضل خان
- جنرل صاحبزادہ دلاور خان عباسی
- جنرل جے ایچ مارڈن
- میجر جنرل ایچ ایل سی رابرٹسن
- میجر جنرل ایس گریوز

مجلس کے اسپیکر:

- سید عنایت حسین شاہ
- شیخ عبدالحق

نیا نظام

بریگیڈیئر سید نذیر علی کی انگریزی تصنیف صادق نامہ مطبوعہ 1959 کا ایک باب

"میرے بعد طوفان"—لوئس چہاردہم، بادشاہ فرانس

تقسیم کے فوراً بعد سیاست ہر طرف طوفانی انداز میں پھیل گئی۔ برصغیر کو تقسیم کرنے کے لیے جو اقدامات اختیار کیے گئے وہ سبک رفتاری سے اور اچانک کیے گئے۔ جنگ کے دنوں میں ایک تیزی سے دولت مند ہونے والا طبقہ وجود میں آ چکا تھا۔ دفاتر کے بہت سے ملازمین جو حساب کتاب میں ماہر تھے اور کئی تجربہ کار اوورسیئر جو تعمیری کام میں ماہر تھے، نوکریاں چھوڑ کر کاروبار میں لگ گئے۔ ان دونوں طبقوں اور با اثر امیر لوگوں کے امتزاج نے پچھلے متوسط طبقے کو گمنامی میں دھکیل دیا۔ نئے آقا، جن میں سے کچھ پہلے نامعلوم تھے، اقتدار میں آ گئے اور سیاسی منظر پر چھا گئے۔ مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت خوش قسمتی سے بہت سے بے لوث رہنماؤں پر مشتمل تھی پھر بھی نو زائیدہ ریاست پاکستان کو نہ صرف ایک دلہن بننا تھا بلکہ پیدائش کے فوراً بعد ماں کا کردار بھی ادا کرنا پڑا۔ اس وقت کے حالات کے پیش نظر یہ پرورش کچھ بری نہ تھی۔ "مانچسٹر گارڈین" لندن 18 دسمبر 1957 کو پاکستان کی دسویں سالگرہ کے موقع پر لکھتا ہے:

..."پاکستان کے لیے محض زندہ رہ جانا ہی ایک کارنامہ ہے۔ کوئی ملک ایسی زبردست محرومیوں سے دوچار ہو کر قائم نہیں ہوا۔ اس کی سرحدوں کی کوئی جڑ تاریخ یا روایت میں نہ تھی۔ تقسیم کے طوفان پر قابو پانا پڑا، حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کرنا پڑا، قومیت کے جذبے کو پروان چڑھانا پڑا۔ اس کے بعد بھی کئی مسائل پیدا ہوئے۔ پچھلے دس برسوں میں پاکستان سیاسی بحرانوں سے گزرتا رہا ہے، اب بھی اس کی کیفیت غیر یقینی ہے، سچ یہ ہے کہ اس عرصے میں کوئی عام انتخابات نہ ہوئے لیکن انتظامی طور پر یہ ملک مستحکم رہا، اقتصادی طور پر غیر منقسم اور سیاسی طور پر آزاد رہا۔ پاکستانیوں کو اپنے نئے وطن پر بجا طور پر امید رکھنی چاہیے۔" شاہی ریاستوں کی اندرونی کہانی اور بھی الجھن

آمیز تھی۔ ہمسایہ علاقوں سے موازنہ کریں تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے لوگ اور حکومت نسبتاً کم ضرر رساں تھے۔اس کے باوجود بہاولپور ریاست میں پہلے سے موجود حکومت کی صورت حال بحال نہ ہو سکی اور کسی نہ کسی طرح کمتر ہونے کا احساس موجود رہا۔ سابق ریاست کے باشندے خود کو لاوارث اور افسردہ محسوس کرتے تھے۔مسٹر اسٹیفن کی یہ مشاہدات صورتحال کو بخوبی بیان کرتے ہیں:

..."اب بھی برطانوی شاہی خاندان اور سابق وائسرائے اور صوبائی گورنروں سے دوستیوں میں وفادار لیکن نئے پاکستان سے بھی مخلص — اگرچہ بعض اوقات بین الاقوامی اور ملکی معاملات میں الجھاؤ محسوس کرتا ہے اور انہی میں اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔حقیقت میں یہ ایک تاریخی طور پر منقسم شخصیت ہے... بادشاہوں اور برطانوی زمینداروں کو جس تبدیلی کے لیے صدیوں درکار تھیں، وہ اب دہائی میں سمٹ آئی ہے۔ بہاولپور کے حکمران اس تبدیلی کو وقار اور عقل مندی سے قبول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

اپنی دانش مندی سے، امیر کو اگر حالات کا بہت زیادہ دباؤ نہ ہاتا تو وہ تدریجی تبدیلی کو ترجیح دیتے لیکن موجودہ حالات میں ان کے پاس اپنے منتخب وزرا کے ساتھ چلنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ "پاکستان کے قیام کے دوران مسلمانوں کی بستیوں میں یہ تصور سیلاب کی طرح پھیل گیا۔تمام سیلابوں کی طرح اس ریلے میں بہت سا گند اور کچرا بھی اونچی جگہوں پر جمع ہو گیا۔" (کے۔ ایل۔ گابا)

اگرچہ ان میں ریاستی معاملات میں مہارت کم تھی، خوش قسمتی سے ریاست کے منتخب وزرا اور مجلس کے ارکان زیادہ تر وفادار لوگ تھے۔اکثریت سچائی سے حکمران سے محبت کرتی تھی لیکن نئے نظام کی چمک دمک بہت پرکشش تھی۔جلد ہی راستوں پر کئی پرچم لہرانے لگے۔ایک ہی میان میں کئی تلواریں، ایک ریاست اور بہت سے آقا، اور نصف درجن مصنوعی سیارے سورج کی جگہ چمکنے لگے۔ بہاولپور میں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ۔۔۔۔ کے تصور کی کثرت اور تعدد ازدواج کے نظریات یہاں عملی صورت میں موجود ہیں۔ سیاسی میدان میں درجنوں " کروم ویل" اپنے "مینَن کامف" پڑھا رہے تھے۔لوگ نظم وضبط کے عادی تھے لیکن اختلافِ رائے ہوتے ہی منتخب وزرا میں جھگڑا شروع ہوا۔ مرکزی حکومت کو مداخلت کرنی پڑی۔ وزارت برطرف کر دی گئی۔ حکمران کو دوبارہ مکمل

اختیارات سنبھالنے پڑے۔ اس میں امیر کی معاونت مشیر اعلیٰ جناب اے۔ آر۔ خان نے کی جو نہایت قابل سول سرونٹ تھے۔ بہاولپور اگر آزاد ریاست رہتا تو اسلامی جمہوریہ کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ مضبوط مرکزی حکومت میں چھوٹے صوبے، ضم شدہ ریاستیں، کشمیر اور یہاں تک کہ پختونستان بھی بہتر نتائج دیتے۔

''قومی رہنمائی کی عدم موجودگی میں ترقی خودکار طریقے سے نہیں ہوسکتی لیکن جب ہم کسی آئینی ڈھانچے کی تلاش کرتے ہیں تو ہمیں اس قوم یا نسل کی تاریخ، کردار اور تجربے کو سامنے رکھنا چاہیے۔ امریکہ کی صدارت اس کی بہترین مثال ہے، جو مقامی حالات سے ہم آہنگ ہو کر بنی لیکن ہندوستان (یا پاکستان) میں تاریخی، سماجی اور مذہبی وجوہ کی بنا پر صرف بادشاہت ہی آخری سہارا ہو سکتی ہے۔ (آغا خان)

ایک اکائی بننے پر ریاست مغربی پاکستان میں ضم ہوگئی۔ پہلے جو تعلقات عوام اور سرکاری اہلکاروں کے درمیان تھے، وہ ختم ہو گئے۔ مقامی تہوار اب جمعہ کی بجائے اتوار کو منائے جانے لگے۔ سی ایس پی افسران کی طرف سے عوام سے تعلق بھی برقرار نہ رہ سکا۔ بنوں کے کسی پٹواری کے لیے بہاولپور کے طریقوں میں خود کو ڈھالنا آسان نہ تھا۔

ایک لا-بابا ریاست پہلی جنگ عظیم کے بعد عراق ترکوں سے چھوٹ گیا۔ عرب اور برطانوی دونوں نے اس پر مکمل قبضہ نہ کیا۔ ایک عرب کشتی بان سے پوچھا گیا کہ وہ کن میں سے کس کو اپنا حکمران بنانا پسند کرے گا؟ اس نے آہ بھری اور کہا "لا-بابا"! اس مختصر جملے میں اس نے یتیم خاندان اور حکمران سے محروم ریاست کی کیفیت بیان کر دی۔ ریاست کے ایک اکائی میں ضم ہونے کے بعد بہاولپور والے خود کو لا-بابا ریاست کے شہری محسوس کرتے ہیں۔

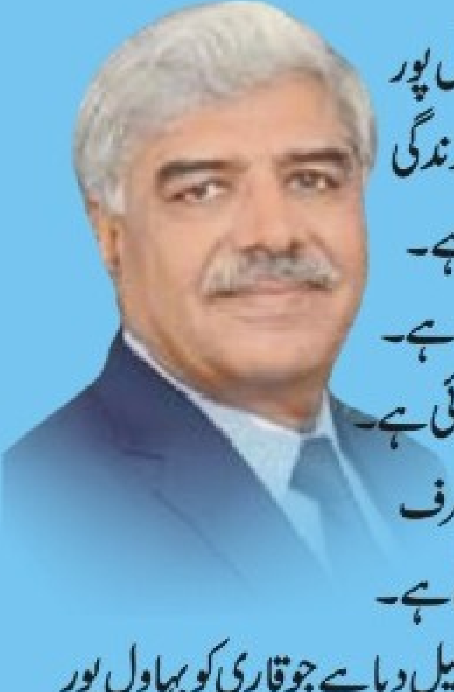
: مسٹر صالح محمد، صوبائی ڈپٹی وزیر نے کہا تھا": اکائی بنانا پیسے کے لحاظ سے مہنگا سودا ہے"!
مختلف صوبوں اور ریاستوں کو ایک اکائی میں ضم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وادی سندھ کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔قوم کی یکجہتی اصل چیز ہے۔"وہ اختلاف میں میل جول چاہتے ہیں، مخالفت میں نہیں۔ نہ کہ کچلے ہوئے انتشار میں، بلکہ دنیا کی طرح ہم آہنگ اتحاد میں؛ جب ہم رنگارنگی

میں ترتیب دیکھتے ہیں؛ اور پھر سب اپنی اپنی جگہ متفق ہوتے ہیں۔"

"برصغیر کی تاریخ کے مطالعے کے بعد مجھے کوئی تامل نہیں کہ مغل سلطنت کے ٹکڑے ہونے کی وجہ مرکزی نظام ہی تھا۔ مغل منظّم ترین قوت تھے۔ اگر وفاقی نظام اپنایا ہوتا تو وہ دکن، بنگال، راجپوتانہ اور افغان قومیت کو اپنے گرد جمع کر لیتے۔" (آغا خان)

یقیناً مضبوط مرکزی حکومت نے پاکستان میں پاک دولتِ مشترکہ کے تصور کو پروان چڑھایا۔ ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد ریاست میں کاروبار مفلوج ہو گیا۔ مسلمان کاشتکار ہندوؤں سے بیج کا اناج ادھار لیتے تھے۔ ابتدائی دو موسموں میں بیج نہ ملنے کی وجہ سے کسانوں کو شدید مشکلات ہوئیں۔ وہ ادھار اناج کی قیمت اشیاء میں مہنگی ادا کرتے تھے، اس طرح وہ غلامی میں جکڑے رہتے۔ اس سے ہندو بہت خوش ہوتے تھے لیکن جب کاشتکاروں کو خود انتظام کرنا پڑا تو انہوں نے اپنے لیے اناج جمع کرنا سیکھ لیا اور خوشحال ہونے لگے۔

مسٹر کے۔ ایم۔ پنی کر اپنی کتاب "ان ٹو چائنا" میں لکھتے ہیں کہ بہاولپور میں ایک رات میں پانچ سو ہندو قتل کر دیے گئے۔ یہ معلومات درست نہیں۔ فسادات کے دوران بہاولپور ریاست پورے برصغیر میں سب سے پرامن رہی۔ مسلم حکمران اور مسلمان رعایا نے مذہبی فرائض کو کبھی نظرانداز نہ کیا۔ موجودہ امیر ہمیشہ غیر مسلم رعایا کے ساتھ فیاضی سے پیش آئے۔ انہوں نے اقلیتوں کے حقوق کی بہترین حفاظت کی۔ غیر مسلموں کی اکثریت کے چلے جانے کے بعد دو باتیں نمایاں ہوئیں۔ سب سے اہم یہ کہ اس علاقے کے لوگ زیادہ تعداد میں اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے لگے۔ تعلیم یافتہ افراد کی تعداد بڑھ گئی۔ صرف ایس ڈی ہائی اسکول میں 1957 میں پانچویں جماعت میں 391 طلبہ داخل تھے۔ نئی نسل باشعور اور ذہین ہے۔ یقیناً موجودہ حکومت، اساتذہ اور والدین اس خوشگوار تبدیلی کا کریڈٹ لینے کے حقدار ہیں۔



یہ کتاب فقط ایک تاریخی مجموعہ نہیں بلکہ ریاست بہاول پور کی دو صدیوں پر محیط سیاسی، سماجی، انتظامی اور تہذیبی زندگی کا ایسا آئینہ ہے جس میں ماضی سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ ہر صفحہ، ہر تحریر، ہر حکم نامہ اور ہر معاہدہ ایک دور کی بازگشت ہے۔ ایک ایسی بازگشت جو آج بھی ہمارے حال سے جڑی ہوئی ہے۔ انگریزی میں محفوظ نایاب دستاویزات کا یہ اردو ترجمہ صرف الفاظ کی منتقلی نہیں بلکہ ایک تہذیب کی روح کی ترجمانی ہے۔

ان دستاویزات نے ایک منفرد اور مربوط بیانیہ تشکیل دیا ہے جو قاری کو بہاول پور کی تاریخ کے زندہ سفر پر لے جاتا ہے۔ یہ محض کتاب نہیں، ریاست بہاول پور کی جیتی جاگتی آواز ہے، ایک تاریخ جو آج بھی ہم سے ہم کلام ہے۔ اس کتاب کو ہاتھ میں لیں اور بہاول پور کی سانسوں کو محسوس کریں — ایک ایسی سرزمین جو اپنی دستاویزات میں آج بھی زندہ ہے۔

پروفیسر نسیم بلوچ کی کتب

1۔ چونواں کلام بہادر علی زار
2۔ ستلج کی ریت سے لپٹی یادیں
3۔ دستاویزات میں بولتا بہاول پور (1833-2025)
4۔ بہاول پور: تہذیب، تاریخ، ادب (مضامین)
5۔ رحیم یار خاں تہذیب، تاریخ، ادب (مضامین)
6۔ ڈسٹرکٹ گزٹیئر منٹگمری 1933 کا اردو ترجمہ

9 789697 576920

بکس اینڈ ریڈرز

25-A فیز 1، واپڈا ٹاؤن، ملتان

Ph. 061-6210154, 0300-9634424

Email. booksnreaders1@gmail.com